تاریخِ اہلِ حدیث
امام العصر
حضرت مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی
مکتبہ قدوسیہ اردو بازار لاہور

تاریخ اہل حدیث

امام العصر

حضرت مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی

حرف آغاز

برصغیر پاک و ہند میں اہل حدیث کے متعلق مختلف غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ مخالفین ان کے عقائد مسخ کر کے عوام کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ جب کہ تاریخ کے حوالے سے بھی ان کے متعلق گمراہ کن باتیں کی جاتی ہیں۔ عقائد میں جہاں ان کو (معاذ اللہ) گستاخ رسول، درود کا منکر اور نہ جانے کن کن خرافات کا حامل ٹھہرایا جاتا ہے وہاں تاریخی اعتبار سے ان کو ڈیڑھ سو برس کی پیداوار کہا جاتا ہے۔ عموماً حضرات احناف کے دونوں گروہوں (بریلوی اور دیوبندی) کا ان کے متعلق یہی رویہ ہے۔ بعض نامور اہل علم بھی اس مسلکی تعصب کا شکار ہو چکے ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اہل حدیث نہ تو گستاخ رسول اور درود کے منکر ہیں اور نہ ہی یہ کل کی پیداوار ہیں۔ اگر فرقہ وارانہ تعصب کو بالائے طاق رکھ کر غیر جانبدارانہ رویہ اپناتے ہوئے اہل حدیث کے افکار اور تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو حقائق تصویر کا کچھ اور ہی رخ پیش کرتے ہیں۔ اہل حدیث کا یہ عقیدہ ہے کہ زندگی کے ہر مرحلے میں براہ راست کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ سے رجوع کیا جائے۔ محمد ﷺ کے ہوتے ہوئے امت محمدیہ کے کسی فرد کی بات اپنے لئے حجت اور دلیل سمجھنا اصل گستاخی ہے۔ الحمدللہ اہل حدیث کا دامن اس سے پاک ہے۔

دعوت اہل حدیث سو ڈیڑھ سو برس کی بات نہیں بلکہ چودہ سو برس پرانی فکر ہے جب ہدایت کی شمع حجاز مقدس میں روشن ہوئی۔ اس کے ایک طویل عرصے بعد بعض لوگوں نے ضرورت محسوس کی کہ ہمارے لئے شاید قول نبی کافی نہیں اس لئے انہوں نے قول امام کو بھی اپنے لئے ضروری سمجھا۔ اسی وقت امت میں دو مستقل مکاتب فکر وجود میں آ گئے۔ ایک کو اہل حدیث کا لقب دیا گیا اور دوسرے کو اہل الرائے کے نام سے جانا گیا۔ اس کتاب میں قارئین اس گروہی تفریق کے متعلق مزید تفصیلات ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ اہل حدیث کا غیر اہل حدیث حضرات سے جو بنیادی اختلاف ہے وہ یہی ہے۔ افراط و تفریط کے اس دور میں یہ اختلاف محض نماز کے چند فروعی مسائل تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ حالانکہ مالکی، حنبلی اور شافعی عموماً ان مسائل میں اہل حدیث کے ہم نوا ہیں لیکن بسا اوقات یہ لوگ بھی احناف کی طرح تقلید جامد کا شکار ہو جاتے ہیں۔

بدقسمتی کی بات ہے کہ اہل حدیث کی فکر جو کہ بہت بلند اور وسیع تھی، آمین و رفع الیدین وغیرہ

چند مسائل تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس رویے کو بدلا جائے۔ لوگوں کو بتایا جائے کہ اہل حدیث محض چند اختلافی مسائل کے حامل گروہ کا نام نہیں بلکہ یہ تو ان نفوس قدسیہ کی جماعت اور تحریک کا تسلسل ہے جنہوں نے حدیبیہ کے مقام پر نبی ﷺ کے دست اقدس پر موت کی بیعت کی تھی۔

امام العصر حضرت مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی کا شمار برصغیر پاک و ہند کے چوٹی کے علماء میں ہوتا تھا۔ ہر مکتب فکر میں آپ کو تبحر علمی، وسعت مطالعہ کی بنا پر احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ سیاسی اعتبار سے آپ مسلم لیگ کے ہم نوا تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے قیام پاکستان کے لیے بے حد جدوجہد کی۔ سیالکوٹ کے ایک متمول دین دار گھرانے سے آپ کا تعلق تھا۔ آپ بہت بڑے مبلغ بھی تھے۔ اشاعت اسلام کے لیے دیار ہند کے دور دراز گوشوں میں جا کر قرآن و سنت کا بول بالا کیا۔ اس کار خیر میں شیخ الاسلام حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ عموماً آپ کے شریک سفر ہوتے تھے۔ مولانا سیالکوٹی تقریر کے ساتھ ساتھ تحریر کے میدان کے بھی شہسوار تھے۔ آپ کی تصنیفات کی تعداد ۸۴ تک پہنچتی ہے جو کہ تقریباً مطبوعہ ہیں۔ تبصیر الرحمن فی تفسیر القرآن کے نام سے آپ نے قرآن حکیم کی مبسوط تفسیر لکھنا شروع کی۔ لیکن افسوس ہے ابتدائی تین سپاروں سے کام آگے نہ بڑھ سکا۔ واضح البیان کے نام سے آپ نے سورۂ فاتحہ کی ضخیم تفسیر لکھی۔ اس کے علاوہ مختلف سورتوں کی تفسیر لکھی جو مختلف عنوانات کے تحت شائع ہو چکی ہیں۔ سیرت النبیؐ پر آپ نے چھوٹی بڑی آٹھ مختلف کتابیں تحریر فرمائیں، جن میں نبی کریم ﷺ کی حیات طیبہ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ قادیانیوں اور عیسائیوں کے رد میں آپ نے تقریباً پچیس کتب لکھیں۔ ان میں آپ کی کتب شہادۃ القرآن اور عصمت انبیاء کو غیر معمولی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ شہادۃ القرآن کو احناف کے بریلوی مکتب فکر کی نامور شخصیت پیر مہر علی شاہ نے بہت پسند فرمایا۔ دیوبندی مکتب فکر کی معروف روحانی شخصیت مولانا عبدالقادر رائے پوری کے ارشاد پر مجلس تحفظ ختم نبوت نے اسے دوبارہ شائع کروایا۔ شہادۃ القرآن میں حضرت سیالکوٹی نے حیات مسیح علیہ السلام کے اہم موضوع پر بحث کی ہے۔ اس کے علاوہ مرزا قادیانی کی کتاب ازالۃ اوہام کا رد کیا ہے۔ مولانا میر سیالکوٹی کی ایک کتاب پیغام ہدایت در تائید مسلم لیگ کے نام سے بھی ہے۔ مسلم لیگ کی تائید و حمایت میں مختلف مضامین جو انہوں نے مختلف اوقات میں لکھے تھے، ان کا یہ مجموعہ ہے۔

مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی تہجد گزار اور شب زندہ دار تھے اور اوراد و وظائف کے پابند تھے۔ عالم باعمل تھے۔ آپ نے ۱۲ جنوری ۱۹۵۶ء کو جمعرات کے روز شام پانچ بجے وفات پائی۔ اگلے روز

نماز جمعہ کے بعد آپ کا جنازہ ادا کیا گیا۔ نماز جنازہ حضرت حافظ عبداللہ روپڑیؒ نے پڑھائی۔ نامور علمی و تاریخی شخصیت محترم مولنا محمد اسحاق بھٹی آپ کے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ "اپنے ہم عصروں میں وہ بڑے ذہین و طباع اور نکتہ رس تھے۔ ان کے پرتاثیر مواعظ اور بلاغت بیان کی کشمیر سے راس کماری تک دھوم تھی۔ دفاع اسلام کے لیے ان کی تگ و تاز مجاہدانہ نے آدھی صدی سے زیادہ عرصے تک اس دور کے پورے ہندوستان کا احاطہ کیے رکھا۔ ملک کے علمی حلقوں میں ان کی آواز کو ہمیشہ پذیرائی حاصل رہی۔"

جماعت اہل حدیث کے ایک اجلاس میں یہ طے پایا کہ تاریخ اہل حدیث پر کچھ لکھا جائے۔ اس مقصد کے لئے مولنا سیالکوٹی کو یہ خدمت سونپی گئی اور آپ نے یہ کتاب تالیف کی۔ ۱۹۵۳ء میں پہلی دفعہ یہ کتاب شائع ہوئی۔ بعد میں مختلف اوقات میں پاکستان و ہندوستان سے شائع ہوتی رہی۔ ہماری بڑے عرصے سے یہ خواہش تھی کہ تاریخ اہل حدیث کے موضوع پر مواد عوام کے سامنے لایا جائے تاکہ اہل حدیث کے متعلق غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جا سکے۔ اس کتاب کی اشاعت اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ تاریخ اہل حدیث کے موضوع سے ہماری دلچسپی کی اہم وجہ ہمارے والد محترم حضرت مولنا عبدالخالق قدوسیؒ کی ذات گرامی قدر ہے۔ آپ اہل حدیث کی تاریخ پر ایک جامع اور تفصیلی کتاب لکھنا چاہتے تھے۔ آپ اس کا خاکہ تیار کر چکے تھے۔ کام کا ابھی آغاز ہی کیا تھا کہ ۲۳ مارچ ۱۹۸۷ء کو لاہور میں مینار پاکستان کے قریب قلعہ چھمن سنگھ میں منعقدہ اہل حدیث کانفرنس میں آپ نے بم دھماکے میں جام شہادت نوش فرمایا۔ آپ جس انداز کی تاریخ مرتب کرنا چاہتے تھے، قارئین کی دلچسپی کے لئے اس کا کچھ تعارف پیش خدمت ہے۔ آپ لکھتے ہیں

"میں نے تاریخ اہل حدیث پر جب کام شروع کیا تھا تو میری تحقیق کا محور صرف برصغیر پاک و ہند تھا، لیکن جب جماعت اہل حدیث کو میں نے بحیثیت ایک فقہی مکتب فکر کے پڑھنا شروع کیا تو لامحالہ مجھے ہندوستان سے باہر نکل کر اس سرزمین میں جانا پڑا جہاں سے آفتاب اسلام طلوع ہوا تھا۔ اس مقصد کے لیے میں نے اسلام کی ابتدائی تین صدیوں کے متعلق پڑھنا ضروری سمجھا اور اس میں شک نہیں کہ جو شخص بھی اسلام کو اپنی اصلی حالت میں دیکھنا چاہتا ہے اسے حقیقت تک پہنچنے کے لیے ان تین صدیوں کا مطالعہ ضرور کرنا ہوگا اور مجھے یہ کہنے میں قطعاً تردد نہیں کہ ان تین سو سالوں میں آپ اسلام کا جو حقیقی اور خوب صورت چہرہ دیکھیں گے اس کی عام فہم تعبیر فکر اہل حدیث ہے۔ بہرحال میں مطالعہ کرتے ہوئے جب برصغیر سے نکل کر دیار حبیب میں پہنچا اور براہ راست اصل ماخذ کی ورق گردانی شروع کی تو تاریخ اہل حدیث کے متعلق میرا ذہن علاقائی نہیں بلکہ آفاقی بن

چکا تھا۔ اب میں تاریخ اہل حدیث کے نام سے جو کتاب لکھنا چاہتا ہوں' یہ اہل حدیث کی ایک جامع اور مفصل تاریخ ہوگی جو خیر القرون سے دور حاضر تک چودہ سو سال پر محیط دستاویز ہوگی۔ یہ کتاب چودہ جلدوں میں مکمل ہوگی یعنی ہر صدی کے لیے ایک جلد مختص ہوگی۔ ہر صدی پر لکھتے ہوئے اس صدی کے سیاسی حالات کا عمومی جائزہ لینا ہوگا' اس میں یہ بات خاص طور پر بتائی جائے گی کہ کون سے مکاتب فکر کس حد تک سیاسی حالات سے متاثر ہوئے یا سیاسی حالات نے انھیں جنم دیا' کیونکہ تاریخ میں یہ بات محفوظ ہے کہ بہت سے اعتقادی فرقے اور کئی فقہی مذاہب خالص سیاسی حالات کی پیداوار ہیں اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

''اس کے بعد اس صدی کے اعتقادی اور فقہی مذاہب کا مختصر جائزہ لیا جائے گا' ان کی علمی خدمات پر طائرانہ نظر ہوگی۔ اس کے بعد اہل حدیث کی سیاسی اور علمی خدمات کی مفصل روداد اور دوسری جماعتوں سے ان کے کام کا موازنہ ہوگا اور اس صدی کے علمائے اہل حدیث کا تفصیلی ذکر ہو گا' جس میں ان کی زندگی کے مختلف گوشوں پر مناسب گفتگو کی جائے گی اور ان کے علمی اور سیاسی کارناموں کا تفصیل سے ذکر کیا جائے گا۔

''نیز بعض صدیوں میں ہمیں بعض علاقوں کے متعلق ایک مستقل باب کا اہتمام کرنا پڑے گا جس میں فکر اہل حدیث کے نشوونما کی تفصیل بیان کی جائے گی۔ یہ ان علاقوں کے متعلق ہوگا جہاں اسلام اپنی اصلی شکل وصورت میں نہیں پہنچا اور عام لوگوں کو جو چیز اسلام کے نام پر پیش کی گئی وہ اسلام نہیں بلکہ کچھ اور ہی تھا اور لوگ نام کی وجہ سے دھوکا کھا گئے۔ پھر کچھ اللہ والے اٹھے' انھوں نے اسلام کے غبار آلود چہرے کو صاف کیا جسے بعض لوگوں نے پہچان لیا' لیکن جن لوگوں کو اندھیرے سے پیار تھا' انھوں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ وہی لوگ جو گمراہی پر متفق تھے' حق کے معاملے میں اختلاف کا شکار ہو گئے۔ اختلاف وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ نفرتیں بڑھیں' معاملہ جنگ وجدال تک پہنچا جس نے ایک دردناک تاریخ کو جنم دیا' انتہائی دردناک۔ یہ باب ائمہ اہل حدیث کے حالات سے پہلے آئے گا۔''

مندرجہ بالا اقتباس پیش کرنے کا ایک مقصد یہ ہے کہ شاید کوئی اللہ کا بندہ اس علمی وتحقیقی خدمت کو انجام دے سکے۔ یہ کام مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں۔ کاش ہمارے اہل علم اپنی ترجیحات کا رخ صحیح طور سے متعین کر لیں اور مسلک اہل حدیث کے اس دیرینہ قرض کو ادا کر دیں۔

ابوبکر قدوسی

یکم جنوری ۲۰۰۱ء

فہرست

حصہ دوم

تاریخ اہلحدیث
تدوین علم حدیث

حصہ سوم

تاریخ اہلحدیث
ہندوستان میں علم وعمل بالحدیث

تاریخ اہل حدیث

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لله الذی اسبغ علینا نعمه فی القدیم والحدیث وارسل الینا رسوله النبی الامی باحسن الحدیث الذی بین لنا ما احل لنافیه من الطیب وحرم علینا من الخبیث ووضع عنا اصار رسوم الجاهلية واغلال الاوهام فسرنا بلطفه السیر الحثیث واوصی الی اصحابه و خلص احبابه ان یبلغوا عنه ماسمعوا منه من الحدیث فبذلوا جهدهم رضی الله عنهم فی اشاعة سنته واذاعة امره بالسیر السریع والطلب الحثیث فصل الله علیه وعلیهم وعلی اله وعلی من جلس مجالس العلم للتحدیث.

اما بعد.

التماس مولف :-

پس بندہ حقیر محمد ابراہیم میر سیالکوٹی اپنے ناظرین با تمکین کی خدمت میں عرض پرداز ہے کہ اس کتاب کا موضوع اس کے نام سے ظاہر ہے- پیشتر اس کے کہ خاکسار اس کے مبادی ومقاصد کو بیان کرے- چند امور کا اظہار ضروری ہے-

اول یہ کہ اس کتاب کے مضامین گو سمجھنے میں صاف وسادہ ہیں لیکن بیان کرنے اور سمجھانے میں مشکل اور مجھ ایسے کم ہمت و قلیل البضاعت کی استعداد سے بڑھ کر ہیں- وجہ مشکل ہونے کی یہ ہے کہ اس کتاب کے دو بڑے حصے ہیں- تاریخی اور اصولی- حصہ تاریخی کے لئے مواد کا کثرت سے میسر آنا اور ان پر مصنف کا عبور ضروری ہے- علم تاریخ میں جہاں تک میرا ناقص مطالعہ ہے اس موضوع پر کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے- لہٰذا ضروری ہے کہ مختلف کتابوں کی ورق گردانی سے جمع اشتیات و

تالیف متفرقات کر کے سب کو اپنی طرز پر ترتیب دوں‘ جو محنت و مشقت کا کام ہے۔ اور مجھ ایسے عدیم الفرصت کے لئے نہایت مشکل ہے۔

حصہ اصولی میں یہ مشکل ہے کہ مصنف کے لئے ضروری ہے کہ وہ مذہب کے اصول و فروع کے تائیدی و تنقیدی امور پر پوری نظر رکھتا ہو۔ بیان میں مشاق و ماہر ہو۔ مطالعہ کتب میں وسیع النظر ہو۔ دوسروں کے نقض و معارضہ کا کافی جواب دے سکتا ہو۔ جزئیات کو کلیات کے ماتحت کر کے ان میں مطابقت دے سکتا ہو اور کلیات جزئیات کا استخراج کر کے ان میں نظام قائم کر سکتا ہو اور ان سب کے علاوہ فہم سلیم و طبع مستقیم کی بخشش سے بھی خاص طور پر بہرہ اندوز ہو۔ اور اس مذہب کی عملی سہولتوں اور زمانے اور قوم کی ضرورتوں کو تجربہ و تدبیر سے بخوبی سمجھتا ہو اور سب کے بعد یہ کہ اسے صحت فکر کے لئے فراغت و یکسوئی حاصل ہو۔ لیکن خاکسار کی حالت اس کے برخلاف ہے مطالعہ ناقص اور علم قاصر ہے۔ فکر غیر صائب اور طبع نارسا ہے‘ اور کثرت مشاغل کی وجہ سے دل جمعی مفقود ہے اپنے گروہ باشکوہ کے علمائے باوقار میں جن کی دریوزہ گری کا مجھے فخر حاصل ہے اس قابل ہرگز نہیں ہوں کہ ان امور کو جو اس کتاب میں بیان ہونے والے ہیں کماینبغی ادا کر سکوں‘ بالخصوص ان حضرات کے سامنے جنہوں نے اس خدمت کو مجھ پر لازم کیا۔ کیونکہ مجھے ان کی نسبت پورا اعتماد ہے کہ وہ اس ضرورت کو میری نسبت کم محنت سے اور احسن صورت میں پورا کر سکتے ہیں[1] اور کمالات علمیہ اور عملیہ میں اس ہیچمدان و ہیچمیرز سے بدرجہا افضل ہیں ؎

یکے قطرہ باراں ز ابرے چکید — خجل شد چو پہنائے دریا بدید

دیگر یہ کہ اس کتاب کے بعض مضامین میں یہ دقت ہو گی کہ جماعت اہلحدیث (کَثَّرَ اللّٰہُ سَوَادَ ھُمْ) کو دیگر اسلامی فرقوں سے ممیز کرتے وقت ضرور ہے کہ ان

---

[1] مثلاً استاذ الاساتذہ حضرت مولانا حافظ عبد اللہ صاحب غازی پوریؒ اور مولانا حافظ عبد العزیز صاحب رحیم آبادیؒ اور جناب شاہ عین الحق صاحب پھلواروی۔ اور جناب مولانا حافظ مولوی عبد الجبار صاحب عمرپوری اور مولانا شمس الحق صاحب ڈیانوی وغیرہم۔

دیگر فرقوں کا ذکر بھی آجائے اور مخالفت مذہبی ایک ایسا امر ہے کہ اس میں عصبیت و حمیت کی رگ جوش میں آجاتی ہے۔ کبھی تو مقرر و مصنف کی طبیعت اعتدال پر نہیں رہتی اور اس سے ایسے سخت سست الفاظ نکل جاتے ہیں۔ یا طرز بیان ایسا دل آزار ہو جاتا ہے کہ سنجیدہ مزاج لوگ اسے ہرگز پسند نہیں کرتے۔ بلکہ بسا اوقات تلخ گوئی اور سخت کلامی کے سبب اصلاح پذیر طبائع بھی بدک جاتی ہیں اور بجائے فائدے کے الٹا نقصان ہوتا ہے اور کبھی پڑھنے سننے والے محض اس خیال سے کہ مصنف یا مقرر ان کے اپنے مذہب کا نہیں ہے۔ نفس مضمون کی قبولیت سے ہر چند کہ وہ حق اور راست ہو انحراف کر لیتے ہیں بلکہ ایسے مسائل کی تسلیم سے بھی انکار کر دیتے ہیں جو ان کے اپنے مسلمات کے رو سے بھی قابل قبول ہوں۔ بلکہ ان کے اپنے ائمہ و علمائے مذہب اور کتب مسلمہ کی تصریحات و شہادات سے بھی ثابت ہوں لیکن مشہور و معمول عوام کے موافق نہ ہوں۔ آہ! بہت سے حقائق ہیں جن کو زمانے کی اسی روش نے پامال کر دیا اور بہت سے سچے موتی ہیں جن کو تعصب کی آندھی نے زیر غبار کر دیا۔ فالی اللہ المشتکی۔

غرض بجائے اس کے کہ سننے سنانے اور لکھنے پڑھنے سے کسی کو فائدہ پہنچتا اور آپس میں تبادلہ خیالات سے اختلاف کی جگہ اتفاق اور مخالفت کی بجائے موافقت پیدا ہو جاتی اور نفرت رغبت سے بدل جاتی۔ الٹا طبیعتوں میں بغض و عناد اور فتنہ و فساد اور ایک دوسرے سے بد ظنی و نفرت پیدا ہو جاتی ہے اور اختلاف رائے خلاف طبائع کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ اسی سبب سے قرآن شریف میں جو اخلاق فاضلہ اور عادات حسنہ کی اعلیٰ تعلیم اور نہایت معتدل روش پر چلانے والی اکیلی کتاب ہے اور نفسانی جذبات اور فطری قویٰ کی رعایت بدرجہ غایت رکھتی ہے خاص طور پر حکم ہے'

وقل لعبادی یقولو التی ھی احسنؕ ان الشیطان ینزغ بینھم (بنی اسرائیل)

"(اے میرے پیارے نبی) آپ میرے بندوں سے کہہ دیں کہ وہ ایسی بات کہا کریں جو بہت اچھی ہو۔ کیونکہ شیطان ان میں جدائی (عداوت) ڈلوائے گا۔"

اسی طرح سامعین کی نسبت فرمایا :-

فبشر عباد الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ اولئك الذین هدهم الله واولئك هم اولو الالباب (الزمر پ ۲۳)

"(اے میرے پیارے نبی) آپ میرے ان بندوں کو (جنت) کی بشارت سنادیں جو کلام کو (غور سے) سن لیتے ہیں پھر اس کی اچھی باتوں کی پیروی کرتے ہیں- یہی لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت بخشی ہے اور یہی لوگ عقل والے ہیں-"

سو یہ خاکسار حتی الوسع اس تحریر میں نہ تو ایسے الفاظ استعمال کرے گا- جن سے کسی خاص فرقے پر حملہ مقصود ہو- اور نہ ایسا طرز بیان اختیار کرے گا جس سے کسی فریق کی ہتک مطلوب ہو بلکہ دلائل کو واضح اور مسائل کو صاف و شستہ الفاظ میں بیان کرنے کے علاوہ اس امر کی بھی کوشش کرے گا کہ جس طرح کوئی حاذق طبیب اس خیال سے کہ بیمار کی طبیعت دوا کی تلخی سے کراہت نہ کرے- ضیافت طبع کے لئے شیرینی کو جزو نسخہ بنا دیتا ہے- اور کالی کڑوی گولی کو ورق نقرہ میں لپیٹ کر یا اس پر قند کا غلاف چڑھا کر بیمار کو کھلاتا ہے- اسی طرح یہ عاجز اللہ تعالیٰ عزوجل کی حسن توفیق و تائید سے ایسی شیریں کلامی اور پسندیدہ طرز اور سنجیدہ انداز سے بیان کرے گا تاکہ ناظرین اسے آسانی سے سمجھ جانے کے ساتھ خوشی سے گوارا اور قبول بھی کر لیں تاکہ اس پر عمل پیرا ہو کر دنیا اور عاقبت کی سعادت حاصل کر سکیں- وما توفیقی الا باللہ.

(۱) اپنی اس نیت و کوشش کے بعد اپنے ناظرین سے میری یہ توقع بیجانہ ہو گی کہ وہ میرے بیان کو جس میں قرآن مجید کی روایات اور رسول اللہ ﷺ کی مقبول و صحیح احادیث ہوں گی' یا ان دونوں (قرآن و حدیث) سے صحیح استنباط ہو گا' محض اختلاف مذہبی کی وجہ سے درجہ قبولیت سے گرا نہیں دیں گے بلکہ دلیل کی قوت اور بیان کی صداقت پر نظر کر کے عدل و انصاف کی رعایت اور حق کی حمایت کریں گے- لان الحق احق ان یتبع.

(۲) میں خود بھی اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں اور میرے عزیز و معزز ناظرین! آپ بھی کریں کہ وہ مجھے میرے علم و عمل میں اور قول و فعل میں لغزش سے بچائے- اور میرے دل پر حق بات نازل کرے- اور میرے قلم سے حق ہی لکھوائے اور ہمارے لئے اپنی رضا کی سچی راہیں کھول دے- اور اپنی ہدایت کو خوشی اور رغبت خاطر سے قبول کرنے کی توفیق بخشے- آمین یا رب العالمین. اللهم انی اعوذ بك من شر نفسي وسوء عملي وشر قلمي ومن سوء فهمي وقلة علمي وزلة قدمي. اللهم سدد لساني وثبت حجتي وقني شر حسدی انك انت نصيری وعضدی بك احول وبك اصول '

(۳) یہ امر بھی خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ بعض مصنفین فریق مخالف کا مذہب ذکر کرنے میں بوجوہات کمی بیشی کر جاتے ہیں- کمی کی یہ صورت ہے کہ اصل مسئلہ یا اس کے دلائل کے بیان میں کچھ کمی کر دی- یا ان کی کسی ضعیف دلیل کو بیان کر کے اس کا رد کر دیا- اور بیشی کی صورت یہ ہے کہ اصل مسئلہ میں اپنی طرف سے کوئی ایسی بات ملا دی جو فریق مخالف کا مذہب نہیں ہے- یا مسئلہ کے طرز بیان کو بدل دیا- جس سے مفہوم کلام میں خرابی پیدا ہو گئی اور اس فریق کا مذہب ضعیف یا باطل کر کے دکھا دیا-

اسی طرح بعض اوقات اپنا مذہب بیان کرنے میں اپنا ضعف معلوم کر کے اس کے بیان میں کمی بیشی تغیر و تبدل کرتے ہیں جس سے ناظرین کو مذہب کی اصلی صورت پر نظر کرنے کا موقع نہیں ملتا-

لیکن اللہ کے فضل سے آپ یہ معائب اس کتاب "تاریخ اہلحدیث" میں نہیں پائیں گے- جو کچھ کسی دوسرے مذہب کی نسبت لکھا گیا- اس میں کسی طرح کی کمی بیشی نہیں کی گئی- نہ تو اصل مسئلہ کی صورت میں اور نہ اس کے دلائل کے بیان میں اور نہ وجہ استدلال میں- اور نہ طریق ادا اور طرز بیان میں- بلکہ ٹھیک اسی طرح بیان کیا گیا ہے- جس طرح اصل قائل نے کہا ہے- یا اس مذہب کی معتبر کتب اور اس کے مستند محقق علماء نے تحقیق کیا ہے-

اسی طرح اپنے مذہب اہل حدیث کے بیان کرنے میں بھی کسی طرح کی کمی بیشی یا تغیر و تبدل یا اخفا یا تقیہ نہیں کیا اور نہ لوگوں سے لحاظ یا رعب کے سبب اصل حقیقت کو چھپایا یا دبایا ہے۔ نہ تو ملمع سازی سے اپنے مذہب کو دوسروں پر غالب کر کے دکھایا ہے اور نہ تعصب سے دوسروں کو نظروں سے گرایا ہے۔ بلکہ جو کچھ لکھا ہے دلیل و برہان سے علی وجہ البصیرت لکھا ہے۔ واللہ اسئل ان یعصمنی من الذلل ویحفظنی من الخطل۔

آخری گذارش یہ ہے کہ میں نے اس کتاب میں جو کچھ لکھا ہے۔ وہ اپنے علم میں حتی الامکان درست اور صحیح لکھا ہے نہ حوالہ میں غلطی کی ہے اور نہ استدلال میں مغالطہ' تاریخی امور کو معتبر کتب سے چنا ہے اور اصولی مسائل کو مسلمہ کتب اصول سے نقل کیا ہے۔

حوالہ جات کے متعلق ایک خاص بات کی طرف توجہ دلاتا ہوں کہ بعض اوقات کوئی مصنف کسی کتاب کا حوالہ دیتا ہے وہ حوالہ بلحاظ صحت نقل و اعتبار کتاب تو بالکل درست ہوتا ہے۔ لیکن مستدل کے مفید مطلب نہیں ہوتا۔ اور یہ امر کبھی تو مصنف کی خامی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ کہ وہ مفید اور غیر مفید میں تمیز نہیں کر سکتا اور کبھی قواعد استدلال کو نہ جان کر دعویٰ اور دلیل کی مطابقت نہیں سمجھتا۔ اور کبھی اصل مسئلے کی بے ثبوتی کے سبب ہوتا ہے کہ محض دلیل کا نام رکھنے کے لئے ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارتا ہے اور تنکے کا سہارا ڈھونڈتا ہے۔ یا طوالت کلام سے اپنے ناظرین کو خوش کرنا چاہتا ہے اور وقت ٹالتا ہے۔

لیکن خاکسار اپنے ناظرین کو نہایت وثوق سے باور کراتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احسان سے یہ عیب اس کتاب میں نہیں پائیں گے۔ بلکہ جو حوالہ دیا ہے وہ بذات خود درست اور معتبر ہونے کے علاوہ عین مطلب کا ہے اور ٹھیک موقع پر چسپاں ہوتا ہے۔ وهذا من فضل ربی۔

(۶) باقی رہی میری اپنی بے بضاعتی اور کم فہمی سو اس کا اعتراف کرتے ہوئے گذارش

کرتا ہوں کہ ہر چند حتی الوسع سب طرف نظر کر کے اور نہایت احتیاط سے دامن سمیٹ کر چلا ہوں۔ لیکن پھر بھی انسان ہوں نسیان اور ذہول میرے خمیر میں ہے اور سہو و خطا میری فطرت میں ہے۔

فان اصبت فمن الله الرحمن وان اخطأت فمني ومن الشيطان. فالمرجو من الكمل ان يعفو الزلل ويسد الخلل لان جهد المقلّ مشكور و باذل الوسع معذور وان اريد الا الاصلاح ما استطعت وما توفيقي الا بالله عليه توكلت واليه انيب اللّٰهُمَّ تقبل مني انك انت السميع المجيب.

وانا عبدك الناسوتي
محمد ابراہیم السیالکوتی
مولف "تاریخ اہل حدیث"

مقدمہ

۱- مذہب کا اصلی رکن اور اہم مقصد- اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کی عبادت ہے- اور چونکہ ذات باری تعالیٰ ہمارے ادراک اور فہم سے پرے اور وسعت و رسائی سے بالاتر ہے- اس لئے ہم اس کی نسبت محض اپنے قیاس سے کوئی صحیح و قابل اطمینان اعتقاد جو اس کی شان کے لائق اور اس کی صفات کمال کے مناسب ہو- قائم نہیں کر سکتے' ولنعم ماقیل ؎

اے برادر بے نہایت در گہیست
ہرچہ بروئے میر سی بروئے مالیست

۲- نیز چونکہ ہر شخص کا قیاس اختلاف طبائع اور ماحول کے تاثرات اور ماخذ علم کے سبب دوسرے سے مختلف ہو گا اور نظام قائم نہیں رہے گا اور پھر وجوہات ترجیح بھی مختلف ہوں گے- اس لئے ضروری ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ بیچوں کی ذات اور اس کی صفات کی نسبت جو بھی اعتقاد رکھیں وہ خود اسی کا تعلیم کردہ ہو- چنانچہ سید المرسلین ﷺ نے بھی باوجود اعرف واعلم باللہ ہونے کے اس مقام پر آکر صاف صاف کہہ دیا- لا احصی ثناء علیك انت کما اثنیت علی نفسك (حصن) یعنی (اللہ تعالیٰ) میں تیری ثنا (کما حقہ) نہیں کر سکتا تو ایسا ہے جیسا تو نے اپنی بابت خود فرمایا:

اس قصور علم کا اقرار بڑے سے بڑے عارف بڑے سے بڑے فلسفی کو بھی کرنا پڑا ہے- چنانچہ حضرت علی سے منقول ہے:

العجز عن الادراك (ملا مبین)

"یعنی اللہ تعالیٰ کے ادراک سے عاجز آجانا یہی ادراک ہے-"

اسی طرح امام رازیؒ کا قول ہے:

نهاية اقدام العقول عقال و اكثر سعي العٰلمين ضلال

"یعنی انسانی عقل کی رسائی کا انجام گھٹنے کی بندش ہے اور دنیا جہان یا علما کی اکثر دوڑ کا حاصل رستے کا گم ہو جانا ہے۔"

۳۔ اور چونکہ خدمت و اطاعت تب بار آور ہو سکتی ہے جب مخدوم و مطاع اسے پسند کر لے۔ اور اس پر اپنی رضا ظاہر کرے اور کسی کی رضا و ناراضی اس کے اپنے بتائے بغیر معلوم نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کی عبادت کا طریق ہم اپنی طرف سے مقرر نہیں کر سکتے۔ بلکہ ضروری ہے کہ اس کی تعلیم بھی خاص اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہو۔

۴۔ پھر چونکہ ہر خاص و عام دربار شاہی سے بالا ستقلال بغیر واسطہ کے حکم نامہ اور شرف ہم کلامی حاصل کرنے کے لائق نہیں ہوتا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ اپنے علم و حکمت سے نوع انسانی میں سے بعض افراد کو منتخب کر کے ان پر بذریعہ وحی اپنی رضا کے رستے کھولتا رہا ہے اور ان کے قلوب کو نور علم و یقین سے منور اور معرفت حق سے معمور کرتا رہا ہے اور ان کو اپنی معصیت سے معصوم رکھنے کے لئے ان کے علمی و عملی قویٰ میں رسوخ و اعتدال پیدا کرتا رہا ہے اور تمام لوگوں کو جن کو ان کی دعوت پہنچے۔ ان کی پیروی و فرمانبرداری کا حکم کرتا رہا ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے علم و ارادہ میں ان کے پیدا کرنے سے بڑا مقصد یہی ہوتا تھا کہ ان کو خلقت کی رہبری کے لئے مقرر کرے[۱] اور یہ اللہ تعالیٰ کی کمال رحمت ہے چنانچہ سید المرسلین خاتم النبیین ﷺ کی شان میں فرمایا:

وما ارسلنك الا رحمة للعالمين (پ ۱۷۔ انبیاء)

یعنی (اے پیغمبرؐ) ہم نے آپ کو دنیا جہاں والوں پر رحمت کرنے کے لئے رسول بنایا ہے اور بس۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے تقاضے سے ہر امت میں رسول پیدا کیا۔ جو ان کو غیر

---

[۱] ایسے شخص کو نبی یا رسول و پیغمبر کہتے ہیں۔ نبی اس لحاظ سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک نہایت ممتاز اور رفیع القدر ہوتا ہے یا اس لئے کہ اللہ تعالیٰ سے علم و خبر پا کر خلقت کو بتاتا اور سکھاتا ہے اور رسول و پیغمبر اس نظر سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام و پیغام اس کے بندوں کو پہنچاتا ہے۔

اللہ سے ہٹاتا اور محض اللہ تعالیٰ کی عبادت کا حکم سناتا رہا- چنانچہ فرمایا-

ولقد بعثنا فی کل امة رسولا ان اعبدوا اللہ واجتنبوا الطاغوت

(نحل پ ١٤)

"ہم ضرور ضرور ہر امت میں رسول بھیجتے رہے ہیں کہ بس اللہ ہی کی عبادت کرو اور غیر اللہ سے اجتناب کرو"

نیز فرمایا-

وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ (نساء پ ٥)

"ہم نے جو بھی رسول بھیجا وہ صرف اس مقصد کے لئے بھیجا کہ ہمارے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے"

۵- مذہب کے دو حصے ہیں اول اصول یعنی عقائد ان کا تعلق قلب (دل) سے ہے دوم فروع جن میں عبادات' معاملات' اخلاق و دیگر اعمال حسنہ شامل ہیں- ان کا تعلق زبان- اور دیگر اعضاء اور انسان کی متعلقہ اشیاء جیسے مال و دولت سے ہے- بس یہ دونوں حصے (اصول و فروع یا عقائد و اعمال) اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے اس کے کسی رسول برحق کی معرفت مقرر ہوتے رہے ہیں- اور اسی حیثیت سے کسی مذہب کو بالفاظ مختلفہ دین الہٰی دین حق 'شریعت الہٰی اور سچا مذہب کہتے ہیں-

۶- نیز چونکہ مذہب کا تعلق صرف اللہ ذوالجلال سے ہے اور مذہبی اعمال و عقائد کی جزا بھی اسی سے مطلوب ہے اور ہونی چاہیئے- اس لئے اللہ تعالیٰ سے صرف اسی اعتقاد صحیح اور عمل صالح کی جزائے خیر ملے گی جو اس نے اپنے رسول برحق کی معرفت مقرر و تعلیم کیا ہو- اسی لئے فرمایا:

ام لهم شرکٰؤُ شرعوا لهم من الدین ما لم یاذن به اللہ (حم شوری پ ٢٥)

"کیا ان لوگوں کے واسطے شریک ہیں جنہوں نے ان کے لئے دین کی وہ باتیں مقرر کر دی ہیں جن کی اجازت اللہ نے نہیں دی"

۷- چند امور ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سوائے نبی بر حق کی ذات بابرکات کے کسی دیگر کی ذات میں جمع نہیں کرتا وہ یہ ہیں (الف) نبی اللہ کی پیدائش و پرورش اور اس کا نشوونما اور اس کا انتخاب و اصطفاء ایک خاص ارادہ الٰہی کے ماتحت ہوتا رہا ہے آیت ولتصنع علی عینی[۱] (طہ پ۱۶) اس پر شاہد ہے جس کی علت غائی اللہ تعالیٰ کی شریعت کا اظہار اور نبی اللہ کا خلقت کی رہنمائی کے لئے مبعوث و مخصوص ہونا ہے اور یہ امر واصطنعتك لنفسی[۲] اذهب انت واخوك بایاتی[۳] (طہ پ ۱۶) سے ثابت ہے۔

(ب) اسی لئے اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کے علمی اور عملی قویٰ میں ایسا رسوخ و اعتدال پیدا کرتا رہا ہے کہ وہ اتباع ھوا سے معصوم رہتے ہیں اور فرائض کی انجام دہی میں کوتاہی نہیں کرتے۔ اس وصف کی شان حکم ولا تنیا فی ذکری[۴] (طہ پ ۱۶) میں چمک رہی ہے۔

(ج) نبی اللہ کبھی تو اللہ تعالیٰ کا بے واسطہ مخاطب ہوتا ہے اور کبھی بواسطہ فرشتہ لیکن بندوں تک اللہ تعالیٰ کے احکام شرعی پہنچنے میں ایک وہی (پیغمبر) واسطہ ہوتا ہے اور بس۔

(د) امت کی طرح نبی اللہ خود بھی احکام الٰہیہ کا مکلّف ہوتا ہے "الا ماخص منها" ان سب امور چہارگانہ کو زیر نظر رکھنے سے ایک روشن ضمیر راست رو شخص ضرور ضرور اس نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ نبی اللہ کو شریعت الٰہیہ کی سمجھ صحیح طور پر ہونی چاہئے۔ تاکہ اس کے بیان و طریق عمل سے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا منشاو مقصد پورا پورا اور صحیح صحیح معلوم ہو جائے اور وہ غلط فہمی میں نہ پڑیں۔ کیونکہ لوگوں کی نظریں تو اسی مقدس ہستی

---

۱ تاکہ تو پرورش کیا جائے سامنے میری آنکھ کے
۲ اور میں نے تجھے اپنی ذات کے لئے پسند کر لیا ہے۔
۳ تو اور تیرا بھائی میری آیات (نشانات و احکام) لے کر جاؤ۔
۴ اور میری یاد میں سستی نہ کرنا۔

کی طرف لگی ہوتی ہیں جس کی معرفت ان کو اللہ کے احکام پہنچتے ہیں اور صرف اسی کے اعتبار پر وہ اس کے اس قول کی تصدیق کرتے ہیں کہ یہ اللہ کا حکم ہے ورنہ ان کے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ یہ خداوند عالم کا حکم ہے پس ضرور ہے کہ نبی اللہ کے قول و طریق عمل کو معتبر جان کر اس کی پیروی کی جائے تاکہ من یطع الرسول فقد اطاع اللہ[۱] (نساء پ ۵) کی سند اور قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ[۲]

---

[۱] جو اس رسول (محمدؐ) کی اطاعت کرتا ہے یا کرے گا۔ وہ اللہ کی اطاعت کرے گا کیونکہ اس نے رسول اللہ کی اطاعت اللہ کے واطیعوا الرسول کی تعمیل میں کی۔

[۲] (اے میرے حبیب ان سے) کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت کرے گا۔ یعنی صدر اول میں آنحضرت ﷺ کے دعوی نبوت کے وقت صرف آپ کے اعتبار و اقرار پر قرآن شریف کے کلام اللہ اور منجانب اللہ ہونے کا اعتبار و اقرار کیا گیا۔ چنانچہ سورہ یونس میں منکرین کے جواب میں فرمایا فقد لبثت فیکم عمرا من قبلہ افلا تعقلون (یعنی اے میرے حبیب ان سے کہہ دیں کہ میں اس (تلاوت قرآن اور دعویٰ نبوت) سے پیشتر ایک کافی عمر تم ہی میں رہ چکا ہوں تو کیا تم عقل نہیں کرتے اور سورہ مومنون میں فرمایا ام لم یعرفوا رسولھم فھم لہ منکرون یعنی آیا یہ لوگ اپنے رسول (محمدؐ) کو (شخصیت و سیرت صدق و امانت اور خاندان کی رو سے) جانتے پہچانتے نہیں کہ اسے اوپرا جان کر اس سے انکار کرتے ہیں۔ ان آیتوں میں قابل التفات دو لفظ ہیں عقل اور معرفت عقل کا کام ہے معلومات سے مجہولات کا علم حاصل کرنا اور معرفت اس علم کو کہتے ہیں جو آثار و علامات میں تفکر کرنے سے حاصل ہو چنانچہ فرمایا تعرفھم بسیماھم (پ ۳) اور اس کی ضد انکار ہے جیسا کہ اوپر کی آیت میں معرفت کے مقابلے میں انکار کا ذکر کیا۔ پس ہر دو آیات کی توضیح یوں ہے کہ صدر اول کے لوگ جن میں آنحضرت ﷺ نے دعویٰ نبوت کیا آنحضرت ﷺ کے حسب نسب اور آپ کی شخصیت و پاک سیرت سے پورے پورے واقف تھے پس جو کچھ ان کو معلوم تھا یعنی آپ کی سیرت و عملی زندگی اسی کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے ان کو اس شے کی طرف رہنمائی کی جس کا ان کو علم نہیں تھا۔ اور وہ بوجہ جہالت کے انکار کرتے تھے یعنی آپ کی نبوت اور آپ پر کلام الٰہی کا نازل ہونا اور استدلال کا صحیح طریق یہی ہے اور آنحضرت کے حالات شخصیہ پر نظر کر کے ان میں تفکر کرنے کی بابت فرمایا قل انما اعظکم بواحدۃ ان تقوموا اللہ مثنی وفرادی ثم تتفکروا ما بصاحبکم من جنۃ ان ھو الا نذیر لکم بین یدی عذاب شدید (پ ۲۲) یعنی ان سے کہہ دیجئے کہ میں تم کو صرف ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں کہ تم اللہ کو حاضر ناظر جان کر اکیلے اکیلے اور دو دو مل کر کھڑے ہو اور پھر غور و فکر

(آل عمران پ ۳) کا درجہ حاصل ہو۔

(۸) بیان بالا کا حاصل مطلب یہ ہے کہ علم دین کے دو ہی رکن ہیں اور بس کتاب الٰہی (قرآن مجید) جو اللہ کا کلام ہے ۲۔ اور اس کے رسول پاکؐ کی سنت (حدیث شریف) جو آنحضرت ﷺ کے قول و فعل اور سیرت کا دفتر و مجموعہ ہے اس معنی میں کہا گیا ہے۔

اصل دین آمد کلام اللہ معظم داشتن
پس حدیث مصطفیٰ بر جاں مسلم داشتن

بس یہی "اہلحدیث" کے مذہب کا صحیح فوٹو ہے۔ اور یہی ان کا موٹو[1] ہے۔ اور اس کتاب میں اس کی بادلائل، تفصیل و توضیح ہے۔

خاکسار
محمد ابراہیم سیالکوٹی

□ □ □

گذشتہ سے پیوستہ

کرو (تو تم کو معلوم ہو جائے گا) کہ تمہارے صاحب (محمدؐ) کو کسی قسم کا جنون نہیں ہے اور آپ کے اخلاق کریمانہ اور عادات حسنہ اور پاکیزہ عملی زندگی کی بابت فرمایا: انك لعلى خلق عظيم (ن پ ۲۹) یعنی تحقیق آپ اعلیٰ اخلاق پر (قائم) ہیں۔

خلاصہ اس سارے حاشیہ کا یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے آپؐ کی نبوت کی صداقت اور قرآن کے من جانب اللہ ہونے کے ثبوت میں آنحضرت ﷺ کی عملی زندگی کو پیش کیا گیا ہے جو سب کو معلوم تھی اور جس کا وہ سب اعتراف کیا کرتے تھے۔

[1] موٹو انگریزی Moto لفظ جس کے معنی ہیں نصب العین

دین واحد میں مختلف فرقے کس طرح بن جاتے ہیں

صاحب شرع (پیغمبر) کی موجودگی میں سب امتی ایک ہی فرقہ ہوتے ہیں- جو کچھ نبی اللہ نے فرمایا اپنے عمل سے بتلایا- سب نے اس کے سامنے گردن جھکا کر اسی کی پیروی اختیار کی- چنانچہ خدا تعالیٰ نے زمانہ سابق کی حالت یوں بیان فرمائی-

وما کان الناس الا امة واحدة فاختلفوا (یونس پ ۱۱)

"یعنی تمام لوگ (پہلے) ایک ہی گروہ موحد تھے مختلف تو پیچھے ہوئے"

جوں جوں عصر نبوت سے دوری ہوتی جاتی ہے- بعد کی نسلوں میں ذہول و نسیان غالب ہوتا جاتا ہے- غفلت و بے پرواہی کی وجہ سے دل سخت ہو کر نصیحت پانے کے قابل نہیں رہتے- جہالت پھیلتی جاتی ہے "کتاب الٰہی" اور سنت نبویؐ متروک ہو جاتی ہے- آثار نبوت محفوظ نہیں رہتے اور ان کی بجائے اقوال الرجال رائے و قیاس اور بے سند سنی سنائی باتوں کی پیروی کا رواج عام ہو جاتا ہے- اس پر طرہ یہ کہ نفسانی خواہشوں اور آپس کی عداوتوں کے لئے بھی مذہب ہی کو آڑ بنایا جاتا ہے- جس کی وجہ سے تحریف لفظی و معنوی وضع مسائل' افتراء علی اللہ اور اختراع مسائل اور بدعات جیسے امور سرزد ہوتے ہیں- اور دین الٰہی میں ایسا فتنہ عظیم برپا ہو جاتا ہے کہ حق و باطل کی تمیز بعض صورتوں میں تو مشکل اور بعض حالتوں میں عادتاً ناممکن ہو جاتی ہے-

یہ امور عشرہ ایسے قابل قبول ہیں کہ کوئی زمانہ شناس جو حالات اقوام کو گہری نگاہ سے دیکھتا ہو اور ان کے اختلافات و انقلابات کو فکر صائب سے سوچتا ہو اور گذشتہ امتوں کی تواریخ پر نظر رکھتا ہو ان کی واقعیت سے انکار نہیں کر سکتا-

یہ سب امور قرآن شریف میں یہود و نصاریٰ کے مذکورات میں متفرق مقامات پر بالتصریح مذکور ہیں جو قرآن شریف کے باترجمہ پڑھنے والوں کو روزمرہ کی تلاوت میں

بآسانی مل سکتے ہیں۔

۱۔ مثلاً عصر نبوت سے دور ہونے کی وجہ سے غفلت و بے پرواہی اور سخت دلی اور اس سے فسق و بے دینی پیدا ہو جانے کی نسبت فرمایا :۔

الم یان للذین امنوا ان تخشع قلو بھم لذکر اللہ وما نزل من الحق ولا یکونوا کالذین اوتوا الکتاب من قبل وطال علیھم الامد فقست قلوبھم و کثیر منھم فسقون(الحدید پ ۲۷)

"کیا مومنوں کے لئے ابھی وہ وقت نہیں آیا؟ کہ ان کے دل اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لئے اور اس کے لئے بھی جو حق اترا ہے عاجز ہو جاویں اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو ان سے پہلے کتاب دی گئی تھی۔ تو (جب) ان پر مدت دراز ہو گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے۔اور بہت سے ان میں فاسق (ہو گئے اور) ہیں۔"

۲۔ اسی طرح کتاب الہٰی کو ترک کر دینے اور اس کی بجائے سنت انبیاء کے خلاف کتابوں کی پیروی کرنے اور ان کی تعلیم کو انبیاء علیہم السلام کی طرف نسبت کرنے کی بابت فرمایا :

ولما جاء ھم رسول من عند اللہ مصدق لما معھم نبذ فریق من الذین اوتوا الکتاب کتاب اللہ وراء ظھورھم کانھم لا یعلمون واتبعوا ماتتلوا الشیطین علی ملك سلیمنؑ وما کفر سلیمن ولکن الشیطین کَفَرُوا (بقرہ پ ۱)

"اور جب ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا رسول آچکا۔ جو اس (کتاب) کی تصدیق کرنے والا ہے۔ جو ان کے پاس ہے تو ان لوگوں میں سے جن کو وہ کتاب دی گئی تھی۔ ایک گروہ نے اللہ تعالیٰ کی اس (کتاب) کو پس پشت ڈال دیا گویا کہ وہ اسے جانتے ہی نہیں۔ اور ان کتابوں کی پیروی کرنے لگے جو عہد سلیمان میں شیاطین پڑھا پڑھایا کرتے تھے اور اور سلیمانؑ نے تو

کفر کیا نہیں تھا- لیکن ان شیطانوں ہی نے کفر کیا تھا-"

۳-اسی طرح بغیر تحقیق محض سنی سنائی باتوں کی پیروی کرنے اور ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنے کے بارے میں فرمایا:

ومنهم اميون لا يعلمون الكتابَ الا اماني وان هم الا يظنون فويل لِلذين يكتبون الكتب بايديهم ثم يقولون هذا من عند الله ليشتروا به ثمنا قليلا فويل لهم مما كتبت ايديهم وويل لهم مما يكسبون

(بقرہ پ ۱)

"اور بعض ان میں سے امی (ان پڑھ) ہیں- جو کتاب (الٰہی) کا علم نہیں رکھتے- ہاں کچھ سنی سنائی باتیں جانتے ہیں اور وہ فقط ظنی تکے چلاتے ہیں پس ان لوگوں کے لئے ویل ہے جو کتاب تو اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے (منزل) ہے تاکہ اس کے ذریعے تھوڑے سے دام (دنیوی فوائد) حاصل کریں پس ان کے لئے عذاب ہے اس کی کتابت کی وجہ سے بھی جو انہوں نے کمائی-"

۴-اسی طرح ان زیادتیوں کی بابت جو علمائے یہود کتاب اللہ میں کرتے تھے اور اسے کتاب اللہ کا جزو قرار دے کر لوگوں کے سامنے پیش کرتے تھے، فرمایا:-

وان منهم لفريقا يلوُن السنتهم بالكتاب لتحسبوه من الكتاب وما هو من الكتابع ويقولون هو من عند الله وما هو من عندالله وما هو من عندالله ويقولون على الله الكذب وهم يعلمون(آل عمران پ ۳)

"اور بیشک ان (اہل کتاب) میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کتاب پڑھتے وقت اپنی زبانوں کو مروڑتے ہیں- تاکہ تم سمجھو کہ جو کچھ وہ پڑھتے ہیں وہ سب کتاب (الٰہی) کا جزو ہے- حالانکہ وہ کتاب الٰہی کا جزو نہیں- اور کہتے ہیں (جو کچھ ہم پڑھتے ہیں) وہ سب اللہ کے ہاں سے (اترا) ہے حالانکہ وہ سب اللہ کے ہاں سے نہیں اترا اور جان بوجھ کر اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں-"

۵-اسی طرح اقوال الرجال کی پیروی کی نسبت فرمایا:

اتخذوا احبار هم ورهبا نهم اربابا من دون الله (توبه پ ۱۰)

"انہوں نے (یعنی یہود و نصاری نے) اپنے عالموں اور مشائخوں کو اللہ تعالیٰ کے سوا رب بنالیا-"

جامع ترمذی میں حضرت عدی بن حاتم طائیؓ سے روایت ہے کہ میں نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا- اور میرے گلے میں سونے کی صلیب چمکتی تھی- آپ نے فرمایا-اے عدی یہ بت اپنے گلے سے اتار پھینک اس وقت میں نے آپ کو سورہ برأت کی آیت **اتخزوا احبارهم ورهبا نهم اربابا من دون الله** پڑھتے سنا- آپ نے فرمایا یاد رکھنا کہ وہ لوگ ان عالموں اور مشائخوں کی عبادت تو نہیں کرتے تھے لیکن جب وہ (علماء و مشائخ) ان کے لئے کسی شے کو حلال کہہ دیتے تھے تو وہ لوگ (یہود و نصاری) اس کو حلال سمجھ لیا کرتے تھے اور جب کسی شے کو حرام کہہ دیتے تھے تو وہ اسے حرام جان لیتے تھے-انتہی ملخصا (امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن صحیح کہا ہے)

۶-اسی طرح علماء اور مشائخ جو باطل طریقوں سے لوگوں کے مال کھاتے اور لوگوں کو توحید الٰہی اور سنن انبیاء سے روکتے تھے-ان کی بابت فرمایا:

یایها الذین امنوا ان کثیرا من الاحبار والرهبان لیاکلون اموال الناس بالباطل ویصدون عن سبیل الله (توبه)

"مسلمانو (یہود و نصاری کے) بہت سے علماء اور مشائخ لوگوں کے مال باطل طریق سے کھاتے ہیں-اور (ان کو) اللہ تعالیٰ کی راہ سے روکتے ہیں-"

۷-اسی طرح احکام الٰہی کے ظاہر نہ کرنے اور ان پر حطام دنیوی حاصل کرنے کی نسبت فرمایا:

واذ اخذ الله میثاق الذین اوتوا الکتاب لتبیننه للناس ولا تکتمونه فنبذوه وراء ظهورهم واشتروا به ثمنا قلیلا فبئس ما یشترون.

(ال عمران پ ٤)

"اور جب اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے عہد لیا جن کو کتاب دی گئی تھی کہ اس کتاب کو ضرور ضرور بیان کرنا ہو گا اور ہر گز ہر گز نہ چھپانا ہو گا۔ تو انہوں نے اسے پس پشت ڈال دیا اور اس کے عوض تھوڑی قیمت (مال دنیا) حاصل کرنے لگے پس جو کچھ وہ حاصل کرتے ہیں وہ بہت ہی برا ہے۔"

۸۔اسی طرح آپس کے لڑائی جھگڑوں اور عداوتوں کی وجہ سے مذہبی مسائل میں اختلاف ڈالنے کی بابت فرمایا:

ان الدین عند اللہ الاسلام وما اختلف الذین اوتوا الکتاب الا من بعد ماجاء ھم العلم بغیا بینھم (آل عمران پ ۳)

"اس میں کچھ شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تو (ایک) اسلام ہی دین (معتبر) ہے۔اور اہل کتاب نے (اس میں) اختلاف ڈالا تو علم آچکنے کے بعد صرف آپس کی عداوت کی وجہ سے (ڈالا)"

۹۔اسی طرح کتاب اللہ کی نسبت فرمایا:

افتطمعون ان یومنوا لکم وقد کان فریق منھم یسمعون کلام اللہ ثم یحرفونہ من بعد ما عقلوہ وھم یعلمون (بقرہ پ ۱)

"(مسلمانو!) کیا تم کو توقع ہے کہ یہ (یہود) تمہاری بات مان لیں گے حالانکہ ان میں ایسے لوگ بھی ہو چکے ہیں۔جو کلام اللہ (توریت) سنتے تھے۔پھر اسے سمجھ جانے کے بعد جان بوجھ کر بدل ڈالتے تھے۔"

نیز فرمایا:

فبما نقضھم میثاقھم لعنھم وجعلنا قلوبھم قاسیۃ○ یحرفون الکلم عن مواضعہ ونسوا حظا مما ذکروا بہٖ ولا تزال تطلع علی خائنۃ منھم الا قلیلا منھم (مائدہ پ ٦)

"پس انہیں لوگوں کے اپنے عہد توڑنے کی وجہ سے ہم نے ان کو پھٹکار دیا اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا کہ توریت کے لفظوں کو ان کی جگہ سے پھیر

دیتے ہیں- اور اس میں سے ایک (بڑا) حصہ بھلا بیٹھے جس کی ان کو نصیحت کی گئی تھی اور (اے میرے پیارے نبیؐ) آپ ان کی خیانتوں پر اطلاع پاتے رہیں گے- مگر ان میں سے تھوڑے ہی (جو خیانت نہیں کرتے)"

نیز فرمایا:

یایها الرسول لایحزنك الذین یسارعون فی الکفر من الذین قالوا (امنّا) بافواههم ولم تومن قلوبهم ومن الذین هادوا سمٰعون للکذب سمعون لقوم اخرین لم یاتوك یحرفون من بعد مواضعه ج یقولون ان اوتیتم هذا فخذوه وان لم تؤتوه فاحذروا ط (مائدہ پ ٦)

"اے پیغمبر! جو لوگ کفر پر لپکتے ہیں- ان کی وجہ سے آپ آزردہ خاطر نہ ہو جائیں- جو اپنے مونہوں سے تو کہہ دیتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اور ان کے دل ایمان نہیں لائے اور نیز ان لوگوں سے جو یہودی ہو گئے جھوٹی جھوٹی باتوں کی کن سوئیاں لیتے پھرتے ہیں اور کن سوئیاں بھی لیتے پھرتے ہیں تو دوسرے دوسرے لوگوں کے لئے جو ہنوز آپ کے پاس نہیں آئے وہ الفاظ (کتاب الٰہی) کو ان کے محل متعین ہوئے پیچھے غیر محل پر پھیر دیتے ہیں اور (لوگوں سے) کہتے ہیں کہ اگر تم کو (حد کی طرف سے بھی) یہی حکم دیا جائے- تو اسے تسلیم کر لینا اور اگر تم کو یہ حکم نہ دیا جائے تو اس سے بچے رہنا-"

۱۰- اسی طرح اختراع بدعات کے متعلق فرمایا:

ورهبانیة ن ابتدعوها ماکتبنها علیهم الا ابتغاء رضوان الله فمار عوها حق رعایتهاج (حدید پ ٢٧)

"اور رہبانیت (ترک دنیا) جس کو انہوں نے از خود ایجاد کیا تھا ہم نے ان پر مقرر نہیں کی تھی مگر ہاں انہوں نے اسے اللہ ہی کی خوشنودی کے لئے (ایجاد کیا تھا) لیکن جیسا کہ اسے نبھانا چاہئے تھا- نہ نبھا سکے-"

مذکورہ بالا آیات سے کتاب (یہود و نصاریٰ) کے اختلافات کے اسباب و وجوہ ایسے صاف صاف ظاہر ہیں کہ ان پر کسی مزید حاشیہ کی ضرورت نہیں۔ان آیات کے علاوہ دیگر آیات بھی موجود ہیں لیکن ہم نے بطور مشتے نمونہ از خروارے انہی پر اکتفا کرنا مناسب سمجھا۔

اللھم ثبت قلوبنا علی دینك واحفظنا ان نزل او نضل او نضل او نضل

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ''الفوز الکبیر'' میں متعدد مقامات میں اسی امت مرحومہ میں بھی یہود و نصاریٰ اور مشرکین کی مشابہت کی نسبت فرمایا ہے جو ہماری مذکورہ بالا دفعات کے ذیل میں آجاتا ہے۔مثلاً

(ا) وان کنت متوقفا فی تصویر حال المشرکین وعقائدھم و اعمالھم فانظر الی حال العوام والجھلة من اھل الزمان خصوصا من سکن منھم باطراف دارالاسلام کیف یظنون الولایة وماذا یخیل الیھم منھا ومع انھم یعترفون بولایة الاولیاء المتقدمین یعدون وجود الا ولیاء فی ھذا الزمان من قبیل المحال ویذھبون الی القبور والاثار ویرتکبون انواعا من الشرك وکیف تطرق الیھم التشبیه والتحریف ویحکم الحدیث الصحیح لتتبعن سنن من قبلکم حذو النعل بالنعل وما من آفة من ھذه الافات الاوقوم من اھل ھذا الزمان واقعون فی ارتکابھا معتقدون مثلھا عافانا اللہ سبحانه من ذلك (ص ۱۴' ۱۵ مطبوعه مصر)

(ا) اگر تم مشرکین کے حالات اور ان کے اعمال و عقائد کی تصویر کے سمجھنے میں متوقف ہو تو (اپنے) اس زمانہ کے عوام و جہال کے حال پر نظر کرو خصوصاً ان لوگوں کی طرف جو دارالاسلام (بغداد) کے اطراف میں رہتے ہیں کہ ولایت (الہیہ) کے متعلق ان کے خیالات و ظنون کیسے ہیں؟ اور باوجود اس کے کہ ان کو گذشتہ اولیاء اللہ کی ولایت کا اعتراف و اقرار ہے'

(اپنے) اس زمانے میں وجود اولیاء کو از قبیل محال جانتے ہیں اور (بزرگوں کی) قبروں اور ان کے نشانات (کے مقامات) پر جاکر (وہاں) طرح طرح کے شرک کا ارتکاب کرتے ہیں اور ان میں (ذات خداوندی کی نسبت (تشبیہ کا عقیدہ) اور (دین میں) تحریف کس طرح گھس گئی ہے اور یہ صحیح حدیث ان پر کیسی صادق آتی ہے (جو آنحضرت صلعم نے فرمائی کہ تم ضرور ضرور پہلے لوگوں کی روش پر اس طرح چلنے لگو گے کہ جوتی کا ایک پاؤں دوسرے کے مطابق ہوتا ہے اور ان آفتوں میں سے کوئی بھی ایسی آفت نہیں جس میں اس زمانہ کے لوگ مبتلا نہ ہوں اور ان کی مثل کے معتقد نہ ہوں- اللہ سبحانہ ہم کو اس سے بچائے رکھے)'

(۲) فان شئت ان تری الموذج الیھود فانظر الی علماء سوء من الذین یطلبون الدنیا وقد اعتادوا تقلید السلف واعرضوا عن نصوص الکتاب والسنة وتمسکوا بتعمق عالم وتشدده واستحسانه فاعرضوا عن کلام الشارع المعصوم وتمسکوا باحادیث موضوعة وتاویلات کاسدة کانھم ھم (ص ۲۶' ۲۷)

(۲) اگر تم یہود کا نمونہ (اپنے لوگوں میں) دیکھنا چاہو تو تم دنیا کے طالب برے علماء کو دیکھو کہ سلف کی تقلید ان کی خو ہو گئی ہے- اور انہوں نے قرآن و حدیث کی نصوص سے منہ پھیر لیا ہے اور دستاویز بنالیا کسی عالم کے تعمق کو اور اس کے تشدد کو اور اس کے استحسان کو' پس انہوں نے معصوم و (بے خطا) صاحب شرع کے کلام سے تو روگردانی کرلی اور جعلی روایتوں اور ناقص اور کھوٹی تاویلوں کو دستاویز بنالیا ہے گویا کہ یہ برے علماء وہی یہودیوں کے علماء ہیں-

(۳) وان شئت ان تری انموذجا لھذا الفریق فانظر الیوم الی اولاد المشائخ الاولیاء وماذا یظنون بابائھم فتجدھم قد

افرطوانی اجلالهم کل الافراط وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون۔[1]

(۳) اگر تم اس فریق کا نمونہ (اپنی قوم میں) دیکھنا چاہو تو تم آج مشائخ اولیاء اللہ کی اولاد کی طرف دیکھو کہ وہ اپنے آباؤ اجداد کے متعلق کیا کیا۔ گمان کرتے ہیں پھر تم کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ ان کی بزرگی میں نہایت درجے کی افراط کرتے ہیں اور عنقریب ان ظالموں کو معلوم ہو جائے گا کہ ان پر کیسی گردش آتی ہے۔

[1] الفوز الکبیر عربی برحاشیہ سفر السعادت مطبوعہ مصر ص ۲۹

آنحضرت ﷺ نے اپنی امت میں بھی مختلف فرقے بن جانے کی خبر بطور پیش گوئی کے فرما دی تھی!

اس میں کچھ شک نہیں کہ جن اسباب سے اہل کتاب (یہود و نصاری) میں اختلاف پھوٹا وہ اسباب اس امت مرحومہ میں بھی مدت سے موجود ہو چکے ہیں اور اختلاف کا جو بد نتیجہ ان اہل کتاب کے حق میں نکلا تھا۔ مسلمان بھی مدتوں سے اس کا خمیازہ اٹھا رہے ہیں۔ اور جو الزام کتاب الٰہی کو پس پشت ڈالنے اور سنن انبیاء کو فراموش کر دینے اور ان کی جگہ جعلی کتابوں اور کم علم و بد عمل علماء اور گمراہ مشائخ کی پیروی اختیار کر لینے کا اہل کتاب پر عائد ہوا تھا۔ مسلمان بھی عرصے سے اسے اپنے سر لے چکے ہیں اور وضع مسائل اور اختراع بدعات سے تبدیل دین کا جو فتنہ یہود و نصاری نے برپا کیا تھا اسی قسم کے فتنے میں مسلمان بھی کافی حصہ لے چکے ہیں[1]

ہاں اللہ تعالیٰ نے اس امت مرحومہ پر ایک خاص رحمت کی ہے۔ کہ اپنی کتاب اور اپنے نبی کی سنت کو ضائع نہیں ہونے دیا۔ اور اس پر ایسی حالت نہیں آنے دی کہ ساری کی ساری امت گمراہی میں پڑ جائے بلکہ اس میں ایک ایسا فرقہ ہر زمانہ میں برابر قائم رکھا ہے جن کی تمام تر کوشش احیائے سنت اور رد بدعات میں لگی رہی اور لگی ہوئی ہے اور لگی رہے گی لہٰذا ہم اس فصل میں یہ امور بیان کرنا چاہتے ہیں۔

امر اول : اللہ تعالیٰ نے دین میں اختلاف کرنے سے منع کیا۔ اور حدیث اختلاف امتی رحمۃ کا حال۔

امر دوم : اس امت میں بھی مختلف فرقے بن جانے کی پیشگوئی۔

امر سوم : اختلاف کے وقت ایک فرقہ کا سنت پر قائم رہنا۔

امر چہارم : سنت پر قائم رہنے والا فرقہ کونسا ہے؟

---

[1] اس کی تفصیل ان شاء اللہ آئندہ فصل میں ہو گی۔

آیات قرآنیہ

امر اول : یعنی دین میں اختلاف پیدا کرنے اور مختلف فرقے بنانے کی ممانعت کے متعلق قرآن شریف میں وارد ہے :-

ولا تکونوا کالذین تفرقوا واختلفوا من بعد ماجاء هم البینت واولئك لهم عذاب عظیم (آل عمران پ ٤)

"مسلمانو! ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے آپس میں جدائی ڈالی اور اختلاف کیا بعد اس کے کہ ان کو روشن دلائل آچکے تھے۔"

یہ آیت ممانعت اختلاف وافتراق میں بالکل صاف ہے اللہ تعالیٰ گذشتہ امتوں کا حال ذکر کر کے اس امت مرحومہ کو ایسا بننے سے منع فرماتا ہے تفسیر خازن[1] میں اس آیت کے ذیل میں حضرت عبداللہ بن عباس وغیرہ کے اقوال نقل کئے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ

قال ابن عباس امر المومنین بالجماعة ونها هم عن الاختلاف الفرقة واخبر هم انما هلك من كان قبلكم بالمراء والخصو مات فی الدین وقال بعضهم هم المبتدعة من هذه الامة وقال ابو امامة هم الحروریة[2]

"اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مومنوں کو مجتمع رہنے کا حکم کیا۔اور ان کو جدائی اور اختلاف سے منع کیا اور ان کو خبر دی کہ پہلی امتیں صرف آپس کے جھگڑوں اور مذہبی خصومتوں کی وجہ سے ہلاک ہوئیں اور بعض نے کہا کہ ان سے اس امت کے بدعتی لوگ مراد ہیں اور حضرت ابو امامہ نے کہا کہ یہ حروریہ فرقے کے لوگ ہیں۔"

---

[1] خازن جلد اول ص ۲۶۸ مطبوعہ مصر

[2] حروراء ایک موضع کا نام ہے جہاں خارجیوں نے حضرت علیؓ کے خلاف جمعیت بنائی تھی اس سے خارجیوں کا نام حروریہ بھی پڑ گیا۔

تذکیر:-

اختلاف و فرقہ بندی سے صرف دین ہی میں خرابی پیدا نہیں ہوتی بلکہ دنیوی نظام میں بھی تباہی و بربادی ہو جاتی ہے-دوسری قوموں کے مقابلے میں رعب اٹھ جاتا ہے-وقار و بھرم جاتا رہتا ہے-ہوا اکھڑ جاتی ہے-ارادے پست ہو جاتے ہیں اور ہمت بیٹھ جاتی ہے- بجائے عزت کے ذلت اور بجائے وقار کے حقارت اور بجائے اولوالعزمی کے بزدلی و پست خیالی-اور بجائے حکومت کے ماتحتی نصیب ہوتی ہے-(اعاذنا اللہ منھا)فاطر فطرت جل شانہ فرماتا ہے-

یایها الذین امنوا اذا القیتم فئة فاثبتوا واذکروا الله.

مسلمانو! جب کبھی (کافروں کی) کسی فوج سے تمہاری مڈ بھیڑ ہو جائے تو ثابت قدم رہا کرو-اور

کثیرا لعلکم تفلحون واطیعوا الله ورسوله ولا تنازعوا فتفشلوا وتذهب ریحکم واصبروا ط ان الله مع الصابرین (انفال پ ۱۰)

کثرت سے اللہ کو یاد کیا کرو تاکہ تم مراد کو پہنچو-اور اللہ کا اور اس کے رسول کا حکم مانا کرو اور آپس میں جھگڑا نہ کیا کرو (آپس میں جھگڑو گے) تو تم ہمت ہار دو گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور (تکالیف پر) صابر رہا کرو بیشک اللہ صابروں کا ساتھی ہے-

(۳) اسی طرح اہل کتاب کی خستہ حالت کی نسبت فرمایا:

لا یقاتلونکم جمیعا الا فی قری محصنة او من وراء جدر ط باسهم بینهم شدید تحسبهم جمیعا وقلوبهم شتی ط ذلك بانهم قوم لا یعقلون ع (الحشر پ ۲۸)

"مسلمانو! یہ (اہل کتاب) سب مل کر تم سے نہیں لڑ سکتے مگر ہاں محفوظ بستیوں میں یا دیواروں کی آڑ میں (ہو کر کیونکہ) ان کی آپس میں سخت لڑائی ہے تو (اے دیکھنے والے یا اے پیغمبرؐ) ان کو اکٹھا خیال کرتا ہے حالانکہ ان

کے دل جدا جدا (پھٹے ہوئے) ہیں- یہ اس سبب سے ہے کہ یہ لوگ بے عقل ہیں-"

احادیث نبویہ:

رسول اللہ ﷺ کو اپنی امت میں اختلاف بہت ناگوار تھا- چنانچہ آپ گذشتہ امتوں کے احوال ذکر کر کے اپنی امت کو تحذیر کرتے تھے-

عن عبد الله بن عمرو قال هجرت الى رسول الله صلى الله عليه وسلم يوما قال فسمع اصوات رجلين اختلفا في اية فخرج علينا رسول الله صلى الله عليه وسلم يعرف في وجهه الغضب فقال انما هلك من كان قبلكم باختلافهم في الكتاب (رواه مسلم[1])

"حضرت عبداللہ بن عمرو کہتے ہیں کہ ایک دن میں دوپہر کے وقت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا- آپ نے دو آدمیوں کی آواز سنی جو کسی آیت کی نسبت آپس میں اختلاف کر رہے تھے- پس آنحضرت ﷺ ہمارے پاس (گھر سے) باہر نکلے اور آپ کے چہرے مبارک پر غضب کے نشان ظاہر تھے پس آپ نے فرمایا کہ بات یہی ہے کہ تم سے پہلے لوگ کتاب اللہ میں اختلاف کرنے کے سبب ہلاک ہو گئے-"

(۲) اسی طرح حضرت ابوامامہؓ صحابی سے (جن کا قول اوپر مذکور ہوا) روایت ہے-

عن ابي امامةؓ قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ماضل قوم بعد هدى كانوا عليه الا اوتوا الجدل ثم قرء رسول الله صلى الله عليه وسلم هذه الاية ماضربوه لك الاجد لابل هم قوم خصمون[2] (رواه احمد والترمذي وابن ماجة)

"کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ نہیں گمراہ ہوئی کوئی قوم بعد اس ہدایت کے

---

[1] مشکوۃ باب الاعتصام ص ۳۰-

[2] مشکوۃ باب الاعتصام ص ۲۳-

جس پر وہ (کسی وقت قائم) تھے مگر ایسی صورت میں کہ جھگڑے میں پڑ گئے پھر رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت پڑھی ماضربوہ لك الا جد لابل هم قوم خصمون (یعنی آپ کے سامنے نہیں پیش کرتے یہ اسے (حضرت عیسیٰؑ کو) مگر جھگڑے کے طور پر بلکہ یہ لوگ ہیں ہی جھگڑالو۔"

تنبیہ:

بعض لوگ روایت اختلاف امتی رحمۃ کو حدیث صحیح قرار دے کر اس امت کے ہر اختلاف کو بے پرواہی سے دیکھتے ہیں۔ لہٰذا ان کو اختلاف کے بد نتائج نہیں سوجھتے پس مناسب ہے کہ اس موقع پر اس غلط فہمی کو بھی دور کر دیا جائے۔

سو معلوم ہو کہ محدثین کے نزدیک یہ روایت ثابت نہیں ہوئی امام سخاویؒ نے المقاصد الحسنۃ میں اور ملا علی قاری حنفی نے موضوعات کبیر میں اور شیخ محمد طاہر پٹن گجراتیؒ نے خاتمہ مجمع البحار میں مطولاً و مختصراً بہت سے محدثین کے نزدیک اس کا بے اصل ہونا ذکر کیا ہے لہٰذا اس کا اعتبار کر کے دھوکے میں نہیں پڑنا چاہئے اور اختلاف امت کے غم سے بے فکر نہ ہونا چاہئے۔ اللهم الف بين قلوب المسلمين واصلح ذات بينهم۔

۲۔امر دوم: یعنی اس امت میں اختلاف پیدا ہونے اور مختلف فرقے بن جانے کی پیش گوئی کا بیان یوں ہے کہ صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت ابو سعید خدریؓ سے مروی ہے کہ:

عن ابی هريرة عن النبی صلى الله عليه وسلم قال لا تقوم الساعة حتى تاخذ امتى باخذ القرون قبلها شبرا بشبر و ذراعاً بذراع فقيل يا رسول الله كفارس و الروم قال ومن الناس الا اولئك[1]

آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ قیامت قائم نہ ہوگی جب تک میری امت پہلے زمانوں کی روش اختیار نہ کر لے بمقابلہ بالشت کے بالشت اور بمقابلہ ہاتھ

---

[1] صحیح بخاری کتاب الاعتصام جلد دوم ص ۱۰۸۸ مطبع نظامی کانپور

کے ہاتھ صحابہ نے عرض کی یارسول اللہ (ﷺ) کیا فارسیوں اور رومیوں کی طرح؟ آپ نے فرمایا ان کے سوا اور کون لوگ مراد ہیں؟

۳-امر سوم: یعنی اس امر کا بیان کہ اختلاف کے وقت ایک فرقہ سنت پر قائم رہے گا یوں ہے کہ صحیح بخاری میں ہے-

عن المغيرة ابن شعبة عن النبي صلى الله عليه وسلم قال لاتزال طائفة من امتي ظاهرين حتى ياتي امر الله وهم ظاهرون

مغیرہ بن شعبہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ غالب رہے گا حتیٰ کہ جب اللہ تعالیٰ کا حکم (فنائے دنیا کی نسبت) جاری ہو گا تو وہ اس وقت بھی دوسرے لوگوں پر غالب ہوں گے-

یہی مضمون صحیح مسلم میں حضرت جابر سے بھی مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا-

عن جابر بن عبداللهؓ قال سمعت النبي صلى الله عليه وسلم يقول لاتزال طائفة من امتي يقاتلون على الحق ظاهرين الى القيمة

(ص ۸۷ و جلد ۱)

کہ میری امت میں ایک گروہ ہمیشہ رہے گا- جو حق پر ہو کر مقابلہ کرتا رہے گا اور قیامت تک غالب ہوتا رہے گا-

وفي لفظ له عن ثوبان لايضرهم من خذلهم حتى ياتي وعد الله وهم كذلك

صحیح مسلم کی ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ جو کوئی اس گروہ کا ساتھ چھوڑے گا ان کو کچھ بھی ضرر نہیں پہنچا سکے گا- حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ (فنائے دنیا کا) آجائے گا- اور وہ اسی حالت (منصورہ) پر ہوں گے-

ایک فرقہ کو سنت پر قائم رکھنے میں حکمت

غرض یہ امر آنحضرت ﷺ سے صحیح طور پر ثابت ہے کہ آپ نے اپنی امت کے فرقوں میں سے ایک فرقہ کی نسبت فرمادیا تھا- کہ وہ ہمیشہ سنت پر قائم رہے گا- تاکہ ساری امت کے گمراہ ہو جانے سے دین محمدی محرف نہ ہو جائے- نیز اس لئے کہ اس فرقہ حقہ سے دوسروں پر اللہ تعالیٰ کی حجت پوری ہوتی رہے- انہی لوگوں کی نسبت حجۃ الہند حضرت شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں-

فان للہ طائفة من عبادہ لا یضرھم من خذلھم ھم حجة اللہ فی الارض (حجة اللہ مصری جلد ۱ ص ۱۵۳)

یعنی خدا تعالیٰ کے بندوں میں سے ایک گروہ ایسا بھی ہے جن کو وہ شخص جو ان کا ساتھ چھوڑ دے کچھ بھی ضرر نہیں پہنچا سکتا اور وہ زمین میں اللہ تعالیٰ کی حجت ہیں-

اگلی امتوں کے دین اسی سبب سے محرف ہو گئے- کہ کتاب اللہ کے محرف ہو جانے پر اختلاف کے وقت ان میں سے کوئی فرقہ بھی بہ حیثیت فرقہ سنن انبیاء پر قائم نہ رہا- یہ امر اس شخص کے لئے سمجھنا آسان ہے جو یہود و نصاریٰ کی کتابوں کا مطالعہ گہری نظر سے کرلے- اور ان کے باہمی اختلاف کو فکر صائب سے سوچے- چنانچہ فرمایا:

ولقد بوانا بنی اسرائیل مبوا صدق ورزقنھم من الطیبٰت ج فما اختلفوا حتی جاء ھم العلم ط ان ربك یقضی بینھم یوم القیٰمة فیما کانوا فیه یختلفون ○ فان کنت فی شك مما انزلنا الیك فسئل الذین یقرون الکتب من قبلك ج لقد جاء ك الحق من ربك فلا تکونن من الممترین (یونس پ ۱۱)

اور البتہ □ ہم نے بنی اسرائیل کو صدق (و صفائی) کا ٹھکانا دیا اور ان کو

ستھری چیزوں سے روزی بخشی پس انہوں نے آپس میں اختلاف کیا تو علم آچکنے کے بعد ہی کیا۔ بیشک آپ کا رب قیامت کے دن ان امروں میں جن میں وہ اختلاف کرتے رہے (حق حق) فیصلہ کردے گا۔ پس (اے ہمارے حبیبؐ) اگر آپ (بالفرض ان کے اختلاف کے متعلق) جس کی خبر آپ پر نازل کی گئی شک و تردد میں ہوں تو ان (علماء) سے دریافت کر دیکھئے جو آپ سے پہلے کتاب الٰہی کو پڑھتے ہیں۔ بے شک یہ جو کچھ آپ کے پاس آپ کے رب کی طرف سے آیا ہے سب حق حق آیا ہے۔ پس آپ ہر گز ہر گز شک کرنے والوں میں سے نہ ہوں۔

اس آیت کے نازل ہونے پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا لا اشك و لا اسئل[1] یعنی نہ مجھے اس میں شک ہے اور نہ میں اس کی نسبت دریافت کرتا ہوں[1]

باقی رہا امر چہارم کہ سنت پر قائم رہنے والا کونسا فرقہ ہے سو سنت کی قید سے کسی مزید تفتیش کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ کیونکہ ہر فرقے کے عقائد اور طریق عمل کو دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ علماً و عملاً آنحضرت (ﷺ) کے طریق عمل پر زندگی گذارنا کن لوگوں کا مقصد ہے اور خلاف قواعد علمیہ خود رائی اور تاویلات فاسدہ و رکیکہ کی پیروی سے پرہیز کرتے ہوئے اور یمین و یسار کی کدو کاوش سے بچ کر دین کی حالت کو ٹھیک اسی صورت پر رکھنا جس پر آنحضرت (ﷺ) صحابہؓ کی مقدس جماعت کو چھوڑ گئے تھے۔ اور بعد ازاں سلف امت میں اسی پر عمل جاری رہتے ہوئے صحیح اور معتبر وسائط سے ہم تک پہنچانا کن لوگوں کا وطیرہ ہے؟ اور اپنے حال و قال اور وضع اور چال اور اعتقاد و عمل اور عبادت و ریاضت (تصوف) اور تمدن و سیاست غرض ہر امر زندگی سے ثابت کرنا کہ ہمارا اوڑھنا بچھونا اور دل کی خواہش و تمنا اور حاصل دین اور محصول دنیا بس صرف اتباع کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ اور معیت جماعت صحابہؓ ہی ہے کن لوگوں کا کام ہے۔

---

[1] تفسیر فتح القدیر للعلامۃ الشوکانی جلد دوم۔

فریب رائے عزیزاں کجا خورم کہ مرا
حدیث سید کونین برزبان باقیست

نیز حضرت شاہ ولی اللہ صاحب (قدس سرہ) فرماتے ہیں :-

علمے کی کہ نہ ماخوذ از علم نبیست
واللہ کہ سیرابی ازاں تشنہ لبیست
جائے کہ بود جلوہ حق حاکم وقت
تابع شدن حکم خرد بولہبیست[1]

هذا واللہ الھادی

مختلف فرقہائے اسلام اور ان کا تاریخی سلسلہ

۱- جب یہ بات پایہ تحقیق کو پہنچ چکی کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی امت مرحومہ کے اختلاف وافتراق کی خبر پہلے سے فرمادی تھی تو اب اس کے مطابق مختلف فرقہائے اسلام کا تاریخی سلسلہ بھی سمجھنا چاہئے کہ کوئی گروہ کب اور کس طرح اس جماعت سے جو صدر اول کی روش پر قائم رہی الگ ہوتا رہا- ان میں سے بعض تو بے شک مذہبی اختلاف رائے سے الگ ہوئے (عام اس سے کہ ان کا اختلاف غلط فہمی سے تھا یا زیغ قلبی سے) لیکن بعض ایسے فرقے بھی ہوئے جن کی تفریق بندی ہوئی تو ملکی نزاع کے سبب مگر بڑھتے بڑھتے ان کا مذہب بھی جدا قائم ہو گیا اور انہوں نے اپنے اصول و فروع بھی اپنے طور پر الگ مدون کر لئے-

(ا) عثمانی اور سبائی :

سب سے پہلے سبائیوں کا فتنہ اٹھا- اس کی بنا محض ملکی نزاع پر تھی- اس کی مختصر تفصیل یوں ہے کہ خلیفہ ثالث حضرت عثمانؓ کی خلافت کے آخری سال میں ایک یہودی الاصل عبداللہ بن سبا نے بظاہر مسلمان بن کر حضرت عثمانؓ کے استحقاق خلافت

[1] حیات ولی ص ۲۷۷-

کے متعلق تو نہیں بلکہ ان کے نظم و نسق کے خلاف نکتہ چینی اور سیاسی اجیٹیشن شروع کر دی جس سے عثمانی اور سبائی دو جماعتیں بن گئیں۔ عثمانی حضرت عثمانؓ کے حامی تھے اور سبائی ان کے بر خلاف۔ آخر کار ۱۸ ماہ ذی الحجہ سن ۳۵ھ کو حضرت عثمانؓ باغیوں کے ہاتھ سے شہید ہو گئے (انا للہ وانا الیہ راجعون)

حضرت خواجہ حسن بصریؒ تابعی کا قول ہے۔

"امیر المومنین عثمانؓ نے بارہ سال تک (خلافت کا) کام کیا آپ پر کسی نے بھی کوئی اعتراض نہ کیا۔ حتی کہ چند فاسق آئے (اور اعتراض کرنے لگے) بخدا اہل مدینہ نے ان کے بارے میں مداہنت کی" (ص ۳۲ تاریخ صغیر اللامام البخاریؒ)۔

آپ کے بعد مہاجرین اور انصار کے متفقہ انتخاب سے حضرت علی مرتضیٰؓ خلیفہ مقرر ہوئے۔ عثمانیوں نے حضرت علیؓ سے حضرت عثمانؓ کے خون کے انتقام کا مطالبہ کیا اور معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہا۔ حضرت علیؓ نے کہا میں خود اس کام کو کروں گا۔ لیکن ذرا شورش ٹھنڈی ہو جانے دو۔ اس پر بگاڑ ہو گیا۔ اور اہل شام نے جو عثمانی تھے حضرت علیؓ کے مقابلہ میں حضرت معاویہؓ کو خلیفہ مقرر کر لیا۔ دوسری طرف ان کے مقابلہ لا لحب علي بل لبغض معاوية سب سبائی حضرت علیؓ سے مل گئے۔ اور باقاعدہ صف آرائی سے مسلمانوں کی دو جماعتوں میں جنگ شروع ہو گئی۔ مسلمانوں میں یہ سب سے پہلی جنگ ہے۔ آخر جنگ صفین میں اس بات پر لڑائی تھمی کہ ایک منصف (حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ) حضرت علیؓ کی طرف سے اور ایک منصف (حضرت عمرو بن عاصؓ فاتح مصر) حضرت معاویہؓ کی طرف سے مقرر ہوئے اسے تاریخ اسلام میں امر تحکیم کہتے ہیں۔ سبائی فتنہ انگیز تھے صلح نہیں چاہتے تھے اس لئے اس بہانے سے کہ حضرت علیؓ نے اللہ کو چھوڑ کر ایک انسان کا حکم مانا ہے اور یہ بموجب آیت افغير الله ابتغي حكما (پ ۸ انعام) شرک ہے اور مشرک کی اطاعت جائز نہیں حضرت علیؓ کی اطاعت سے خارج ہو گئے۔ اور پھر انہوں نے اس امر میں یہاں تک ترقی کی کہ ہر کبیرہ گناہ کا مرتکب کافر ہے۔ اور یہ کہ وہ سدا دوزخ میں رہے گا (معاذ اللہ)

(۲) شیعہ اور خارجی :

پس بجائے دو گروہوں میں صلح ہونے کے خود حضرت علیؓ کی جماعت دو گروہوں میں بٹ گئی۔ جو لوگ حضرت علیؓ کی اطاعت سے خارج ہو گئے ان کا نام خارجی ہوا اور جو لوگ حضرت علیؓ کے ساتھ قائم رہے ان کا نام شیعہ علیؓ (حضرت علیؓ کی جماعت پڑا)

(۳) فرقہ قدریہ :

زمانہ عبدالملک بن مروان[1] میں ایک شخص معبد نامی شہر بصرہ میں ظاہر ہوا۔ جس نے تقدیر کا انکار کیا۔ امام اوزاعیؒ[2] کہتے ہیں کہ معبد مذکور نے انکار تقدیر کا عقیدہ ایک نصرانی شخص سوسن نامی سے لیا تھا۔ جو کچھ مدت مسلمان رہ کر مرتد ہو گیا تھا[3]

(۴) فرقہ جہمیہ :

ہشام بن عبدالملک کے عہد میں ایک شخص جعد بن درہم نے صفات الٰہیہ سے انکار شروع کیا اس کا انکار قرآن و حدیث کی تصریحات اور خیار امت یعنی صحابہؓ و تابعین کے عقائد کے بالکل خلاف ہے اس اختلاف نے ملکی فتنہ کی آگ میں بھی ہیزم کشی کا کام کیا کہ جعد مذکور نے سیاسی تحریکوں میں خالد قسری حاکم عراق اور حجاج بن یوسف مشہور ظالم کی مخالف پارٹی کا پارٹ لیا اور وہ ہر ممکن طور سے ان کی مدد کرتا تھا جس کی پاداش میں خالد قسری نے جعد مذکور کو بقر عید کے دن شہر واسط جس کو حجاج بن یوسف نے آباد کیا تھا قتل کر دیا۔

---

[1] عبدالملک بن مروان کا زمانہ حکومت ۶۵ھ سے ۸۶ھ تک رہا۔

[2] امام اوزاعیؒ کا نام عبدالرحمٰن بن عمرو ہے اہل شام کے جلیل الشان امام تھے کبار اتباع تابعین سے تھے ۱۵۷ھ میں فوت ہوئے رحمہ اللہ۔

[3] تقدیر کا مسئلہ بموجب حدیث صحیحین کے امور ایمان میں سے ہے جملہ صحابہؓ اور خیار تابعین کا اس پر اتفاق ہے اس کا انکار کفر ہے لفظ تقدیر کے معنی ہیں اندازہ کرنا اور مراد اس سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو بھی پیدا کیا یا اس کو پیدا کرنے والا ہے اس کے ہر پہلو کا اندازہ اس کے علم میں اس چیز کی پیدائش سے پیشتر ہوتا ہے کیونکہ اس کا علم ازلی ہے حادث نہیں ہے سورہ حدید پ ۲۷ کی آیت الا فی کتب من قبل ان نبرء ھا کا مفاد یہی ہے۔

کوفہ میں جعد مذکور کا ایک شاگرد تھا جہم بن صفوان- اگرچہ وہ کوئی بڑا عالم نہیں تھا لیکن بولنے میں لسان اور فصیح البیان تھا اس نے جعد کے خیالات کی اشاعت بہت زور سے شروع کر دی- بہت لوگ اس کے ہم خیال ہو گئے اور ان کا نام جہم کے نام پر جہمیہ پڑ گیا جہم بھی اپنے پیشوا جعد کی طرح بنی امیہ کے آخری خلیفہ مروان الحمار[1] کے عہد میں سن ۱۲۸ھ میں نصر بن سیار حاکم خراسان کے حکم سے قتل کر دیا گیا-

(۵) فرقہ معتزلہ :

حضرت حسن بصریؒ[2] سے کسی نے عرض کیا کہ خوارج کا قول ہے کبیرہ گناہ کفر ہے اور اس کا مرتکب (کرنے والا) کافر ہے- اور مرجیہ کہتے ہیں کہ مومن کو گناہ سے مطلقاً کوئی ضرر نہیں پہنچے گا- جس طرح کہ کافر کو طاعت سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا- آپ اس میں فیصلہ فرمایئے- آپ ابھی خاموش تھے کہ آپ کے شاگردوں میں سے ایک شخص واصل بن عطا نامی بول اٹھا کہ صاحب کبیرہ کا حکم ان دونوں کے درمیان ہے- کہ نہ وہ مومن ہے نہ کافر ہے- واصل یہ کہتا ہوا ایک ستون کی طرف الگ چلا گیا- اس پر حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا اعتزل عنا الواصل یعنی واصل ہم سے الگ ہو گیا-

واصل نے اپنے خیالات کی اشاعت شروع کر دی- اور کئی ایک اشخاص جو پہلے بھی مسئلہ تقدیر وغیرہ میں اس کے ہم خیال تھے اس کے ساتھ ہو گئے- ان کا گروہ بڑھتا گیا- اور ان کا نام حضرت حسنؒ کے قول کے مطابق معتزلہ پڑا- خلیفہ مامون الرشید[3] اس

---

[1] ۱۳۲ھ میں مروان الحمار کے بعد بنی امیہ کی خلافت کا خاتمہ ہو گیا- اور زمام خلافت بنی عباسؓ کے ہاتھ آ گئی-

[2] حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ ۱۱۰ھ میں فوت ہوئے یہ جلیل القدر تابعی ہیں- ان کی والدہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی خادمہ تھیں- وہ کام کاج کے وقت ان کو حضرت ام سلمہؓ کی گود میں دے دیتی تھیں- حضرت ام سلمہؓ ان کو بہلانے کے لئے اپنا...... ان کے منہ میں ڈالتیں- خدا کی قدرت سے اس سے دودھ اتر پڑتا- پس ساری برکت ظاہری و باطنی اسی دودھ سے ہے- زہے نصیب حضرت حسن بصریؒ کے-

[3] خلیفہ مامون رشید کا زمانہ ۱۹۸ھ سے ۲۱۸ھ تک رہا- علوم یونانیہ' فلسفہ' منطق اور طب کے تراجم کی ترقی اسی عہد میں ہوئی-

مذہب کے مشہور عالم ابوہذیل کے شیشے میں اتر آیا۔ اور ان کے مخصوص مسائل کو جبر و تشدد سے منوانے لگا۔ جس سے علمائے سنت سخت امتحان و ابتلا میں پڑے۔

فرقہ مرجیہ:

فرقہ مرجیہ کی ابتداء اور اس کے بانی کی نسبت بنا پر اختلاف مسائل اصحاب مقالات کے اقوال مختلف ہیں۔

حضور نواب صاحب مرحوم فرماتے ہیں۔

"امام ابن قتیبہؒ نے کہا کہ سب سے پہلے جس نے بصرہ میں مسئلہ ارجا جاری کیا وہ حسان بن بلال مزنی ہے اور بعض نے کہا کہ سب سے پہلے ابو سلت سمان نے جاری کیا۔ ابو سلت ۱۵۲ھ میں فوت ہوا" (خبیئۃ الاکوان مترجما ص ۲۵۱)

۲۔ علامہ شہر ستانی" الملل والنحل میں فرماتے ہیں :۔

"بعض کا قول ہے کہ پہلے پہل جوار جاء کا قائل ہوا حسن بن امام محمدؒ بن علیؓ بن ابی طالب ہے۔"

اسی طرح خلاصہ میں بھی حسن بن محمد حنفیہ کے ترجمہ میں کہا ہے هو الاول من تکلم فی الارجاء (ص ۸۱) یعنی وہ پہلا شخص ہے جس نے ارجاء کے متعلق کلام کیا۔ حافظ ابن حجرؒ تقریب میں فرماتے ہیں کہ یہ ثقہ تھے فقیہ تھے کہا جاتا ہے کہ پہلے پہل انہوں نے ہی ارجاء میں کلام کیا۔ یہ تیسرے طبقہ سے تھے سن ۱۰۰ھ میں یا اس سے ایک سال پیشتر فوت ہوئے رحمہ اللہ تعالیٰ حافظ صاحب موصوف نے تہذیب التہذیب میں بھی اس کا ذکر کیا ہے لیکن کہا ہے کہ جس ارجاء کے وہ قائل تھے وہ ارجاء نہیں ہے جو اہل سنت کے نزدیک موجب عیب ہے۔ چنانچہ حافظ صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے وہ کتاب جو حسن بن محمد نے لکھی خود پڑھی اس میں اتباع کتاب و سنت کی وصیت (تاکید) کے بعد یہ لکھا تھا۔

"ہم حضرت ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما کو دوست رکھتے ہیں اور ان کی حمایت میں زور خرچ کرتے ہیں۔ کیونکہ امت مرحومہ میں ان دونوں کے متعلق

لڑائی نہیں ہوئی اور نہ امت مرحومہ کو ان کی بابت کوئی شک یا تردد پڑا اور ان دونوں کے بعد ان لوگوں کا معاملہ جو فتنہ (خانہ جنگی) میں داخل ہوئے موخر چھوڑتے ہیں اور خدا کے سپرد کرتے ہیں۔" (الی آخر ماقال)

پھر اس کے بعد حافظ صاحب ممدوح حضرت حسن بن محمدؒ کے قول کے معنی میں فرماتے ہیں۔

"حضرت حسن نے جو کچھ کہا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ آپ ان دونوں گروہوں میں سے جو فتنہ (خانہ جنگی) میں لڑتے رہے کسی ایک کے حق میں بھی قطعی حکم نہیں لگاتے کہ کون ان میں سے خطا پر ہے اور کون صواب پر۔ اور آپ کا مذہب یہ تھا کہ وہ ان دونوں گروہوں کا معاملہ آخرت پر چھوڑتے تھے۔ لیکن وہ ارجاء جو ایمان کے متعلق ہے آپ کی التفات اس کی طرف نہیں ہے۔ اور ایسی صورت میں آپ پر کوئی عیب نہیں آسکتا" واللہ اعلم[1]

اطلاق لفظ ارجاء لغت میں ارجاء کے دو معنی ہیں۔ تاخیر کرنا بھی اور امید دلانا بھی۔ بنابریں ارجاء کا اطلاق کئی ایک مسائل پر آسکتا ہے۔

(۱) عمل کو ایمان سے موخر کرنا۔

(۲) حضرت علی مرتضیٰؓ کی خلافت کو درجہ اول سے درجہ چہارم پر موخر کرنا۔

(۳) صاحب کبیرہ کے حکم کو قیامت پر موخر کرنا۔ اور اس دنیا میں اس کی نسبت کوئی قطعی حکم نہ لگانا کہ وہ جنتی ہے یا دوزخی۔

(۴) ایمان کے ہوتے معاصی کا کچھ بھی ضرر نہ دینا۔ اور محض ایمان پر نجات کلی کی امید دلانا۔

اس چوتھی صورت کی نسبت علامہ شہرستانی فرماتے ہیں کہ وہ مرجیہ خالصہ ہیں اور حافظ ابن کثیرؒ اور حافظ ابن حجرؒ اور حافظ ذہبیؒ اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ اسے ہی خلاف خیار امت (صحابہؓ و تابعین) کہتے ہیں۔

---

[1] تہذیب التہذیب جلد دوم ترجمہ حسن بن محمد ص ۳۲۱۔

مجسمہ یا کرامیہ :

حکومت کے اثر اور نئے علوم میں رسوخ اور دیگر مذاہب سے مناظرات کرنے کے سبب معتزلوں کا گروہ بہت زبردست ہوتا گیا حتیٰ کہ دوسری صدی کے بعد خلیفہ مامون ہی کے عہد میں ایک شخص ابو عبداللہ محمدؒ بن کرام (ابن کرام) سجستانی ظاہر ہوا- جس نے معتزلوں کی ضد میں صفات الٰہیہ کو ایسے طور پر ثابت کرنا شروع کیا کہ اس کی رو سے آخر کار (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ بیچوں اور بیمثل کو مجسم مانا گیا- ہاتھ پاؤں آنکھ وغیرہ اعضاء ذات باری عزاسمہ تعالیٰ شانہ کے لئے بھی حقیقۃً سمجھے گئے تو ان کا نام مجسمہ یا بانی فرقہ (ابن کرام) کی طرف نسبت کر کے کرامیہ ہوا- یہ مذہب بھی خوب چلا اور لوگ کثرت سے اس شبہ کا شکار ہو گئے محمد بن کرام نے حج بھی کیا اس کے پیرو بظاہر تزہد و تعبد میں بھی کم نہ تھے- آخر ملک شام کا سفر کیا اور ۲۵۶ھ میں بمقام زغرہ فوت ہو گیا- صرف شام میں اس کے پیرو کوئی بیس ہزار سے زائد تھے اور جو بلاد مشرق میں تھے سو علاوہ-

قرامطہ یا باطنیہ :

اس کے بعد ۲۶۱ھ میں ایک شخص حمدان اشعث معروف بہ قرمط ظاہر ہوا اور اس نے بھی سب سے نرالا فرقہ نکال کھڑا کیا- جس کا نام قرامطہ پڑا- اس مذہب نے بھی اچھی رونق پائی اور عراق و شام میں خوب چمکا حتیٰ کہ اہل جنابہ میں سے ایک شخص ابو سعید جنابی بحرین کا حاکم ہو گیا اس کی سیاسی طاقت اس کے اپنے وقت میں اور بہت مدت تک اس کے جانشینوں میں ایسی قوی رہی کہ "خلفائے عباسیہ" بھی ان سے خائف رہتے تھے- خیر یہ تو ملکی فتنہ تھا- مذہبی فتنہ یہ تھا کہ انہوں نے فرائض اسلام (نماز' روزہ' حج اور زکوۃ) اور احکام حلال اور حرام کے ظاہری و متعارف معانی ترک کر کے اپنی خواہش سے ان کے باطنی معنی کچھ ایسے تجویز کئے کہ حلال و حرام کا فرق اٹھا دیا- حتیٰ کہ ماں' بہن' بیٹی کی بھی تمیز نہ رہی جس سے مقدس اسلام میں ایک فتنہ عظیم برپا ہو گیا- اس لئے ان کا نام "باطنیہ" بھی ہوا عقائد نسفی وغیرہ کتب کلامیہ میں جو یہ عبارت ہے-

النصوص تحمل علی ظاهرها والعدول عنها الی معان یدعیها اهل الباطن الحاد و کفر[1] وہ اسی فرقے کی تردید میں ہے۔ انہوں نے ہر طرف کثرت سے اپنے **مبلغین** منتشر کیے جنہوں نے بہت سے خواہش پرست لوگوں کے خیالات پلٹ دیے اور ان کو مذہبی قیود سے آزاد کر دیا[2]

اس روش کے لوگ آج کل بھی ملحد فقیروں کی صورت میں پنجاب' ممالک متحدہ (ہندوستان) بنگالہ' سندھ اور دکن میں ملتے ہیں جن کے دام میں کئی ایک ناواقف مسلمان پھنس جاتے ہیں۔

تنبیہ:

اس مقام پر یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ان فرقہائے مذکورہ بالا میں سے بعض فرقے بعض کی ضد سے پیدا ہوئے یا یہ کہ ان کے اصول دوسروں کی ضد ٹھہرے مثلا خوارج شیعوں کی ضد ہیں مجسمہ معتزلہ کی ضد اور جبریہ قدریہ کی ضد اور وعیدیہ مرجیہ کی ضد ہیں ایک درجہ افراط میں ہے تو دوسرا تفریط میں ان سب کے پیدا ہو جانے کی جامع وجہ یہی ہے کہ انہوں نے اپنے خیالات و قیاسات کو داخل شریعت کیا اور اس طریقہ کو ملحوظ نہ رکھا جس پر آنحضرت ﷺ نے اپنی پاک جماعت صحابہ کرام کو چھوڑا تھا۔ اور وہ صدر اول سے ان کے اوقات تک برابر متوارث چلا آیا تھا۔

---

[1] یعنی نصوص شرعیہ قرآن و حدیث کو ان کے ظاہری اور عرفی شرعی معانی پر محمول کرنا چاہئے۔ اور شرعی اور عرفی اور لغوی معانی کو چھوڑ کر وہ معانی مراد لینے جو باطنیہ کہتے ہیں الحاد و کفر ہے۔

[2] مولانا عبد الحئی لکھنوی مرحوم نے فوائد بہیہ کے حواشی تعلیقات تراجم الحنفیہ میں قرامطہ کے بعض فسادات کا ذکر کیا ہے۔ مثلا تخریب بیت اللہ اور تیرہ یا سترہ سو حجاج کا قتل عام اور حجر اسود کا اکھاڑ کر لے جانا وغیرہ وغیرہ۔

بعض فرقوں کے امتیازی مسائل پر تبصرہ

جب یہ محقق ہو چکا۔ کہ آنحضرت ﷺ نے اس امت مرحومہ کے افتراق و اختلاف کی خبر پہلے سے دے دی تھی اور آپ اس کے مطابق مختلف فرقہائے اسلام کا تاریخی سلسلہ بھی سمجھ چکے تو اب ان کے امتیازی مسائل بھی ملاحظہ فرمائیں جن میں وہ صحابہؓ اور خیار تابعین کی جماعت سے الگ ہوئے۔

تنبیہ:

ناظرین ہمارے اوپر کے اجمالی بیان کو ہر فرقے کے حال میں بالخصوص ملحوظ رکھیں۔

فتنہ عبداللہ بن سبا:

سب سے پہلے شیعہ اور خارجی الگ ہوئے۔ تفصیل اس کی یوں ہے کہ حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں علاقہ صنعاء سے ایک یہودی عبد اللہ بن سبا نام جسے اس کی ماں کی طرف منسوب کر کے ابن سوداء بھی کہتے ہیں' منافقت سے مسلمان ہو گیا۔ شرارت منافق کی فطرت میں ہوتی ہے۔ اس نے مسلمانوں میں ضلالت و فساد پھیلانے کی خاطر مختلف بلاد اسلامیہ میں گشت لگانے شروع کئے پہلے حجاز میں آیا لیکن اس کی پاک زمین نے اس کے تخم فساد کو قبول نہ کیا تو بصرہ میں چلا گیا وہاں بھی مقصود حاصل نہ ہوا تو شام (دمشق) میں آ گیا۔ یہاں سے بھی نکالا گیا۔ تو سیدھا مصر کا راستہ لیا۔ یہاں کی زمین نے اس کے تخم فساد کو قبول کر لیا۔ مدتوں کی محنت ٹھکانے لگی۔ اور اس کا درخت ایسا بڑھا پھولا کہ تھوڑے ہی دنوں میں تمام عالم اسلام کو اپنے منحوس سائے میں لے لیا (اعاذنا اللہ منہا)

ابن سباء نے موقع غنیمت جان کر اور زمین مصر کو قابل دیکھ کر حضرت عثمانؓ کے عمال پر طعن و تشنیع اور اعتراض کر کے آپ کے برخلاف ایجی ٹیشن (تحریک

بغاوت) پھیلادی اور یہ جادو چل نہیں سکتا تھا۔ جب تک حضرت عثمانؓ کے مقابلہ میں کسی مقدس ہستی کو قوم کے سامنے پیش نہ کیا جاتا۔ تاکہ انقلاب کے لئے تخریب و تعمیر ہر دو پہلو درست رہیں۔

لہٰذا اس نے حضرت علیؓ کی طرف داری میں (بغیر اس کے کہ حضرت علیؓ اس کو اپنا وکیل مقرر کر کے یہ ڈیوٹی اس کے سپرد کریں) مسائل اختراع کرنے شروع کر دیئے۔ جس سے اس کے اثر میں بہت سے لوگ آگئے اور دن بدن زیادہ ہوتے گئے حتی کہ فساد کی آگ عام ہو گئی اور مسلمانوں میں ایک فتنہ عظیم برپا ہو گیا۔

ہم اسے اپنے الفاظ میں نہیں بلکہ مشہور مورخ ابن جریر طبری کے الفاظ میں لکھتے ہیں۔

کان عبد الله بن سبا یهود یامن اهل صنعاء امه سوداء فاسلم زمان عثمان ثم تنقل فی بلدان المسلمین یحاول ضلالتهم فبدء بارض الحجاز ثم الکوفة ثم الشام فلم یقدر ما یرید عند احد من اهل الشام فاخرجوه حتی اتی مصر فاعتمر فیهم فقال لهم فیما یقول

عبداللہ بن سبا اہل صنعاء میں سے ایک یہودی تھا اس کی ماں کا نام سوداء تھا۔ حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں (بظاہر) مسلمان ہوا۔ پھر اسلامی شہروں میں مسلمانوں میں گمراہی پھیلانے کے لئے گشت لگانے لگا۔ تو پہلے زمین حجاز میں آیا۔ پھر کوفہ میں پھر شام میں اہل شام میں سے کسی کے پاس بھی اپنا مقصود حاصل نہ کر سکا۔ تو انہوں نے اسے وہاں سے نکال دیا حتی کہ مصر میں آیا۔ اور ان میں مل جل کر رہنے لگا پھر ان سے یہ بات کہی۔

مسئلہ رجعت آنحضرتؐ:

العجب ممن یزعم ان عیسی یرجع ویکذب بان محمداً: یرجع وقد قال الله عزو جل ان الذی فرض علیك القران لرادك الی

معاد فمحمدؐ احق بالرجوع من عیسیٰؑ قال فقبل ذلك عنه ووضع لهم الرجعة[1] فتکلموا فیها ثم قال لهم بعد ذلك ان عثمان اخذها بغیر حق وهذا وصی رسول الله ﷺ فانهضوا فی هذا لا مر فحرکوه وابدوا بالطعن علی امرائکم واظهروا الامر بالعروف والنهی عن المنکر تستمیلوا الناس وادعو هم الی هذا الامرفبعث دعاته وکاتب من کان استفسد فی الامصار وکاتبوه و دعوا فی السرالی ما علیه دائیهم واظهر والامر بالمعروف والنهی عن المنکر وجعلوا یکتبون الی الامصار بکتب یصنعونها فی عیوب ولاتهم ویکاتب اخوانهم بمثل ذلك ویکتب اهل مصر منهم الی مصر اخر بما یصنعون فیقروءه اولئك فی امصارهم وهوء لاء فی امصارهم حتی تنالوا بذلك المدینة داوسعوا الارض ادعة وهم یریدون غیر ما یظهرون ویسرون غیر مایبدون فیقول اهل کل مصر انالفی عافیة مما ابتلی به هولاء الا اهل المدینة فانهم جاء هم ذلك عن جمیع الامصار فقالوا انا لفی عافیة مما فیه الناس[1]

مسئلہ رجعت آنحضرتؐ:

"کہ اس شخص پر تعجب ہے جو یہ تو مانتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ دنیا میں پھر آئیں گے- اور اس بات کو نہیں مانتا بلکہ جھوٹ جانتا ہے کہ محمد (ﷺ) پھر دنیا میں آئیں گے- حالانکہ خدا تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے تحقیق وہ اللہ تعالیٰ جس نے آپ پر قرآن فرض کیا ہے البتہ لوٹانے والا ہے آپ کو واپسی کی جگہ میں پس محمد (ﷺ) عیسیٰ علیہ السلام سے زیادہ حقدار ہیں کہ دنیا میں واپس آئیں- پس اس کی یہ بات مانی گئی اور اس نے رجعت کا مسئلہ گھڑا پس اس بات کا چرچا ہوا پھر ان لوگوں سے کہنے لگا کہ ایک ہزار نبی ہوئے ہیں اور

---

[1] تاریخ طبری جلد پنجم ص ۹۸ واقعات ۳۵ھ مطبوعہ مصر-

ہر نبی کا ایک وصی بھی ہوا ہے اور محمد (ﷺ) کا وصی علیؓ ہے پھر کہنے لگا- کہ حضرت محمد (ﷺ) خاتم الانبیاء ہیں اور علیؓ خاتم الاوصیاء ہیں پھر کہنے لگا کہ اس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہے جو رسول اللہ ﷺ کی وصیت کو جاری نہ کرے اور امت کا نظام اپنے ہاتھ میں لے لے- پھر ان لوگوں سے کہنے لگا کہ حضرت عثمانؓ نے خلافت بغیر حق کے لی ہے' اور یہ (حضرت علیؓ) رسول اللہ ﷺ کے وصی ہیں پس تم (اے لوگو!) اس بات کے لئے اٹھو اور اسے (حضرت علیؓ) کو ابھارو اور اولاً والیان حکومت پر طعن کرنا شروع کرو- اور اسے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نام سے ظاہر کرو- تاکہ لوگوں کو اپنی طرف مائل کر سکو اور لوگوں کو بھی اس امر کی دعوت دو پس اس نے اپنے دعوت دینے والوں کو (مختلف) شہروں میں پھیلایا اور ان لوگوں سے جو دوسرے شہروں میں فساد کے طالب تھے خط و کتابت کی اور انہوں نے بھی اس سے کی اور جو کچھ ان کی رائے میں پختہ ہو چکا تھا اس کی طرف خفیہ دعوت دینے لگے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نام سے ظاہر کرنے لگے اور والیان حکومت کے عیوب میں جعلی خط بنا بنا کر دوسرے شہروں میں بھیجنے لگے اور ان کے ہم خیال بھی اسی طرح سے خط و کتابت کرنے لگے- اور ایک شہر کے لوگ دوسرے شہر والوں کی طرف لکھنے لگے جو وہ کرتے تھے پس یہ لوگ ان کے شہروں میں اور وہ لوگ ان کے شہروں میں پڑھ پڑھ کر سنانے لگے- حتیٰ کہ یہ سب لے لے کر مدینہ طیبہ و دارالخلافہ میں آنے لگے- اور بلاد اسلامیہ میں اس کی عام اشاعت کی اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے تھے اس کے خلاف ارادہ کچھ اور رکھتے تھے اور جو کچھ وہ منہ سے کہتے تھے باطن میں اس کے سوا کچھ اور چھپاتے تھے- پس ہر شہر والے کہتے تھے کہ ہم لوگ ان باتوں سے جن میں دوسرے شہروں کے لوگ مبتلا ہیں عافیت میں ہیں سوائے اہل مدینہ کے کہ ان کو ہر شہر سے ایسی خبریں آتی تھیں پس یہ (اہل مدینہ) کہتے

تھے کہ ہم ان امور سے جن میں سب لوگ مبتلا ہیں عافیت میں ہیں-"

یہ مضمون دیگر مورخین ابن اثیر و ابن خلدون وغیرہما نے بھی باختصار عبارت بیان کیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ ابن سبا کا اصل مقصود فتنہ و فساد برپا کرنا اور خلافت کے خلاف ایک انقلاب پسند جماعت کا قائم کرنا تھا- جس کے لئے اس نے دو قسم کے کام کئے اول یہ کہ حکام خلافت پر طعن و تشنیع کرنا شروع کیا دوم یہ کہ مسئلہ رجعت و وصیت جاری کیا- پہلی قسم یعنی اصلاح و فساد میں تمیز کرنا بہت مشکل ہوتا ہے- اس لئے کئی ایک صلحاء بھی اس کے فریب میں آگئے مثلاً ابوذر غفاری جو صحابہ میں بہت بڑے زاہد تھے ان کو زاہدانہ رنگ میں حضرت معاویہ کی بدگوئی کر کے ان سے بدظن کر دیا- اور دوسری قسم یعنی جعلی مسائل سے لوگوں کو گمراہ کرنا- سو صحابہ میں تو اس کے ساتھ کوئی نہ ہوا کیونکہ آنحضرتؐ کے پاس اقوال اور پسندیدہ افعال کا گواہ صحابہ کے سوا دیگر کون ہو سکتا ہے؟ ہاں دیگر لوگوں میں سے بہت سے عوام اس کے دام میں آگئے-

حضرت علیؓ اور وصیت خلافت :

یہی وہ پہلا موقع تھا کہ حضرت علیؓ کے لئے وصیت کا مسئلہ گھڑا گیا- ورنہ اس سے پہلے صحابہ میں اس کا کبھی ذکر نہیں آیا نہ تو ثقیفہ بنی ساعدہ میں جب حضرت ابوبکرؓ کی بیعت ہوئی- نہ حضرت ابوبکرؓ کے حضرت عمرؓ کو خلیفہ مقرر کرنے کے وقت اور نہ حضرت عمرؓ کے چھ شخصوں میں سے ایک کو مقرر کرنے کا حکم دینے کے وقت- اور نہ حضرت علیؓ کے مقابلہ میں حضرت عثمانؓ کو خلیفہ مقرر کرنے کے وقت-

حدیث وصیت کے پیش ہونے کے یہ بہت ضروری مواقع تھے- ان میں سے کسی موقع پر بھی اس کا ذکر نہیں آیا- یہ حدیث نہ تو حضرت علیؓ نے خود پیش کی اور نہ کسی دیگر صحابی نے اس کا ذکر کیا- سب سے پہلے یہ مسئلہ ابن سبا نے اس امت میں فتنہ ڈالنے کے لئے گھڑا جب چرچا عام ہو گیا- اور دو محارب فریقوں میں امر فارق قرار پایا تو یہ بھی تھوڑے عرصہ کے بعد ایک نظریہ ہو گیا- کہ آنحضرت ﷺ نے خلافت کے

متعلق کسی کے حق میں وصیت کی تھی یا نہیں چنانچہ صحیح بخاری میں ہے۔

عن ابراھیم عن الاسود قال ذکروا عند عائشةؓ ان علیا کان وصیا فقالت متی اوصی الیه وقد کنت مسندته علی صدری او قالت حجری فدعا بطست فلقد انخنث فی حجری فما شعرت انه مات فمتی اوصی الیه[1]

ابراہیم نخعیؒ سے روایت ہے وہ اسود سے روایت کرتے ہیں کہ اسود نے کہا (کوفہ کے) لوگوں نے حضرت عائشہؓ کے پاس ذکر کیا کہ حضرت علیؓ وصی تھے؟ تو آپ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے کس وقت ان کے حق میں وصیت کی تھی؟ (وفات کے وقت تو) آپ میرے سینے سے ڈھاسنا (تکیہ) لگائے ہوئے تھے پس آپ نے (پیشاب کرنے کے لئے) طست طلب کیا۔ آپ کی روح (پاک) تو اس طرح چپکے سے قبض ہو گئی کہ مجھے بھی آپ کی موت کا پتہ نہ لگا تو ان کے لئے وصیت کب کی تھی؟ (یعنی نہیں کی)

اس حدیث کو امام بخاری کے علاوہ امام نسائی اور امام مسلم نے بھی روایت کیا ہے۔

حضرت عائشہ کی وفات ۵۷ ۵۸ ہجری میں ہوئی۔ ان سے اسود بن یزید تابعیؒ روایت کرتے ہیں یہ کوفی ہیں ۷۴ھ یا ۷۵ھ میں فوت ہوئے پھر ان سے ان کے بھانجے ابراہیم نخعیؒ روایت کرتے ہیں۔ ان کی بابت پوچھنے کی ضرورت نہیں یہ امام ابو حنیفہ کے استاد حماد بن ابی سلیمان کے استاد ہیں یہ بھی کوفی ہیں ۹۶ ہجری میں فوت ہوئے۔

۲۔ اسی طرح صحیح بخاری میں طلحہ بن مصرف تابعی سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عبد اللہؓ ابن ابی اوفی صحابی سے پوچھا کہ کیا رسول اللہ ﷺ نے وصیت کی تھی تو حضرت عبد اللہؓ نے کہا نہیں۔ الحدیث۔

حضرت عبد اللہؓ بن ابی اوفی صحابی[2] اور طلحہ بن مصرف تابعی[3] اور ان کے نیچے

---

[1] بخاری کتاب الوصایا جزو ۱۱ ص ۱۸، ۱۹

[2] عبد اللہ بن ابی اوفی صحابیؓ کوفہ میں رہنے والے صحابہ میں سب سے پیچھے فوت ہوئے (اصحابہ و تجرید)

سب راوی جو صحیح بخاری میں ہیں سب کوفی ہیں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ابن سبا کے اثر سے کوفہ میں بھی اس مسئلہ کا چرچا ہو گیا تھا۔ اور وہ لوگ صحابہ سے دریافت کرتے تھے تو وہ اس کی تردید کرتے تھے۔ الغرض ہر دو روایتوں کے راوی اسی مقام کے رہنے والے ہیں جہاں پر چرچا ہو رہا ہے اور یہ سب راوی ثقہ اور معتبر ہیں۔

سبائی اور عثمانی :

الغرض ابن سبا کی اس تحریک بغاوت پر امت مرحومہ دو جماعتوں میں منقسم ہو گئی۔ ایک تو وہ جو اس کے بھرے میں آ گئے ان کو سبائی کہتے تھے۔ دوسرے وہ جو اس کے دام میں نہ پھنسے۔ اور برابر حضرت عثمانؓ پر حسن ظنی سے قائم رہے ان کا نام عثمانی تھا۔ علم تاریخ[1] شروح حدیث اور اسماء الرجال کی کتابوں میں دونوں ناموں کا استعمال بہت جگہ آتا ہے۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت :

ابن سبا نے جو جماعت تیار کی تھی وہ مصر' کوفہ اور بصرہ سے ہزاروں کی تعداد میں حج کے بہانے مدینہ طیبہ میں آ کر جمع ہوئی۔ اور تیس چالیس دن تک حضرت عثمانؓ کے مکان کا محاصرہ کیے رہی۔ آخر ١٨ ذی الحجہ کو چند مفسدین نے آپ کو جبکہ آپ قرآن شریف کھول کر تلاوت کر رہے تھے۔ نہایت بے دردی سے قتل کر ڈالا[2] مفسدوں کے گھر گھی کے چراغ جلے اور مخلصوں میں گھر گھر ماتم پڑ گیا۔ اور جماعت مسلمین کا شیرازہ

گذشتہ سے پیوستہ :

[3] طلحہ بن مصرف تابعیؒ کوفہ میں سید القراء کہے جاتے تھے ١١٢ھ یا ١١٣ھ میں فوت ہوئے (تہذیب التہذیب)

[1] امام بخاری نے تاریخ صغیر میں حضرت حسن بصری سے باسناد روایت کیا کہ انہوں نے فرمایا کہ امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ نے بارہ سال تک (خلافت) کا کام کیا آپ پر کسی نے کوئی اعتراض نہ کیا حتی کہ چند فاسق آئے (اور اعتراض کرنے لگے) بخدا اہل مدینہ نے ان کے بارہ مداہنت کی ص ٢٣۔

[2] حضرت عثمانؓ کی عمر اس وقت بیاسی سال کی تھی۔

بکھر گیا- اور امت مرحومہ کا تمام نظام بگڑ گیا- فانا للہ

حضرت علیؓ کا انتخاب :

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد مہاجرین و انصار کی ایک جماعت کے سخت اصرار پر حضرت علیؓ نے انکار کرنے کے بعد خلیفہ ہونا منظور کر لیا- جب آپ بیعت و خطبہ خلافت سے فارغ ہو کر گھر تشریف لے گئے- تو حضرت طلحہؓ و زبیرؓ نے آکر آپ سے کہا کہ ہم نے آپ سے حدود شرعیہ کے قائم کرنے کی شرط پر بیعت کی ہے- پس آپ حضرت عثمانؓ کے قاتلوں پر حدود شرعیہ قائم کریں- آپ نے نہایت متانت سے جواب دیا کہ ابھی مجھے اس بات پر پوری قدرت نہیں- ذرا شورش فرو ہو جائے تو معاملات پر غور کیا جائے- پس اسی بات پر بگاڑ ہو گیا- اور بنی امیہ مدینہ طیبہ چھوڑ کر دمشق اور مکہ معظمہ کو بھاگنے لگے حتی کہ حضرت نعمانؓ بن بشیر صحابی حضرت عثمانؓ کا خون آلود کرتہ جس میں آپ شہید ہوئے تھے اور آپ کی زوجہ محترمہ کی کٹی ہوئی انگلیوں کو لے کر چلاتا اور فریاد کرتا دمشق جا پہنچا- دمشق میں اس دل سوز اور جگر دوز منظر سے کہرام مچ گیا- یہ لوگ عثمانی تو تھے ہی- سب خون کے انتقام پر تل گئے- اور حضرت علیؓ کے مقابلے میں حضرت معاویہ کو اپنا امیر بنا لیا- ادھر حضرت طلحہؓ و زبیرؓ مدینہ شریف سے مکہ مکرمہ میں تشریف لے گئے-

تین گروہ :

اس وقت امت مرحومہ تین جماعتوں میں منقسم ہو گئی (اول) عثمانی جو حضرت عثمانؓ کے انتقام کے طالب تھے- یہ سب بنی امیہ اور شامی اور مکی لوگ تھے- اور دیگر بھی جو ان کے طرف دار تھے- مثلاً مصر' بصرہ اور کوفہ کے بہت سے لوگ- ان سب کے لیڈر حضرت معاویہؓ اور حضرات طلحہؓ اور زبیرؓ تھے (دوم) علوی یا شیعہ (جماعت علی- سبائی انہی میں مدغم ہو گئے' کیونکہ عثمانیوں کے مدمقابل تو یہی تھے (سوم) غیر جانبدار کہ نہ ادھر شامل ہوئے نہ ادھر بعض تو خانہ نشین ہو گئے- اور بعض دیہات و صحرا میں چلے گئے انہوں نے اسے ایک ملکی نزاع اور امت مرحومہ میں فتنہ سمجھا- اور

ان احادیث پر عمل کیا- جو آنحضرت ﷺ نے ایسے وقت کے لئے فرمائی تھیں مثلاً

قال سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول ستکون فتنة القاعد فیها خیر من القائم والقائم خیر من الماشی والماشی خیر من الراکب والمسلمون اخوان دماؤهم واموالهم حرام[1]

"کہا اس نے میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ عنقریب ایسا فتنہ اٹھے گا کہ گھر میں بیٹھ رہنے والا چلنے والے سے بہتر ہو گا- اور پیدل چلنے والا سوار سے بہتر ہو گا- اور مسلمان تو آپس میں بھائی بھائی ہیں- ان کے خون اور مال حرام ہیں"[2]

حضرت ابو موسیٰؓ کی اس حدیث کا مضمون امام ابن ماجہ نے خود حضرت ابو موسیٰؓ سے اور دیگر محدثین مثل امام بخاری وامام مسلم وغیرہما نے دیگر صحابہ سے بھی روایت کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فتنہ قائم ہونے کی خبر دی تھی اور اس میں شریک نہ ہونے کی تاکید بھی کی تھی- لیکن ہم وہ سب احادیث بخوف طوالت درج نہیں کر سکتے-

حضرت ابو موسیٰ اسی غیر جانبداری کی وجہ سے حکومت کوفہ سے الگ ہو گئے- لیکن فتنہ میں شریک نہ ہوئے[3]

ان اصحاب کے علاوہ دیگر اصحاب بھی بکثرت تھے جو اس فتنہ اور اس سے بعد کے فتنہ میں شریک نہیں ہوئے مثلاً عبد اللہ بن عمرؓ، سعد بن ابی وقاصؓ، عمران بن حصینؓ، جندب بن عبد اللہ بجلیؓ، ابو مسعودؓ وغیرہم رضی اللہ عنہم اجمعین-

غرضیکہ صحابہ کی ایک بڑی جماعت اسی وجہ سے غیر جانبدار رہی کہ انہوں نے

---

[1] ابن خلدون بقیہ جلد ثانی ص ۵۹

[2] اس جگہ لفظ حرام کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ بے وجہ کسی مسلمان کا خون کرنا اور اس کے مال پر تصرف کرنا ناجائز و حرام ہے- دیگر یہ کہ مسلمان کا خون اور مال احترام و حفاظت کے لائق ہے-

[3] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا میدان میں طرفین کو سمجھانے کے لئے آئی تھیں نہ کہ لڑائی کے لئے (تحفہ اثنا عشریہ)

اسے امت مرحومہ میں ایک فتنہ سمجھا اور اس میں پڑ کر مسلمانوں میں خونریزی درست نہ جانی۔

جنگ صفین اور امر تحکیم :-

حضرت عائشہؓ کی صلح صفائی کے بعد حضرت علیؓ نے کوفہ اور بصرہ کا انتظام کر کے شام کا قصد کیا اور حسب عادت معاویہؓ کو پیغام اطاعت بھیجا۔ لیکن بات نہ بنی تو دونوں لشکروں میں پورے زور کی لڑائی ہوئی۔ آخر فریقین کی قرارداد سے دو حکم مقرر ہوئے۔ حضرت علیؓ کی طرف سے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اور حضرت معاویہ کی طرف سے حضرت عمرو بن عاص فاتح مصر حکم مقرر ہوئے۔

خارجی :-

اس امر تحکیم پر شیعہ علیؓ میں سے ایک بڑی جماعت ناراض ہو کر آپ کی اطاعت سے خارج ہو گئی تو ان کا نام خارجی ہوا۔ ان خوارج میں بعض وہ بھی تھے جنہوں نے کتاب اللہ پر فیصلہ کرنے پر بہت زور دیا تھا۔ اور حضرت علیؓ کو دھمکی دی تھی کہ اگر آپ اس طریق پر فیصلہ نہ کریں گے تو ہم آپ کے ساتھ وہ سلوک کریں گے جو حضرت عثمانؓ کے ساتھ کیا تھا۔ مثلاً سعر بن فدک تیمی اور زید بن حصین طائی۔ یہ جماعت کوئی بارہ ہزار تھی اور بموجب ایک روایت کے بڑھتے بڑھتے چوبیس ہزار ہو گئی انہوں نے حضرت علی کے خلاف ان الحکم الا للہ کا نعرہ لگانا شروع کر دیا۔ حضرت علیؓ نے سنا تو فرمایا کلمۃ حق ارید بھا الباطل (یعنی یہ کلمہ تو حق ہے لیکن اس سے باطل کا ارادہ کیا گیا ہے یعنی شرارت و فساد کرنا چاہا ہے۔)

صفین سے ہو کر حضرت علی کوفہ میں داخل ہوئے۔ لیکن خوارج آپ کے ساتھ نہ ہوئے بلکہ مقام حرورا پر جمع ہو کر الگ مشورت کرنے لگے۔

جب یہ بھی ایک الگ جماعت بن گئی۔ تو شیعہ علی دو گروہ ہو گئے۔ ایک شیعہ جو آپ کے ساتھ رہے دوسرے خارجی جو آپ سے الگ ہو کر آپ کی اطاعت سے خارج ہو گئے۔

اب امت مرحومہ کے چار گروہ ہو گئے۔ عثمانی' شیعہ' خارجی اور غیر جانبدار

حضرت علیؓ پر خارجیوں کے اعتراضات اور حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ کے ان کو جوابات

خارجیوں نے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے متعلق جو اعتراض تراشے وہ حسب روایت ابن عباس رضی اللہ عنہ تین ہیں۔ عبدالرزاق اور حاکم اور بیہقی (رحمہم اللہ) نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ جب حروریہ (خارجی) الگ ہو گئے اور وہ ایک مکان پر علیحدہ تھے تو میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آپ نماز (ظہر) کو ٹھنڈا کریں تاکہ میں اس قوم کے پاس جا کر ان سے بات چیت کروں۔ میں ان کے پاس آیا اور اچھے سے اچھے حلے پہنے۔ انہوں نے کہا مرحبا یا ابن عباس یہ حلہ کیسا ہے؟ میں نے کہا کہ تم اس میں مجھ پر کیا عیب پکڑتے ہو میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے اچھے سے اچھا حلہ پہنا۔ اور یہ آیت اتری قل من حرم زینة اللہ التی اخرج لعبادہ والطیبت من الرزق الایۃ۔ انہوں نے کہا (اچھا) فرمائیے۔ آپ کیسے تشریف لائے ہیں؟ میں نے کہا۔ مجھے بتاؤ کہ تم رسول اللہ (ﷺ) کے ابن عم اور آپ کے داماد اور سب سے پہلے ایمان لانے والے اور رسول اللہ (ﷺ) کے ان اصحاب میں جو ان کے ساتھ ہیں کیا برائی پاتے ہو؟ انہوں نے کہا ہم ان میں تین باتیں بری پاتے ہیں۔ میں نے کہا وہ کونسی ہیں؟ انہوں نے کہا کہ پہلی ان میں سے یہ ہے کہ اس نے خدا کے دین میں آدمیوں کو حکم مانا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ ان الحکم الا للہ یعنی نہیں حکم (مگر واسطے اللہ کے) میں نے کہا اور کیا؟ انہوں نے کہا اس نے قتال کیا اور نہ ان کو گالیاں دیں اور نہ ان کا مال لوٹا۔ اگر وہ کافر تھے تو ان کے مال حلال تھے۔ اور اگر وہ مومن تھے تو ان کے خون حرام تھے۔ میں نے کہا اور کیا؟ انہوں نے کہا اس نے (تحریک صلح والے کاغذ پر سے) امیر المومنین نہیں تو وہ امیر الکافرین ہے۔ میں نے ان

سے کہا (اچھا) اگر میں تم پر قرآن محکم پڑھوں اور رسول اللہ ﷺ کی سنت سے جس میں تم شک نہ کر سکو حدیث بیان کروں تو کیا تم رجوع کر لو گے؟ انہوں نے کہا نعم یعنی ہاں۔

میں نے کہا تمہارا یہ قول کہ اس نے یعنی حضرت علیؓ نے اللہ تعالیٰ کے دین میں آدمیوں کو حکم مانا ہے (اس کا جواب یہ ہے) کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یایها الذین امنوا لاتقتلوا الصید وانتم حرم (الی قوله) یحکم به ذوا عدل منکم۔ الایہ۔ نیز بیوی اور اس کے خاوند کے بارے میں فرمایا۔ وان خفتم شقاق بینهما فابعثوا حکما من اهلها۔ الایة میں تم سے اللہ تعالیٰ کے نام پوچھتا ہوں کہ (مسلمان کو) لوگوں کے خونوں اور جانوں کی حفاظت میں۔ اور ان کے آپس کے معاملات کی اصلاح میں حکم مقرر ہونا بہتر ہے یا ایک خرگوش کے بارے میں جس کی قیمت ایک درہم کا چوتھا حصہ ہے (یعنی ایک آنہ) انہوں نے کہا ان کے خون میں اور ان کے آپس کے معاملات کی اصلاح میں حکم مقرر ہونا بہتر ہے۔ میں نے کہا کیا میں اس (دلیل) سے (پہلے اعتراض سے) نکل گیا۔ انہوں نے کہا اللهم نعم۔ (پھر میں نے کہا) اور تمہاری یہ بات کہ اس نے قتال کیا اور (فریق مخالف کو) گالیاں نہیں دیں اور نہ ان کا مال لوٹا (سو اس کا جواب یہ ہے) کہ کیا تم اپنی ماں حضرت عائشہؓ کو گالی دو گے؟ اور اس کے متعلق بھی اس امر کو حلال جانو گے۔ جو اس کے سوا سے حلال جانتے ہو؟ اگر ایسا ہے تو تم نے کفر کیا۔ اور اگر تم گمان کرو کہ وہ تمہاری ماں نہیں ہے تو بھی تم کافر ہو گئے۔ اور اسلام سے خارج ہو گئے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے النبی اولی بالمومنین من انفسهم وازواجه امهاتهم الایة پس تم دو گمراہیوں میں ڈگمگا رہے ہو پس جس کو چاہو اختیار کر لو کیا میں اس سے بھی نکل گیا؟

انہوں نے کہا اللهم نعم (پھر حضرت ابن عباس نے کہا) لیکن تمہارا یہ قول کہ اس نے اپنا نام امیر المومنین (کے لقب) سے مٹا دیا (تو اس کا جواب یہ ہے کہ) رسول اللہ ﷺ نے (صلح) حدیبیہ کے روز قریش کو دعوت دی کہ ہمارے اور تمہارے درمیان ایک نوشت ہو جائے (رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ کو فرمایا) لکھو "یہ وہ صلح نامہ ہے

جس پر محمدؐ رسول اللہ نے صلح کی۔ (قریشیوں نے) کہا اللہ کی قسم اگر ہم آپ کو اللہ کا رسول جانتے تو ہم آپ کو بیت اللہ شریف سے نہ روکتے اور نہ آپ سے لڑائی کرتے لیکن آپ محمد بن عبد اللہ لکھوائیں۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی قسم میں اللہ کا رسول ہوں۔ اگرچہ تم میری تکذیب کرتے ہو۔ اے علیؓ لکھو محمد بن عبد اللہ اور (معلوم ہے کہ) رسول اللہ حضرت علیؓ سے افضل ہیں۔ کیا میں اس سے بھی نکل گیا؟ انہوں نے کہا اللھم نعم پس ان میں سے بیس ہزار آدمی تائب ہو گئے اور چار ہزار باقی رہ گئے۔ جو قتل کیے گئے (فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت مطبوعہ مصر مع مستصفی للامام الغزالیؒ جلد ۲ ص ۳۸۸، ۳۸۹)

اس اختلاف کا اثر یا نتیجہ :۔

خارجیوں نے کھلم کھلے طور پر حضرت علیؓ کی تکفیر شروع کر دی کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا بندوں کو حکم بنایا ہے اسی پر ترقی کرتے کرتے کبیرہ گناہ سے کافر ہو جانا خارجیوں کا مذہب قرار پایا۔ اس پر بھی طرفین سے دلائل شروع ہوئے تو سیاسی اختلاف نے مذہبی صورت اختیار کر لی۔ پس اب یہ حالت ہو گئی کہ علوی تو عثمانیوں کو گالیاں دیں۔ اور حضرت عثمانؓ کی منقصت کر کے حضرت علیؓ کو ان سے افضل کہیں۔ اور عثمانی علویوں کو برا کہیں اور حضرت عثمانؓ کو حضرت علیؓ پر فضیلت دیں۔ اور خارجی ہر دو کو کافر کہیں۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ نے سنا تو فرمایا:

امروا ان یستغفروا لاصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم فسبوھم[1] (نووی شرح مسلم)

"یعنی اللہ تعالیٰ کا حکم تو یہ تھا کہ آنحضرت ﷺ کے اصحاب کے لئے استغفار

---

[1] امام نووی نے اس کی شرح میں کہا ہے کہ قال القاضی الظاھر انھا قالت ھذا عند ماسمعت اھل مصر یقولون فی عثمان ما قالوا واھل الشام فی العلویۃ ماقالوا والحروریۃ فی الجمیع ماقالوا واما الامر بالاستغفار الذی اشارت الیہ فھو قولہ تعالی والذین جاؤا من بعد ھم یقولون ربنا اغفرلنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان (نووی شرح مسلم جلد دوم ص ۴۲۱ کتاب التفسیر)

کریں۔ لیکن ان لوگوں نے اس کی بجائے گالیاں دینی شروع کر دی ہیں۔"

اسی طرح امام بخاریؒ نے تاریخ صغیر میں اور حافظ ابن حجرؒ نے تہذیب التہذیب میں ابواسرائیل اسماعیل بن اسحاق کے ترجمہ میں نقل کیا ہے کہ وہ حضرت عثمانؓ کے حق میں گالیاں بکا کرتا تھا۔ ابواسرائیل مذکور ۸۴ھ میں پیدا ہوا۔ تاریخ صغیر ص ۱۸۷

مذکورہ بالا اختلافات سیاسی تھے

اس تفصیل سے صاف ظاہر ہے کہ جماعت صحابہ میں یہ اختلاف محض سیاسی تھا نہ مذہبی۔ اور یہ بھی کہ جماعت صحابہؓ میں باوجود اس اختلاف کے دشنام دہی کسی کا مذہب نہیں تھا۔ جن لوگوں نے اسے داخل مذہب کیا تھا وہ مفسدین کی جماعت تھی۔ صحابہؓ سے الگ تھی۔ خواہ وہ سبائی تھے یا شیعہ و خارجی تھے۔

نیز یہ کہ اس وقت حضرت شیخین یعنی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے متعلق کوئی تذکرہ نہیں چھڑا۔ نہ ان کے استحقاق خلافت پر گفتگو ہوئی نہ ان کے انتظام خلافت پر اعتراض ہوا۔ نہ ان کی فضیلت میں کسی کو کلام تھا۔ ہاں حضرت عثمانؓ کے استحقاق خلافت کی نسبت تو نہیں لیکن آپ کے انتظام کی نسبت اخیر عہد خلافت میں ایک مفسد گروہ نے جن کا ذکر سابقاً گذر چکا ہے۔ ایجی ٹیشن (تحریک بغاوت) شروع کر دی۔ جس کی نوبت زبان درازی تک ہی نہیں بلکہ بڑھتے بڑھتے ان کی فضیلت بھی زیر بحث ہو گئی۔

لیکن حضرت علی مرتضیٰؓ اسی سے سخت بیزار تھے تاریخ ابن خلدون میں متعدد جگہ مذکور ہے کہ حضرت علیؓ نے متعدد مواقع پر قاتلین حضرت عثمانؓ کو ملعون کہا۔

ایقاظ: خاکسار نے اس مضمون میں تاریخی واقعات کو بالتمام بیان نہیں کیا۔ بلکہ موضوع کتاب کو ملحوظ رکھ کر نہایت اختصار سے صرف ان امور پر اکتفا کیا ہے جن کو اصل مقصود یعنی مذہبی اختلاف سے تعلق ہے ہاں اس بات کا لحاظ خاص طور پر رکھا ہے کہ سلسلہ ذکر برابر چلتا جائے۔ تاکہ نتائج کے اخذ کرنے میں کوئی خلل یا ابہام ناظرین کے سد راہ نہ ہو۔

(۲) چونکہ سب امور مذکورہ منقولی ہیں۔ اس لئے اکثر جگہ تو ماخذ کا حوالہ دے دیا ہے۔ اور جہاں حوالہ نہیں دیا۔ وہ تاریخ ابن جریر۔ تاریخ ابن اثیر اور تاریخ ابن خلدون میں سے کسی ایک یا دو یا تینوں سے

فرقہ قدریہ:

بصرہ میں زمانہ عبدالملک بن مروان میں ایک شخص معبد جہنی ظاہر ہوا۔ جس نے تقدیر کا انکار کیا۔ امام اوزاعیؒ کا قول ہے کہ معبد نے انکار تقدیر ایک شخص سوسن نامی سے سیکھا جو مسلمان ہو گیا تھا۔ اور پھر مرتد ہو گیا۔ معبد کی آمد و رفت خواجہ حسن بصری کی مجلس میں بھی تھی۔ آپ نے اس کے عقائد پر نظر کر کے لوگوں کو اس کی مجالست سے منع کر دیا اور فرمادیا "ھو ضال مضل" یعنی یہ شخص خود بھی گمراہ ہے۔ اور دوسروں کو بھی گمراہ کرنے والا ہے۔" بصرہ کے بہت سے لوگ اس کے فتنے میں آگئے اور ان کا نام انکار تقدیر کے سبب قدریہ ہوا۔

معبد مدینہ طیبہ بھی گیا۔ اور وہاں بھی کئی لوگوں کو بگاڑا۔ آخر اس کو حجاج بن یوسف نے قتل کر ڈالا۔ کیونکہ یہ اس کے مشہور محارب عبدالرحمٰن بن اشعث کا طرف دار تھا۔

مسئلہ تقدیر کا اقرار امور ایمان میں سے ہے صحیح مسلم کی روایت ذیل ملاحظہ ہو۔

"قاضی یحییٰ بن یعمر بصری اور حمید بن عبدالرحمٰن حمیری حج بیت اللہ کو گئے تو انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے ملاقات کر کے ان سے منکرین تقدیر کا ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا جب ان سے ملو۔ تو کہنا کہ میں (عبداللہ بن عمرؓ) حلفاً کہتا ہوں کہ اگر ان میں سے کسی کے پاس احد (پہاڑ) کے برابر بھی سونا ہو اور وہ اسے (راہ خدا میں) خرچ کرے۔ تو

گذشتہ سے پیوستہ
ماخوذ ہیں۔ واللہ الہادی۔

(۳) مضمون مذکور علم حدیث۔ تاریخ، اسماء الرجال اور اسماء صحابہ کی کثیر التعداد اور کبیر الحجم کتب کے مطالعہ و انتخاب سے نہایت محنت و عرق ریزی سے شدت گرما اور قحوط مطر کے زمانہ میں تیار کیا گیا ہے۔ اس سے انکار کرنے میں جلد بازی نہ کی جائے۔ خدا کے فضل سے اس میں نہ تو کوئی حوالہ غلط ہے اور نہ مطلب بیان کرنے میں کوئی مغالطہ ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ جو کچھ لکھا ہے طریق محدثین کو ملحوظ رکھ کر اس کے مطابق لکھا ہے اپنی رائے و قیاس اور وہم و خیال سے کچھ نہیں بنایا۔ ہاں یہ ضرور کہتا ہوں کہ انما انا بشر مثلکم انسی کما تنسون فاذا انسیت فذکرونی۔ وان اصبت فمن اللہ وان اخطات فمنی ومن الشیطان۔ اللھم لک اختصم وبک اعتصم۔ (خاکسار میر سیالکوٹی)

اللہ تعالیٰ اسے قبول نہیں کرے گا- حتیٰ کہ تقدیر پر ایمان لائے-اس کے بعد حضرت عبد اللہؓ نے اپنے باپ عمرؓ والی مشہور حدیث بیان کی- جس میں مذکور ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے آنحضرت ﷺ سے ایمان اور اسلام اور احسان اور قیامت اور علامات قیامت کی بابت پوچھا تو رسول اللہ ﷺ نے امور ایمان کی نسبت فرمایا-

ان تومن باللہ وملئکتہ وکتبہ ورسلہ والیوم الاخرو تومن بالقدر خیرہ وشرہ (مسلم)

"یعنی تو اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر اور پچھلے دن پر اور خیر وشر کی تقدیر پر ایمان لاوے-"

توضیح مسئلہ:

تقدیر مسئلہ کے ماننے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جبر سے ہر انسان کے عمل اس کے ذمے لگا دیئے ہیں-اور وہ بہرصورت اس سے سرزد ہوتے رہتے ہیں-بلکہ اس کے یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر شے کو اس کے حدود وکوائف اور اس کے وقت و مقام حدوث سمیت اپنے علم ازلی سے قبل اس کے خلق وایجاد کے جانتا ہے-پس جو کچھ واقع وحادث ہوتا ہے اسی جانے ہوئے علم کا ظہور ہوتا ہے چنانچہ امام نوویؒ حدیث بالا کی شرح میں فرماتے ہیں-

واعلم ان مذھب اھل الحق اثبات القدر و معناہ ان اللہ تبارک و تعالی قدر الاشیاء فی القدم وعلم سبحانہ انھا ستقع فی اوقات معلومۃ عندہ سبحانہ و تعالی وعلی صفات مخصوصۃ فھی تقع علی حسب ماقدرھا سبحانہ وتعالے وانکرت القدریۃ ھذا اوزعمت ان سبحانہ وتعالی لم یقدرھا ولم یتقدم علمہ سبحانہ بھا وانھا مستانفۃ العلم ای انما یعلمھا سبحانہ بعد وقوعھا

"اہل حق کا مذہب تقدیر کو ثابت کرنا ہے-اور اس کے یہ معنی ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ازل میں سب چیزوں کا اندازہ کر رکھا ہے اور جان رکھا ہے

کہ وہ ان اوقات میں جو اس کو معلوم ہیں اور مخصوص صفات پر ہیں ضرور ضرور واقع ہوں گی۔ پس وہ اس اندازہ کے مطابق ہی واقع ہوتی ہیں اور قدریہ اس امر کا انکار کرتے ہیں ان کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا اندازہ نہیں کیا اور نہ اس نے ان کو پیشتر سے جان رکھا ہے۔ بلکہ ان کے متعلق علم مستانف ہے۔ یعنی اللہ سبحانہ ان کو ان کے وقوع کے بعد نئے علم سے جانتا ہے (نہ کہ علم قدیم سے)"

پھر اس سے تھوڑا آگے امام خطابی سے نقل کر کے لکھتے ہیں :

قال الخطابی وقد یحسب کثیر من الناس ان معنی القضاء والقدر اجبار اللہ سبحانہ العبد وقھرہ علی قدرہ وقضاہ ولیس الامر کما یتوھمونہ وانما معناہ الاخبار عن تقدم علم اللہ سبحانہ وتعالی بمایکون من اکتساب العبد وصدورھا من تقدیر منہ وخلق لھا خیرھا وشرھا قال والقد راسم لما صدر مقدرا عن فعل القادر یقال قدرت الشئی وقدرتہ بالتخفیف والتثقیل بمعنی واحد والقضافی ھذا معناہ الخلق کقولہ فقضا ھن سبع سموت فی یومین ای خلقھن[1]

"امام خطابی نے کہا کہ بہت سے لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ قضاو قدر کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ کا بندے کو اپنی قضاو قدر پر مجبور و مقہور کرنا۔ اور یہ بات جس طرح کہ ان لوگوں نے سمجھی ہے اس طرح نہیں ہے اس کے معنی تو صرف اللہ تعالیٰ کا اپنے علم سابق سے بندے کے ان کاموں کے کرنے اور ظاہر ہونے کی خبر ہے۔ جو اللہ کے پیدا کرنے سے پیدا ہوں گے۔ خواہ نیک ہوں یا بد۔ اور قدر تو اس فعل کا نام ہے جو قادر کے فعل سے اندازہ کیا گیا ہو۔ چنانچہ محاورہ ہے قدرت الشئی وقدرتہ مخفف اور مثقل ان دونوں کے

---

[1] شرح صحیح مسلم جلد اول ص ۷۲۔

ایک ہی معنی ہیں اور اس موقع پر قضا کے معنی پیدا کرنے کے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے فقضاھن سبع سموات فی یومین یعنی پیدا کئے سات آسمان دو دن میں۔"

نکتہ نمبرا: آیت محولہ بالا فقضاھن سبع سموات (پ ۲۴ حم السجدہ) میں حرف (ف) اور ھن (ضمیر منصوب) کے لانے میں ایک نہایت باریک علمی نکتہ ہے۔ جس میں امام خطابیؒ کے قول کی تائید ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے پیشتر فرمایا۔ ثم استوی الی السماء یعنی پھر اللہ تعالیٰ نے آسمان (بنانے) کا قصد کیا اس کے بعد ف سے مصدر کر کے فرمایا فقضاھن یعنی اس قصد کو پورا کرنے کے لئے آسمانوں کو بنا کھڑا کیا۔ اور آسمانوں کا ذکر اسم ضمیر (ھُنّ) سے کرنے میں یہی مضمر ہے کہ آسمانوں کی صورت کذائی اللہ کے علم ازلی میں قبل ان کی پیدائش کے حاضر تھی۔ ورنہ یہاں ھُنّ اسم ضمیر کا موقع نہیں تھا۔ پس معلوم ہوا کہ اسی صورت علمیہ پر حکم کن وارد ہوا اور وہ (آسمان) عالم شہود میں موجود ہو گئے۔ اور علم نحو میں مقدر اسی کو کہتے ہیں جو لفظاً تو موجود نہ ہو لیکن معنی و مراداً ذہن میں موجود ہو اس نکتے کی توضیح نیچے عنوان "فائدہ جلیلہ" میں ملاحظہ فرمائیں۔

فائدہ جلیلہ: اللہ تعالیٰ کا حکم ازلی ہے وہ حوادث اور ذی حوادث اشیاء کو ان کے حدوث و شہود کے قبل بھی ویسا ہی جانتا ہے جیسا کہ حدوث کے وقت اور اس کے بعد جانتا ہے۔ کیونکہ اس کا علم حضوری ہے۔ حصولی و محتاج آلات و اسباب نہیں ہے اور اس کا یہ علم ان اشیاء و حوادث کے جمیع حوادث و زمانہ پر بھی حاوی ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کا علم کلی اور تفصیلی ہے پس جب اس کے علم کے مطابق کسی امر کے ظہور کا وقت آتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی اس صورت کو جو اس کے علم میں ہوتی ہے حکم کرتا ہے کن (ہو جا) (فیکون) تو وہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ منہاج السنۃ میں فرماتے ہیں۔

وقد قال اللہ تعالی انما امرہ اذا اراد شیئا ان یقول لہ کن فیکون (وھذا) عند اکثر العلماء ھو خطاب یکون لمن یعلمہ الرب

تعالی فی نفسہ وان لم یوجد بعد[1]

"اللہ تعالیٰ نے فرمایاانما امرہ اذا اراد شیئااور اکثر علماء کے نزدیک یہ اس صورت کو خطاب ہوتا ہے جو خداوند تعالیٰ کے علم میں ہوتی ہے اگرچہ فی الوقت موجود نہ ہو۔"

اسی طرح حافظ ابن حجرؒ حدیث جبریلؑ کے ذیل میں فرماتے ہیں :

والمراد ان اللہ علم مقادیر الاشیاء وازمانھا قبل ایجادھا ثم اوجد ماسبق فی علمہ انہ یوجد فکل محدث صادر عن علمہ وقدرتہ وارادتہ ھذا ھو المعلوم من الدین والبراھین القطعیۃ وعلیہ کان السلف من الصحابۃ وخیار التابعین الی ان حدثت بدعۃ القدر فی اواخر زمن الصحابۃ۔[2]

"تقدیر سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ چیزوں کے مقداروں اور زمانوں کو ان کے پیدا کرنے سے بھی پہلے سے جانتا ہے۔ پھر جیسا کہ پہلے اس کے علم میں ہوتا ہے کہ یہ چیز اس طرح موجود ہوگی اسی طرح اس کو وجود میں لاتا ہے۔ پس ہر پیدا شدہ اس کے علم اور اس کی قدرت اور اس کے ارادے سے پیدا ہوتی ہے۔ اصل (دینی بات) جو براہین قطعیہ سے معلوم ہوئی ہے یہی ہے۔ اور صحابہ اور خیار تابعین اسی کے معتقد تھے۔ یہاں تک کہ تقدیر کے انکار کی بدعت زمانہ صحابہ کے آخری سالوں میں پیدا ہوگئی۔"

اسی طرح حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ فقہ اکبر میں اندراجات لوح محفوظ کی نسبت فرماتے ہیں : ولکن کتبہ بالوصف لا بالحکم اور ملا علی قاریؒ اس کی شرح میں فرماتے ہیں :

ای کتب اللہ فی حق کل شئی بانہ سیکون کذ او کذا ولم یکتب

۱۔ منہاج جلد دوم ص ۸۱' ۸۲۔

۲۔ شرح صحیح بخاری جلد اول ص ۲۷۔

بانہ لیکن کذا و کذا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے علم ازلی سے ہر شے کی نسبت وصف کے طور پر اس کا حال لکھا ہے کہ وہ اس طرح اسی طرح ہو گی حکم کے طور پر یہ نہیں لکھا کہ اس طرح ہو۔[1]

جہمیہ: خلیفہ ہشام بن عبد الملک کے عہد میں ایک شخص جعد بن درہم نے صفات الٰہیہ کا انکار شروع کر دیا۔

مسئلہ صفات الٰہیہ بڑا دقیق اور مشکل ہے۔ جس کی گتھی عقل و وہم کے ناخنوں سے نہیں کھل سکتی۔ ہم کیا اور ہماری بساط کیا؟ خود سرور کائنات ﷺ دربار ایزدی میں اظہار عجز کر کے اور حقیقی علم کو اسی ذات سرمدی کے سپرد کر کے فرماتے ہیں لا احصی ثناء علیك انت كما اثنیت علی نفسك[2] پس اپنی عاجزی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس وقت ہمارا مقصود مسئلہ صفات کے متعلق اختلافات کی صورت کا بیان کر دینا ہے۔ جس کی مجمل تشریح یوں ہے کہ ذات بیچون عزاسمہ کی صفات دو قسم کی ہیں سلبیہ اور وجودیہ۔

سلبیہ سے یہ مراد ہے کہ ذات بر حق کو جملہ معائب اور نقائص سے اور ہر چیز سے جو اس کی شان کے لائق نہ ہو منزہ و مبرا مانا جائے۔ اسے تنزیہ کہتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ جسم نہیں ہے۔ وہ کسی سے متحد نہیں ہوتا۔ اس کی ذات کسی میں حلول نہیں کرتی وغیر ذلک۔ چنانچہ فرمایا:

---

[1] شرح فقہ اکبر مطبوعہ مصر ص ۳۶۔ امام ابن تیمیہ فقہ اکبر کو امام ابو حنیفہ کی تصنیف قرار دیتے ہیں اور اسی سے آنجناب کو قائلین تقدیر میں شمار کرتے ہیں فان ابا حنیفة من المقرین بالقدر باتفاق اهل معرفته به وبمذهبه وكلامه فی الرد علی القدرية معروف فی الفقه الاكبر وبسط الحجج فی الرد علیهم بما لم یبسطه علی غیر هم فی هذا الكتاب (منہاج السنۃ جلد ۲ ص ۲۴)۔ یہ عاجز زلہ ربائے علمائے سلف کہتا ہے کہ حضرت امام صاحبؒ کے اس قول کی تائید کلام ربانی میں موجود ہے ولو علم الله فیهم خیرا لا سمعهم (انفال پ ۹)

[2] (خداوند) میں تیری ثنا (کما حقہ) بیان نہیں کر سکتا تو ویسا ہے جیسا تو نے خود اپنی صفت بیان کی۔

لم یلد ولم یولد ولم یکن له کفوا احد (سورہ اخلاص پ ۳۰)
"یعنی نہ خدا نے کسی کو جنا اور نہ وہ خود کسی سے جنا گیا اور نہ کوئی اس کا ہمسر ہے۔"

صفات وجودیہ سے یہ مراد ہے کہ ذات باری جل مجدہ کو جملہ صفات کمال سے موصوف سمجھا جائے یہ بھی دو قسم پر ہیں صفات افعال کہ ان کا ظہور بالفعل مخلوق کے ظہور و وجود سے ہے۔ مثلاً خالقیت کہ اس کا ظہور بالفعل اس وقت ہوتا ہے جب کوئی شے مخلوق ہو جائے اور ربوبیت کہ اس کا ظہور شے مربوب کو چاہتا ہے۔ ایسی صفات کی دو جہتیں ہیں۔ ایک جہت ذات برحق کی نعت و صفت ہونے کے لحاظ سے۔ اور دوسری مخلوق سے متعلق ہونے کے لحاظ سے۔ ذات خداوندی سے تو اس کا تعلق حادث نہیں یعنی ایسا کوئی وقت نہیں تھا کہ ذات برحق اس سے مجرد محض ہو۔ اسی معنی میں امام الائمۃ حضرت امام ابو حنیفہؒ نے فقہ اکبر میں فرمایا۔

کان الله خالقا قبل ان یخلق
"یعنی خدا پیدا کرنے سے پہلے بھی خالق تھا۔"

امام غزالیؒ نے اقتصاد میں اس امر کو بہت صفائی سے بیان کیا ہے۔
باقی رہی دوسری جہت۔ یعنی مخلوق کے ساتھ اس صفت کا تعلق۔ سو وہ حادث ہے یعنی جب خدا نے چاہا کہ کسی شے کو ہستی میں لائے۔ تو اپنی صفت خالقیت کو اس شے کی صورت علمیہ کے متعلق کر دیا جو اس کے علم ازلی میں ہے اور اس کو موجود بالفعل کر دیا۔ پس یہ تعلق اور متعلق بہ ہر دو حادثات ہوئے نہ کہ صفت الٰہی۔

اسی قسم میں سے بعض اضافی ہیں مثلاً هو الاول والاخر (سور حدید پ ۲۷)
دوسری قسم صفات وجودیہ کی صفات ازلیہ ہیں۔ ان کو ذاتیہ' حقیقیہ اور قدیمہ (مطلقاً) بھی کہتے ہیں۔ مثلاً علم' قدرت اور حیات کہ ان کا انفکاک ذات بیچوں سے نہ کبھی ہوا۔ نہ ہو سکے یعنی وہ ہمیشہ سے ان صفات سے موصوف ہے اور ہمیشہ موصوف رہے گا۔

صفات سلبیہ اور اضافیہ کی نسبت تو اختلاف نہیں۔ہاں حقیقیہ کی نسبت یہ اختلاف ہے کہ ان کا مفہوم مفہوم ذات کا عین ہے یا اس سے کوئی زائد امر ہے۔

مثبتین صفات (اہلسنت اور ان کے موافقین) کہتے ہیں کہ ان صفات کا مفہوم ذات واجب تعالیٰ کے مفہوم پر زائد ہے۔اور اسم اللہ ذات بحث کا نام نہیں ہے۔بلکہ ذات مع صفات کا نام ہے۔ہاں وہ عین ذات بھی نہیں ہیں کہ ان کو خدا سمجھ لیا جائے۔اور غیر بھی نہیں کہ ذات بر حق کو ان سے مجرد و خالی مانا جائے۔چونکہ کوئی ذات جو علم و قدرت و حیات و سمع و بصر و ارادہ و کلام۔صفات کمال سے خالی ہو خارج میں اس کی کوئی حقیقت نہیں اور نہ وہ اللہ ہو سکتی ہے۔اور نہ مستحق عبادت۔قرآن شریف میں جا بجا انہی صفات کی نفی سے باطل معبودوں کی تردید کی گئی ہے۔

جہمیہ اور ان کی موافقین شیعہ اور معتزلہ کہتے ہیں کہ خدا کہ یہ صفات اس کی عین ذات ہیں اور مفہوم ذات سے زائد کوئی چیز قدیم نہیں ہے۔ورنہ تعدد قدما لازم آئے جب ذوات متعدد ہوں۔ذات واحد ہو۔اور اس کی صفات کثرت سے ہوں تو تعدد قدما کہاں ہوا افہم۔

پس صحیح یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی صفات کے ساتھ قدیم ہے۔اور اس میں کوئی وقت نہیں۔

یہ ہے اقرار بالصفات اور انکار بالصفات کے متعلق مختصر تشریح جو ہم نے بہت سی کتب کلامیہ کی ورق گردانی اور ان میں غور و خوض کرنے سے سمجھی ہے۔واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

رجوع بمطلب: اس نزاع نے ایک دوسرے کی تکفیر تک نوبت پہنچائی اور ملکی فتنہ کی آگ میں ہیزم کشی کا کام دیا۔جس کی تفصیل مختصراً درج ذیل ہے۔

تتمہ فرقہ مرجیہ: تاریخی سلسلہ کے ضمن میں فرقہ مرجیہ کی ابتدا اور اس کے بانی اور اس کے مختلف مسائل کی نسبت کہ ارجاء کا اطلاع حسب لغت کس کس مسئلہ پر آسکتا ہے۔مختصراً ذکر ہو چکا ہے اور یہ بھی گذر چکا ہے کہ اس کی بعض صورتیں ائمہ اہل

سنت کے نزدیک قابل اعتراض نہیں ہیں۔ البتہ مرجیہ خالصہ کا یہ قول کہ ایمان کے ہوتے معاصی و بدکرداریاں مضر نہیں ہیں۔ سراسر باطل اور قابل اعتراض ہے۔

اس موقع پر اس شبہ کا حل بھی نہایت ضروری ہے کہ بعض مصنفین نے سیدنا امام ابو حنیفہؒ کو بھی رجال مرجیہ میں شمار کیا ہے۔ حالانکہ آپ اہل سنت کے بزرگ امام ہیں۔ اور آپ کی زندگی اعلیٰ درجے کے تقویٰ اور تورع پر گذری۔ جس سے کسی کو بھی انکار نہیں۔

ارجاء اور امام ابو حنیفہؒ: بے شک بعض مصنفین نے (خدا ان پر رحم کرے) امام ابو حنیفہؒ اور آپ کے شاگردوں امام ابو یوسف' امام محمد' امام زفر اور امام حسن بن زیاد (رحمہم اللہ) کو رجال مرجیہ میں شمار کیا ہے۔ جس کی حقیقت کو نہ سمجھ کر اور حضرت امام صاحب ممدوح کی طرز زندگی پر نظر نہ رکھتے ہوئے بعض لوگوں نے اسے خوب اچھالا ہے۔ لیکن حقیقت رس علماء نے اس کا جواب کئی طریق پر دیا ہے۔

اول: یہ کہ آپ پر یہ بہتان ہے۔ آپ مخصوص فرقہ مرجیہ میں سے نہیں ہو سکتے۔ ورنہ آپ اتنے تقویٰ و طہارت پر زندگی نہ گذارتے۔ حوالہ جات ذیل ملاحظہ ہوں۔

(۱) شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ منہاج السنۃ میں فرماتے ہیں۔

کما ان ابا حنیفة وان کان الناس خالفوه فی اشیاء وانکروها علیه فلا یستریب احد فی فقهه و فهمه وعلمه وقد نقلوا عنه اشیاء یقصدون اشاعة علیه وهی کذب علیه قطعا مثل مسئلة الخنزیر البری ونحوها (منهاج السنة جلد اول ص ۲۵۹ مطبوعه مصر)

"جس طرح کہ اگرچہ بہت لوگوں نے کئی مسائل میں امام ابو حنیفہؒ کی مخالفت کی اور آپ پر ان امروں کا انکار کیا۔ لیکن کوئی شخص بھی ان کی فقاہت اور فہم اور علم میں شک نہیں کر سکتا۔ اور لوگوں نے آپ سے بہت سی ایسی چیزیں نقل کیں۔ جن سے ان کا مقصد آپ پر برائی تھوپنا تھا۔ حالانکہ وہ باتیں آپ

پر قطعی طور پر جھوٹ ہیں۔ مثلاً خنزیر بری اور مثل اس کی دیگر مسائل۔"

(ب) اسی طرح دوسرے موقع پر امام مالکؒ' امام شافعیؒ' امام احمدؒ' امام بخاریؒ' امام ابو داؤدؒ' امام دارمیؒ وغیرہ ائمہ اہل سنت کے ساتھ امام ابو حنیفہؒ اور آپ کے شاگردوں امام ابو یوسفؒ' امام محمدؒ' امام زفرؒ اور امام حسن بن زیادؒ لولوئی کا ذکر بھی ان کے ساتھ ہی کر کے سب کے علم و فضل اور اجتہاد کی تعریف کرتے ہیں۔ حالانکہ بعض مصنفین نے ان کو بھی رجال مرجیہ میں شمار کیا ہے (منہاج السنتہ جلد اول ص ۲۳۱' ۲۳۲)

(ج) نیز فرماتے ہیں۔

امام مالکؒ' امام احمدؒ' اور امام ابو حنیفہؒ وغیرہم ائمہ سلف میں سے ہیں (منہاج السنتہ جلد دوم ص ۲۳۳ نیز جلد اول ص ۲۴۰' ۲۴۱)

کہاں تک گنتے جائیں۔ منہاج السنتہ ایسے حوالہ جات سے بھری پڑی ہے۔ اور امام ابن تیمیہؒ' امام ابو حنیفہؒ کے حق میں دیگر ائمہ سنت کی طرح نہایت ہی حسن ظن رکھتے ہیں۔

(۲) اسی طرح علامہ شہرستانی فرماتے ہیں۔

"اور تعجب ہے کہ غسان (مرجیوں میں سے فرقہ غسانیہ کا پیشوا) امام ابو حنیفہؒ سے بھی مثل اپنے مذہب کے نقل کیا کرتا تھا۔ اور آپ کو مرجیوں میں شمار کرتا تھا۔ اور غالباً یہ جھوٹ ہے۔ مجھے اپنی زندگی کی قسم ہے کہ امام ابو حنیفہؒ اور آپ کے اصحاب کو مرجیتہ السنتہ کہا جاتا تھا۔ اور بہت سے اصحاب مقالات نے آپ کو مجملہ مرجیہ کے شمار کیا ہے۔" (الملل والنحل للشہرستانی جلد اول ص ۱۸۹)

تنبیہ:

گو اس حوالہ میں مرجیہ کہا جانا مذکور ہے لیکن "مرجیہ السنتہ" کہنے میں مدافعت بھی ہے۔ کیونکہ مرجیہ خالصہ اور مرجیتہ السنتہ میں فرق ہے کہ مرجیہ خالصہ تو وہ ہیں جو بحیثیت فرقہ کے جمیع خصوصیات مرجیہ کے قائل ہیں۔ جن کو علامہ شہرستانی (جلد

اول ص ۱۸۶ میں) مرجیہ خالصہ کہتے ہیں اور امام ابن تیمیہؒ منہاج السنۃ جلد ۳ ص ۷۲ میں اور حضرت نواب صاحبؒ بحوالہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ دلیل الطالب میں ان کا مذہب یہ بیان کرتے ہیں کہ ایمان کے ہوتے معصیت ضرر نہیں دیتی- اور یہ مذہب خلاف صحابہ اور ائمہ سنت ہے- اور مرجیۃ السنۃ سے ایسے لوگ مراد ہیں جو ہوں تو اہل سنت لیکن عسب لغت ان مسائل کی وجہ سے جو اہل سنت کے نزدیک قابل اعتراض نہیں ہیں- ان پر ارجاء کا لفظ بولا گیا ہو جیسا کہ سابقا حضرت حسن بن محمد بن حنفیہؒ کے ذکر میں حافظ ابن حجرؒ کے کلام سے گذر چکا-

(۳) اسی طرح حافظ ذہبیؒ آپ کی جلالت شان کے بدل قائل ہیں چنانچہ آپ اپنی مایہ ناز کتاب میزان الاعتدال کے شروع میں فرماتے ہیں-

> "اور اسی طرح میں اس کتاب میں ان ائمہ کا ذکر نہیں کروں گا- جن کی احکام شریعت (فروع) میں پیروی کی جاتی ہے کیونکہ ان کی شان اسلام میں بہت بڑی ہے اور مسلمانوں کے دلوں میں ان کی عظمت بہت ہے- مثلاً امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ اور امام بخاریؒ-" (میزان جلد اول ص ۳ مطبوعہ لکھنؤ)

اسی طرح حافظ ذہبی اپنی دوسری کتاب "تذکرۃ الحفاظ" میں آپ کے ترجمہ کے عنوان کو معزز لقب امام اعظم سے مزین کر کے آپ کا جامع اوصاف حسنہ ہونا ان الفاظ میں ارقام فرماتے ہیں-

> **كان اماما ورعا عالما عاملا متعبدا كبير الشان لايقبل جوائز السلطان بل يتجر ويكتب** (تذكرة جلد ١ ص ١٥١)

> "آپ (دین کے) پیشوا صاحب ورع' نہایت پرہیز گار عالم باعمل تھے (ریاضت کش) عبادت گذار تھے- بڑی شان والے تھے- بادشاہوں کے انعامات قبول نہیں کرتے تھے بلکہ تجارت کر کے اور اپنی روزی کما کر کھاتے تھے-"

سبحان اللہ' کیسے مختصر الفاظ میں کس خوبی سے ساری حیات طیبہ کا نقشہ سامنے

رکھ دیا ہے اور آپ کی زندگی کے ہر علمی اور عملی شعبہ اور قبولیت عامہ اور غنائے قلبی اور احکام و سلاطین سے بے تعلقی وغیرہ فضائل میں سے کسی بھی ضروری امر کو چھوڑ کر نہیں رکھا۔

اسی طرح اسی کتاب میں امام یحییٰ بن معینؒ سے نقل کر کے فرماتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا۔ "امام ابو حنیفہؒ میں کوئی عیب نہیں اور آپ کسی برائی سے متہم نہ تھے[1]۔" ص ۵۱

تنبیہ :

شاید آپ کے دل میں ان حوالہ جات کے بعد بھی یہ وسوسہ گذرے کہ ہو سکتا ہے کہ امام ذہبیؒ کو امام صاحب کے مرجیہ ہونے کا علم نہ ہو۔ سو اس کا مختصر اور مسکت جواب یہ ہے کہ حافظ ذہبیؒ میزان الاعتدال میں امام مسعر کے ترجمہ کے ضمن میں امام ابو حنیفہؒ اور آپ کے بزرگ استاد حماد بن ابی سلیمانؒ کا بالخصوص ذکر کر کے سب مذکورین سے الزام ارجائی کو اس طرح دفع کرتے ہیں۔

> "مسعر بن کدام حجت ہیں۔ امام ہیں۔ اور سلیمانی کا یہ قول کہ مسعر اور حماد بن سلیمان اور نعمان یعنی امام ابو حنیفہؒ اور عمرو بن مرہ اور عبد العزیز ابن رواد اور ابو معاویہ عمر بن ذر اور اس قسم کے دیگر بہت سے بزرگ جن کا ذکر اس نے کیا ہے۔ مرجیہ میں سے ہیں قابل اعتبار نہیں ہے۔" (میزان جلد دوم ص ۷۴ مطبوعہ لکھنؤ)

اس کے بعد حافظ ذہبیؒ فرماتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ ارجاء[2] بہت سے بڑے بڑے علماء کا مذہب ہے پس مناسب

---

[1] امام یحییٰ بن معین جرح میں متشددین سے تھے۔ باوجود اس کے وہ امام ابو حنیفہؒ پر کوئی جرح نہیں کرتے۔

[2] یعنی ارجاء کی وہ صورت جو اہل سنت کے نزدیک قابل اعتراض نہیں ہے۔ جو عنقریب انشاء اللہ شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت سے نقل کی جائے گی۔ اور کچھ علامہ شہرستانی رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ حرانی رحمۃ اللہ علیہ اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کے کلام سے ذکر ہو چکی۔

نہیں کہ اس کے قائل پر حملہ کیا جائے (ص ۴۷۰) اس فہرست میں دیگر بزرگوں کے ساتھ ابو حنیفہؒ اور آپ کے استاد حمادؒ کا بھی ذکر ہے۔ جن کے مناسب حال یہ شعر ہے ؎

نہ تنہا من دریں مے خانہ مستم   جنید و شبلی و عطار شد مست

امام سعید بن جبیر تابعی: اسی طرح علامہ شہرستانیؒ حضرت سعید بن جبیرؒ کو بھی رجال مرجیہ میں شمار کرتے ہیں۔ لیکن حجاج بن یوسف مشہور ظالم نے جو ان کو قتل کیا تو حافظ ذہبیؒ اس واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں قتله الحجاج قاتله الله حضرت سعید بن جبیر تابعی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے شاگرد ہیں جب کوفہ کے لوگ حج کو آتے اور حضرت ابن عباسؓ سے کوئی مسئلہ دریافت کرتے تو آپ جواب میں فرماتے "کیا تم میں سعید بن جبیر نہیں ہے"؟ اگر حضرت سعید بن جبیرؒ واجب التعظیم بزرگ نہ ہوتے تو حافظ ذہبیؒ جیسا ناقد الرجال امام ان کے قتل پر حجاج کے حق میں یہ بددعا نہ کرتا[1]

حاصل کلام یہ کہ لوگوں کے لکھنے سے آپ کس کس کو ائمہ اہل سنت کی فہرست سے خارج کریں گے؟

خاتمۃ الحفاظ حافظ ابن حجرؒ اور امام ابو حنیفہؒ: حافظ ذہبیؒ کے بعد خاتمۃ الحفاظ حافظ ابن حجرؒ کو بھی دیکھئے۔ علوم حدیثیہ و تاریخیہ میں ان کے تبحر و فضل و کمال اور احوال رجال سے پوری آگاہی کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ آپ تہذیب التہذیب میں جو اصل میں امام ذہبیؒ کی کتاب تہذیب کی تہذیب ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کے ترجمہ میں آپ کی دینداری اور نیک اعتقادی اور صلاحیت عمل میں کوئی بھی خرابی اور کسر بیان نہیں کرتے۔ بلکہ بزرگان دین سے ان کی از حد تعریف نقل کرتے ہیں اور فرماتے ہیں الناس فی ابی حنیفة حاسد وجاہل یعنی حضرت امام ابو حنیفہؒ کے متعلق (بری رائے رکھنے والے) لوگ کچھ تو حاسد ہیں اور کچھ جاہل ہیں سبحان اللہ کیسے اختصار سے دو حرفوں

---

[1] حضرت سعید بن جبیرؒ کے یہ حالات تذکرۃ الحفاظ جلد اول ص ٦٦ میں ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ تقریب میں فرماتے ہیں کہ حضرت سعید بن جبیرؒ ۹۵ھ میں فوت ہوئے۔

میں معاملہ صاف کر دیا۔

نیز حافظ صاحب ممدوح لکھتے ہیں کہ قاضی احمد بن عبدہ قاضیؒ نے اپنے باپ سے نقل کیا کہ ہم ابن عائشہ کے پاس بیٹھے تھے کہ اس نے امام ابو حنیفہؒ کی ایک حدیث بیان کر کے کہا کہ تم لوگ اگر آپ کو دیکھ پاتے تو ضرور آپ کو چاہنے لگتے۔ پس تمہاری اور ان کی مثال ویسی ہے جیسے یہ شعر کہا گیا ہے ؎

اقلوا علیھم ویلکم لا ابالکم
من اللوم او سدوا المکان الذی سدوا

یعنی "لوگو تمہارا برا ہو۔ تمہارے باپ مر جائیں۔ ان پر ملامت (کی زبان) کو تاہ کرو۔ ورنہ اس مکان کو پر کرو جس کو انہوں نے پر کیا تھا۔" یعنی ویسے بن کر دکھاؤ۔ سبحان اللہ کیسے عجیب پیرائے میں اعلیٰ درجہ کی تعریف کی ہے۔

حوالہ تاریخ صغیر اور سیدنا امام ابو حنیفہؒ :

امام بخاری (علیہ رحمۃ اللہ الباری) کے بعض حوالے لوگوں کے لئے سخت ٹھوکر کا باعث ہوئے ہیں۔ پس لازم ہے کہ ہم ان میں سے سب سے سخت حوالے کا ذکر کر کے اس کا جواب دیں۔ اور باقی حوالوں کو اسی کے قیاس پر چھوڑ دیں۔ وباللہ التوفیق۔

مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری مرحوم اکثر دفعہ فرمایا کرتے تھے۔ عرب کا منہ زور شاعر متنبّی کہتا ہے ؎

اذا اتتك مذمتی من ناقص فھی الشھادۃ لی بانی کامل

"یعنی جب تیرے پاس میری مذمت کسی ناقص آدمی کے ذریعے پہنچے تو تو سمجھ لے کہ وہ اس بات کی شہادت ہے کہ میں کامل ہوں۔"

محدثین کے نزدیک روایت کے متعلق سب سے پہلے راویوں کی دیکھ بھال ہوتی ہے کہ وہ کیسے ہیں اور یہ بھی یاد رہے کہ امام بخاریؒ نے اپنی صحیح کی طرح اپنی دیگر کتب میں صحت کا التزام نہیں کیا۔ پس دیکھنا چاہئے کہ یہ روایت امام بخاریؒ تک کیسے واسطے سے پہنچی ہے سو معلوم ہوا کہ امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ تاریخ صغیر میں فرماتے ہیں۔

بیان کیا ہم سے نعیم بن حماد نے اس نے کہا ہم سے بیان کیا فرازی نے اس نے کہا میں (امام) سفیانؒ کے پاس (بیٹھا) تھا کہ ان کے پاس (امام) نعمان (ابو حنیفہؒ) کی موت کی خبر آئی تو انہوں نے کہا الحمد للہ۔ وہ اسلام کو گھنڈی گھنڈی کر کے توڑتا تھا۔ اسلام میں اس سے بڑا بد بخت کوئی پیدا نہیں ہوا" (معاذ اللہ) (تاریخ صغیر ص ۱۷۴ مطبوعہ الہ آباد)

الجواب : نعیم کے متعلق نقاد ائمہ حدیث میں سخت اختلاف ہے۔ بعض کی رائیں اچھی ہیں اور بعض کی بہت سخت ہیں حافظ ذہبیؒ میزان میں فرماتے ہیں۔

(۱) احد الائمة الاعلام علی لین فی حدیثه۔ "یعنی ائمہ اعلام میں سے ایک ہے۔ باوجود اس کی روایت حدیث میں نرم ہے۔"

(۲) خرج له البخاری مقرونا بغیره۔ "امام بخاریؒ نے اس کی حدیث روایت کی ہے لیکن دوسرے (ثقہ راوی) کے ساتھ ملا کر"۔

(۳) قال العباس بن مصعب فی تاریخه نعیم بن حماد وضع کتبا فی الرد علی الحنیفة۔ یعنی عباس بن مصعب نے اپنی تاریخ میں کہا کہ نعیم بن حماد نے حنفیوں کے رد میں کئی کتابیں تصنیف کیں"۔

(۴) امام یحییٰ بن معینؒ کہتے ہیں انا اعرف الناس۔ (میزان) یعنی میں نعیم کے حال سے سب سے زیادہ واقف ہوں اس کے بعد امام ذہبیؒ افتراق امت کی حدیث جو نعیم کی روایت سے ہے ذکر کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ تفترق امتی علی بضع وسبعین فرقة اعظمها فتنة علی امتی قوم یقیسون الامور برایهم فیحلون الحرام ویحرمون الحلال (میزان ج ۲ ص) یعنی آنحضرتؐ نے فرمایا کہ میری امت ستر سے کچھ اوپر فرقوں میں منقسم ہو جائے گی۔ میری امت پر سب سے بڑے فتنہ والا وہ فرقہ ہو گا جو امور (دین) کو اپنی رائے سے قیاس کر کے حرام کو حلال اور حلال کو حرام بنائیں گے (معاذ اللہ)

بیشک نعیم کی یہ حدیث حنفیوں کے رد کے لئے متشددین کے ہاتھ میں سیف

مصقول کا کام دیتی ہے۔ لیکن اس کے آگے ملاحظہ فرمائیں کہ نعیم کی اس روایت کی بابت امام ذہبیؒ انہی امام یحییٰ بن معین کی کیا رائے نقل کرتے ہیں۔

"محمد بن علی بن حمزہ مروزیؒ[1] کہتے ہیں میں نے حضرت یحییٰ بن معین سے اس روایت کی بابت سوال کیا تو آپ نے فرمایا۔ لیس له اصل یعنی اس کا کوئی اصل نہیں ہے۔"[2]

اس روایت کو نعیم کی کتب دربارہ تردید حنفیہ کے ساتھ ملا کر غور کیا جائے تو صاف کھل جاتا ہے کہ نعیم کی مخالفت بنا بر تحقیقات نہیں۔ بلکہ بے اصل روایات کی بنا پر ہے۔

خیر یہ تو مذہب حنفی کے متعلق اس کی روش کا حال ہے۔ اب خود سیدنا حضرت امام ابو حنیفہؒ کی ذات اقدس کی نسبت حافظ ذہبیؒ کا حوالہ ملاحظہ فرمائیں کہ آپ کے ترجمہ میں فرماتے ہیں۔ "(ابو الفتح) ازدی نے کہا نعیم سنت کی تقویت میں حدیث بنالیا کرتا تھا اور جھوٹی حکائتیں بھی (امام ابو حنیفہؒ) نعمان کی عیب گوئی میں جو سب کی سب جھوٹی ہیں۔" (میزان جلد ۲ ص ۵۳۶)

اسی طرح حافظ ابن حجرؒ نے بھی اس قول کو تہذیب التہذیب میں نقل کیا ہے کہ حافظ عبد العظیم منذری نے ترغیب و ترہیب کے خاتمہ پر بعض ان راویوں کی فہرست لکھی ہے جن کے متعلق ائمہ حدیث کی مختلف رائیں ہیں اس فہرست میں اسی نعیم کا بھی ذکر کیا ہے۔ اور امام ازدی کا مذکورہ بالا قول نقل کیا ہے کہ نعیم (مذکور) سنت کی تقویت میں اور امام ابو حنیفہؒ کی بدگوئی میں جھوٹی حدیثیں اور من گھڑت حکائتیں بنالیا کرتا تھا۔ (ترغیب و ترہیب مطبوعہ دہلی بر حاشیہ مشکوٰۃ ص ۵۷۴)۔

اس کے علاوہ ہم ایک نادر حوالہ کا ذکر کرتے ہیں جو اکثر علماء کی نظر سے مخفی ہے۔

---

[1] محمد بن علی بن حمزہ مروزیؒ انہی نعیم بن حماد کے بھی شاگرد ہیں (لسان المیزان) حافظ ابن حجرؒ نے تقریب میں کہا ثقہ حدیث ثقہ ہے صاحب حدیث ہے بارہویں طبقے سے ہیں ۲۸۳ میں فوت ہوئے۔

[2] میزان الاعتدال جلد دوم ص ۵۳۵۔

حوالہ کتاب نہایۃ السئول

احوال کتاب و مصنفؒ:- اس کتاب کا قلمی نسخہ کتب خانہ ریاست رامپور میں موجود ہے یہ نسخہ مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے مصنف نے اس کتاب کی تالیف ربیع الاول یا ربیع الاخر ۸۲۸ھ میں شروع کی اور ۱۶ ربیع الاول ۸۲۹ھ میں اس سے فراغت پائی گئی گویا تالیف و کتابت ہر دو میں ایک سال لگا- کتاب ضخیم ہے فل سکیپ سائز پر باریک خط سے پانچ سو ورق پر ختم ہوئی ہے- یعنی ایک ہزار صفحہ کی ضخامت ہے مصنف کا نام ابراہیم ہے والد کا نام خلیل ہے حلب کے رہنے والے ہیں سبط ابن العجمی کے نام سے مشہور تھے- ۸۴۱ھ میں فوت ہوئے- رحمہ اللہ- کتاب کی عبارت یوں ہے (کان نعیم) ممن یضع الاحادیث فی تقویۃ السنۃ و حکایات مزورۃ فی ثلب نعمان کلھا کذب ۱۲ کتاب کا پورا نام (نہایۃ السئول فی رواۃ الستۃ الاصول) ہے جس میں مصنف علامؒ نے صحاح ستہ کے راویوں کو جمع کر کے ان کے احوال ذکر کئے ہیں- مجھ عاجز کو اس کتاب کا مطالعہ مولانا محمد علی و شوکت علی صاحبان کے چچیرے بھائی حافظ احمد علی صاحب کی معرفت جو اس کتب خانہ کے سرکار رامپور کی طرف سے مہتمم تھے اور نواب حامد علی خاں صاحب بالقابہ مرحوم والی ریاست کے معتمد خاص تھے- نصیب ہوا تھا- مولانا عبدالحئی لکھنوی نے فوائد بہیہ میں ان کے ترجمہ اور تصنیف کا ذکر تفصیل سے لکھا ہے- ان میں نہایۃ السئول کا بھی ذکر کیا ہے-

(۴) امام نسائی کہتے ہیں نعیم ضعیف۔ لیس بثقۃ۔ یعنی نعیم ضعیف ہے- ثقہ نہیں ہے لیس حجۃ (اکیلا روایت کرے تو) حجت نہیں ہے-

(۵) ذکرہ ابن حبان فی الثقات وقال ربما اخطاء ووھم یعنی ابن حبان نے اس کو ثقات میں لکھا ہے اور (باوجود اس کے) کہا وہ خطا بھی کرتا تھا اور وہم بھی-

(۶) اسی طرح امام ابوداؤدؒ کہتے ہیں- نعیم کی بیس احادیث ہیں جن کا کوئی اصل نہیں-

خلاصۃ الکلام یہ کہ نعیم کی شخصیت ایسی نہیں ہے کہ اس کی روایت کی بنا پر حضرت امام ابوحنیفہؒ جیسے بزرگ امام کے حق میں بدگوئی کریں- جن کو حافظ شمس

الدین ذہبیؒ جیسے ناقد الرجال امام اعظم کے معزز لقب سے یاد کرتے ہیں اور آپ کے حق میں لکھتے ہیں۔ احد ائمة الاسلام والسادة الاعلام واحد ارکان العلماء' واحد الائمة الاربعة اصحاب المذاهب المتبوعه (الخ) نیز امام یحییٰ بن معینؒ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ آپ (امام ابو حنیفہؒ) ثقہ تھے۔ اہل الصدق تھے کذب سے متہم نہ تھے۔ نیز عبد اللہ بن داؤد حرینی سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ لوگوں کو مناسب ہے کہ اپنی نماز میں امام ابو حنیفہؒ کے لئے دعا کیا کریں۔ کیونکہ انہوں نے ان پر فقہ اور سنن (نبویہ) کو محفوظ رکھا (البدایہ والنہایۃ جلد دہم ص ۱۰۷)

ایمان میں کمی بیشی اور حضرت امام ابو حنیفہؒ :۔ ایمان میں کمی بیشی کے مسئلہ کا مدار ایمان واعمال صالحہ کی درمیانی نسبت ہے۔ اس کے متعلق علماء اسلام میں اختلاف ہے جس کی تفصیل امام نوویؒ نے شرح صحیح مسلم میں اور حافظ ابن حجرؒ نے شرح صحیح بخاری میں بسط سے لکھ دی ہے۔ امام بخاریؒ اپنی صحیح کی کتاب الایمان کے شروع میں فرماتے ہیں۔

باب قول النبی صلی اللہ علیه وسلم بنی الاسلام علی خمس وهو قول و فعل ویزید وینقص.

نبی ﷺ کے اس فرمان کا بیان کہ اسلام پانچ چیزوں پر بنایا گیا ہے "اور وہ قول اور فعل ہے" اور وہ زیادہ بھی ہوتا ہے اور کم بھی ہوتا ہے۔

حافظ ابن حجرؒ فتح الباری شرح صحیح بخاری میں اس کے ذیل میں فرماتے ہیں۔

فالسلف قالوا هو اعتقاد بالقلب ونطق باللسان وعمل بالارکان.

سلف امت کا قول ہے کہ ایمان اعتقاد قلبی اور شہادت زبانی اور اعضاء سے عمل کرنے کا نام ہے۔

اور اس کے بعد فرماتے ہیں والمرجئة قالوا هو اعتقاد ونطق فقط یعنی مرجئہ کہتے ہیں کہ ایمان صرف اعتقاد اور شہادت کا نام ہے۔

علامہ بدر الدین عینی حنفی نے عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری میں ایمان کی تعریف

کے متعلق اسلامی فرقوں کے اختلافات ذکر کیے ہیں۔ تیسرے فرقے کے اقوال کے ضمن میں نمبر اول پر فرماتے ہیں۔

الاول ان الایمان اقرار باللسان ومعرفة بالقلب وهو قول ابی حنیفةؒ وعامة الفقهاء بعض المتكلمين (جلد ۱ ص ۱۲۱ مصری)

کہ ایمان زبان سے اقرار کرنے اور دل کی معرفت کا نام ہے اور یہ قول ہے امام ابو حنیفہؒ کا اور عام فقہاء کا اور بعض متکلمین کا۔

پس حضرت امام صاحب پر ایک یہ بھی اعتراض ہے کہ ان کا قول مرجیوں کے موافق ہے۔

علامہ محمد بن عبد الکریم شہرستانی" الملل والنحل میں مرجیوں کے فرقوں کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ کو مرجیوں میں کیوں شمار کیا گیا؟

ولعل السبب فيه انه لما كان يقول الايمان هو التصديق بالقلب وهو لا يزيد ولا ينقص ظنوا انه يوخر العمل عن الايمان والرجل مع تحرجه فی العمل كيف يفتی بترك العمل وله سبب اخر وهو كان يخالف القدرية والمعتزلة الذين ظهروا فی الصدر الاول والمعتزلة يلقبون كل من خالفهم فی القدر مرجئا وكذلك وعيدية من الخوارج فلا يبعد ان اللقب انما لزمه من فريقی المعتزلة والخوارج والله اعلم[1]

---

[1] کتاب الملل والنحل للشہرستانی" بہامش کتاب الفصل لابن حزم مطبوعہ مصر (جلد اول ص ۱۸۹) علامہ ابو الفتح محمد بن عبد الکریم شہرستانی علم کلام کے ایک مشہور امام ہیں۔ آپ امام دارمی سے کچھ پیشتر ہوئے ہیں آپ کی وفات ۵۴۸ھ میں ہوئی اور امام رازی کی ۶۰۶ھ میں اور حافظ ابن حزم قرطبی ہسپانی ہیں۔ حافظ حدیث تھے۔ علوم عقلیہ اور نقلیہ میں جامع ہونے کے علاوہ وزیر سلطنت بھی تھے۔ آپ اتباع سنت میں بہت سخت تھے ان کی کتاب الفصل اپنے باب میں بیمثل کتاب ہے اور آپ نہایت ذکی اور قوی الحافظہ تھے آپ ۴۵۶ھ میں فوت ہوئے۔ رحمہم اللہ تعالیٰ

شاید اس کا سبب یہ ہو کہ چونکہ آپ یعنی امام ابو حنیفہؒ کا قول یہ ہے کہ ایمان (اصل میں) تصدیق قلبی کا نام ہے اور وہ نہ زیادہ ہوتا ہے اور نہ کم ہوتا ہے تو اس سے لوگوں نے سمجھ لیا کہ آپ عمل کو ایمان سے موخر کرتے ہیں اور وہ مرد (خدا) یعنی امام ابو حنیفہؒ عمل میں اس قدر پرہیزگار ہوتے ہوئے ترک عمل کا فتویٰ کس طرح دے سکتے ہیں اور اس کا سبب ایک اور بھی ہے کہ آپ قدریوں اور معتزلوں کے مخالف تھے جو صدر اول میں ظاہر ہوئے۔ اور معتزلہ لوگ ہر اس شخص کو جو تقدیر کے متعلق ان کا مخالف ہو مرجی کہتے تھے۔ اسی طرح خوارج میں سے وعیدیہ لوگ بھی۔ پس بعید نہیں کہ آپ کو یہ لقب ہر دو فریق معتزلہ و خوارج سے الزاماً ملا ہو واللہ اعلم۔

محاکمہ : جس امر میں بزرگان دین میں اختلاف ہو۔ اس میں ہم جیسے ناقصوں کا محاکمہ کرنا بری بات ہے لیکن چونکہ بزرگوں سے حسن تادب کی وجہ سے ہمارا فرض ہے کہ ان کے کلام کے صحیح محمل بیان کر کے ان سے الزام و اعتراض کو دور کریں۔ اور محض اپنی شخصی رائے سے نہیں۔ بلکہ بزرگوں ہی کے اقوال سے جو قرآن و حدیث سے مستنبط ہیں۔ جس کی تفصیل مختصراً یہ ہے کہ اعمال کے جزو ایمان ہونے یا نہ ہونے یعنی داخل ماہیت ایمان ہونے یا نہ ہونے کی بنا پر ایمان و اسلام کی درمیانی نسبت کے سمجھنے پر ہے کہ ہر دو ایک ہیں یا ان میں کچھ اختلاف ہے۔ اور اس امر میں ائمہ دین میں جو اختلاف ہے وہ معلوم علماء ہے۔ جسے امام نووی نے شرح صحیح مسلم میں اور حافظ ابن حجرؒ نے اور علامہ عینی حنفیؒ نے بھی شرح صحیح بخاری میں نہایت بسط سے بیان کر دیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے صاف معلوم ہو سکتا ہے کہ ہر فریق کے پاس قرآن و حدیث سے دلائل ہیں۔ پس کسی فریق کو بھی ملامت نہیں کر سکتے[1]

---

[1] خاکسار نابکار کہتا ہے کہ ایمان حسب لغت تو تصدیق کو کہتے ہیں جو دل کا کام ہے اور زبان سے اس کی شہادت ہوتی ہے اور اعمال اس کی علامات و ثمرات ہیں۔ اور خدا نے ان ہر سہ پر نجات کلی کا وعدہ کیا ہے۔ پس ایمان کی شرعی ماہیت میں یہ تینوں امر داخل ہیں۔ اور اس صورت میں سب دلائل جمع ہو جاتے ہیں۔ اور امام نوویؒ نے ایک گروہ علماء سے ایسا ہی نقل کیا ہے واللہ اعلم

حوالہ فقہ اکبر: اس کے بعد ہم خود امام صاحب ممدوح کے کلام فیض التیام سے ثابت کرتے ہیں کہ آپ ارجاء اور مرجیہ سے اعتزال اور اہل اعتزال سے بالکل بیزار اور بری ہیں۔ چنانچہ آپ فقہ اکبر میں فرماتے ہیں[1]

ولا نقول ان المومن لا تضره الذنوب ولا نقول انه لا يدخل النار ولا نقول انه يخلد فيها وان كان فاسقا بعد ان يخرج من الدنيا مومنا ولا نقول ان حسناتنا مقبولة وسياتنا مغفورة كقول المرجئة ولكن نقول من عمل حسنة بجميع شرائطها خالية عن العيوب المفسدة ولم يبطلها بالكفر والردة والاخلاق السئية حتى خرج من الدنيا مومنا فان الله تعالى لا يضيعها بل يقبلها منه ويثيبه عليها وما كان من السئيات دون الشرك والكفر ولم يتب عنها صاحبها حتى مات مومنا فانه في مشية الله تعالى ان شاء عذبه بالنار وان شاء عفا عنه ولم يعذبه بالنار اصلا (فقه اكبر حامل شرح ابو المنتهى مطبوعه حيدر آباد دكن ص۲۸/ ۳۰)

"اور ہم نہ نہیں کہتے کہ مومن کو گناہ مضر نہیں ہے اور نہ ہم یہ کہتے ہیں کہ (بالکل) دوزخ میں نہیں جائے گا۔ اور نہ ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا۔ اگرچہ وہ (عمل میں) فاسق ہو۔ بشرطیکہ وہ دنیا سے ایمان کے ساتھ گیا ہو اور نہ ہم یہ کہتے ہیں کہ ہماری نیکیاں (ضرور) مقبول ہیں۔ اور ہماری برائیاں (ضرور) مغفور ہیں جس طرح کہ مرجیئہ کہتے ہیں۔ لیکن یہ کہتے ہیں کہ جو شخص کوئی نیکی تمام شرائط سے ادا کرے درحالیکہ وہ نیکی عیوب مفسدہ سے خالی ہو اور اس نے اس کو کفر اور ارتداد اور بری عادتوں سے باطل نہ کر دیا ہو حتی کہ وہ دنیا سے ایمان کے ساتھ رخصت ہوا ہو تو اللہ تعالیٰ

[1] امام ابن تیمیہؒ منہاج السنۃ میں فقہ اکبر کو حضرت امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب قرار دیتے ہیں۔ پس مولانا شبلی مرحوم کے انکار کی بنا پر اسے معرض بحث میں لانے کی ضرورت نہیں۔

اس نیکی کو ضائع نہیں کرے گا بلکہ قبول کرے گا اس کو اس شخص سے اور اس کو اس پر ثواب دے گا اور جو برائیاں شرک اور کفر کے سوا ہوں اور ان کے کرنے والے نے ان سے توبہ نہ کی ہو۔ حتیٰ کہ وہ ایمان کی حالت میں مر جائے۔ تو اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر ہے چاہے اسے دوزخ سے عذاب کرے (اور پھر نکال لے) اور چاہے اسے معاف کر دے۔ اور بالکل دوزخ کا عذاب نہ دے۔"

تبصرہ :۔ اس عبارت میں حضرت امام صاحب موصوف نے معتزلوں اور خوارج کے مسائل سے بھی اختلاف کیا ہے اور مرجیوں کا نام لے کر ان سے بیزاری ظاہر کی ہے اور واضح ہے کہ جو شخص کسی فرقہ میں داخل ہو وہ اس فرقہ کا نام لے کر اس کی تردید نہیں کرتا۔ اس عبارت میں آپ نے خالص اہل سنت کے مسائل لکھے ہیں۔ جو قرآن و حدیث سے ثابت ہیں۔ اور صحابہؓ اور خیار تابعین ان پر کاربند تھے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ لکھتے وقت جزا سزا کے متعلق آیات و احادیث کا نقشہ آپ کے سامنے رکھا تھا۔ سب امور کو ملحوظ رکھ کر نہایت احتیاط و اعتدال کی باتیں لکھی ہیں اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ اعمال پر جزا سزا کے ترتب کے قائل تھے اور نجات کلی (حسب وعدہ الٰہیہ) کے لئے اعمال صالحہ کا اعتبار کر کے اعمال سیئہ کو موجب عذاب جانتے ہیں۔ لیکن ان کی معافی اور ان پر عذاب کا فیصلہ سپرد باری تعالیٰ کرتے ہیں۔ سوائے کفر و شرک کے کہ ان کی معافی شرعاً سوائے اس دنیوی زندگی میں توبہ کرنے کے نہیں ہو سکتی اور یہ سب باتیں آیت ان اللہ لا یغفر ان یشرك به ویغفر مادون ذلك لمن یشاء اور اس قسم کی دیگر آیات و احادیث سے ثابت ہیں۔ عبارت مذکورہ بالا سے تھوڑا آگے آپ ایمان کی بحث میں فرماتے ہیں۔

ایمان کی بحث :

والایمان هو الاقرار والتصدیق وایمان اهل السماء والارض لا یزید ولا ینقص من جهة المومن به ویزید وینقص من جهة الیقین

والتصديق والمومنون مستوون في الايمان والتوحيد متفاضلون في الاعمال والاسلام هو التسليم والانقياد لاوامر الله تعالى. فمن طريق اللغة فرق بين الايمان والاسلام لكن لا يكون ايمان بلا اسلام ولا يوجد اسلام بلا ايمان وهما كالظهر مع البطن والدين اسم واقع الى الايمان والاسلام والشرائع كلها (ص ۳۳ سے ۳۶ تک نسخہ مذکورہ بالا)

"اور ایمان وہ اقرار (زبانی) اور تصدیق (قلبی کا نام) ہے اور آسمان اور زمین والوں کا ایمان بلحاظ امور ایمانیہ کے کم و بیش نہیں ہوتا۔ اور یقین اور تصدیق کی رو سے زیادہ اور کم ہو جاتا ہے۔ اور (سب) مومن ایمان اور توحید میں برابر ہیں۔ اور اعمال میں ایک دوسرے پر فضیلت رکھتے ہیں اور اسلام اللہ تعالیٰ کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کرنے اور ان کا پابند رہنے کا نام ہے۔ پس لغت کی رو سے تو ایمان اور اسلام میں فرق ہے لیکن شرعاً ایمان کے بغیر اسلام نہیں ہوتا اور اسلام کا وجود بغیر ایمان کے نہیں اور وہ دونوں مثل پشت اور پیٹ کے ہیں اور دین ایک ایسا اسم ہے جس کا اطلاق ایمان اور اسلام اور احکام شرعیہ سب پر ہے۔"

تبصرہ: اس حوالہ سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت امام والا مقام ایمان میں کمی بیشی کے قائل تو ہیں۔ لیکن نفس ایمان اور ایمانیات اور اعمال میں بنابر حقیقت و ماہیت فرق کر کے ایک جہت میں قائل ہیں اور دوسری میں نہیں اور یہ ایک اجتہادی باریک بنی ہے۔ جس سے تفصیلات و اعتبارات میں اختلاف ہے۔ نفس مسئلہ میں نہیں۔ اسی لئے تو وہ ایمان اور اسلام میں حسب لغت تو فرق کرتے ہیں۔ لیکن حسب شرع کہتے ہیں کہ ایمان اسلام کے بغیر نہیں۔ اور یہ بات حدیث جبرائیل علیہ السلام سے صاف ظاہر ہے جس میں رسول کریم ﷺ کا ایمان کے ضمن میں عقائد کو اور اسلام کی تشریح اور فرائض و شرائع کو اور ان سب عقائد و شرائع کو لفظ دین سے تعبیر کرنا مذکور ہے۔ (صحیح بخاری کتاب الایمان)۔

لطف یہ ہے کہ حضرت امام ہمامؒ ایمان و اسلام کے تعلق و تلازم اور دونوں میں امتیاز حسب حقیقت کو پشت اور شکم کی مثال سے ظاہر کرتے ہیں جو نہایت ہی لطیف و موزوں ہے وللہ درہ۔

جملہ شرعیات ایمان شرعی میں داخل ہیں: اگرچہ یہ امر حوالہ مذکورہ سے بھی ظاہر ہے۔لیکن ہم اس کی بابت ایک خاص حوالہ ذکر کرتے ہیں۔ جو اکثر علماء کی نظر میں نہ ہوگا۔

وقد حکی الطحاویؒ حکایة عن ابی حنیفة مع حماد بن زید ان حماد بن زید لماروی له حدیث ای الاسلام افضل الخ قال له الاتراه یقول ای الاسلام افضل قال الایمان ثم جعل الهجرة والجهاد من الایمان فسکت ابو حنیفة فقال بعض اصحابه الاتجیبه یا ابا حنیفةؒ قال بما اجیبه وهو یحدثنی بهذا عن رسول الله صلی الله علیه وسلم (ص ۲۸۱)[1]

امام طحاوی حنفیؒ امام ابو حنیفہؒ کا ایک واقعہ جو امام حماد بن زیدؒ محدث کے ساتھ ہوا حکایت کرتے ہیں کہ جب حضرت حماد نے امام صاحب کے پاس حدیث ای السلام روایت کی اور کہا کہ آپ دیکھتے نہیں کہ سائل نے آنحضرت سے سوال کیا ای السلام افضل تو آنحضرت نے فرمایا الایمان پھر ہجرت اور جہاد کو بھی امور ایمان میں شمار کیا تو امام ابو حنیفہؒ خاموش ہو گئے آپ کے ایک شاگرد نے کہا آپ اس کو جواب کیوں نہیں دیتے تو آپ نے فرمایا وہ مجھ کو اس بارے میں رسول اللہ کی حدیث سناتا ہے میں اس کو کیا جواب دوں۔

امام طحاویؒ کے اس حوالہ سے صاف معلوم ہو گیا کہ حضرت امام ابو حنیفہؒ حدیث

---

[1] کتاب شرح الطحاویہ فی العقیدۃ السلفیہ مطبوعہ مکہ مکرمہ ۱۲ یہ کتاب ۱۳۴۹ھ میں بامر سلطان ابن سعود ایدہ اللہ مکہ معظمہ میں طبع ہوئی ہے۔ یہ حوالہ اس عاجز کو حاجی عبدالغفار صاحب تاجر کوٹھی حاجی علی جان مرحوم کے افادات سے ملا۔ جبکہ میں سفر بمبئی سے دہلی واپس آیا۔ آہ آج حاجی عبد الغفار صاحب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ عاملہ اللہ برحمتہ الواسعتہ۔ میں عاجزان کے لئے ہر شب ان کا نام لے کر مع بعض دیگر احباب کے مغفرت کی دعا کرتا ہوں بفضل اللہ تعالیٰ میر سیالکوٹی۔

رسول اللہ ﷺ کی کتنی تعظیم کرتے تھے۔اس کے سامنے کس طرح گردن جھکا دیتے تھے۔اور یہ بھی کہ آپ نے ازروئے شرع اعمال کو داخل ایمان تسلیم کر لیا یا آپ آگے ہی تسلیم کرتے تھے بذا و اللہ الحمد۔

حوالہ غنیۃ الطالبین اور اس کا جواب :

بعض لوگوں کو حضرت سید عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ کے حوالے سے بھی ٹھوکر لگی ہے کہ آپ نے حضرت امام صاحب رحمتہ اللہ علیہ کو مرجیوں میں شمار کیا۔سو اس کا جواب ہم اپنے الفاظ میں نہیں بلکہ اپنے شیخ الشیخ حضرت سید نواب صاحب مرحوم کے حوالے سے دیتے ہیں جو انہوں نے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی کتاب سے نقل کیا ہے۔

آپ دلیل الطالب میں بطور سوال و جواب فرماتے ہیں۔

سوال : در غنیۃ الطالبین مرجیہ را در اصحاب ابی حنیفہ نعمانؒ ذکر کردہ اند و کذا غیرہ فی غیرہ وجہ آن چیست ؟

جواب : شاہ ولی اللہ محدث دہلوی در تفہیمات الہیہ نوشتہ ارجاء دوگونہ است یکے ارجاء است کہ قائل را از سنت بیرون می کند۔ دیگر انست کہ از سنت بیرون نمی کند۔ اول ان ست کہ معتقدان باشد کہ ہرکہ اقرار بلسان و تصدیق بجنان کرد۔ ہیچ معصیت او راضر نیست اصلا ودیگر انکہ اعتقاد کندکہ عمل از ایمان نیست ولیکن ثواب و عقاب بران سترتب ست و سبب فرق میان ہر دو انست کہ صحابہ و تابعین اجماع کردہ اندبر عطیہ مرجیہ و گفتہ اند کہ برعمل ثواب و عقاب مترتب می شود۔ پس مخالف ایشاں ضال وبتدع است و در

شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے تفہیمات الہیہ میں لکھا ہے کہ ارجاء دو قسم پر ہے۔ ایک ارجاء ایسا ہے کہ قائل کو سنت سے نکال دیتا ہے دوسرا وہ ہے جو سنت

سے نکالتا نہیں۔ اول یہ ہے کہ کوئی اس بات کا معتقد ہو کہ جس شخص نے زبان سے اقرار کر لیا اور دل سے تصدیق کر لی اس کو کوئی معصیت بالکل ضرر نہیں دے گی۔ اور دوم یہ کہ اعتقاد کرے کہ عمل ایمان کی جز نہیں ہے لیکن ثواب و عقاب ان پر مترتب ہوتے ہیں اور دونوں (قسموں) میں فرق کرنے کی وجہ یہ ہے کہ صحابہ اور تابعین کا اجماع ہے مرجیہ کے خطا ہونے پر اور ان (صحابہ اور تابعین) کا قول ہے کہ عمل پر ثواب اور عقاب مترتب ہوتا ہے۔

مسئلہ ثانیہ: اجماع سلف ظاہر نشده بلکه دلائل متعارض است بعض آیات و احادیث واثر دلالت می کنند برآں که ایمان غیر عمل ست و بسیارے از دلیل دال ست براں که اطلاق ایمان برمجموع قول و فعل ست واین نزاع راجع می شود بسوئے لفظ ۔ بجهت اتفاق همه براں که عاصی از ایمان خارج نمی شود اگرچه مستحق عذاب ست و صرف دلائل داله براں که ایمان عبارت از مجموع ایں چیز ہا است از ظواہرش بادنئے عنایت ممکن ست انتہی

پس ان (صحابہ اور تابعین) کا مخالف گمراہ اور بدعتی ہے اور دوسرے مسئلہ میں سلف کا اجماع ثابت نہیں ہوا۔ بلکہ دلائل متعارض ہیں۔ بعض آیات و احادیث اور آثار (صحابہ) اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ ایمان غیر عمل ہے اور اکثر دلائل اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ ایمان کا اطلاق قول اور عمل پر ہے اور یہ نزاع (محض) لفظ کی طرف رجوع کرتی ہے یعنی لفظی ہے بوجہ اس کے کہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ عاصی ایمان سے خارج نہیں ہوتا۔ اگرچہ مستحق عذاب ہے۔ اور ان دلائل کو پھیرنا جو اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ ایمان ان سب چیزوں (عقائد و اعمال) کا نام ہے ادنیٰ توجہ سے ممکن ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے اس حوالہ کے بعد حضرت نواب صاحب مرحوم و مغفور

اپنی طرف سے اس پر تبصرہ کر کے کہتے ہیں۔

وازانیجا معلوم شد کہ مراد حضرت شیخ جیلانیؒ از مرجیہ بودن اصحاب ابی حنیفہ ثانی شق ست ولا غبار علیہ اگرچہ ارجح از روئے نظر در دلائل ہماں مذہب اہل حدیث ست کہ ایمان عبارت ست از مجموع اقرار و تصدیق و عمل وبہ قال القاضی ثناء اللہ فی مالا بدمنہ فاندفع الاشکال وصفی مطلع الھلال وباللہ التوفیق۔ ص ۱۶۵'۱۶۶

حضرت شیخ جیلانیؒ کی مراد شق ثانی ہے۔ اور اس پر کوئی غبار نہیں۔ اگرچہ دلائل پر نظر رکھنے سے اہل حدیث کا مذہب ہی راجح ہے کہ ایمان مجموع اقرار اور تصدیق اور عمل کا نام ہے۔ اور قاضی ثناء اللہ صاحب حنفیؒ نے بھی مالا بد منہ میں یہی کہا ہے۔ پس مشکل دور ہو گئی اور ہلال کا مطلع صاف ہو گیا اور توفیق خدا سے ہے۔

فیض ربانی: ہر چند کہ میں سخت گنہگار ہوں۔ لیکن یہ ایمان رکھتا ہوں اور اپنے صالح اساتذہ جناب مولانا ابو عبداللہ عبیداللہ غلام حسن صاحب مرحوم سیالکوٹی اور جناب مولانا حافظ عبدالمنان صاحب مرحوم محدث وزیر آبادی کی صحبت و تلقین سے یہ بات یقین کے رتبے تک پہنچ چکی ہے کہ بزرگان دین خصوصاً حضرات ائمہ متبوعین سے حسن عقیدت نزول برکات کا ذریعہ ہے۔ اس لئے بعض اوقات خدا تعالیٰ اپنے فضل عمیم سے کوئی فیض اس ذرہ بے مقدار پر نازل کر دیتا ہے۔ اس مقام پر اس کی صورت یوں ہے کہ جب میں نے اس مسئلہ کے لئے کتب متعلقہ المداری سے نکالیں۔ اور حضرت امام صاحبؒ کے متعلق تحقیقات شروع کی تو مختلف کتب کی ورق گردانی سے میرے دل پر غبار آ گیا۔ جس کا اثر بیرونی طور پر یہ ہوا کہ دن دوپہر کے وقت جب سورج پوری طرح روشن تھا۔ یکایک میرے سامنے گھپ اندھیرا چھا گیا گویا ظلمت بعضھا فوق بعض کا نظارہ ہو گیا معاً خدا تعالیٰ نے میرے دل میں ڈالا کہ یہ حضرت امام صاحبؒ سے بدظنی کا

نتیجہ ہے اس سے استغفار کرو- میں نے کلمات استغفار دہرانے شروع کئے- وہ اندھیرے فوراً کافور ہو گئے اور ان کی بجائے ایسا نور چمکا کہ اس نے دوپہر کی روشنی کو مات کر دیا- اس وقت سے میری حضرت امام صاحبؒ سے حسن عقیدت اور زیادہ بڑھ گئی- اور میں ان شخصوں سے جن کو حضرت امام صاحب سے حسن عقیدت نہیں ہے کہا کرتا ہوں کہ میری اور تمہاری مثال اس آیت کی مثال ہے کہ حق تعالیٰ منکرین معارج قدسیہ آنحضرت ﷺ سے خطاب کر کے فرماتا ہے افتمارونہ علی مایری۔ میں نے جو کچھ عالم بیداری اور ہشیاری میں دیکھ لیا اس میں مجھ سے جھگڑا کرنا بے سود ہے- ہذا واللہ ولی الہدایۃ-

خاتمۃ الکلام: اب میں اس مضمون کو ان کلمات پر ختم کرتا ہوں اور اپنے ناظرین سے امید رکھتا ہوں کہ وہ بزرگان دین سے خصوصاً ائمہ متبوعینؒ سے حسن ظن رکھیں- اور گستاخی اور شوخی اور بے ادبی سے پرہیز کریں- کیونکہ اس کا نتیجہ ہر دو جہاں میں موجب خسران و نقصان ہے- نسئل اللہ الکریم حسن الظن والتادب مع الصالحین ونعوذ باللہ العظیم من سوء الظن بھم والوقیعۃ فیھم فانہ عرق الرفض[1] والخروج وعلامۃ المارقین ولنعم ماقیل

از خدا خواہیم توفیق ادب | بے ادب محروم شد از لطف رب

خاک پائے علماء متقدمین ومتاخرین حافظ محمد ابراہیم میر سیالکوٹی

---

[1] مولانا ثناء اللہ مرحوم امرتسری نے مجھ سے بیان کیا کہ جن ایام میں میں کانپور میں مولانا احمد حسن صاحب کانپوری سے علم منطق کی تحصیل کرتا تھا- اختلاف مذاق و مشرب کے سبب احناف سے میری گفتگو رہتی تھی- ان لوگوں نے مجھ پر یہ الزام تھوپا کہ تم اہل حدیث لوگ ائمہ دین کے حق میں بے ادبی کرتے ہو- میں نے اس کے متعلق حضرت میاں صاحب مرحوم دہلوی یعنی شیخ الکل حضرت سید نذیر حسین صاحب مرحوم سے دریافت کیا تو آپ نے جواب میں کہا کہ ہم ایسے شخص کو جو ائمہ دین کے حق میں بے ادبی کرے چھوٹا رافضی جانتے ہیں- علاوہ بریں میاں صاحب مرحوم معیار الحق میں حضرت امام صاحب کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں اما منا و سیدنا ابو حنیفۃ النعمان افاض اللہ علیہ شا ابیب العفو والغفران (۲) نیز فرماتے ہیں کہ مجتہد ہونا اور متبع سنت اور متقی اور پرہیز گار ہونا کافی ہے ان کے فضائل میں اور آیہ کریمہ ان اکرمکم عند اللہ اتقکم زینت بخش مراتب ان کے لئے ہے" (ص ۵)

فرقۂ معتزلہ

معتزلوں نے اپنے لئے "اہل العدل والتوحید" کا نام تجویز کیا۔اس لئے کہ ان کے نزدیک خدا تعالیٰ پر واجب ہے کہ مطیع کو ثواب دے اور عاصی کو اگر وہ بغیر توبہ کے مر گیا ہو عذاب کرے۔ورنہ اس کا "عدل" قائم نہیں رہے گا۔ نیز اس لئے کہ ان کے نزدیک بھی جہمیہ کی طرح صفات باری کا مفہوم "مفہوم ذات" پر کوئی زائد امر نہیں ہے۔بلکہ اس کی صفات عین اس کی ذات ہیں۔ورنہ تعدد قدما لازم آئے گا اور "توحید" قائم نہیں رہے گی۔(اعاذنا اللہ منہ)

<u>حل اشکال</u> :۔ گو ظاہر میں یہ بڑی باریک بینی ہے۔ لیکن حقیقت میں انہوں نے اس میں نمایاں ٹھوکر کھائی ہے۔کیونکہ جب کہا گیا کہ فلاں امر ذات بر حق پر واجب ہے۔تو کوئی اس کا واجب کرنے والا بھی چاہئے پس اگر واجب کرنے والا کوئی غیر ہے تو یہ بالبداہت باطل ہے کیونکہ خدا پر کوئی حاکم نہیں اور اگر خود خدا تعالیٰ واجب کرنے والا ہے تو اس کی صورت یہی ہے کہ بعض امور میں اس نے وعدہ کیا ہے کہ میں ایسا ایسا کروں گا۔اور وعدہ کرنا یا نہ کرنا خدا کے اختیار میں تھا۔ کسی کے اجبار ایجاب سے وعدہ نہیں کیا۔ پس اس کے یہ معنی ہوئے کہ اس نے کوئی امر خود اپنے اختیار سے اپنے اوپر لازم کر لیا ہے۔ جزا و سزا بھی اسی باب سے ہیں۔ورنہ بندوں کی طرف سے یا نفس اعمال کی وجہ سے ایجاب کی کوئی وجہ نہیں۔کیونکہ ہماری ساری طاعتیں اس کی نعمتوں کے شکریہ میں ہیں۔لہذا اجرت مابعد لینے کا کوئی حق نہیں اس کے ساتھ یہ بھی یاد رہے کہ مطیع کو ثواب دینے میں تو ایفائے وعدہ ایک امر محمود ہے اور اس کی خلاف ورزی ایک عیب ہے جس سے شان و ذات خداوندی پاک ہے لیکن عاصی کو عذاب کرنا لازم نہیں (اگرچہ واقع میں یہی ہوگا کہ عذاب کرے گا) کیونکہ عدل کے خلاف ظلم ہے اور ظلم کسی دوسرے کے حق میں بغیر اجازت اس کی تصرف کرنے کو کہتے ہیں اور خدا تعالیٰ کا

اپنی مخلوقات میں جس طرح کہ وہ چاہے تصرف کرنا بے جا نہیں ہے اس لئے گنہگار کی ☐ خلاف عدل نہیں ہے بلکہ مغفرت و رحمت میں خوبی و حسن زیادہ ہے

در عفو لذتیست کہ در انتقام نیست

پس ڈرانے اور ڈانٹنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ مغفرت سے مسلوب الاختیار نہیں ہو جاتا اسی اختیار کے سمجھانے کے لئے فرمایا فیغفر لمن یشاء ویعذب من یشاء (بقرہ پ ۳) "یعنی جسے چاہے گا بخشے گا اور جسے چاہے گا عذاب کرے گا۔" ہاں اس کا وعدہ ہے کہ میں ایمان اور اعمال صالحہ پر نیک جزا دوں گا۔ "اور اس نے ڈرایا بھی ہے کہ کفر و شرک اور بداعمالی پر عذاب کروں گا۔ اور مسلم (فرمانبردار) اور مجرم (نافرمان) کا حشر ایک نہ کروں گا۔" اس قسم کی جتنی آیات و احادیث ہیں۔ سب میں اعلان قانون ہے اور اختیار اور قانون دو الگ الگ مفہوم ہیں۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ اس کا قانون اس کے اختیارات کے ماتحت ہے لایسئل عما یفعل۔ یا یوں سمجھئے کہ اس کا یہ بھی قانون ہے کہ اس کا اختیار قانون پر حاوی ہے۔

(۲) باقی رہا صفات کا مسئلہ سو اس کی نسبت ہم سابقہ فرقہ جہمیہ کے ذکر میں کسی قدر وضاحت کے ساتھ بیان کر آئے ہیں کہ تعدد قدماء وہ منافی توحید ہے۔ جس میں ذوات متعددہ مانی جائیں مثلاً آریہ کہ ان کے نزدیک ذات باری، روح اور مادہ تینوں قدیم ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ تینوں ذاتی طور پر الگ الگ چیزیں ہیں اور عیسائی کہ باپ اور بیٹا اور روح القدس تینوں کو قدیم مانتے ہیں اور یہ بھی اپنی اپنی ذات میں ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ لیکن صفات و ذات باری کا حال ایسا نہیں بلکہ ذات "واحد" ہے اور اس کی صفات کمال "کئی ایک" ہیں و انّٰی ھذا من ذالك کیونکہ ایک ہی ذات کی کئی ایک صفات ہو سکتی ہیں ایک ہی انسان میں شفقت و مہربانی بھی ہے اور دوسرے موقع پر اس میں غصہ و انتقام بھی ہے۔

<u>خلیفہ مامون و مذہب اعتزال</u>:۔ خلیفہ مامون[1] کو علوم یونان کے عربی تراجم کا از حد

---

[1] خلیفہ مامون کا عہد ۱۹۸ھ سے ۲۱۸ھ تک رہا۔

شوق تھا- چنانچہ اس نے اس امر کے لئے بھی ایک خاص محکمہ کھولا جس میں ہر ملت و مذہب کے ماہرین فن کو مناسب خدمتیں سپرد کیں اور ان کے وظائف و مشاہرے مقرر کئے اور جو انعامات و عطیات عطا ہوتے تھے وہ اس پر علاوہ تھے-

دربار خلافت میں علمی مجالس منعقد ہوتیں- اور مذہبی مسائل پر آزادی سے گفتگو ہوتی- مجالس مناظرہ کے سرخیل ابوہذیل علاف اور ابراہیم نظام تھے- جو اہل اعتزال کے پیشوا اور مقتدا تھے- ابوہذیل تو نظام کا استاد تھا- اور نظام خود خلیفہ کا- بس اب دربار خلافت میں ان کے اقتدار میں کیا کسر باقی رہ سکتی تھی- خود خلیفہ بھی ان کے شیشے میں اتر آیا اور مذہب اعتزال "شاہی مذہب" ہو گیا-

خلیفہ نے معتزلوں کے بعض مخصوص مسائل جبر و تشدد سے منوانے چاہئے اور اپنے جانشین خلیفہ معتصم کو بھی اسی کی وصیت کر گیا- جس سے علمائے سنت سخت امتحان و ابتلا میں پڑے- چنانچہ امام اہل سنت حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی ایذاء و ابتلا اسی زمانہ کی یادگار ہے- جس کی وجہ یہ تھی کہ امام صاحب ممدوح نے خلیفہ کی موافقت میں قرآن مجید کو مخلوق نہ کہا-

حیرت :- خلیفہ مامون میں جہاں بہت سی قابل قدر' مہر و ماہ کی طرح درخشاں خوبیاں تھیں- وہاں اس مہتاب میں ایک داغ بھی تھا- کہ جو بات اس کے ذہن میں بیٹھ جاتی اسے بجبر منوانے کی کوشش کرتا- لیکن یہ جبر و سختی غیر ادیان پر نہیں تھی-

معتزلوں کی صحبت سے خلیفہ کے ذہن نشین ہو گیا- کہ قرآن مجید "مخلوق" ہے- اس کی اشاعت کے لئے اسحاق بن ابراہیم والیٔ عراق کو لکھا کہ فقہاء و محدثین کو جمع کرو- اور قرآن مجید کے متعلق ان سے سوال کرو- اگر وہ اسے مخلوق کہیں تو چھوڑ دیں- ورنہ پابزنجیر میرے پاس بھیج دو- اس جبری حکم سے بڑے بڑے محدث بزرگ آزمائش میں پڑے- بعض نے عذر و بہانے سے پنڈ چھڑایا- اور بعض نے پہلی ہی دھمکی سے بادل ناخواستہ مان لیا- اور بعض نے مصیبت میں پڑ کر جان چھڑائی- لیکن اہلسنت کے سرخیل امام احمد بن حنبل نے سب کچھ برداشت کیا- کلام خدا کو مخلوق نہ کہا- تغمدھم

الله برحمة الواسعة

ہماری حیرت کی کوئی حد نہیں رہتی جب ہم ایک طرف تو یہ دیکھتے ہیں کہ مجوسیوں اور نصرانیوں کو تو مذہبی امور میں یہاں تک آزادی ہے کہ وہ کھلے دربار میں پاک اسلام پر نکتہ چینی کریں۔ اور خلیفہ حوصلہ و حلم سے برداشت کرے اور ان کے بیہودہ اعتراضات کا جواب دے۔ اور ان کے لاجواب ہو جانے پر بھی ان کو اسلام لانے پر مجبور نہ کرے۔ اور نہ اعتراض کرنے سے روکے۔ اور دوسری طرف یہ دیکھتے ہیں کہ بڑے بڑے محافظین سنت اور ائمہ حدیث پر اس قدر تنگی ہے کہ ایسے مسئلہ میں جو سلف امت میں معرض بحث میں نہیں آیا۔ تو اگر وہ محض اس میں دینداری اور تقویٰ کے خیال سے خلیفہ کے ہم خیال نہیں ہوتے تو ان کی بے عزتی و بے حرمتی اور ایذا و تکلیف میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی جاتی۔

مکش بہ تیغ ستم والہانِ سنت را
نکردہ اند بجز پاسِ حق گناہے دگر

اگر یہ سلوک کسی زود رنج، متلون مزاج، کم علم، کم فہم شخص سے سرزد ہوا ہوتا تو ہم کو کوئی تعجب نہ ہوتا۔ کیونکہ جبر و استبداد کے ایسے واقعات حکومت کی طرف سے عموماً ہوتے رہتے ہیں لیکن خلیفہ مامون ایسے حلیم و بردبار، متین و باوقار، فہیم و علمدار شخص سے ایسا نہیں ہونا چاہئے تھا۔

غرض معتزلوں کو دربار خلافت میں رسائی، شاہی قدر افزائی اور اس پر مزید یہ کہ خود خلیفہ کی حمایت بلکہ ہم نوائی کے سبب بمجوائے "ہر عیب کہ سلطاں بہ پسندد ہنر ست" بہت فروغ ہوا۔

امور مذکورہ بالا کے علاوہ ایک اور سبب بھی تھا۔ جس نے معتزلوں کو خلیفہ کے بہت قریب کر دیا۔ وہ یہ کہ خلیفہ مامون بمتابعت شیعیت حضرت علی مرتضیٰ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ ورضاہ) کو صحابہ میں سب سے افضل جانتا تھا۔ اور معتزلہ کا بھی یہی مذہب ہے۔ (دیباچہ نہج البلاغۃ)

علم کلام :- خیر مذکورہ بالا امور تو مسلمانوں کے آپس کے تھے بیرونی (غیر مذاہب کے) حملوں اور اعتراضوں کے مقابلہ کے لئے عقلی اصول کی بنا پر خلیفہ مامون کے دادا خلیفہ مہدی کے حکم سے رد ملحدین و منکرین میں کئی ایک کتابیں لکھی گئیں۔ جس سے ایک مستقل فن کی بنیاد پڑ گئی تھی۔ لیکن تکمیل و باقاعدہ تدوین اسی زمانہ میں یعنی خلیفہ مامون کے عہد میں ہوئی اور اس کا نام علم کلام ہوا۔ کیونکہ اس وقت اس کے مباحث میں زیادہ مشہور مسئلہ کلام باری تعالیٰ کا تھا۔ چونکہ اس فن کے لکھنے والے "معتزلہ" تھے اور اس کے مسائل کی تحقیق بھی ان ہی کے اصول پر تھی۔ جن سے ائمہ حدیث کو سخت نفرت تھی۔ اور جس کے سبب سے وہ سخت سے سخت تکالیف کے تختہ مشق بنائے گئے تھے۔ اس لئے ائمہ سنت نے اس فن کو قبول نہ کیا اور ان کتابوں کا مطالعہ اور درس و تدریس جائز نہ جانا امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ وغیرہما ائمہ سنت سے علم کلام کی مذمت میں جو کچھ منقول ہے وہ اسی علم کلام کی نسبت ہے۔ جو ان کے وقت میں انہی معتزلہ نے لکھا تھا بیشک اس میں بہت سے ایسے مسائل تھے جو یا تو جماعت صحابہ و خیار تابعینؒ کے برخلاف تھے۔ یا ایام سلف میں ان کے متعلق کوئی بحث نہ چھڑی اور ان کا زمانہ امن سے گذر گیا تو متاخرین (تبع تابعین) اور "محدثین" نے بھی اس بے امنی کے وقت میں ان میں بے ضرورت بحث و کرید کر کے نئے اختلافات پیدا کرنے نہ چاہے۔ چنانچہ سید عبدالقادر جیلانیؒ غنیۃ الطالبین میں فرماتے ہیں۔

وانما كفر القائل بخلق القران وبدع الاخر لان مذهبه رحمه الله على ان القران اذا لم ينطق بشئى ولا يروى فى السنة عن رسول الله صلى الله عليه وسلم شئى وانقرض عصر الصحابة ولم ينقل احد منهم قولا فالقول فيه بدعة وحدث[1]

"یعنی امام احمد نے قائل خلق قرآن کو کافر اور دوسرے کو بدعتی اس لئے کہا کہ آپ کا مذہب اس بات پر مبنی ہے کہ جب قرآن شریف میں (اس بارے

[1] غنیۃ مترجم فارسی ترجمہ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی متوفی ۱۰۶۷ھ۔

ہیں) کچھ مصرح نہیں اور علم حدیث میں رسول اللہ ﷺ سے کچھ مروی نہیں۔اور صحابہ کا زمانہ بھی اسی طرح گذر گیا کہ ان میں سے بھی کسی نے کچھ بھی نقل نہیں کیا تو اس بارے میں کوئی بات کہنا بدعت ہے اور دین میں نئی بات نکالنا ہے۔"

تبصرہ بر علم کلام: حضرت مولانا روم صاحبؒ فرماتے ہیں ۔

چند خوانی حکمت یونانیان
حکمت ایمانیان راہم بخواں

صحابہ و تابعین کے زمانہ میں مسلمانوں کی علمی و عملی جدوجہد شریعت مطہرہ کی اشاعت و ترویج اور تعلیم و تعمیل پر بس رہی جس میں ان کی دین و دنیا کی بہبودی و سعادت تھی۔

صنائع وعلوم عقلیہ نہ تو عرب میں تھے اور نہ ان کو ان کی ضرورت پڑی۔پھر آہستہ آہستہ جوں جوں تمدن میں ترقی ہوتی گئی اور فتح ممالک کی وجہ سے غیر قوموں سے اختلاط وامتزاج ہوتا گیا۔طبعیتیں اس طرف مائل ہوتی گئیں۔جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان ان علوم عقلیہ میں بھی کامل اور پورے ماہر ہو گئے۔کئی مسائل میں یونانیوں سے بر بنائے دلیل اختلاف کیا۔اور کئی ایک جدید تحقیقات اضافہ کیں۔اور کئی ایک علوم کو ان کی ابتدائی حالت سے کمال تک پہنچادیا۔اور ایسے علماء حکمائے اسلام یا **متکلمین** کہلائے۔جنہوں نے علوم عقلیہ کے رو سے عقائد اسلام کے متعلق کتابیں تصنیف کیں

فجزاهم الله عنا خير الجزاء۔

اہل سنت و اہل حدیث

جن فرقوں کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ ان کے اختلاف کی بنا مذہبی روایات پر نہ تھی۔ بلکہ وساوس و شبہات پر تھی۔ جو قرآن مجید میں اپنی رائے و قیاس کو داخل کرنے سے پیدا ہوتے تھے۔ اور وہ لوگ ان کو عقلی و علمی تحقیقات قرار دیتے تھے۔ اور ان کا حل ورد بھی اسی طریق سے چاہتے تھے ان سب کے مقابلے میں ایک گروہ ایسا بھی تھا۔ جو سلف امت صحابہ و خیار تابعینؒ کی روش پر قائم تھا۔ یہ لوگ عبادات و معاملات کی طرح عقائد میں بھی اسی طرز قدیم یعنی اتباع نصوص پر جمے رہے اور ان سے سر مونہ سر کے نہ تو نئے علوم کی طرف التفات کی اور نہ نئے عقلی طریق پر ان کی تردید کی۔ بلکہ صرف قران شریف اور سیرت نبوی کو کافی جان کر انہی پر قناعت کی۔ اس جماعت کے متعلق بھی آنحضرت ﷺ نے خبر دے دی تھی کہ میری امت میں سے ایک طائفہ ہمیشہ رہے گا جو حق پر قائم رہ کر مقابلہ کرتا رہے گا۔ اور قیامت تک غالب رہے گا۔ (بخاری و مسلم)

دوسرے فرقوں کے ذکر میں آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ یا تو ان کا نام بانی فرقہ کے نام پر پڑا یا چند مخصوص مسائل میں دوسروں سے مختلف ہونے کہ وجہ سے پڑا۔ یا ملکی فتنوں اور تنازعات کے سبب الگ الگ جماعتیں بنیں۔ اور پھر مذہباً بھی الگ الگ ہو گئے۔ لیکن یہ جماعت جس کا ذکر ہم اب کرنے لگے ہیں۔ ان اسباب میں سے کسی سبب سے بھی پیدا نہیں ہوئی۔ بلکہ یہ وہی لوگ تھے جن کے عقائد و اعمال توارث و تعامل سے صدر اول سے ان اختلافات کے وقت تک برابر ایک ہی نہج پر چلے آئے۔ چونکہ انہوں نے طریق متوارث سے افتراق کر کے کوئی نیا فرقہ نہیں بنایا۔ اس لئے ہم ان کو فرقہ نہ کہیں تو بجا ہے لیکن چونکہ دوسرے فرقوں کے مقابلے میں یہ بھی ایک جماعت موجود تھی لہذا ان کی نسبت سے ہم ان کو بھی ایک فرقہ شمار کرتے ہیں۔

چونکہ ان کی روش سنت نبویؐ اور سیرت صحابہؓ کی پابند تھی۔ اس لئے ان کا نام اہل حدیث یا اہل السنت والجماعت ہوا۔ اس لفظ کا استعمال اختلاف و فتنہ کے وقت ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ امام مسلم اپنی صحیح کے مقدمہ میں امام محمد بن سیرینؒ تابعی سے باسناد خود روایت کرتے ہیں۔

لم یکونوا یسئلون عن الاسناد فلما وقعت الفتنة قالوا سموا لنا رجالکم فینظر الی اهل السنة فیوخذ حدیثهم وینظر الی اهل البدع فلا یوخذ حدیثهم[1]

(پہلے) اسناد کی نسبت سوال نہیں ہوتا تھا۔ لیکن جب فتنہ برپا ہو گیا تو سوال ہونے لگا کہ ہمیں اپنے راویوں کی شخصیت بتاؤ تاکہ اہل سنت کی تمیز کر کے ان کی روایت کردہ حدیث لے لی جائے اور اہل بدعت کو بھی دیکھ کر ان کی بیان کردہ حدیث نہ لی جائے۔

امام محمد بن سیرین تابعی ہیں۔ حضرت عثمانؓ کے عہد میں ۳۳ھ میں پیدا ہوئے۔ اور ۱۱۰ھ میں ستتر سال کی عمر میں بصرہ میں فوت ہوئے آپ کا یہ قول اصل میں روایت ہی ہے کیونکہ وہ لفظ قَالُوا سے روایت کرتے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ ان کے زمانے سے پیشتر لفظ اہل سنت رائج ہو چکا تھا اور اہل سنت اور اہل بدعت کی تمیز بھی ہو چکی تھی۔

تنبیہ :۔ اس حوالے سے یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ اہل سنت کا معزز لقب اہل بدعت کے مقابلہ میں تجویز ہوا تھا۔ پس کوئی اہل بدعت بدعت کرتے ہوئے اس لقب کا حقدار نہیں ہو سکتا۔ فافہم

اشعریہ :۔ اہل سنت ایک فرقہ اور اس کے مقابلے میں اس قدر فرقے پیدا ہوتے گئے اور ابھی بس نہیں ہو گئی تھی سب کی بنا عقلی شبہات پر تھی۔ اور اہل سنت ہیں کہ ان علوم کی طرف کان نہیں دھرتے۔ ائمہ اہل سنت یعنی امام مالکؒ اور امام احمدؒ

---

[1] مقدمہ صحیح مسلم مطبوعہ مطبع انصاری دہلی ص ۱۱۔

اور امام شافعی وغیرھم نے جو کچھ لکھا صحیح روایتوں سے لکھا- لیکن چونکہ وہ سب کچھ نقلی تھا- اس لئے اس سے مریضان عقل کی تسلی نہ ہو سکتی تھی- آخر خدائے ذوالجلال کو ایک نیا انقلاب منظور ہوا- اور ان سے بھی اسی عقلی طریق سے کام لینے کا وقت آپہنچا- تو خواجہ ابوالحسن اسمٰعیل بن علی الاشعری[1] جو تو واسطوں سے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ صحابی کی اولاد سے تھے- اپنے استاد ابو علی جبائی معتزلی سے مختلف ہو کر طریق سنت پر آگئے- چونکہ انہوں نے علوم عقلیہ میں تربیت پائی تھی- اور مخالفین کے جوابات میں بڑے ماہر تھے- اس لئے انہوں نے اہل سنت کے عقائد کو دلائل عقلیہ سے بیان کرنا چاہا اور بہت سی کتابیں بھی تصنیف کیں- جن کی تعداد پچپن تک پہنچتی ہے- ان میں وہ عقلی و نقلی طریق کو ممزوج کر کے دیگر مذاہب کی افراط و تفریط کے درمیان درمیان چلے ہیں- مثلاً اہل اعتزال صفات ذات کی قدامت سے انکار کرتے کرتے آخر کار صفات ہی سے منکر ہو گئے- اور ذات بحت کے قائل ہوئے- اور مجسمہ نے اثبات صفات میں ایسا طریق اختیار کیا کہ خدائے بے چون کو بھی ایک جسم بنا دیا- اور اس کے لئے اعضاء حقیقی تجویز کئے اعاذنا اللہ منہما-

امام اشعری نے کہا کہ صفات تو ثابت ہیں- لیکن ان کی کیفیت معلوم نہیں جس طرح کہ اس کی ذات کی حقیقت وکنہ معلوم نہیں لاھو ولا غیرہ[2] کا حاصل یہی ہے-

بتقاضائے وقت اور بحکم ضرورت اہل سنت نے ایسے شخص کو غنیمت جانا- چنانچہ آپ کی تصانیف مقبول عام ہو گئیں- اور آپ کے شاگرد و فیضیاب سینکڑوں ہزاروں تک پہنچ گئے- جن میں سے بعض عظیم الشان ائمہ فن ہوئے-

اشعری طریق کی بنیاد بھی نصوص پر ہے- چنانچہ خود خواجہ ابوالحسن اشعریؒ نے اپنی ایک تصنیف "کتاب الابانہ"[3] میں بتصریح فرمایا ہے- کہ ہم خدائے تعالیٰ عزوجل

---

[1] امام اشعری ۲۷۰ھ میں بمقام بصرہ پیدا ہوئے اور سن ۳۳۰ھ میں بمقام بغداد فوت ہوئے-

[2] یعنی نہ وہ عین ذات ہیں نہ غیر-

[3] یہ کتاب حیدر آباد میں چھپ گئی ہے-

کی کتاب اور نبی ﷺ کی سنت سے - اور نیز اس سے جو صحابہ کرامؓ و تابعین عظام اور ائمہ حدیث سے مروی ہے تمسک کرتے ہیں - اور جو کچھ امام احمد بن حنبلؒ نے کہا ہے ہم اسی کے قائل ہیں اور جو کچھ اس کے خلاف ہے ہم اس کے مخالف ہیں -

نیز شیخ الاسلام حضرت امام تیمیہ ''کتاب العقل والنقل'' میں فرماتے ہیں -

وکان الاشعری وائمة اصحابه يقولون انهم يحتجون بالعقل لما عرف ثبوته بالسمع فالشرع هو الذی يعتمد عليه فی اصول الدين والعقل عاضدله معاون -[1]

''امام اشعری اور ان کے شاگرد جو ائمہ فن ہوئے وہ کہا کرتے تھے کہ ہم عقل سے ان امور کی دلیل پکڑتے ہیں جن کا ثبوت شریعت کی طرف سے روایت کے رو سے معلوم ہو چکا ہو - پس اصول دین میں صرف شرع ہی پر اعتماد ہو سکتا ہے اور عقل تو اس کی معاون و مددگار ہے -''

پس اس طریق کو بھی اہلسنت ہی کے دائرے میں ایک جدا مسلک قرار دیا گیا - جس سے اشعری طریق کی بنیاد پڑ گئی - لیکن چونکہ طریق بیان عقلی تھا - اس لئے بعض جگہ تمہید مقدمات یا فہم نصوص میں روش محدثین سے قدرے اختلاف ہو گیا - کیونکہ امام اشعریؒ فن حدیث میں پورے ماہر نہیں تھے - چنانچہ شیخ الاسلام فرماتے ہیں -

وهذا صمامدح به الاشعری فانه بين من فضائح المعتزلة وتناقض اقوالهم فسادها مالم يبينه غيره لانه كان منهم وكان درس الكلام علی ابی علی الجبائی اربعين سنة وكان ذكيا ثم انه رجع عنهم وصنف فی الرد عليهم ونصرفی الصفات طريقة ابن كلاب لانها اقرب الی الحق والسنة من قولهم ولم يعرف غيرها فانه لم يكن خبيرا بالسنة والحديث واقوال الصحابة و التابعين وغيرهم -[2]

---

۱ - کتاب العقل بہامش المنہاج جلد دوم ص ۷ -

۲ - منہاج السنۃ جلد سوم ص ۷۱ -

"یہ بات ان باتوں میں سے ہے جن کی وجہ سے امام اشعریؒ قابل مدح ہیں کیونکہ اس نے معتزلہ کے فضائح اور ان کے اقوال کے تناقض و فسادات ایسے بیان کئے ہیں کہ کسی دیگر نے نہیں کئے۔ کیونکہ وہ خود بھی انہیں میں کا تھا۔ اور چالیس سال تک ابو علی جبائی (رئیس المعتزلہ) سے علم کلام حاصل کرتا رہا تھا۔ اور بہت ذہین تھا۔ پھر ان کے مذہب سے تائب ہو گیا اور ان کے رد میں تصنیف کرنے لگا۔ اور اس نے صفات الٰہی میں ابن کلاب کے طریق کی تائید کی۔ کیونکہ یہ طریق معتزلوں کی نسبت حق اور سنت کے زیادہ قریب تھا۔ اور امام اشعری اس کے سوا اور علم کا عالم نہیں تھا۔ کیونکہ وہ سنت رسول اللہ ﷺ اور اقوال صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین و غیرہم کے علم میں ماہر نہیں تھا۔"

اگرچہ امام اشعریؒ امام احمدؒ کے بیان کردہ عقائد کی موافقت میں تمہید مقدمات اور صورت مسائل میں معتزلوں کے سخت مخالف ہو گئے تھے۔ لیکن پھر بھی معتزلوں میں رہ کر علوم عقلیہ میں بہت سی عمر گذارنے اور علم حدیث میں کافی ماہر نہ ہونے کے سبب ان میں کچھ نہ کچھ اعتزالی اثر باقی رہ گیا تھا۔ جس کی وجہ سے امام احمدؒ کی پوری مطابقت نہ رہ سکی۔ چنانچہ شیخ الاسلام "منہاج" میں ایک مسئلہ کے ضمن میں فرماتے ہیں۔

وهذا من الكلام الذى بقى على الاشعرى من بقايا كلام المعتزلة فانه خالف المعتزلة لما رجع عن مذهبهم فى امو الهم التى اشتهر وافيها بمخالفة اهل السنة كاثبات الصفات و الرؤيته وان القران غير مخلوق واثبات القدر وغير ذلك من مقالات اهل سنة والحديث وذكر فى كتاب الابانة انه يقول بما ذكره من اهل السنة والحديث وذكر فى الابانة انه يأتم بقول الامام احمد[1]

"اور یہ اس کلام میں سے ہے جو امام اشعریؒ میں معتزلوں کے کلام میں سے رہ گیا۔ کیونکہ جب اس نے معتزلوں کے مذہب سے رجوع کیا۔ تو ان کے انہی

---

[1] منہاج السنہ جلد سوم ص ۲۰۵۔

اصول میں اختلاف کیا جو اہل سنت کی مخالفت میں مشہور تھے مثلاً صفات و رویت کا اثبات اور یہ کہ قرآن غیر مخلوق ہے- اور اثبات تقدیر وغیرہ وغیرہ احوال اہل سنت و حدیث کے مسائل ہیں- اور اس نے کتاب المقالات میں ذکر کیا کہ میں وہی کہتا ہوں جو سنت اور حدیث والوں نے کہا ہے- اور اس نے کتاب الابانہ میں ذکر کیا کہ میں امام احمدؒ (بن حنبل) کے قول کی پیروی کرتا ہوں-"

پھر اس کے چند سطر بعد فرماتے ہیں-

"وان هذه بقيت عليه من كلاب المعتزلة"

"یہ مسئلہ امام اشعریؒ میں معتزلوں کا بقیہ رہ گیا تھا-"

امام اشعریؒ کی وجہ سے علم کلام نے اہل سنت کے ہاں بھی قبولیت پائی- تو آپ کے شاگردوں اور پھر ان کے شاگردوں اور ان کے بعد کے لوگوں میں سے بھی بڑے بڑے ائمہ فن پیدا ہوئے- جن کے زور قلم اور قوت استدلال سے اشعری طریق نے خوب رونق پائی- اور معتزلوں کا زور ٹوٹ گیا- مثلاً ابو سہل صعلوکی ابو بکر قفال' ابو زید مروزی' ابو بکر باقلانی استاد ابو اسحٰق اسفرائنی' ابو بکر بن فورک' امام الحرمین (امام غزالیؒ کے استاد) جن کا فتوی عراق سے عرب تک بلا مزاحمت چلتا تھا- خود امام حجتہ الاسلام اور پھر امام فخر الدین رازیؒ جیسے مشہور عالم متکلمین اہل سنت-

اس کے علاوہ بعض سلاطین بھی اسی روش کے ہوئے- تو انہوں نے زمانہ سابق کے مفاسد دور کرنے کے لئے اپنے زور حکومت سے بھی اسی طریق کی اشاعت کی- چنانچہ جب سلطان صلاح الدین ایوبیؒ[1] فاتح بیت المقدس نے مصر پر تسلط کیا- تو اس

---

[1] سلطان صلاح الدینؒ اسلام کا وہ نامور اور قابل فخر بہادر ہے جس نے فرنگستان کی بڑی بڑی سلطنتوں میں ہلچل مچا دی تھی- اور جس کی دہشت نے عیسائی سلاطین کے دل ہلا دیے- عامله الله برحمة الواسعة- خاکسار نے شعبان ۱۳۳۰ھ مطابق اگست ۱۹۱۲ء میں سفر حج کے ضمن میں جب مصر' حیفا' یافا' دمشق اور بیت المقدس کا بھی سفر کیا تو نماز جمعہ مسجد اقصی ایوبی میں پڑھی تھی- محراب منبر پر سلطان مرحوم کے نام کا کتبہ پڑھ کر جو کیفیت حاصل ہوئی تھی- وہ آج اخیر ۱۳۵۰ھ میں بھی یاد ہے والحمد للہ-

وقت وہاں عبید یین کی حکومت کے زور سے مذہب شیعہ بہت زور پر تھا- انہوں نے اہل سنت کو گوناگوں مظالم کا تختہ مشق بنا بنا کر ان کے مذہب کو سخت ضعیف کر دیا تھا- سلطان صلاح الدینؒ نہایت دیندار تھے- فروع میں شافعیؒ اور اصول میں اشعری طریق پر تربیت پائی تھی- مصر کی حکومت ہاتھ لیتے ہی مذہب شافعی اور طریق اشعری کی ترویج شروع کر دی- قضا' تولیت' او قاف وغیرہ کے سب عہدے شوافع اور اشعریہ ہی کے سپرد کئے گئے- طریق اشعری آگے ہی زیادہ تر شوافع ہی میں رائج ہوا تھا- سلطان کے اس رویہ سے شافعیت و اشعریت آپس میں لازم و ملزوم ہو گئے- اور مصر' شام' ارض حجاز' یمن اور بلاد مغرب میں ہر جگہ شافعیوں اشعریوں ہی کا پھریرا لہرانے لگا-

اسی طرح ابو عبداللہ محمد بن تومرت مغربی نے جب عراق کا سفر کیا تو امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ کی صحبت میں رہ کر اشعری طریق سیکھا اور اپنے دیار میں واپس جا کر اسی طریق کو جاری کیا- جب محمد بن تومرت فوت ہو گیا اور عبدالمومن بن علی قیسی اس کا خلیفہ ہوا- اور اس نے بلاد مغرب میں قبضہ پا کر تسلط حاصل کیا- تو "امیر المومنین" کا لقب اختیار کر کے اشعری طریق کو بزور شائع کیا- اور جس کسی نے اس سے انکار کیا- اس کی گردن اڑا دی- کیونکہ محمد بن تومرت ان کے نزدیک امام معصوم اور مہدی موعود[1] سمجھے جاتے تھے- بلاد مغرب میں حکومت موحدین سے انہی کی حکومت مراد ہے-

سلطان صلاح الدین مرحوم کے بعد تخت مصر پر اور بلاد مغرب میں عبدالمومن کے بعد ان کی اولاد میں سے جو جو جانشین ہوئے- وہ بھی انہی کے نقش قدم پر چلے- اور سوائے اشعریوں کے کسی کا قدم نہ جمنے دیا- اور یہ امر اشعری طریق کی عام اشاعت کا ایک سبب ہوا-

---

[1] اس عہدے کے امیدوار کئی ایک حریص ہوتے رہے ہیں- چنانچہ ہمارا ملک بھی اس قسم کے لوگوں سے خالی نہیں رہا یہ فرق کہ مغربی امیدواروں کے بازوؤں میں کچھ قوت بھی تھی- جس سے ان کو کچھ سیاست بھی حاصل ہو گئی- اور ہمارے ملک کے امیدوار نواب بے ملک تھے- کہ کفار اغیار کے سامنے جبہ سائی کرتے رہے اور "حضور کا اقبال و دولت ترقی پر رہے" کی دعائیں کرتے اور منت و خوشامد کی ناک رگڑتے اور دانت گھساتے مر گئے- خسر الدنیا و الاخرۃ ذلک ھو الخسران المبین-

ماتریدیہ :- خواجہ ابوالحسن اشعری کے زمانہ ہی میں بمقام ماتریدیہ جو سمرقند کا ایک محلہ یا اس کے متصل ایک موضع تھا- امام ابو منصور[1] محمد بن محمود ہوئے- یہ دو واسطوں سے قاضی ابو یوسف اور امام محمد کے شاگرد تھے- انہوں نے قاضی ابوبکر احمد جوزجانی سے علم فقہ سیکھا تھا- جنہوں نے ابو سلیمان جوزجانی سے پڑھا تھا- اور انہوں نے امام محمدؒ سے-

امام ابو منصور ماتریدی نے بھی خواجہ ابوالحسن اشعری کی طرح معتزلہ' قرامطہ اور روافض کے رد میں کئی ایک کتابیں لکھیں- عقائد کی بنا نصوص ہی پر رکھی- لیکن طریق بیان اور صورت استدلال عقلی میں بعض مسائل میں خواجہ اشعری سے اختلاف کیا- لہٰذا ان کا طریق الگ قرار پایا- اور "ماتریدی" کے نام سے موسوم ہوا- چونکہ یہ خود حنفی تھے- اور قاضی ابو یوسف کے قاضی القضاۃ اور امام محمد کے قاضی ہونے کے سبب بلاد خراساں میں حنفی مذہب کی عام اشاعت ہو چکی تھی- اس لئے امام ماتریدی کا مسلک زیادہ تر حنفیوں ہی نے اختیار کیا- پس اشعری اور ماتریدی ہر دو مسلک شوافع اور احناف میں بالترتیب مخصوص سمجھے گئے چنانچہ علامہ عزالدین ابن اثیر جزری "تاریخ کامل" میں واقعات ۴۹۳ھ میں قاضی ابوالحسین بن ابی جعفر سمنانی کی وفات کے بیان میں لکھتے ہیں-

وکان ھو وابوہ من الغالین فی مذھب الاشعری ولابیہ فیہ تصانیف کثیرۃ وھذا مما یستطرف ان یکون حنفی اشعریا-[2]

"قاضی ابو حسین اور ان کا باپ (ابو جعفر) دونوں طریق اشعری میں نہایت غلو کرتے تھے- اور ان کے باپ (ابو جعفر) کی اس بارے میں بہت سی تصانیف ہیں اور یہ تعجب کی بات ہے کہ کوئی حنفی بھی اشعری ہو-"

ماتریدی و اشعری همه خوب لیك طور سلف برد مرغوب

---

[1] امام ابو منصور ماتریدی ۳۳۵ھ میں امام اشعری سے تین سال بعد فوت ہوئے رحمہما اللہ-

[2] تاریخ کامل جلد ۲ ص ۳۲-

حنابلہ یا اہل حدیث :۔ان ہر دو نبرد آزما جماعتوں کے مقابلے میں ایسے لوگ بھی چلے آئے۔ جنہوں نے اس نئے علم کلام میں بھی اسی طرح حصہ نہ لیا۔ جس طرح کہ انہوں نے معتزلوں کے علم کلام میں نہ لیا تھا۔ بلکہ نہایت سیدھے سادے طریق پر جس طرح کہ فروع مین بغیر کسی خاص شخص کی تقلید کے صرف کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کی تابعداری اور جماعت صحابہؓ کے طریق عمل کو اپنا دستور العمل بنایا تھا۔ (جیسا کہ انشاء اللہ آئندہ فصل سے ظاہر ہو گا) اسی طرح عقائد و اصول میں بھی روایات صحیحہ کی بناء پر قرآن و حدیث کے بیان اور جماعت صحابہ کے مسلمات پر قائم رہے۔ تاکہ جس طرح فروع و عملیات کا سلسلہ بطریق تعامل آنحضرت ﷺ پر جا منتہی ہوتا ہے۔ اسی طرح اصول و عقائد کا تاریخی سلسلہ بھی بطریق توارث خدا کے پاک رسول اور آپ کی مقدس جماعت تک پہنچا ہوا ہے۔ یہ "محدثین" کا گروہ تھا۔ اور ان کے سر خیل (امام اشعری و امام ماتریدی سے بہت پیشتر) امام احمد بن محمد بن حنبلؒ تھے۔ جنہوں نے فتنہ مسئلہ کلام کے وقت ایک رسالہ عقائد سلف میں لکھا۔ اور اُسے علم کلام کی اینچا پیچیوں اور وہمی کھینچ تان سے بالکل صاف رکھا اس طریق کا نام حنبلی[1] پڑ گیا۔ اس رسالہ کا شروع اس طرح ہے۔

وهذا مذهب اهل العلم واصحاب الاثر اهل السنة المتمسكين بعروتها المعروفين بها المقتدى بهم فيها من لدن اصحاب النبي صلى الله عليه وسلم الى يومنا هذا وادركت من علماء الحجاز و الشام و غير هم عليها۔[2]

---

[1] حنبل امام احمد مرحوم کے دادا مرحوم کا نام تھا۔ لہذا لوگ آپ کو آپ کے دادا کی نسبت سے بھی پکارتے تھے۔ جس طرح کہ آنحضرت ﷺ کو آپ کے جد امجد کی طرف منسوب کر کے ابن عبد المطلب بھی کہتے تھے۔ اور خود آپ بھی اس طرح کہا کرتے تھے۔ چنانچہ غزوہ حنین میں آپ کا یہ اجز مشہور ہے۔

انا الرسول لا كذب انا ابن عبدالمطلب

[2] عقیدہ اہل سنت مطبوعہ دہلی ص ۳۔

یہ باتیں اہل علم اور اہل حدیث کے مذہب کی ہیں جو اہل سنت ہیں (اور) سنت کے کڑے کو دستاویز بنانے والے ہیں- اسی سے ان کی پہچان ہے (اور) وہ آپس میں پیشوا ہیں نبی ﷺ کے اصحابوں کے زمانے سے ہمارے اس زمانے تک اور یہ وہ باتیں ہیں جن پر میں نے علماء حجاز و شام اور ان کے سوا دیگروں کو پایا ہے-

اور اختتام رسالہ ان الفاظ پر ہے-

ویرحم الله عبدا قال الحق واتبع الاثر وتمسك بالسنة انتهى والحمد لله وحده وصلى الله على نبينا محمد صلى الله عليه وسلم- (ص ۱۱)

"اور رحم کرے اللہ اس بندے پر جو حق کہے اور حدیث کی پیروی کرے اور سنت کے دستاویز بنائے اور سب تعریف خدائے واحد کے لئے خاص ہے اور اللہ تعالیٰ ہمارے نبی محمد (ﷺ) پر درود بھیجے-"

ان عبارتوں سے صاف ظاہر ہے کہ امام صاحب ممدوح صرف ان عقائد کے قائل تھے- جو صحابہؓ سے مروی ہوں- اس کی وجہ یہ ہے کہ دین اسلام کی تعلیم کے دو حصے ہیں- عقائد حقہ اور اعمال صالحہ- عقائد کا محل تو قلب ہے جس سے ان کی تصدیق کی جاتی ہے- اور زبان سے ان کا اظہار ہوتا ہے اور اعمال اعضاء سے بجالائے جاتے ہیں- اور دین اسلام اسی کا نام ہے اور تمام انبیاء علیہم السلام اسی کی تعلیم کے لئے آئے ہیں-

تشریح :- چونکہ اسلام کے اس دور اخیر کا شروع آنحضرت ﷺ سے ہے- جن کے عہد کے فیض یاب اور تربیت یافتہ اصحاب النبی اور اصحاب رسول اللہ (ﷺ) کے معزز لقب سے پکارے جاتے ہیں- اور آنحضرت ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر مجمع عام میں آسمان کی طرف سر اٹھا کر دو یا تین دفعہ کہا تھا- اللهم هل بلغت - اللهم هل بلغت (بخاری) یعنی خداوند! میں (وہ دین جس کی تبلیغ تو نے میرے ذمے لازم کی تھی) پہنچا چکا- پہنچا چکا- پھر صحابہ سے خطاب کر کے فرمایا- الا ليبلغ الشاهد الغائب

منکم یعنی سن رکھو! جو حاضر ہیں وہ اپنے بغیر حاضروں کو پہنچادیں)

اور صحابہ کی عام عادت پائی گئی ہے کہ جو کچھ انہوں نے آنحضرت ﷺ سے سنا تھایا آپ کو کرتے دیکھا تھا۔ وہ اس کے بیان واظہار اور اس کی تبلیغ واشاعت یا اقتدا و عمل میں ہرگز کوتاہی نہیں کرتے تھے۔ اس لئے انہوں نے آنحضرتؐ کے ارشاد بالا کی تعمیل میں اپنے شاگردوں کو جن کو تابعین کہتے ہیں۔ سارا دین جوں کا توں پہنچادیا اور اس میں کسی طرح کی کمی بیشی نہ ہونے دی۔ تابعین واتباع تابعین میں ان اسلامی روایات کے حافظ و ضابط بڑے بڑے ائمہ فن ہوئے جن کی دیانت ووثاقت اور وسعت علم اور قوت حافظہ کا شہرہ تمام اسلامی ممالک میں پھیل گیا تھا۔ اور دور نزدیک کے تمام علم دوست اور دیندار لوگوں نے ان کی علمی و عملی قابلیت کا اقرار کر کے اپنی گردنیں ان کے سامنے جھکادیں تھیں۔ مثلاً مکہ معظمہ میں عطاء بن ابی رباح اور ان کے شاگرد ابن جریج رومی وغیرہ اور مدینہ منورہ میں ابن شہاب زہری اور ان کے شاگرد امام مالک وغیرہ۔ اور شام میں امام اوزاعی وغیرہ۔

اس لئے جو شخص کسی اعتقاد یا عمل کو اسلامی اور آنحضرت کا تعلیم کردہ قرار دیتا ہو اس پر لازم ہے کہ اس اعتقاد و عمل کی سند ایسے صحیح طریق سے بیان کرے کہ اس کا وجود زمانہ سلف میں بھی پایا جائے اور اسی کا نام روایت ہے ورنہ اس اعتقاد و عمل کے جدید و بدعت ہونے میں کیا کلام؟ حدیث نبوی من عمل عملاً لیس علیه امرنا فهورد (مشکوٰۃ) کی بنا اسی پر ہے۔

اہل سنت کے سوا دیگر مذاہب مذکورہ بالا کے پیدا ہونے کی وجہ سے جامع یہی ہے کہ انہوں نے اس طریق وروش کو ملحوظ نہیں رکھا جس پر آنحضرت ﷺ جماعت صحابہؓ کو چھوڑ گئے تھے۔ بلکہ انہوں نے اپنی رائے و قیاس کو جس کی حقیقت اوہام ووساوس اور شکوک و شبہات سے زیادہ نہیں۔ دین میں داخل کیا۔ حالانکہ دین کی بنیاد وحی الٰہی پر ہے۔ نہ کہ انسانی رائے و قیاس پر۔ اور اسی لئے دین کو خدا کی طرف منسوب کیا جاتا ہے ورنہ رائے و قیاس کے لحاظ سے اسے خدا کی طرف نسبت کرنا بالکل بے معنی ہے۔

ازالۂ وہم: اس موقع پر شاید کسی کو یہ وہم گذرے کہ کیا پھر اہلحدیث کے نزدیک شریعت ایک ایسا امر ہے جس میں عقل کو مطلقاً کچھ بھی دخل نہیں؟ تو اس کا مختصر و قاطع جواب یہ ہے کہ شریعت تو سراسر حکمت ہے۔ لیکن فہم شرع اور وضع و ایجاد شرع میں فرق ہے۔ شرع کی وضع و تقرر وحی ربانی سے ہے۔ جس کے ہم تک پہنچنے کا مدار سمع و روایت پر ہے۔ اور عقل اس کے فہم اور اس کے مطابق اعتقاد کرنے اور اس پر عمل کرنے کے لئے ہے۔ پس فہم کی تو تاکید و ترغیب ہے فافہم چنانچہ فرمایا۔

ام لهم شركنوا شرعوا لهم من الدين مالم ياذن به الله (شوری پ ۲۵) وقال ایضا كتاب انزلنه اليك مبارك ليدبروا ايته وليتذكر اولوالالباب (ص پ ۲۳)

کیا ان کے لئے شریک (اللہ) ہیں۔ جنہوں نے ان کے لئے دین میں وہ باتیں مقرر کر دی ہیں جن کی اجازت اللہ نے نہیں دی۔ نیز فرمایا (اے پیغمبر!) ہم نے یہ برکت والی کتاب نازل کی ہے۔ تاکہ یہ لوگ اس کی آیتوں میں سوچ کریں اور تاکہ مغزوالے لوگ (اس سے) نصیحت پکڑیں۔

الغرض حنبلی طریق کی بنیاد نصوص قرآنیہ اور ارشادات نبویہؐ اور آثار صحابہؓ پر ہے اور اس کے امام احمد بن حنبل کی طرف منسوب ہونے کی وجہ یہ ہے کہ افتراق امت کے فتنے اور ہوائے نفسانی و بدعات کے شیوع کے وقت آپ نے اہلسنت کے لئے عقائد ماثورہ یک جا محفوظ کر دیے تھے۔ اور انہی عقائد پر ثابت قدم رہنے اور ابتلاء امتحان[1] مامونی و معتصمی میں استقامت رکھنے کی وجہ سے آپ اور بھی شہرہ آفاق ہو گئے اور امام اہل السنۃ کے لقب سے پکارے جانے لگے تو یہ طریق بھی آپ کی طرف منسوب کیا جانے لگا۔ ورنہ یہ طریق سب سے پہلا اور پرانا ہے اور آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام کے وقت کا ہے۔ اول اس وجہ سے کہ امام احمدؒ امام اشعری اور امام ماتریدی

[1] اس ابتلاء یعنی مسئلہ خلق قرآن کا اجمالی ذکر سابقاً فرقہ معتزلہ کے بیان میں ہو چکا ہے۔

سے بہت قبل ہوئے ہیں[1]- دیگر اس وجہ کہ کہ امام احمد نے اپنے بیان کردہ عقائد کی بنا اپنی رائے و قیاس پر نہیں بلکہ روایات صحیحہ پر رکھی- چنانچہ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں-

ومن اہل السنة والجماعة مذهب قديم معروف قبل ان يخلق الله ابا حنيفة ومالك والشافعي واحمد فانه مذهب الصحابة الذين تلقوه عن نبيهم ومن خالف ذلك كان مبتدعا عند اهل السنة فانهم متفقون ان اجماع الصحابة حجة ومتنازعون في اجماع من بعد هم و احمد بن حنبل قد اشتهر بامامة السنة لصبره على ما امتحن به ليفار قها و كان الائمة قبل قد ماتوا قبل المحسنة[2]

"اور اہل سنت والجماعت میں سے ایک قدیم و معروف مذہب ہے- جو اس وقت سے بھی پیشتر کا ہے جبکہ خدا تعالیٰ نے حضرت ائمہ امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ اور امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کو پیدا کیا تھا- کیونکہ وہ مذہب آنحضرت ﷺ کے صحابہ کا ہے جنہوں نے وہ (مذہب) اپنے نبی صلعم سے سیکھا تھا- اور جو کوئی اس مذہب کے خلاف چلے وہ اہلسنت کے نزدیک بدعتی ہے- کیونکہ سب اہلسنت اس بات پر متفق ہیں- کہ صحابہ کا اجماع حجت ہے- اور نزاع صرف ان کے بعد والوں کے اجماع میں ہے- اور امام احمد امام السنۃ کے لقب سے اس لئے مشہور ہوئے کہ انہوں نے ان مصائب پر صبر کیا- جو ان کو طریق سنت پر پہنچائی گئی تھیں کہ اسے چھوڑ دیں اور دیگر ائمہ (ابو حنیفہ وغیرہ) اس آزمائش سے پیشتر فوت ہو چکے تھے-"

یہی مسلک امام احمدؒ کے تلامذہ امام بخاریؒ و امام مسلمؒ و امام ابوداؤدؒ وغیرہ (رحمہم اللہ

[1] خواجہ ابوالحسن اشعری ۳۳۰ھ میں اور ابو منصور ماتریدی ۳۳۳ھ میں اور امام احمدؒ بن حنبل ۲۴۱ھ میں فوت ہوئے-

[2] منہاج جلد اول ص ۲۵۶-

اجمعین) کا ہے۔ چنانچہ امام بخاریؒ نے ایک کتاب خلق افعال العباد نام معتزلہ کے رد میں اسی نمط پر لکھی [1]

ان کے بعد بھی محدثین کی یہی روش رہی کہ کیا عقائد اور کیا اعمال سب میں نصوص ہی کی پیروی واجب جانتے رہے۔ چنانچہ حافظ ابن حزمؒ ظاہری اندلسی جن کا پایہ جملہ فنون عقلیہ اور جمیع علوم نقلیہ میں مسلم کل ہے "کتاب الفصل" میں معتزلہ مرجیہ' شیعہ اور خوارج کا ذکر کر کے "اہل سنت واہل حدیث" کی نسبت لکھتے ہیں۔

قال ابو محمد واهل السنة الذين نذكر هم اهل الحق ومن عداهم فاهل الباطل فانهم الصحابة رضى الله عنهم وكل سلك نهجهم من خيار التابعين رحمة الله عليهم ثم اهل الحديث ومن اتبعهم من الفقهاء جيلا فجيلا الى يومنا هذا ومن اقتدى بهم من العوام فى شرق الارض وغربها رحمة الله عليهم۔ [2]

اور اہل سنت جن کو ہم اہل حق کے نام سے یاد کریں گے۔ اور ان کے مخالفین کو اہل باطل کے نام سے وہ تو آنحضرت ﷺ کے اصحاب ہیں اور خیار تابعین میں سے بھی جو ان کے طریق پر چلے (وہ بھی اہل سنت ہیں) پھر اہل حدیث اور جو کوئی فقہاء میں سے ان کا پیرو ہو زمانہ بزمانہ ہمارے اس زمانے تک اور عوام میں سے بھی جو کوئی ان کا پیرو ہوا چاہے زمین کے مشرق میں ہے چاہے مغرب میں۔ ان سب پر خدا کی رحمت ہو (یہ سب اہل سنت ہیں!)

اہل حدیث نے بہت عرصہ تک علوم عقلیہ کی طرف توجہ نہ کی۔ بلکہ ان کو سخت نفرت سے دیکھتے رہے۔ اور اپنی قدیم روش (اتباع نصوص) پر قائم رہے۔ لیکن بعد کے زمانوں میں ان میں بھی بڑے بڑے ائمہ معقولات ہوئے جنہوں نے عقائد سلف کو دلائل عقلیہ سے ثابت کر کے اور عقائد بدعیہ کی تردید کر کے مخالفین میں ہمت

---

[1] یہ کتاب مطبع انصاری دہلی میں چھپ چکی ہے۔

[2] کتاب الفصل جلد دوم ص ۱۱۳۔

نہ چھوڑی مثلاً اندلس (اسپین) میں یہی حافظ ابو محمد ابن حزمؒ اور شام میں یہی شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ حرانی جن دونوں کی قوت حافظہ' ذکاوت' طبع اور سرعت انتقال ذہن عام بشری طاقت سے فائق مانی گئی ہے[1] اور جامعیت علوم و فنون میں ان کے برابر کا تیسرا شخص اس امت مرحومہ میں پیدا نہیں ہوا اسی طریق کے تھے۔

الغرض اصول و عقائد میں ایک اہلسنت کے تین مسلک قرار پائے۔ حنبلی' اشعری اور ماتریدی اور انہی میں ان کے فروعی مذاہب بھی شامل ہیں۔ حنابلہ میں حنبلی مقلدین اور اہل حدیث قدیم اشاعرہ میں مالکیہ و شافعیہ اور ماتریدیہ میں حنفیہ۔

تذییل :۔ماتریدی طریق کو اشعری طریق کی طرح فروغ نہیں ہوا۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ ان میں اشعریوں کی طرح امام غزالیؒ' امام رازیؒ و غیرھم کے برابر ائمہ فن نہ ہوئے۔ اور جو ہوئے وہ بھی زیادہ تر ناقل ہی رہے۔ امام نہ ہوئے[2] کہ ان کی تصانیف کو اشعریہ کے مقابلے میں قبولیت ہوتی اور کچھ اس وجہ سے کہ اشعری طریق کے قائل سلاطین نے اپنے مسلک کو بزور پھیلایا۔ تو یہ بیچارے دب گئے اور جو پیچھے ہوئے وہ امام غزالیؒ و امام رازیؒ و غیرہما اشاعرہ ہی کے خوشہ چین ہوئے۔ حتی کہ آجکل ہندوستان و دیگر ممالک ایشیا میں "شرح مقاصد" اور "شرح مواقف" وغیرہما علم کلام کی مشہور و معتبر درسی کتابیں حنفیوں کی لکھی ہوئی ہیں۔ ان کے مصنف اگرچہ ائمہ فن نہیں۔ لیکن ماہر فن ضرور ہیں۔ مگر ان میں زیادہ تر امام غزالی اور امام رازی وغیرہما ائمہ اشعریہ کی نقل ہے اور امام ماتریدی کی نقل بہت کم ہے۔ درسوں میں پڑھنے والے بھی حنفی۔ پڑھانے والے بھی حنفی۔ لیکن جو کچھ پڑھا پڑھایا جاتا ہے وہ سب اشعری ہے گویا آج کل حنفی بھی اشعری ہیں۔ ہاں حنابلہ اور اہل حدیث برابر طریق سلف پر قائم ہیں۔ پس

---

[1] اس امر کو مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے الکلام میں امام ابن حزم اور امام ابن تیمیہؒ کے حال میں ذکر کیا ہے۔

[2] جیسا کہ مالکیوں میں علامہ ابن رشد مغربی ہوئے کہ وہ امام غزالی کے کلام کو اتباعا نقل نہیں کرتے بلکہ اجتہاداً اس پر تنقید کرتے ہیں۔

آج کل صرف دو طریق شائع ہیں' اشعری اور حنبلی۔

اہل سنت کون ہیں :۔ اوپر کے بیان سے صاف واضح ہو گیا کہ اہل سنت سے مراد وہ فرقہ ہے جن کے عقائد قرآن و حدیث کی نصوص کے مطابق ہیں۔ یا یوں کہئے کہ وہ جو دین کی اس حالت پر قائم ہیں۔ جس پر رسول اللہ ﷺ نے اپنی جماعت صحابہ کو چھوڑا تھا۔

امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے "حجتہ اللہ" میں اہل سنت کی تحقیق کے متعلق ایک مبسوط و معقول اور جامع و قابل قبول عبارت لکھی ہے۔ جس کا خلاصہ و حاصل مطلب ہم ناظرین کی سہولت کے لئے اپنی زبان میں لکھتے ہیں۔

"ضروریات دین کی تسلیم کے بعد مسلمان جن مسائل میں مختلف ہوئے۔ وہ دو قسم کے ہیں ایک وہ مسائل جو قرآن کریم و احادیث صحیحہ مشہورہ میں مصرح ہیں۔ اور سلف امت (صحابہ) انہی پر گذرے۔ پس جب لوگوں نے رائے اور قیاس کو دین میں داخل کیا۔ اور اس وجہ سے ان کے کئی ایک مذاہب و فرقے بن گئے۔ تو ایک گروہ تو عقائد سلف کو مضبوطی سے پکڑے رہا اور اصول عقلیہ کی موافقت و مخالفت کی پروانہ کی۔ اور اگر عقلیات سے کام لینے کی حاجت پڑی بھی تو محض خصم کی تردید و الزام کے لئے یا زیادت اطمینان کے لئے دلائل عقلیہ کو بھی بیان کر دیا۔ نہ کہ ان کے رو سے عقائد حاصل کرنے کے لئے۔ پس یہ گروہ تو اہل سنت ہے۔ اور ایک گروہ نے ظاہری معنی چھوڑ کر تاویل اختیار کی۔ کیونکہ وہ مسائل ان کے خیال میں اصول عقلیہ کے خلاف نظر آئے۔ اور انہوں نے مسائل میں تحقیق امر اور بیان حقیقت کے لئے معقولات سے کلام کیا۔ اسی قسم کے مسائل میں سے بعض یہ ہیں۔ سوال قبر' وزن اعمال' پل صراط سے گزرنا' دیدار الٰہی' کرامات اولیاء کہ سب ظواہر کتاب و سنت سے ثابت ہیں اور ان کے ظاہری معانی ہی پر سلف صالحین گذر گئے۔ لیکن جب بعض کے نزدیک علم معقول کا کمر بند ان مسائل کے احاطہ سے تنگ ہو گیا۔ تو بعض نے سرے سے ان کا انکار ہی کر دیا۔ اور بعض نے کہا کہ ہمارا سب پر ایمان ہے۔ اگرچہ ہم کو نہ توان

کی حقیقت معلوم ہے۔اور نہ ہم ان کے متعلق کوئی غلط شہادت ہی جانتے ہیں۔

اور دوسری قسم مسائل کی وہ ہے۔ جن کی کیفیت کے متعلق کتاب و سنت میں تصریح نہیں۔اور نہ صحابہ کے عہد میں ان پر گفتگو ہوئی۔پس وہ مسائل جوں کے توں پڑے رہے۔ حتی کہ ان کے بعد بعض علماء نے ان میں کلام کرنا شروع کیا۔ تو ان کی رائیں ان مسائل کے بیان میں اصل مسئلہ کی تسلیم کے بعد چند وجوہات پر مختلف ہو گئیں۔یا تو دلائل عقلیہ سے استنباط کرنے پر یا تمہید مقدمات اصول کی بنا پر۔یا مجمل کی تفصیل اور مبہم کی تفسیر اور تعیین کیفیت میں مختلف ہونے کے سبب۔اور ان مسائل میں بھی ایک گروہ کا قول وہی رہا۔کہ ہم کو معلوم نہیں کہ ان سے کیا مراد ہے"۔(انتہی)

پس اس قسم دوم کے مسائل کے اختلاف کی نسبت حضرت شاہ صاحب اپنا فیصلہ ان الفاظ میں دیتے ہیں:۔

وھذا القسم لست استصح نرفع احدی الفرقتین علی صاحبتھا بانھا علی السنة۔[۱]

"اس قسم کے مسائل میں میں ایک فرق کو دوسرے فرقہ[۲] پر ترجیح دینے کو صحیح نہیں جانتا کہ ٹھیک وہی سنت پر ہے۔"

اس کے بعد حضرت شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہر ایک گروہ نے وجوہ مذکورہ بالا کی بنا پر جو کچھ بیان کیا ہے۔ ضروری نہیں کہ دوسرے کے مقابلہ میں جمیع جزئیات میں راستی پر ہو[۳] اور چونکہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ کسی شخص کا سنی المذہب قسم اول کے لحاظ سے ہے۔اس لئے علماء سنت آپس میں کثیر مسائل میں اختلاف کرتے چلے آئے ہیں۔ مثلاً اشاعرہ اور ماتریدیہ اور (اسی لئے) تو دیکھتا ہے کہ ہر زمانہ کے حاذق علماء کسی ایسے نکتہ کے بیان سے ہرگز نہیں رکے جو سنت کے خلاف نہ

۱۔ حجۃ اللہ مصری جلد اول ص ۱۰۔

۲۔ یعنی مفوضین و مئولین میں سے ایک کو دوسرے پر

۳۔ یعنی ہو سکتا ہے کہ کسی امر میں ایک صحت پر ہو اور دوسرے میں دوسرا۔

ہو-اگر چہ وہ متقدمین سے منقول نہ ہو-

غرض یہ کہ شاہ صاحب اہل سنت ہونے کے لئے منصوصات میں تو ظواہر کتاب و سنت کی پابندی لازم جانتے ہیں جس طریق پر کہ صحابہ اور خیار تابعینؒ گذرے ہیں-اور غیر منصوص مسائل میں قرآن و حدیث کی موافقت یا کم از کم عدم مخالفت کے ہوتے کسی دیگر کی موافقت کو ضروری نہیں گردانتے خواہ اشعری کے موافق ہو یا ماتریدی کے چنانچہ امام ابن تیمیہ اور امام ابن حزم بھی شاہ ولی اللہ کی طرح ایسے امور میں کسی حد بندی کے قائل نہیں ہیں جیسا کہ ان کی تصانیف منہاج السنۃ -اور کتاب العقل سے ظاہر ہے-

وهذا هو الامر- والله يقول الحق وهو يهدى السبيل

خاکسار میر سیالکوٹی

فروعی اختلاف اور مذاہب اربعہ

اصولی و اعتقادی اختلاف کے علاوہ فروعی اختلاف بھی ہوا- جس کا بیان ہمارا خاص مطلب و مقصد ہے- اس کی نسبت یاد رکھنا چاہئے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد جب فتوحات اسلامیہ تمام علوم میں ہر چہار طرف بڑھ گئیں اور کوئی شے اس سیل رواں کی مزاحمت نہ کر سکی- تو فاتحین یعنی صحابہ کرامؓ مختلف شہروں میں منتشر ہو گئے- یہ مقدس جماعت تبلیغ و اشاعت دین کی شیدائی تو تھی ہی- سلطنت کے ساتھ ساتھ دائرہ مذہب کو بھی اتنا وسیع کرتے گئے کہ تھوڑے ہی عرصہ میں ایران' توران' شام' مصر اور افریقہ میں اسلام ہی اسلام نظر آنے لگا- پس ہر صحابی نے آنحضرت ﷺ کے مختلف احوال میں جو کچھ آپ سے دیکھا سنا تھا- لوگوں سے بیان کیا- جس سے ہر علاقہ کے لوگوں میں زیادہ تر انہی روایات کا رواج ہوا جو ان کو ان صحابہ کے ذریعے سے پہنچیں- جو وہاں سکونت پذیر تھے- مثلاً اہل کوفہ کہ انہوں نے زیادہ تر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ متوطنین کوفہ کی روایات پر اعتماد کیا- اور اہل مدینہ طیبہ کہ ان کی بیشتر روایات حضرت عبداللہ بن عمرؓ حضرت عمرؓ اور حضرت عائشہؓ وغیرھم ساکنین مدینہ طیبہ سے ہیں- اور اہل مکہ کہ ان کو اکثر روایات حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ ساکنین مکہ شریف سے ہیں-

اسی زمانہ تک علم حدیث کتابی صورت میں مدون نہیں ہوا تھا- کہ ہر علاقہ کی روایات ایک جگہ جمع ہو جاتیں- اور نہ تنقید و جمع روایات کے اصول و قواعد منضبط ہوئے تھے کہ تطبیق و ترجیح وغیرہ کے لحاظ سے اختلاف حل کر لیا جاتا- بلکہ ہر علاقہ کے لوگوں نے اپنے ہاں کے صحابہؓ کو مقتدا جان کر ان کی روایات و طریق عمل پر قناعت کی- قطع نظر اس سے کہ دوسرے علاقہ کے صحابی نے اس امر میں کیا روایت کیا- یا اس کا اپنا قول و عمل اس کے متعلق کیا ہے- اور یہ اختلاف محض فروع میں تھا- کیونکہ صحابہ میں

اصول (عقائد) میں اختلاف نہیں ہوا- جیسا کہ سابق فصل میں ظاہر ہو چکا ہے- چنانچہ امام مالک کے حالات میں مذکور ہے- کہ جب خلیفہ ہارون الرشید نے آپ کی کتاب مؤطا کو کعبۃ اللہ میں لٹکانے اور اسے سلطنت اسلام میں دستور العمل اور شاہی قانون بنانے کی نسبت امام مالکؒ سے دریافت کیا تو امام صاحب ممدوح نے جواب دیا کہ ایسا نہیں کرنا چاہئے- کیونکہ فروع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں بھی اختلاف تھا- اور وہ مختلف علاقوں میں جا کر آباد ہوئے اور ہر ایک امر سنت ہے جس کا اجرا ہو گیا- یعنی ہر ایک نے اس علاقہ میں اپنا دیکھا یا سنا بیان کیا- اور لوگوں نے ان سے علم حاصل کیا اور طریق عمل سیکھا- تو اب لوگوں کو ان کے علاقہ کی مرویات صحیحہ سے روکنا نہیں چاہئے-

ازالہ وہم :- شاید آپ کو خیال گذرے کہ آنحضرت ﷺ سے صحابہ نے جو کچھ دیکھا سنا- اس میں اختلاف کس طرح ہو سکتا ہے- اور کیوں؟ تو اس وہم کے دور کرنے کے لئے امور ذیل پر نظر رکھیں-

(۱) شریعت کا ایک حصہ ضروری مسائل کا ہے جنہیں فرائض کہتے ہیں کہ ان پر عمل کرنا ضروری ہے- اور ان میں تساہل و ترک کی گنجائش نہیں- ان میں تو بالکل اختلاف نہیں- دوسرا حصہ عوام الناس کی وسعت و سہولت کی نظر سے ضروری نہیں رکھا گیا- تاکہ اعلیٰ درجے والے جو ترقی کے خواہشمند ہوں وہ ان پر عمل کر کے اپنے کمال پر پہنچ سکیں- اور جو اس درجے کے نہیں بلکہ عوام ہیں وہ ان مسائل میں قاصر رہنے کی وجہ سے گنہگار نہ ٹھہریں- ان مسائل کو سنن و مستحبات کہتے ہیں- آنحضرت ﷺ کبھی تو اعلیٰ فطرت اور کامل استعداد والوں کی ترقی کے لئے اس حصہ مسائل میں سے کسی مسئلہ کو عمل میں لائے اور کبھی آپ نے جمہور الناس کی سہولت کے خیال سے اسے ترک کیا- مثلاً سفر میں روزہ رکھنا اور نہ رکھنا-

(۲) کسی فرض امر یا سنت کے بجا لانے میں عملی کیفیت بھی ایک نہج پر نہیں ہوتی- بلکہ اس میں بھی کئی طریقے جائز ہونے کے علاوہ ضروری و غیر ضروری کا فرق ہوتا

ہے-اس لئے رسول اللہ ﷺ نے اسے کبھی کسی طرح ادا کیا اور کبھی کسی طرح مثلاً صلوۃ تہجد اور صلوۃ خوف کہ اس کی عملی کیفیتیں آنحضرت ﷺ سے متعدد طرح منقول ہیں-اور وہ سب جائز ہیں-

(۳) صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اکثر لوگ کاروباری تھے- آنحضرت ﷺ کی خدمت میں ہر وقت نہیں بیٹھ سکتے تھے-اس لئے ہر ایک نے آپ سے وہی کچھ دیکھا جو اس کے سامنے ہوا-

پس اگر مختلف صحابہ نے مختلف اوقات میں کسی عمل کی مختلف صورتوں کو دیکھا یا غیر ضروری مسائل میں کسی نے فعل کے وقت دیکھا اور دوسرے نے ترک کے وقت تو ہر ایک نے وہی کچھ روایت کیا جو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے کانوں سے سنا تھا-یا حاضر الوقت صحابی نے دیکھ سن لیا اور غیر حاضر نے دیکھا نہ سنا لہذا جب صحابہ کی جماعت مختلف بلاد دنیا میں پھیل گئی- تو جو صحابی جس علاقہ میں جا بسا-اس نے وہاں اپنے معلومات ذکر کئے پس اس وجہ سے ہر علاقے کی معلومات مختلف ہو گئیں-اور اس زمانے میں روایات کا کوئی تعلیمی نصاب تو تھا نہیں-جس میں جمیع مرویات ایک جگہ جمع ہوتیں-اور ان میں تطبیق دی جاتی جیسی کہ محدثین رحمہم اللہ کے جمع کر دینے کے بعد صورت بن گئی-اس لئے اگر "انتشار علم حدیث" سے پیشتر ایک جگہ کے لوگوں کو دوسری جگہ بعض روایات نہ پہنچی ہوں تو کچھ تعجب نہیں-بلکہ واقعتاً نہیں پہنچیں-

چنانچہ استاذ الہند حضرت شاہ صاحب حجتہ اللہ میں فرماتے ہیں-

ثم انهم تفرقوا فی البلاد وصار کل واحد مقتدی ناحیة من النواحی فکثرت الوقائع ودارت المسائل فا ستفتوا فیها فاجاب کل واحد حسب ما حفظه اواستنبط وان لم یجد فیما حفظه اواستنبط ما یصلح للجواب اجتهد برایه و عرف العلة التی ادار رسول الله صلی الله علیه وسلم علیها الحکم فی منصوصاته فطرد الحکم حیث ما وجدها لا یالوا جهدا فی موافقة غرضه

عليه الصلوة والسلام فعند ذلك وقع الاختلاف بينهم على ضروب[۱]

"پھر صحابہ مختلف شہروں میں چلے گئے-اور ہر ایک علاقہ کا مقتدا قرار پایا-پس واقعات کثرت سے ہوئے-اور (اسی طرح) مسائل کا دورہ بھی (بہت) ہوا-تو ان سے ان کے بارے میں فتوے پوچھے گئے-پس ہر ایک نے اس کے مطابق جواب دیا جو کچھ اس کو آنحضرت ﷺ سے یاد تھا یا اس نے استنباط کیا-اور اگر اس (صحابی) نے اپنے محفوظات میں یا استنباطات میں قابل جواب بات نہ پائی-تو اس نے اپنی رائے سے اجتہاد کیا اور اس علت کو پہنچایا-جس پر رسول اللہ ﷺ نے اپنے حکم کا مدار رکھا تھا-پس جس جگہ اس علت کو پایا اس کا حکم لگا دیا-اور آنحضرت ﷺ کی منشا کے موافق چلنے میں (اپنی طرف سے) کوئی کسر باقی نہ چھوڑی پس ایسے اوقات میں ان میں کئی طرح پر اختلاف ہوا-"

رجوع بمطلب :-اس کے بعد شاہ صاحبؒ نے ان وجوہات واسباب اختلاف کا ذکر کیا اور پھر زمانہ تابعین کے متعلق لکھا ہے-

وبالجملة فاختلف مذاهب اصحاب النبى صلى الله عليه وسلم واخذعنهم التابعون كذلك كل واحد ماتيسر له فحفظ ما سمع من حديث رسول الله صلى الله عليه وسلم ومذاهب اصحابه وعقلها وجمع المختلف على ما تيسر له ورجح بعض الاقوال على بعض واضمحل فى نظرهم بعض الاقوال وان كان ماثورا عن كبار الصحابة كالمذهب الماثور عن عمر وابن مسعود فى تيمم الجنب اضمحل عندهم لما استفاض من الاحاديث عن عمار و عمران بن الحصين وغير هما فعند ذلك صارلكل عالم من علماء التابعين مذهب على حياله فانتصب فى كل بلد امام

[۱] حجۃ اللہ جلد اول ص ۱۴۰ مطبوعہ مصر-اختلاف الصحابۃ والتابعین فی الفروع-

مثل سعيد بن المسيب وسالم بن عبد الله بن عمر في المدينة وبعدهما الزهري والقاضي يحيى بن سعيد وربيعة بن عبد الرحمن وعطا بن ابي رباح بمكة و ابراهيم النخعي والشعبي بالكوفة والحسن البصري بالبصر طاؤس بن كيسان باليمن و مكحول بالشام (حجة الله باب مذكور ص ۱٤۳)

"حاصل کلام یہ کہ (ان وجوہات مذکورہ بالا کی بنا پر) صحابہ کے مذاہب مختلف ہوئے- اور ان سے تابعین نے بھی اسی طرح (علم) لیا ہر ایک نے وہ کچھ لیا جو اس کو میسر آیا- پس جو کچھ رسول اللہ ﷺ کی احادیث اور مذاہب صحابہ میں سے سنا- اس کو یاد کر لیا اور سمجھ لیا اور مختلفات کو جس طرح کہ ہو سکا جمع کیا- اور بعض اقوال کو بعض (دیگر) پر ترجیح بھی دی اور (بعض صحابہؓ کے) بعض اقوال ان کی نظر میں ضعیف سمجھے گئے- اگرچہ وہ کبار صحابہ سے منقول تھے مثلاً حضرت عمرؓ اور ابن مسعودؓ سے جنبی کے تیمم کے بارے میں جو کچھ منقول ہے وہ ان کے نزدیک حضرت عمارؓ اور عمران بن حصین وغیرہما کی (مرفوع) روایات کی شہرت کی وجہ سے ضعیف قرار پایا- پس اس وقت علمائے تابعین میں سے ہر ایک کا مذہب الگ قرار پایا- اور ہر شہر میں (ایک نہ ایک) امام قائم ہوا- چنانچہ مدینہ طیبہ میں سعیدؒ بن میبؒ[1] اور حضرت عمر کا پوتا سالمؒ[2] اور ان کے بعد امام

---

[1] سعید بن میب ۱۴یا۱۵ھ میں عہد فاروقی میں پیدا ہوئے- بڑے بڑے صحابہ مثلاً حضرت عمرؓ عثمانؓ عائشہؓ علیؓ ابن عمرؓ ابن عباسؓ اور ابو ہریرہؓ وغیرہما سے روایت کی- تابعین میں سب سے زیادہ علم والے یہی سمجھے جاتے تھے- امام شافعیؒ ان کے سوا کسی دیگر کی مرسل روایت کو نہیں مانتے تھے- انہوں نے چالیس حج کئے- سلاطین کے انعامات قبول نہیں کرتے تھے- بلکہ خود تجارت کر کے روزی کما کر کھاتے تھے- ۹۴ھ میں فوت ہوئے- رحمہ اللہ وایانا

[2] حضرت سالمؒ حضرت عمرؓ کے بیٹے عبد اللہ کے بیٹے تھے- صحابہ میں سے اپنے باپ اور حضرت عائشہؓ ابو ہریرہؓ وغیر ھم سے اور اکابر تابعین مثل سعید بن میب سے روایت کرتے ہیں نہایت زاھد و متقی تھے- اپنے دادا کی طرز پر جفاکشی کی زندگی گزارتے تھے- سادہ خوراک کھاتے اور موٹا کپڑا پہنتے تھے- ایسے ہی لباس میں خلیفہ سلیمان کے پاس گئے- تو اس نے اپنے ساتھ تخت خلافت پر بٹھا لیا- فقہائے سبعہ مدینہ سے ایک یہ بھی تھے ۱۰۶ھ میں فوت ہوئے-

زھری[1] اور قاضی یحییٰ[2] بن سعید انصاری اور ربیعہ[3] الرائے بن عبد الرحمٰن اور
مکہ معظمہ میں عطاء[4] بن ابی رباح اور کوفہ میں امام ابراہیم[5] اور امام شعبی[6] اور

---

[1] امام زہری امام مالک کے استاد ہیں ۵۰ھ میں پیدا ہوئے نہایت ذکی و قوی الحافظ تھے۔ اسی راتوں میں قرآن شریف حفظ کر لیا۔ امام مالک کا قول ہے کہ ان کے وقت میں دنیا میں ان کا کوئی نظیر نہیں تھا۔ ۱۲۴ھ میں فوت ہوئے۔

[2] قاضی یحییٰ انصاری مدینہ طیبہ کے قاضی تھے صحابہ سے حضرت انس بن مالکؓ وغیرہ اور کبار تابعین میں سے سعید بن مسیب وغیرہ سے روایت کی اور ان سے امام مالک وغیرہ نے روایت کی یحییٰ القطان ان کو امام زہری پر بھی ترجیح دیتے تھے۔ ۱۴۳ھ میں فوت ہوئے۔

[3] ربیعہ نے حضرت انس وغیرہ صحابہ اور حضرت سعید بن مسیب وغیرہ کبار تابعین سے روایت کی اور ان سے امام مالک وغیرہ نے۔ یہ فقہ اور حدیث ہر دو میں ماہر تھے۔ فقہ میں مہارت رکھتے تھے اور اسی وجہ سے ان کو ربیعۃ الرای کہتے تھے۔ ۱۳۶ھ میں فوت ہوئے۔

[4] امام عطاء مکہ میں حضرت عمر کی خلافت کے آخیر میں پیدا ہوئے حضرت عائشہؓ ام سلمہؓ ابن عباسؓ ابو سعید خدریؓ ابو ہریرہ وغیرہم صحابہ سے روایت کی اور ان سے محمد بن اسحٰق ابن جریج اوزاعی اور امام ابو حنیفہؒ ایسے بڑے بڑے ائمہ نے روایت کی۔ امام ابو حنیفہؒ کا قول ہے کہ میں نے عطا سے افضل کسی کو نہیں دیکھا مکہ شریف میں ۱۱۴ھ میں فوت ہوئے۔

[5] ابراہیم نخعیؒ۔ امام ابو حنیفہؒ کے دادا استاد (استاذ الاستاد) ہیں۔ باوجود زمانہ تابعین میں ہونے کے کسی صحابی سے علم حاصل نہیں کر سکے۔ علقمہ، مسروق وغیرہما تابعین سے روایت کرتے ہیں۔ کثیر العبادت اور بہت باہیبت تھے۔ شہرت سے بہت بھاگتے تھے۔ نماز میں ایسا استغراق ہوتا کہ اس کے بعد کچھ دیر تک ایسے معلوم ہوتے کہ آپ بیمار ہیں ۹۵ھ کے اخیر میں فوت ہوئے۔

[6] امام شعبی۔ علامہ التابعین کر کے پکارے جاتے تھے جلولا کے سال ۱۷ھ میں حضرت عمرؓ کی خلافت میں کوفہ میں پیدا ہوئے۔ پانچ سو صحابہ سے روایت کی۔ مختلف فنون میں ماہر تھے نہایت عقیل۔ عابد اور متقی اور قوی الحافظ تھے صفحہ کاغذ پر نہ لکھتے تھے بلکہ جو کچھ ہوتا۔ صندوق سینہ میں محفوظ رکھتے تھے۔ امام ابو حنیفہؒ کے اساتذہ میں سے سب سے بڑے یہی ہیں۔ معقول و مسکت اور مختصر پر لطف جواب دینے میں بے مثل تھے۔ ابن ہبیرہ (حاکم کوفہ) نے آپ کو قاضی بنانا چاہا۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ رات کو میرے ساتھ مجلس بھی کیا کرو۔ کہا (ایک کام پر جس پر چاہو لگالو) دونوں نہیں کر سکتا۔"

اسی طرح کسی نے پوچھا حضرت ابلیس کی بیوی کا کیا نام ہے۔ فرمایا میں ان کی شادی میں شریک نہیں ہوا تھا۔

بصرہ میں حضرت حسن بصری[1] اور یمن میں طاؤس بن کیسان[2] اور شام میں مکحول[3] رحمتہ علیہ۔

اسی طرح اختلاف کے بہت سے اسباب ہیں جو حجتہ اللہ' انصاف' رفع الملام (لابن تیمیہؒ) وغیرہ کتب میں مفصل مذکور ہیں۔ بعض کی بنا "فہم کلام" پر ہے اور بعض کی تعیین مسلم پر اور بعض کی تبیین مجمل پر۔ اور بعض کی اصول تنقید پر اور بعض کی شروط اعتبار پر (ان امور کو فقہ اور حدیث کے جامع وماہر علماء خوب جانتے پہچانتے ہیں)

غرض صحابہ وتابعین کے اختلاف میں الحادو بے دینی' کجروی و بد اعتقادی' اتباع ہوئ و بد مذہبی نہیں ہے۔ اور اگر حدیث اختلاف امتی رحمۃ کا اعتبار کیا جائے تو اس کی بس یہی صورت ہے جو صحابہ و تابعین میں تھی۔ اور ائمہ مجتہدین کا اختلاف بھی اسی پر مبنی ہے واللہ الھادی۔

مشہور ہے کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ حدیث رسول اللہ ﷺ کے جمع کر لینے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ جس کی طرف رجوع کر کے اختلافی امور میں فیصلہ کیا جائے۔ یا مختلف روایتوں میں جمع و تطبیق کی جائے۔ یا ان میں ترجیح یا نسخ کا حکم لگایا جا سکے۔ ظاہر ہے کہ یہ امور بغیر جمع احادیث کے ممکن نہیں تھے۔ لہذا عمر بن عبد العزیز خلیفہ نے اپنے عہد خلافت[4] میں اپنے استاد امام ابن شہاب زہری سے کہا تو انہوں نے

---

[1] خواجہ حسن بصریؒ عظیم الشان امام ہیں۔ فقہ و حدیث ہر دو میں ماہر کامل تھے۔ محتاج بیان نہیں ۱۱۰ھ میں فوت ہوئے۔ ان کو ظاہری و باطنی برکتیں ام المومنین حضرت ام سلمہ کا دودھ پینے سے حاصل ہوئیں۔

[2] طاؤس یمنی حضرت عبداللہ بن عباس کے شاگرد ہیں۔ کثیر الحج تھے۔ سفر حج میں مکہ شریف میں ۱۰۶ھ میں یوم ترویہ سے قبل یعنی میدان عرفات میں جانے سے پہلے فوت ہوگئے۔

[3] مکحول شامی' اہل شام کے بلا نزاع امام ہیں۔ اپنے وطن شام کے علاوہ مختلف بلاد مصر' عراق اور مدینہ منورہ کا سفر کر کے علم حدیث حاصل کیا ۱۲۳ھ میں فوت ہوئے۔

[4] خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کا عہد ۹۹ھ سے رجب ۱۰۱ھ تک عہد صدیقی کے برابر یعنی دو سال پانچ مہینے رہا۔ آپ مصر میں پیدا ہوئے اور چھ ماہ چالیس سال کی عمر میں ۱۰۱ھ میں زہر سے فوت ہوئے انا للہ۔

اپنے مرویات جمع کر دیئے- نیز ابو بکر ابن حزم حاکم مدینہ کو لکھا کہ آنحضرت ﷺ کی احادیث میں سے جو کچھ ہو اسے دیکھ بھال کر جمع کر لو- مشتغلین بالحدیث کی طبعیتیں اس طرف لگ پڑیں اور مختلف علاقوں میں مختلف لوگوں نے کچھ کچھ احادیث کتابی صورت میں لکھیں[1] حتیٰ کہ امام زہری کے لائق شاگرد اور علمائے مدینہ کے وارث و جانشین مشرق و مغرب کے استاد امام مالکؒ مدینہ طیبہ میں خاص مسجد نبوی میں مسند تدریس پر بیٹھے اور تشنگان حدیث کی پیاس بجھانے لگے جس سے ان کی کتاب مؤطا[2] تیار ہوئی اس زمانے کی دیگر تصانیف سب ناپید ہیں صرف ایک مؤطا امام مالکؒ باقی ہے- اور آج اسلامی کتب میں قرآن شریف کے بعد سب سے پرانی کتاب یہی ہے (سبحان اللہ اللہ جس کو چاہئے بڑھائے)

مؤطا میں امام مالکؒ نے اہل حجاز کی صحیح صحیح احادیث مرفوعہ لکھیں- اور ان کے ساتھ صحابہ و تابعین وغیرہ کے اقوال و فتاویٰ بھی درج کیے- جو اہل مدینہ کے نزدیک معروف تھے اور ان پر ان کا عمل تھا- چنانچہ حافظ ابن حجر مقدمہ فتح الباری میں فرماتے ہیں-

فصنف الامام مالك مؤطا و توخى فيه القوى من حديث اهل الحجاز و مزجه باقوال الصحابة وفتاوى التابعين ومن بعدهم-[3]

پس امام مالک نے مؤطا تصنیف کیا- اور اس میں اہل حجاز (مکہ و مدینہ) کی قوی احادیث جمع کرنے کی کوشش کی- اور اس میں اقوال صحابہ اور تابعین اور

---

[1] اس کا مختصر ذکر فصل زمانہ اتباع تابعین اور مفصل ذکر حصہ دوم فصل اول تدوین علم حدیث میں دیکھئے-

[2] مؤطا کے معنی ہیں ممہد و مہذب- امام مالک نے اسے بنا سنوار کر اور اس کی احادیث کی خوب جانچ پڑتال کر کے اسے لوگوں کے سامنے رکھ دیا- تو اسے مؤطا کہا گیا اور یا یہ کہ مؤطا کے معنی طریق جاری کے ہیں یعنی چونکہ اس میں وہ احادیث و آثار مذکور ہیں جن پر آنحضرت ﷺ اور صحابہ اور اکابر تابعین کا عمل در آمد تھا- اس لئے اس کا نام مؤطا ہوا-

[3] مقدمہ مطبوعہ دہلی-

اتباع تابعین کے اقوال بھی ملائے۔

اسی طرح کوفہ میں بھی امام سفیان ثوریؒ وغیرہ نے ان روایات کو جمع کیا جو ان میں متعارف تھیں۔ ان بزرگوں میں سے ایک امام شعبی ہیں۔ حضرت عمر کی خلافت میں پیدا ہوئے۔ ان کے وفور علم کے سبب ان کو علامۃ التابعین کہا جاتا ہے۔ یہ بھی اتباع آثار واخبار میں بہت سخت تھے۔ اور قیاس ورائے سے بہت منع کرتے تھے۔[۱]

امام ابو حنیفہؒ اپنے استاد حماد کی مسند تدریس پر بیٹھے آپ نے حفاظ محدثین کی طرح ذخیرہ حدیث جمع نہیں کیا اور نہ اس فن میں کوئی کتاب لکھی۔ البتہ اپنے دادا استاد ابراہیم نخعیؒ کے مسلک پر ان کے اقوال پر تخریجات کرتے تھے جن کو آپ کے شاگردوں میں سے سب سے پہلے امام ابو یوسفؒ نے اور پھر امام محمدؒ نے اپنی تصانیف میں جمع کیا۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ حجۃ اللہ میں فرماتے ہیں۔

وکان ابو حنیفة رضی الله عنه الزمهم مذهب ابراهیم واقرانه لا یجاوزه الاماشاء الله وکان عظیم الشان فی التخریج علی مذهبه دقیق النظر فی وجوه التخریجات مقبلا علی الفروع اتم اقبال۔[۲]

"اور امام ابو حنیفہؒ (حضرت) ابراہیم (نخعیؒ)[۳] اور آپ کے ہم زمانہ کے مذہب کو ان سب سے زیادہ لازم پکڑنے والے تھے۔ اس سے تجاوز نہیں کرتے تھے۔ الا ماشاء اللہ۔ اور آپ کے مذہب پر تخریج کرنے میں بڑی شان رکھتے تھے۔ اور وجوہ تخریجات میں بڑی باریک نظر والے تھے۔ (اور) فروع میں

---

[۱] تاویل مختلف الحدیث لابن قتیبہ ص ۶۹۔

[۲] حجۃ اللہ مصری ج ۱ ص ۱۴۵۔

[۳] امام بخاری اپنی صحیح میں اجتہادی مسائل میں امام ابراہیم نخعی کے اقوال کثرت سے اور عزت سے دیگر علمائے تابعین کے ساتھ ذکر کرتے ہیں جس طرح صحیح بخاری قال الحسن (البصری) سے بھری پڑی ہے اسی طرح (وقال ابراهیم وقال النخعی) سے بھی بھری پڑی ہے کسی کو ان کی بزرگی سے انکار نہیں۔ صحیح بخاری اور فتح الباری کو مطالعہ میں رکھنے والے علماء اس بات کو خوب جانتے ہیں اگر کسی ناقص العلم اور متعصب کو ان کی بزرگی میں کلام ہو تو وہ اپنے دل کا علاج کرے۔

پوری توجہ سے متوجہ تھے۔"

آپ کے بعد آپ کے لائق و مشہور شاگردوں میں سے امام ابو یوسفؒ عہد رشیدی میں عہدہ قاضی القضاۃ پر متعہد ہوئے۔ جس سے آپ کے اقوال مخرجہ کو بہت فروغ ہوا اور وہ ایک مستقل مذہب قرار پایا۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحب عبارت بالا کے تھوڑا آگے فرماتے ہیں۔

وكان اشهر اصحابه ذكرا ابو يوسف رحمه الله فولي قاضي القضاة ايام هارون الرشيد فكان سببا لظهور مذهبه والقضاء به في اقطار العراق وخراسان وما وراء النهر[1]

"اور امام ابو حنیفہ کے شاگردوں میں سے زیادہ شہرت والے (امام) ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہ تھے۔ وہ خلیفہ ہارون الرشید کے عہد میں عہدہ قاضی القضاۃ کے متولی ہوئے تو وہ آپ کے مذہب کی شہرت اور اس کی وجہ سے قضاء کے ملنے کا سبب ہوئے عراق اور خراسان اور ماوراء النہر کے علاقوں میں۔"

امام ابراہیم نخعیؒ ۹۵ھ میں اور امام ابو حنیفہؒ ۱۵۰ھ میں اور امام ابو یوسفؒ ۱۸۱ھ میں اور امام محمد بن حسنؒ ۱۸۹ھ میں فوت ہوئے رحمہم اللہ اجمعین۔

امام شافعیؒ:۔ امام ابو حنیفہؒ کی وفات کے سال یعنی ۱۵۰ھ میں امام شافعیؒ پیدا ہوئے سات سال کی عمر میں قرآن شریف اور دس سال کی عمر میں مؤطا امام مالکؒ حفظ کر لیا[2] پھر مدینہ طیبہ میں جا کر خود امام مالکؒ سے روایت کیا اور حدیث و فقہ میں یکتائے زمانہ ہو گئے۔ حتیٰ کہ پندرہ سال کی عمر میں اپنے اساتذہ مثل مسلم بن خالد کے سامنے فتویٰ دینے لگے اور وہ آپ کی تصدیق کرتے تھے۔

آپ نے ہر دو مذاہب (حنفی و مالکی) کو محدثانہ نظر سے دیکھ کر ان میں اصولی طور پر ایسے امور پائے۔ جو ان کو حدیث رسول اللہ ﷺ کے خلاف نظر آئے۔ اس لئے آپ

---

[1] حجۃ اللہ مصری جلد ۱ ص ۱۴۵۔

[2] تہذیب التہذیب

نے اصول حدیث کے متعلق بہت کچھ چھان بین کی اور اصول فقہ کی بنیاد ڈالی[1] کہ قرآن و حدیث سے اس طرح استنباط کرنا چاہئے اور مختلف احادیث کو اس طرح جمع کرنا چاہئے۔اور قرآن شریف کی آیت اور حدیث کو اس طرح جمع کرنا چاہئے۔

پس آپ کا طریق اجتہاد ہر دو مذاہب سے مختلف ہوا۔ تو آپ کا مذہب بھی مستقل مانا گیا۔امام شافعیؒ کی وفات خلیفہ مامون کے عہد میں ۲۰۴ھ میں ہوئی۔

امام احمد بن حنبلؒ:۔امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے بعد حدیث بہت منتشر ہو گئی اور تصانیف بھی عام ہوتی گئیں۔ حتیٰ کہ امام احمدؒ کا زمانہ آیا تو آپ کے پاس اتنا ذخیرہ حدیث جمع ہو گیا۔کہ کسی کے پاس نہ ہوا تھا۔انہوں نے صرف روایات کو پیش نظر رکھا۔اور دائیں بائیں نظر کرنے کی حاجت نہ سمجھی۔اس لئے خالص احادیث اور آثار کی اتباع کرنے کے سبب آپ کا مذہب الگ گنا گیا۔چنانچہ حضرت شاہ صاحب حجتہ اللہ میں فرماتے ہیں۔

وکان اعظمهم شاناو اوسعهم رواية واعرفهم للحديث مرتبة واعمقهم فقها احمد بن حنبل[2]

"سب سے بڑی شان والے اور وسیع روایت والے اور حدیث شریف کے مراتب کو سب سے زیادہ سمجھنے والے اور فقاہت میں سب سے گہرے امام احمد بن محمد بن حنبل ہوئے۔"

امام احمدؒ کی وفات ۲۴۰ یا ۲۴۱ھ میں ہوئی۔ امام احمد صاحب کے وقت تک علم حدیث کی بہت شہرت ہو گئی۔تصانیف بھی کثرت سے ہونے لگیں۔

---

[1] حاجی چلپی کشف الظنون میں علم اصول کی بحث میں فرماتے ہیں واول من صنف فیہ الامام الشافعیؒ الخ یعنی اول جس نے اس فن میں تصنیف کی امام شافعی تھے۔اسے علامہ السنوی نے تمہید میں ذکر کیا ہے اور اس امر پر (سب کا) اجماع نقل کیا ہے ۱۲ جلد اول (ص ۱۱۴) اتحاف النبلاء میں بھی اسی طرح ہے بلکہ اس میں زیادہ امور میں اولیت ذکر کی ہے ص ۴۵ ۳ مقصد دوم

[2] حجتہ اللہ مصری باب الفرق میں اہل حدیث واہل الرائے جلد اول ص ۱۴۹۔

چنانچہ حضرت حجتہ الہند فرماتے ہیں :

فوقع شیوع تدوین الحدیث والاثر فی بلدان الاسلام و کتابة الصحف والنسخ حتی قل من یکون اھل الروایة الا کان له تدوین او صحیفة او نسخة۔[1]

"پس بلاد اسلامیہ میں احادیث و آثار کی تدوین اور کتابوں اور صحیفوں کے لکھنے کی اشاعت ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ اہل روایت میں سے کوئی کم ایسا ہوا ہو گا جس نے کوئی تصنیف یا صحیفہ یا رسالہ نہ لکھا ہو۔"

اس کے بعد شاہ صاحب نے بہت بسط سے بیان کیا ہے کہ اس زمانہ میں جس جس نے بلاد حجاز و شام و عراق و مصر و یمن و خراسان میں سفر کیا۔ اس نے وہاں کے بزرگوں کو پایا۔ اور کتب کو جمع کیا۔ اور نسخوں کی ڈھونڈ بھال اور غریب حدیث اور نادر اثر کی خوب گہری پڑتال کی۔ اور ان کی ہمت سے احادیث و روایتیں اس قدر جمع ہو گئیں کہ ان سے پہلے کسی کے پاس جمع نہ ہوئی تھیں۔

اس کے بعد بعض اجلہ محدثین کے اسماء گرامی لکھ کر فرماتے ہیں۔

فرجع المحققون منھم بعد احکام فن الروایة و معرفة مراتب الاحادیث الی الفقه فلم یکن عند ھم من الرای ان یجمع علی تقلید رجل ممن مضی مع ما یریدون من الاحادیث والا ثار المناقضة فی کل مذھب من تلك المذاھب (ص ۱٤۸)

"محدثین میں سے بعض محققین فن روایت کو پختہ کرنے اور مراتب احادیث کی معرفت کر لینے کے بعد (علم) فقہ کی طرف متوجہ ہوئے تو ان (مشہور) مذاہب میں سے ہر مذہب میں احادیث و آثار مناقضہ کے ہوتے ہوئے ان کے نزدیک یہ بات جائز نہ ہوئی کہ گذشتہ لوگوں میں سے کسی ایک کی تقلید پر جم جائیں۔"

---

[1] حجتہ اللہ مصری جلد اول ص ۱٤۷

اس مختصر سے بیان سے یہ امر واضح ہو گیا کہ کثیر اختلاف کے وقت بھی محدثین کی جماعت سوائے احادیث رسول اللہ ﷺ کے کسی اور طرف نہ جھکی تھی۔ اور ان کی ساری کوشش جمع احادیث و آثار میں صرف ہوئی اور برابر قرون ثلاثہ کی روش پر قائم رہی۔

محدثین اور مسئلہ تقلید :۔ صحابہؓ تابعین اور تبع تابعینؒ کے وقت تک جو فروعی اختلاف ہو چکا تھا اس میں اتنی خیر تھی کہ اختلاف کے سبب مذاہب کے جدا جدا نام وضع کر کے اپنی اپنی حد بندی الگ نہیں کی گئی تھی۔ بلکہ ہر ایک کے نزدیک یہ امر مسلم تھا کہ حدیث رسول اللہ ﷺ کے مقابلہ میں کسی دوسرے کے قول و فعل کو ترک کر دیا جائے۔ جب تک حدیث نہ پہنچے۔ تب تک تو عذر ہے۔ لیکن بعد حدیث کے کوئی عذر نہیں حتی کہ زمانہ تبع تابعین کے بہت مدت بعد تک بھی یہ تفریق نہ ہوئی تھی چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب حجۃ اللہ میں فرماتے ہیں۔

اعلم ان الناس کا نوا قبل المائۃ الرابعۃ غیر مجمعین علی التقلید الخالص لمذھب واحد بعینہ[1]

"جان لو کہ لوگ چوتھی صدی سے پیشتر کسی ایک معین مذہب کی خالص تقلید پر جمع نہ تھے۔"

فروعی اختلاف کی جو حقیقت ہم نے بالاختصار ذکر کر دی ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ حدیث یک جا جمع نہ ہونے کی وجہ سے اختلاف ہوا۔ لیکن جب حدیث جمع ہو گئی اور صحیح اور سقیم میں تمیز اور ناسخ و منسوخ کی شناخت۔ اور مرفوع و موقوف کا علم ہو گیا۔ تو اب پچھلے اختلاف کو قائم رکھنا اور حدیث رسول اللہ ﷺ کو صرف کتابوں میں جمع شدہ سمجھ کر اس کی اتباع سے رکے رہنا درست نہیں چنانچہ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

فان بلغنا حدیث من الرسول المعصوم الذی فرض اللہ علینا طاعتہ بسند صالح یدل علی خلاف مذھبہ وترکنا حدیثہ واتبعنا

[1] حجۃ اللہ مطبوعہ مصر ص ۱۲۰ جلد اول

ذلك التخمين فمن اظلم منا وما عذرنا يوم يقوم الناس لرب العالمين[1]

"اگر ہم کو رسول معصوم علیہ الصلوۃ والسلام کی حدیث جن کی اطاعت ہم پر خدا نے فرض کی ہے صحیح سند سے پہنچ جائے اور وہ حدیث اس امام کے مذہب کے خلاف ہو (جس کی تقلید ہم نے اختیار کی ہے) اور ہم اس حدیث کو تو ترک کر دیں اور اس (امام کی) ظنی بات (قیاس) کی پیروی کر لیں۔ تو ہم سے بڑھ کر کون ظالم ہو گا؟ اور اس دن جس دن تمام لوگ رب العالمین کے سامنے (جواب دہی کے لئے) کھڑے ہوں گے ہمارا کیا عذر ہو گا؟"

معقولی اور تاریخی طریق پر:- اس امر کو ہم معقولی اور تاریخی طور پر بھی ثابت کر سکتے ہیں۔ جس کا بیان اس طرح ہے کہ کوئی نسبت اپنے منسوب الیہ سے پیشتر متحقق نہیں ہو سکتی۔

مثلاً حنفی کہ امام ابو حنیفہؒ کی طرف اور مالکی کہ امام مالکؒ کی طرف اور شافعی کہ امام شافعیؒ کی طرف اور حنبلی کہ امام احمدؒ بن حنبل کی طرف منسوب ہیں۔ پس یہ چاروں نسبتیں ان چاروں اماموں سے پیشتر متحقق نہیں ہو سکتیں۔ ان بزرگ اماموں کی تواریخ ولادت و وفات پر نظر کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ کتنی صدیوں کے مسلمان ان نسبتوں سے منسوب نہیں ہوئے اور نہ ہو سکتے تھے۔ امام ابو حنیفہؒ ۱۵۰ھ میں اور امام مالکؒ ۱۷۹ھ میں اور امام شافعیؒ ۲۰۴ھ میں اور امام احمد بن حنبل ۲۴۰ھ میں فوت ہوئے۔

ظاہر ہے کہ تیسری صدی کے وسط تک یہ سوال نہیں اٹھ سکتا تھا کہ اہل سنت انہی چار مذاہب میں منحصر ہیں۔ اور جو کوئی ان چاروں میں سے کسی ایک کا حلقہ بگوش اور مقلد ہو کر نہ رہے گا۔ وہ اہل سنت سے نہیں ہے۔ اول اس وجہ سے کہ اہل سنت کا لقب دوسرے فرقوں کے مقابلہ میں اعتقادی اختلاف کے سبب سے پڑا تھا اور وہ ان ہر چہار

---

[1] حجۃ اللہ مصری جلد اول ص ۱۵۵

مذاہب کے فروغ سے جن کی بنا فروعی اختلاف پر ہے پہلے پڑ چکا تھا- چنانچہ امام مسلم مقدمہ صحیح مسلم میں محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ تابعی سے باسناد خود روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا-

فینظر الی اھل السنة فیوخذ حدیثھم وینظر الی اھل البدع فلا یوخذ حدیثھم (ص ۱۱)

''اہل السنتہ کو بھی دیکھا جائے اور ان کی حدیث کو قبول کیا جائے اور اہل بدعت کو بھی دیکھا جائے اور ان کی حدیث کو قبول نہ کیا جائے-''

اس سے معلوم ہوا کہ محمد بن سیرین تابعی کے وقت میں اہل سنت نام مشہور ہو چکا تھا- امام محمد بن سیرین کی وفات ۱۱۰ھ میں بصرہ میں ہوئی- پس اس وقت تک ان مذاہب اربعہ میں سے کسی ایک کا وجود کذائی موجود نہ تھا- فافھم ولا تکن من القاصرین-

دوم :- اس لئے کہ صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین جو بہترین امت ہیں- اس تفریق و حد بندی سے پیشتر ہوئے اور وہ ان میں سے کسی ایک کے بھی پابند نہ تھے- پس حقیقت دو حال سے خالی نہیں ہو سکتی- یا تو معاذ اللہ یہ کہا جائے کہ صحابہ و تابعین و تبع تابعین اہل سنت نہیں تھے- اور یا یہ کہ یہ انحصار و حد بندی نئی ہے جو خیر القرون کے بعد پیدا ہوئی- لہٰذا معتبر نہیں ہے- ان میں سے جو نسی بات گوارا ہو اور مطابق واقع ہو اسے اختیار کر لیں اور دوسری کو ترک کر دیں- والامر الیک وما علینا الا البلاغ-

نقشہ مشتمل بر تواریخ ولادت و وفات حضرات ائمہ اربعۃ

نمبر شمار	نام امام	تاریخ ولادت	مقام ولادت	تاریخ وفات	مقام وفات
۱	امام ابو حنیفہؒ	۸۰ھ	کوفہ	۱۵۰ھ	بغداد
۲	امام مالکؒ	۹۳ھ	مدینہ طیبہ	۱۷۹ھ	مدینہ طیبہ
۳	امام شافعیؒ	۱۵۰ھ	غزہ (ضلع عسقلان) علاقہ شام	۲۰۴ھ	مصر قاہرہ
۴	امام احمد بن حنبلؒ	۱۶۸ھ	بغداد	۲۴۱ھ	بغداد

قرون ثلثہ :- صحیح بخاری میں حضرت عمران بن حصین صحابیؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا-

(میری امت میں سے) میرا زمانہ سب سے بہتر ہے- پھر وہ لوگ جو ان سے ملیں گے- پھر وہ لوگ جو ان سے ملیں گے (حضرت عمران صحابی کہتے ہیں) مجھے یاد نہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے زمانہ کے ذکر کے بعد دو دفعہ (دو زمانوں کا) ذکر کیا- یا تین دفعہ-

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ صحابہؓ اور تابعینؒ اور اتباع تابعینؒ بہترین امت ہیں- انہی تین زمانوں کو قرون ثلثہ کہتے ہیں اور چونکہ آنحضرت ﷺ نے ان کی خیریت کی خبر دی ہے- اس لئے ان کو قرون مشہور لها بالخیر بھی کہتے ہیں- اب ان ہر سہ کی حدیں بھی ملاحظہ فرمادیں-

حدود قرون ثلثہ :- آنحضرت ﷺ کا زمانہ ۱۱ھ تک ہے کیونکہ آپ کی وفات شریف ربیع الاول ۱۱ھ میں ہوئی اور صحابہؓ کا زمانہ ۱۱۰ھ تک ہے کیونکہ آخری صحابی ابو طفیلؓ ۱۱۰ھ میں فوت ہوئے اور تابعین کا زمانہ ۱۸۰ھ تک ہے اور اتباع تابعین کا زمانہ

گذشتہ سے پیوستہ

ل دوسرے حج یعنی ۱۳۹۰ھ کے سفر حج میں مدینہ شریف کی زیارت کی سعادت حاصل ہوئی تو قبرستان جنت البقیع میں امام مالک کی قبر مبارک کی بھی زیارت نصیب ہوئی-

ع ۱۳۹۰ھ کے سفر حج کے ضمن میں کئی ایک دیگر بلاد اسلامیہ کے سفر کا بھی موقع ملا- مثلاً حیفا' یافا' بیت المقدس' دمشق پورٹ' سعید' سویز اور مصر (قاہرہ) مصر میں جمعہ کی نماز جامعہ شافعیہ میں مع اپنے رفقاء حج و ٹیلر ماسٹر عبداللہ سیالکوٹی پڑھی اسی کے متصل امام شافعی کی قبر شریف ہے اس کی بھی زیارت کی- بعد ازاں شیخ عبدالوہاب شعرانی شافعیؒ کے مرقد منور کی زیارت کی اور نماز مغرب ان کی مسجد میں ادا کی- اس گنہگار کو سب بزرگان دین کی طرح ان سے بھی کمال حسن عقیدت ہے اور میں نے ان کی کتب سے سلوک و فروع کے متعلق بہت فیض حاصل کیا- اللھم زدنی حب الصالحین-

ے امام شافعیؒ آنحضرتؐ کے جد امجد حضرت عبدالمطلب کے بھائی مطلب کی اولاد سے ہیں آپ ۱۵۰ھ میں شہر عسقلان کے موضع غزہ علاقہ شام میں پیدا ہوئے اور دودھ پینے کی مدت گزرنے پر اپنے وطن مکہ شریف میں لائے گئے اور وہیں بڑھے پلے (تہذیب التہذیب)

۲۲۰ھ تک ہے [1]

اس بیان سے واضح ہو گیا کہ قرون خیار کی میعاد ۱۸۰ھ یا زیادہ سے زیادہ ۲۲۰ھ تک ہے۔ اور ہر چار مذہب کی تقلید اس معیاد تک ثابت نہیں ہوئی۔ کیونکہ چوتھے امام یعنی امام احمد رحمتہ اللہ علیہ کی وفات ۲۴۱ھ میں ہوئی اور یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ امام احمدؒ کی تقلید ان کی زندگی میں واجب جانی تھی حالانکہ وہ خود فرمایا کرتے تھے۔ لا تقلد فی ولا ملکا (عقد الجید للمحدث الدہلوی) پس جس طریق پر قرون ثلثہ مشہود لہا بالخیر گذرے وہی طریق سنت ہے۔ اور وہ کیا تھا۔ بغیر اینچ پیچ اور کھینچ تان کے اور بغیر کسی خاص معین شخص کی تقلید کے قرآن و حدیث پر اور جو بطریق توارث و تعامل جماعت صحابہؓ سے ثابت ہوا اس پر عمل کرنا چاہا چنانچہ حجۃ الہند حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں۔

> "(اے پڑھنے والے) تو جان لے کہ (امت مرحومہ کے) لوگ چوتھی صدی ہجری سے پیشتر بعینہ کسی خاص مذہب کی تقلید پر جمع نہیں تھے (حجتہ اللہ مصری جلد اول ص ۱۵۲)

اسی طرح شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ اپنی مایہ ناز کتاب منہاج السنہ میں فرماتے ہیں۔

> "اور اہل السنہ والجماعت میں سے ایک اور قدیم اور معروف مذہب ہے۔ جو اس وقت سے بھی پیشتر کا ہے۔ جب کہ خداوند تعالیٰ نے امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ اور امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کو پیدا کیا تھا۔ اور وہ صحابہ کا مذہب ہے۔ جنہوں نے وہ مذہب اپنے نبی (ﷺ) سے سیکھا تھا۔ اور جو شخص اس کے

---

[1] مستفاد از فتح الباری وغیرہ کتب شروح حدیث وکتب طبقات العلماء۔

نوٹ خاص تابعین تک تو حدیث کے الفاظ یقینی ہیں اور اتباع تابعین کے لئے راوی کو شک ہے لیکن ہم نے مدت کو لمبا کر کے ان کے زمانہ کو بھی شمار کر لیا ہے تاکہ ظاہر ہو جائے کہ اتباع تابعین تک بھی تقلید شخصی کا رواج نہیں پڑا تھا۔ جیسا کہ آئندہ انشاء اللہ آپ بالاستقلال بھی ملاحظہ فرما لیں گے۔

خلاف چلے وہ اہل سنت کے نزدیک بدعتی ہے (منہاج السنہ جلد اول ص ۲۵۶)"

اس بیان سے عیاں ہو گیا کہ مذہب اہل سنت والجماعت ائمہ اربعہؒ سے پیشتر کا ہے۔ پس اس کو انہی چار اماموں کے مقلدین میں محصور جاننا علم تاریخ کے خلاف ہے۔

بحث تقلید بحیثیت مسئلہ

ہم نے باب سوم کی فصل سوم میں حاشیہ پر لکھا تھا کہ یہ تاریخی بیان ہے۔ مسئلہ تقلید کی مستقل بحث انشاء اللہ الگ فصل میں کی جائے گی۔ سو یہ فصل اس وعدہ کے ایفاء کے لئے ہے۔ واللہ الموفق

اس فصل میں چند عنوان ہیں :۔

عنوان اول تقلید کی تعریف میں

علمائے اصول نے تقلید کی تعریف حسب ذیل کی ہے :۔

(۱) علامہ کمال الدین ابن ہمام حنفی اپنی کتاب تحریر میں ارقام فرماتے ہیں۔

التقلید العمل بقول من لیس قوله احدے الحجج بلا حجة منها

(جلد ۳ ص ۳۴۰ مطبوعہ مصر)

"تقلید نام ہے اس شخص کے قول پر عمل کرنے کا جس کا قول حجج (دلائل اربعہ) میں سے نہیں ہے۔ بغیر دلیل (جاننے کے) ان (چاروں) میں سے۔"

(۲) اور امام جلال الدین محلی جمع الجوامع میں فرماتے ہیں۔

التقلید اخذ القول من غیر معرفة دلیله

(جمع الجوامع جلد ٤ ص ٣٦١)

"تقلید نام ہے بات کو بغیر اس کی دلیل جاننے کے قبول کر لینے کا۔"

(۳) حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اس کے ساتھ کچھ وضاحت کر کے فرماتے ہیں :۔

التقلید هو قبول قول بلا حجة ولیس ذلك طریقا الی العلم لا فی الاصول ولا فی الفروع (المستصفی جلد دوم ص ٣٨٧)

"کسی قول کو بغیر دلیل قبول کر لینے کو تقلید کہتے ہیں اور یہ علم کا کوئی بھی

طریقہ نہیں ہے نہ اصول میں نہ فروع میں"

عنوان دوم انواع تقلید اور اس کے حکم میں

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ عقد الجید میں تقلید کی دو قسمیں واجب اور حرام بتا کر ہر ایک کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص قرآن اور حدیث اور آثار صحابہ سے ناواقف ہو وہ کسی متدین و متقی عالم سے پوچھ کر عمل کر لے۔ پھر اس کی علامت کی بابت فرماتے ہیں۔

وامارة هذا التقليد ان يكون عمله بقول المجتهد كالمشروط بكونه موافقا للسنة فلا يزال متفحصا عن السنة بقدر الامكان فمتى ظهر حديث يخالف قوله هذا اخذ بهذا الحديث واليه اشار الائمة (عقد الجيد مطبوعه لاهور ص ٨٤)

"اور اس قسم کی تقلید کی نشانی یہ ہے کہ مجتہد کے قول پر اس کا عمل کرنا مثل اس شرط کے مشروط ہو کہ وہ قول سنت (نبویہؐ) کے موافق ہو پس وہ مقلد ہمیشہ سنت کے معلوم کرنے کی کوشش میں لگا رہے۔ پس جب اس کو کوئی ایسی حدیث مل جائے۔ جو مجتہد کے اس قول کے خلاف ہو تو اس حدیث کو اختیار کر لے اور حضرات ائمہ علیہم الرحمۃ نے اسی امر کی طرف اشارہ کیا ہے۔"

حضرت شاہ صاحبؒ تقلید کی دوسری قسم کی بابت جو حرام ہے فرماتے ہیں۔

فان بلغه حديث واستيقن بصحته لم يقبله لكون ذمته مشغولة بالتقليد فهذا اعتقاد فاسد و قول كاسدليس له شاهد من النقل والعقل وما كان احد من القرون السابقة يفعل ذلك (ص ٨٥)

"پس اگر اس مقلد کو حدیث نبویؐ مل جائے اور اس کو اس کی صحت کا یقین بھی ہو جائے تو اس حدیث کو قبول نہ کرے اس وجہ سے کہ اس کا ذمہ تقلید سے مشغول ہے۔ تو یہ اعتقاد فاسد ہے اور کھوٹی بات ہے۔ عقل و نقل

(شرعی سے) اس کا کوئی بھی شاہد نہیں ہے اور قرون سابقہ میں اس پر کوئی بھی عمل نہیں کرتا تھا۔"

(۴) اسی طرح علامہ ابن عابدین جو متاخرین حنفیہ میں بڑے پائے کے عالم ہوئے ہیں شرح در مختار میں فرماتے ہیں۔

اذا صح الحدیث وکان علی خلاف المذهب عمل بالحدیث ویکون ذلك مذهبه ولا یخرج مقلده من کونه حنفیا بالعمل به فقد صح عنه انه قال اذا صح الحدیث فهو مذهبی (شامی جلد اول ص ۷۰ مطبوعه مصر)

"جب حدیث صحیح ثابت ہو جائے اور وہ اپنے (تقلیدی) مذہب کے خلاف ہو تو حدیث پر عمل کرے اور وہی اس (امام) کا مذہب ہوگا۔ اور اس حدیث پر عمل کرنے سے امام صاحب کا مقلد حنفی ہونے سے خارج نہیں ہو جائے گا کیونکہ آپ سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جب حدیث صحیح ثابت ہو جائے تو میرا وہی مذہب ہے۔"

(۳) اسی طرح قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ کی تفسیر مظہری میں سے تفسیر جامع البیان کے حاشیہ پر زیر آیت اِتَّخَذُوۡا اَحبَارَهُمۡ وَرُهۡبَانَهُمۡ اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ (پ-۱۰ سورۃ توبہ) نقل کیا ہے کہ :-

اس سے صاف ظاہر ہے کہ جب کسی کے نزدیک آنحضرتؐ کی صحیح اور مرفوع حدیث ثابت ہو جائے جو معارضہ سے بھی سلامت ہو اور اس کا ناسخ ظاہر نہ ہو اور فتوی (امام) ابو حنیفہؒ کا مثلاً اس کے خلاف ہو اور چاروں اماموں میں سے کسی امام کا اس حدیث کے موافق مذہب ہو تو اس شخص پر اس ثابت شدہ حدیث کی پیروی واجب ہے۔ اور اسے اپنے مذہب (تقلیدی) پر جم رہنا اس بات سے نہیں روک سکتا کہ خدا کے سوا ایک دوسرے کو رب بنا لینا لازم نہ آوے (انتہی مترجماً) حاشیہ تفسیر جامع البیان مطبع فاروقی دہلی طبع اول ص ۵۳)

عنوان سوم ائمہ اربعہؒ کے اقوال دربارہ تقلید و اتباع سنت-

یہ عنوان تتمہ یا ضمیمہ ہے عنوان سابق کا- تفصیل اس کی یوں ہے کہ تقلید غیر منصوص احکام میں ہوتی ہے اور وہ بھی اس شرط سے کہ اپنے میں اہلیت استدلال و نظر کی نہ ہو- لیکن جب نص شرعی موجود ہو- یا آدمی خود اہل نظر و اہل علم ہو تو اس پر دلیل کی پیروی واجب ہے- اس امر میں کسی اہل علم کا اختلاف نہیں ہے- یہ سب باتیں اوپر کے دونوں عنوانوں سے معلوم ہو سکتی ہیں لیکن مزید توضیح کے لئے ہم کچھ حوالجات بھی ذکر کرتے ہیں-

(۱) امام عبدالوہاب شعرانی مصری[۱] نے الیواقیت و الجواہر اور میزان کبریٰ[۲] میں اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے انصاف اور عقد الجید میں اس کے متعلق ائمہ اربعہ کے اقوال نقل کئے ہیں- امام شعرانی رحمتہ اللہ علیہ نے میزان میں ائمہ اربعہ کے مفصل اقوال ذکر کر کے فرمایا-

واما مانقل ان الائمة الاربعة رضی الله عنهم اجمعین فی ذم الرای فاولهم تبريأ من کل رأی یخالف ظاهر الشريعة الامام الاعظم ابوحنيفة النعمان بن ثابت رضی الله عنه خلاف مايضيفه اليه بعض المتعصبين و يافضيحته يوم القيمة من الامام اذا وقع الوجه فی الوجه فان من کان فی قلبه نور لا يتجرأ ان يذکر احدا من الائمة بسوء واين المقام من المقام اذا الائمة کالنجوم فی السماء وغيرهم کاهل الارض الذين لا يعرفون من النجوم

---

[۱] امام عبدالوہاب شعرانیؒ مصر کے اولیاء اللہ سے تھے ۹۷۳ھ یا ۹۷۶ھ میں فوت ہوئے- مجھ نابکار کو ان سے بہت عقیدت ہے ۱۳۲۰ھ کے سفر حج کے ضمن میں مصر- حیفا- یافہ- بیت المقدس اور دمشق کا سفر کیا- اس میں مصر میں ان کی مسجد میں نماز مغرب ادا کی اور ان کے مزار مقدس پر فاتحہ پڑھی- آپ شافعی تھے لیکن بہت متادب تھے- آپ کثیر التصانیف ہیں رحمتہ اللہ-

[۲] الیواقیت والجواہر جلد ۲ ص ۸۵'۸۶ اور میزان کبریٰ جلد اول ص ۴ تا ۵۳-

الاخیالها علی وجه الماء فقدی روی الشیخ محی الدین فی الفتوحات المکیة لبسنده الی الامام ابی حنیفة رضی الله عنه انه کان یقول ایاکم والقول فی دین الله تعالی بالرای وعلیکم باتباع السنة فمن خرج عنها ضلّ (میزان کبری ص ۵۰)

(لیکن جو کچھ ائمہ اربعہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے رائے کی مذمت میں نقل کیا گیا ہے۔ سب سے اول بیزاری کرنے والا ہر ایسی رائے سے جو ظاہر شریعت کے خلاف ہو امام اعظم ابو حنیفہؒ نعمان بن ثابت ہے۔ خدا تعالیٰ اس سے راضی ہو برخلاف اس کے جو کچھ آپ کی طرف بعض متعصب لوگ نسبت کرتے ہیں۔ پس کیسی رسوائی ہو گی اس (متعصب) کی دن قیامت کے (حضرات امام (صاحب) کی طرف سے جب رو در رو ہوں گے۔ کیونکہ جس کے دل میں نور ہے وہ ہرگز جرات نہیں کرتا کہ کسی امام کو برائی سے یاد کرے اور اس (متعصب) کا مقام (اماموں کے) مقام (کے مقابلہ میں) کہاں ہے؟ کیونکہ امام آسمان کے ستاروں کی طرح ہیں اور ان کے سوا دوسرے لوگ مثل اہل زمین کے ہیں۔ جو ستاروں کی بابت کچھ نہیں جانتے سوائے خیال کے 'اوپر پانی کے۔ اور بیشک شیخ محی الدین ابن عربیؒ نے فتوحات مکیہ میں اپنی سند سے امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ (اکثر) فرمایا کرتے تھے (اے لوگو!) تم خدا کے دین میں اپنی رائے سے کچھ کہنے سے بچو اور لازم پکڑو اتباع سنت کو کیونکہ جو کوئی اس سے خارج ہوا وہ گمراہ ہو گیا۔

اسی طرح امام شعرانی رحمۃ اللہ علیہ اس سے پیشتر بعض صحابہؓ اور ائمہ کے اقوال دربارہ مذمت رائے میں ذکر کرنے کے بعد تبصرۃً فرماتے ہیں۔

فکانوا رضی الله عنهم لا یجترء احد منهم ان یخرج من السنة قید شبر (میزان جلد اول)

"پس وہ امام خدا ان سے راضی ہو کوئی ان میں سے اس بات کی جرات نہیں کرتا تھا کہ سنت سے ایک بالشت بھر بھی باہر جائے۔"

اس طرح کے اور بھی کئی ایک حوالے ہیں جو وسیع المطالعہ علماء سے مخفی نہیں ہیں۔ لیکن ہم نے یہ دو نادر حوالے عوام کی آگاہی کے لئے لکھ دیے ہیں واللہ الہادی۔

عنوان چہارم التزام مذہب معین

مطلق تقلید کے بعد اس امر کی بحث بھی ہے کہ آیا مذاہب اربعہ مشہورہ میں سے کسی معین کی پابندی ضروری ہے یا نہیں؟ اس کو دوسرے الفاظ میں تقلید شخصی کہتے ہیں۔ مطلق تقلید کو ہر حال میں واجب جاننے والے اس کو بھی واجب جانتے ہیں۔ اور تقلید کی تقسیم کرنے والے اسے واجب نہیں جانتے۔ اگرچہ یہ امر عنوانات سابقہ میں غور کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ بحث اہل حدیث اور حضرات حنفیہ میں بہت طویل ہو کر معرکۃ الآراء ہو گئی ہے۔ اس لئے ہم اسے مستقل عنوان سے بھی بیان کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس کے لئے کسی لمبی چوڑی بحث کی ضرورت نہیں۔ حنفی علمائے اصول۔ (رحمہم اللہ) میں سے دو محقق و مدقق علماء کی تحریر کافی ہے۔ چنانچہ ہم ذیل میں علامہ محب اللہ بہاری (حنفی) رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب مسلم الثبوت اور اس کی شرح فواتح الرحموت مصنفہ علامہ بحر العلوم حنفی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ لفظی درج ذیل کرتے ہیں۔

"اور اگر کسی معین مذہب کا التزام کر لیا یعنی اپنے نفس سے عہد کر لیا کہ وہ اس مذہب پر ہے۔ مثل مذہب (امام) ابو حنیفہؒ وغیرہ کے۔ بغیر اس کے کہ یہ التزام ہر ہر مسئلہ کی دلیل پہچان لینے سے ہو۔ گمان کر کے اس کے راجح (اور) افضل دیگر مذاہب معلومہ کی دلائل پر۔ بلکہ یہ عہد اپنے نفس سے ہوا جمالی طور پر اس کی فضیلت کے ظن سے یا دیگر سبب سے۔ تو کیا اس مذہب پر قائم رہنا اس کے لئے لازم ہے یا نہیں؟ پس کہا گیا ہے کہ ہاں قائم رہنا واجب ہے۔ اور اس مذہب سے دوسرے مذہب کی طرف انتقال کرنا حرام

ہے- حتی کہ بعض متاخرین متکلمین نے تشدد کیا ہے اور کہا ہے کہ اگر کوئی حنفی- شافعی ہو جائے تو اس کو سزا دی جائے- اور یہ شریعت بنانا ہے اپنے نفسوں سے کیونکہ یہ التزام اس میں غلبہ حقیقت کے ظن سے خالی نہیں- پس نہ چھوڑا جائے- ہم (مولانا بحرالعلوم) کہتے ہیں کہ ہم اس کو تسلیم نہیں کرتے- کیونکہ کوئی شخص کبھی لازم پکڑتا ہے دو متساوی امروں میں سے ایک کو اپنے فی الحال نفع کے لئے اور اپنے آپ سے دفع حرج کے لئے- اور اگر اس کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو یہ اعتقاد (التزام مذہب معین) کسی شرعی دلیل سے پیدا نہیں ہوا بلکہ وہ ایک ہوس ہے اس معتقد کی ہوسات میں سے- اور ہوس پر قائم رہنا واجب نہیں- پس (اے قاری) تو (اس کو) سمجھ اور (اس پر) ثابت رہو- اور (یہ بھی) کہا گیا ہے کہ نہیں واجب قائم رہنا اور انتقال کرنا درست ہے- پس یہی وہ حق ہے جو اس بات کے لائق ہے کہ اس پر ایمان اور اعتقاد رکھا جائے- لیکن مناسب نہیں کہ یہ انتقال بطور تلہی (کھیل) کے ہو- کیونکہ تلہی (کھیل) قطعاً حرام ہے- مذہب میں ہو یا اس کے سوا میں- کیونکہ نہیں کوئی واجب مگر جس کو اللہ تعالی نے واجب کیا- اور حکم اسی کا ہے- اور اس نے نہیں واجب کیا کسی پر کہ کوئی اماموں میں سے کسی خاص امام کا مذہب لازم پکڑے پس اس کو واجب گردانا نئی شریعت ایجاد کرنا ہے- اور (اے قاری) تجھے جائز ہے اس بات سے استدلال کرنا کہ اختلاف علماء کا ایک رحمت ہے نص سے- اور آسائش ہے خلقت کے حق میں- پس اگر کسی خاص مذہب پر عمل کرنا لازم کیا جائے تو یہ تکلیف اور شدت ہو گی- اور (یہ بھی) کہا گیا ہے کہ جس نے لازم گردانا ہے وہ مثل اس کی ہے جس نے لازم نہیں گردانا پس وہ نہ رجوع کرے اس سے جس میں اس نے اس کی تقلید لازم پکڑی- اور اس کے سوا میں جس کی چاہے تقلید کر لے اور اسی پر (امام) سبکی ہے شافعیہ میں سے- اور تحریر (ابن ہمامؒ) میں ہے

اور ظن غالب اسی پر ہے کیونکہ بوجہ نہ ہونے اس چیز کے جو اس کو شرعاً واجب کرے یعنی اس وجہ سے کہ ایک ہی مذہب کی پیروی کے لئے کوئی موجب شرعی نہیں۔ اور یہ دعوے کی ایک جزو پر دلالت کرتا ہے وہ یہ کہ وہ تقلید کرلے جس کی چاہے۔"

پھر (یہ کہ) یہ بیان قطعی ہے کہ جس چیز کو شرع واجب نہ کرے وہ باطل ہے کیونکہ رائے کے ساتھ شرع بنانی حرام ہے۔ لیکن یہ بات کہ وہ نہ رجوع کرے اس سے جس میں اس نے تقلید کی ہے۔ پس نہیں لازم آتی اس سے یہ بات قطعاً پس (اے قاری) تو اس میں تامل کرلے" (فواتح الرحموت مع مستصفے الامام الغزالیؒ مطبوعہ مصر جلد دوم ص ۴۰۶ طبع اول[1])

عنوان پنجم۔ اہل حدیث کا مسلک مبین

کیا ہمارے حنفی بھائی ہم اہل حدیثوں کے متعلق یہ خیال رکھتے ہیں کہ ہم تقلید سے مطلقاً انکار کرتے ہیں اور عوام کو تعلیم کرتے ہیں کہ وہ باوجود رسول اللہ ﷺ کی حدیث یا اقوال صحابہؓ نہ ملنے کے اور خود بھی کتب متداولہ مشہورہ میں علمی قابلیت نہ رکھنے کے اقوال ائمہ کو (معاذ اللہ) ٹھکرا دیا کریں۔ اور مادر و پدر آزاد ہو کر جو چاہیں سو کیا کریں۔

اگر ان کا یہی خیال ہے تو ہم صاف الفاظ میں اعلان کرتے ہیں کہ انہوں نے ہمارا مسلک سمجھنے میں تحقیق سے کام نہیں لیا۔ عنوانات سابقہ میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ زیادہ تر حنفی متبحر علماء کی تحریرات سے نقل کیا گیا ہے۔ اگر آپ ان کے مطابق عمل پیرا

---

[1] ملا علی قاری حنفیؒ شرح عین العلم میں زیر لفظ ثم الاحوط فرماتے ہیں کہ یہ (یعنی احوط پر عمل کرنا) طریقہ سنیہ حضرات صوفیہ رحمہم اللہ اجمعین کا طریقہ ہے حتیٰ کہ کہا گیا ہے کہ مذاہب اربعہ کے ساتھ یہ پانچواں مذہب ہے جلد اول بحث علم ص ۳۵ طبع مصر) اس سے ظاہر ہے کہ حضرات صوفیہ کے نزدیک التزام مذہب معین کا لازم نہیں ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ حضرات صوفیہ کے نزدیک التزام مذہب معین کا لازم نہیں ہے۔

ہوں تو ہمارا بھی اس پر صاد سمجھیں- تاکہ روزمرہ کی نزاع مٹ جائے- اور ہم ہر دو فریق خوشی سے کہیں ؎

کون کہتا ہے کہ ہم تم میں جدائی ہو گی
یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہو گی

(ا) ہمارے بے نزاع اور بے نظیر پیشوا شیخنا و شیخ الکل شمس العلماء حضرت مولنا سید نذیر حسین صاحب محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ نے (جن کے علم و فضل اور تقوے و دیانت اور سلامت روی و بے نفسی میں کسی کو کلام نہیں) اپنی مایہ ناز کتاب معیار الحق میں اس مسئلہ کو نہایت تفصیل سے بیان فرمادیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے-

باقی رہی تقلید وقت لاعلمی سو یہ چار قسم ہے قسم اول واجب ہے- اور وہ مطلق تقلید ہے- کسی مجتہد کی مجتہدین اہل سنت میں سے- لاعلے التعیین جس کو مولانا شاہ ولی اللہؒ نے عقد الجید میں کہا ہے کہ یہ تقلید واجب ہے- اور صحیح ہے باتفاق امت قسم دوم مباح ہے اور وہ تقلید مذہب معین کی ہے- بشرطیکہ مقلد اس تعیین کو امر شرعی نہ سمجھے- قسم ثالث حرام و بدعت ہے- اور وہ تقلید ہے بطور تعیین بزعم وجوب کے برخلاف قسم ثانی کے- قسم رابع شرک ہے- اور وہ ایسی تقلید ہے کہ وقت لاعلمی کے مقلد نے ایک مجتہد کی اتباع کی- پھر اس کو حدیث صحیح غیر منسوخ غیر معارض مخالف مذہب اس مجتہد کے معلوم ہو گئی- تو اب وہ مقلد بدستاویز ان عذرات کے جن سے سابقاً بخوبی جواب دیا گیا ہے- یا تو حدیث کو قبول ہی نہیں کرتا- اوریا اس میں بدوں سبب کے تاویل و تحریف کر کے اس حدیث کو طرف قول امام کے لیجاتا ہے- غرض یہ کہ وہ مقلد مذہب اپنے امام کا نہیں چھوڑتا" (ص ۴۲ '۴۳ ۴۴)

اسی طرح اسلامی دنیا میں اہل حدیث کے مسلم پیشوا اور مجتہد امام شوکانی رحمتہ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۵۰ھ) نے القول المفید میں ادلہ تقلید پر سیر کن بحث کی ہے اور اپنی بے نظیر تفسیر فتح القدیر میں آیت ولا تقف ما لیس لك به علم (بنی اسرائیل پ ۱۵) کو اور آیت ان الظن لا یغنی من الحق شیاء (النجم پ ۲۷) کے عموم کو مخصوص البعض

کہہ کر اتباع رائے کی جائز اور ناجائز صورتیں صاف الفاظ میں بیان کرتے ہیں- اور کوئی صاحب علم جو نصوص قرآن و حدیث پر بالغ نظر رکھتا ہو- اور اس کو خدا نے علوم خادمہ میں سے بھی کافی حصہ دیا ہو اور طبع کی سلامتی اور اصابت رائے کی نعمت بھی بخشی ہو اس تقسیم سے گریز نہیں کر سکتا- ورنہ نصوص کی عدم رعایت سے (معاذ اللہ) شریعت مہمل و بیکار سمجھی جائے گی- اور بصورت فقدان نص اجتہاد کی ضرورت کو تسلیم نہ کرتے ہوئے- شریعت اسلامی عالمگیر اور تاقیام قیامت قائم نہ جانی جائے گی- اور یہ دونوں باتیں درست نہیں ہیں- نیز یہ کہ فقہ حنفی میں کتاب ہدایہ میں مسائل فقہیہ کی اسناد میں روایات سے جو ثبوت پیش کیا ہے- اور ان کی تائید میں اصولی و معقولی باتیں سمجھائی ہیں- اس میں امام برہان الدین مرغینانی مصنف ہدایہ کی سعی معاذ اللہ بے سود گنی جائے گی- اور یہ بات سوائے کسی جاہل اور بے سمجھ کے کون کہے گا- ہذا واللہ الہادی-

فرقہ جدیدہ وقدیمہ کی شناخت کے اصول اور ان کی رو سے اہل حدیث کی قدامت

حدیث مشکوٰۃ شریف جس کی بابت اوپر مفصل مذکور ہو چکا ہے اس کے رو سے ہر فرقہ اپنے مخصوص مسائل کو جن کی رو سے وہ دوسرے فرقوں سے ممتاز و الگ گنا جاتا ہے۔ کتاب وسنت پر پرکھے۔ اور اپنے مخصوص طرز استدلال اور رائے وقیاس سے کام نہ لے۔ بلکہ نصوص شرعیہ کو امام بنا کر ان کی پیروی کو لازم پکڑے۔ اور ان میں کسی دیگر فرقے کی مخالفت و موافقت کا لحاظ اور اپنے فرقہ کے متروک ہو جانے کا اندیشہ نہ کرے۔ تو خدا کے فضل سے روز روشن کی طرح حق و باطل میں تمیز ہو جائے گی اور واضح ہو جائے گا کہ ۔

اهل الحديث هم اهل النبي وان
لم يصحبوا نفسه انفاسه صحبوا

”یعنی صرف اہلحدیث ہی آنحضرت ﷺ کے اہل ہیں اگرچہ انہوں نے آپ کی ذات کی صحبت نہیں پائی لیکن ان کو آپ کے انفاس (کلمات) طیبہ یعنی احادیث مطہرہ کی صحبت تو ضرور ہے۔ یعنی احادیث نبویہ ان کا دن رات کا ورد زبان اور دستور العمل ہیں۔“

اس اجمالی اور مختصر طریق کے بعد ہم ایک دیگر تفصیلی طریق فیصلہ بھی لکھتے ہیں۔ جو دلائل عقلیہ ونقلیہ ہر دو سے ممزوج ہے اور وہ یہ ہے کہ کسی فرقہ کی جدت وقدامت معلوم کرنے کے لئے تین باتوں پر نظر کرنی چاہیے۔

اول اس فرقہ کے منسوب الیہ کو دیکھیں کہ اس کا وجود کب ہوا یعنی اس امر کی تحقیقات کریں کہ یہ فرقہ جس کی طرف منسوب ہے وہ کب وجود پذیر ہوا؟ عام اس سے کہ منسوب الیہ کوئی شخص ہو یا کچھ اور۔ کیونکہ ضروری ہے کہ ہر منسوب اپنے

منسوب الیہ کے بعد موجود ہو اور یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ کوئی نسبت اپنے منسوب الیہ سے پیشتر قائم ہو جائے۔ کیونکہ نسبت ایک وصف ہے اور منسوب الیہ موصوف ہے اور کسی وصف کا قیام بغیر موصوف کے نہیں ہو سکتا۔ منسوب الیہ خواہ کوئی خاص شخص ہو یا مقام فن یا قوم مثلاً بنی آدم حضرت آدم علیہ السلام کی طرف منسوب ہو کر آدمی کہلاتے ہیں تو ان کا وجود حضرت آدم علیہ السلام سے پیشتر نہیں ہو سکتا۔ پس اہلحدیث جو سب نسبتوں سے منقطع ہو کر صرف آنحضرت ﷺ کی حدیث پاک کی طرف منسوب ہیں ان کی جدت و قدامت کے لئے حدیث نبویؐ کی طرف نظر کی جاوے گی کہ اس کی ابتداء کب سے ہے جس کی بنا پر وہ فخریہ کہتے ہیں۔ ع

کسی کا ہو رہے کوئی نبی کے ہو رہے ہیں ہم

اس میں تو کسی کو بھی کلام نہیں کہ علم حدیث آنحضرت ﷺ کے اقوال و افعال و تقاریر کا مجموعہ ہے اور یہ سب آنحضرت ﷺ کے زمان برکت نشان ہی میں ہو سکتے ہیں۔ پس گروہ اہل حدیث انہیں پاک لوگوں کے نام لیوا و جانشین ہیں۔ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں آپ کے اقوال و افعال پر عمل پیرا تھے اور اس میں بھی کسی کو کلام نہیں کہ آنحضرت ﷺ کی موجودگی میں صرف کتاب اللہ اور آپ کے اقوال و افعال کی پیروی تھی۔ نہ تو کسی کی رائے پر عمل تھا اور نہ کسی کے قیاسی اصول پر شرعیات کی بنا رکھی جاتی تھی۔ اور خود منصب رسالت پر نظر کرنے سے بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی موجودگی میں آپ کے سوا کوئی دوسرا شخص واجب الاتباع ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اب قرآن مجید تو وہی ہے اور سب فرقوں میں یکساں مسلم ہے۔ لیکن آنحضرت ﷺ کی ذات بابرکات کی بجائے آپ کے وہی اقوال و افعال جو آپؐ صحابہؓ کے سامنے فرمایا اور کیا کرتے تھے کتب حدیث میں جمع ہیں۔ اور ہمارے دستور العمل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اہل حدیث بانخصیص حدیث نبوی کو اپنا منسوب الیہ قرار دیتے ہیں۔

اہل حدیث کے سوا جس قدر فرقے ہیں۔ چونکہ ان کے منسوب الیھم (پیشوا)

آنحضرت ﷺ سے پیچھے ہوئے۔ اس لئے وہ فرقے بھی جدید ہیں اور حقیقت میں انہی لوگوں نے دین واحد میں فرقہ بندی کی اور ایک امت کو کئی فرقوں میں تقسیم کر دیا۔

"فتقطعوا امرھم بینھم زبرا ط کل حزب بما لدیھم فرحون"

(المومنون پ ۱۸)

"(انبیائے سابقین علیہم السلام کے بعد ان کے) امتیوں نے امر دین کو آپس میں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ ہر گروہ اسی پر نازاں ہوا جو ان کے ہاں (مسلم) تھا۔"

تنبیہ :-

چونکہ علم حدیث کی کامل تدوین آنحضرت ﷺ سے بہت عرصہ پیچھے ہوئی۔ یعنی آپ کے افعال و اقوال کو کتابی صورت میں آپ کے بعد ضبط کیا گیا۔ اس لئے بعض لوگ یہ شبہ کرتے ہیں کہ اہل حدیث بھی آپ کے بعد ہوئے۔ نیز یہ کہ حدیث نبوی کی پیروی بھی بعد میں کی جانے لگی۔ یہ لوگ نکتہ رسی سے کوسوں دور ہیں۔ اور یہ بات ان کی غلط فہمی کی علامت اور حدیث پاک سے بدظنی کی نشانی ہے کیونکہ کسی علم کا مستعمل و رائج ہونا امر دیگر ہے اور اس کا کتابی صورت میں مدون ہونا امر دیگر ہے۔ علم حدیث ہی پر کیا موقوف ہے۔ جملہ علوم و فنون کی تدوین اور ان کے تعلیمی و کتابی قواعد کی بنا ان کے رواج و استعمال کے بعد ہوئی اب تو ہر پیشہ کتابی صورت اختیار کر رہا ہے۔ کیا کوئی عقلمند اس سے یہ نتیجہ نکالے گا کہ یہ علوم و فنون اور پیشے و دستکاریاں جو دنیا میں فن کتابت جاری ہونے سے بھی پہلے کے ہیں۔ مثلاً زباندانی و منطق (نطق ظاہری و ادراک باطنی) نئے ہیں۔ حالانکہ ان کے قواعد و مصطلحات سینکڑوں برس بعد بنائے گئے۔ پس اگرچہ علم حدیث مکمل کتابی صورت میں آنحضرت ﷺ کے بعد آیا۔ اور اس کے اصول و مصطلحات پیچھے لکھے گئے۔ لیکن اس کا استعمال اور اس پر عمل درآمد اور اس کا واجب الاتباع ہونا زمانہ نبوت اور عصر صحابہ میں برابر تھا۔ جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ تو اسی عہد سعادت مہد اور زمان برکت نشان کے واقعات کی حکایت ہے اور بس۔ مثلاً نماز و غیرہ عبادات اور معاملات احکام جو کتب حدیث میں مروی ہیں۔

عصر نبوت وعہد صحابہ میں برابر مستعمل تھے اور اسی لئے ان کو "مروی" کہا جاتا ہے کہ وہ زمانہ تدوین سے سابق زمانہ کے حال کی حکایت ہیں- پس جب اسی عمل درآمد کو بعد کے زمانہ میں روایۃً مع اسناد مدون کیا گیا تو کتابت وتدوین نئی ہوئی نہ کہ علم وعمل- پس یہ شبہ بالکل بے بنیاد ہے- واللہ الہادی-

امر دوم :- جس پر کسی فرقے کی جدت وقدامت کے متعلق نظر ضروری ہے- یہ ہے کہ اس فرقے کے امتیازی اصول ومسائل کو دیکھا جائے کہ آیا یہ اصول صاحب شرع کے مقرر کردہ ہیں یا اس کے بعد کسی دیگر نے ان سب کو یا ان میں سے بعض کو وضع کیا-

اس پر نظر کرنے سے یہ فائدہ ہوگا کہ جس فرقے کے امتیازی اصول ومسائل صاحب شرع یعنی آنحضرت ﷺ کے مقرر کردہ ہوں گے- اس کو آپؐ سے خصوصی نسبت اور حقیقی تعلق ہوگا- اور جس فرقے کے تمام یا بعض اصول ومسائل مخترعہ ہوں گے وہ فرقہ از روئے ایک خاص فرقہ ہونے کے مبلغ شریعت پیغمبرؐ برحق فداہ روحی کی طرف **حقیقۃً** منسوب نہیں ہو سکے گا- بلکہ اس کی نسبت اس شخص کی طرف صحیح ہوگی جس نے اس کے اصول ومسائل وضع کئے- چنانچہ جہمیہ کو اس نام سے اس لئے پکارا گیا کہ ان کے مسائل مخصوصہ ان کے امام وپیشوا جہم بن صفوان نے اختراع کئے- اور صفات باری عز اسمہ اور مسئلہ جبر وقدر کی جو کیفیت ان کے ہاں مسلم ہے وہ نہ تو زمانہ نبوت میں تعلیم کی گئی اور نہ عصر صحابہؓ میں اس کا کوئی قائل تھا- پس چونکہ اہل حدیث کا اصل اصول یہ ہے ؎

اصل دین آمد کلام اللہ معظم داشتن
پس حدیث مصطفےٰ برجان مسلم داشتن

اور یہ اصول اپنی ذاتی شہادت سے بغیر کسی خارجی دلیل کی احتیاج کے ظاہر کر رہا ہے کہ میں اپنے نبی محمد رسول اللہ ﷺ کے وقت سے ہوں اس لئے اہل حدیث کی ابتدا بھی جو اس اصول کے پابند وقائل ہیں- آنحضرت ﷺ سے ہے- اسی بنا پر وہ علی روس

الا شہاد کہتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں "ہمارا کوئی عقیدہ اور کوئی طریق عمل اور کوئی طریق عبادت ایسا نہیں۔ جو آنحضرت ﷺ کا سکھایا یا فرمایا ہوا نہ ہو۔ یا عصر صحابہؓ میں اس پر عمل نہ ہوتا ہو" اور سب مراتب کے بعد یہ کہ ہمارا ظاہر و باطن بالکل قرآن و حدیث کے مطابق و موافق ہے۔ اور اس میں سر مو کسی طرح کا تخالف نہیں ہمارے کسی عقیدے اور کسی عمل میں کوئی ایسی بات نہیں جو قرآن شریف کی کسی نص یا حدیث نبوی کے کسی بیان یا ہر دو کے صحیح استنباط سے ذرہ برابر بھی مخالف ہو ہمارے جمیع مسلمات اعتقادیہ و عملیہ (اصولیہ و فروعیہ) ہمارے نزدیک ٹھیک اسی صورت میں تسلیم کئے جاتے ہیں۔ جس صورت میں صحابہؓ میں تسلیم کئے جاتے تھے اور آنحضرت ﷺ نے ان کو تعلیم کئے تھے یا کم از کم بصورت نص موجود نہ ہونے کے قرآن و حدیث سے صحیح طور پر مستنبط ہیں، نہ تو وہ استنباطات مخالف نصوص ہیں اور نہ ان کی بنا محض قیاس و رائے پر ہے۔

امر سوم:۔ جس پر کسی فرقے کی جدت و قدامت کی نسبت نظر کرنی ضروری ہے یہ ہے کہ تاریخی طور پر اس فرقے کے اصول کو دیکھا جائے کہ ان پر عمل در آمد کب شروع ہوا۔ آیا مبلغ شرع پیغمبرؐ خدا کے وقت میں۔ یا اس (آپؐ) کے بعد صدر اول میں ان اصول متنازعہ پر عمل در آمد تھا یا نہیں۔

یہ اس لئے ہے کہ ہو سکتا ہے کہ کوئی فرقہ قرآن و حدیث میں کھینچ تان کر کے اور اپنے خود ساختہ مقدمات و اصول قیاس اور قواعد اجتہاد قائم کر کے اپنے اصول کو پرانے قرار دے لے۔ لیکن دیکھنا تو یہ ہے کہ جس صورت میں یہ اصول و مسائل ہمارے سامنے پیش کئے جاتے ہیں۔ آیا اس صورت نے اس سے قبل عہد نبوت و عصر صحابہؓ میں بھی عملی شکل اختیار کی تھی۔ کیونکہ اسلام عملی مذہب ہے اور اس کا علم بھی عمل سے متعلق ہے۔ محض ذہنی نہیں ہے۔ اور آنحضرت ﷺ اسلام کے آخری نبی ہیں۔ اور صحابہؓ آپ سے علم و عمل حاصل کرنے والے ہیں۔ اگر تاریخی طور پر ثابت ہو جائے کہ یہی پیش افتادہ صورت زمان برکت نشان میں مسلم تھی۔ تو اس فرقے کے قدیم ہونے میں اور اپنے صاحب شرع کے وقت سے ہونے میں کلام نہیں۔ ورنہ اس

کا نیا فرقہ ہونا یقینی ہے۔ بحمدہ اس اصول کے رو سے بھی "اہل حدیث" اپنے پرانے اصول ؎

اصل دین آمد کلام اللہ معظم داشتن
پس حدیث مصطفےٰ برجاں مسلم داشتن

کو دہراتے ہیں نیز سب کو ؎

ما اہلحدیثیم دغارا نشناسیم
با قول نبی چون و چرا رانہ شناسیم

سنا کر کہتے ہیں "زمان سعادت اقتران میں اسی پر عمل تھا۔ عہد صحابہ میں یہی دستور العمل تھا۔ عصر تابعینؒ میں اسی کا رواج تھا۔ اس کے سوا کوئی دیگر امر واجب الاتباع والاطاعۃ نہیں سمجھا جاتا تھا" آیت اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم ولا تتبعوا من دونہ اولیاء[1] (اعراف پ ۸) میں اسی روش کی تاکید ہے اور آیت وما اتکم الرسول فخذوہ وما نھکم عنہ فانتھو[2] (حشر پ ۲۸) کا حکم اسی پر مبنی ہے۔

پس اہلحدیث کے قدیم ہونے اور آنحضرت ﷺ کے وقت سے ہونے میں کوئی شبہ نہ رہا۔ وللہ الحمد

❁ ❁ ❁

[1] پیروی کرو اس کی جو تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے اتارا گیا ہے۔ اور اس کے سوا (خود ساختہ) دوستوں کی پیروی نہ کرو۔

[2] جو کچھ تم کو (خدا کا) رسول دے اسے لے لو اور جس سے روکے اس سے باز رہو۔

فرقہ اہل حدیث کا ذکر کس پرانی کتاب میں ہے

اس عنوان سے اس وہم کا دور کرنا مقصود ہے جو اس زمانہ میں بعض کم علم اور غیر محقق لوگوں کو پڑتا ہے کہ فرقہ اہل حدیث کی ابتدا زیادہ سے زیادہ ایک صدی سے کچھ اوپر کی ہے۔ کیونکہ ان کا نام محمد بن عبدالوہاب نجدی کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے وہابی ہے اور اس کی ولادت ۱۱۱۵ھ میں اور وفات ۱۲۰۶ھ میں ہوئی پس یہ ایک نیا فرقہ ہے۔

(۲) فرقہ اہل حدیث کی قدامت بلحاظ اصول (عقائد) اور فروع (عملیات) کے ہم سابقہ بدلائل ثابت کر آئے ہیں۔ اس فصل میں ہم صرف یہ جتانا چاہتے ہیں کہ اہل حدیث کا ذکر ان کتابوں میں موجود ہے۔ جو شیخ محمد بن عبدالوہاب سے صدیوں پیشتر لکھی گئیں۔ پس ان کی مذہبی نسبت شیخ موصوف کی طرف ہرگز درست نہیں کیونکہ کوئی منسوب شان نسبت میں اپنے منسوب الیہ سے پیشتر نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک ایسا تاریخی ثبوت ہوگا جس سے کوئی انصاف پسند انکار نہیں کر سکے گا اس کے بعد ہم بتائیں گے کہ جس امر میں اہل حدیث' حنفی اور شافعی مقلدین سے ممتاز ہیں اسی امر میں شیخ محمد بن عبدالوہاب سے بھی مختلف ہیں۔ پس ان کو وہابی کہنا ہرگز درست نہیں۔

علم شریعت کے مختلف شعبے ہیں مثلاً تفسیر' حدیث' فقہ' اصول' کلام اور تاریخ وغیرہ ہر شعبہ کی قدیم و جدید تصانیف میں برابر اہل حدیث کا ذکر عزت سے پایا جاتا ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ ان مصنفین کی نظر میں ضرور ایک گروہ موجود تھا جن کی تحقیقات و تنقید کی سب کو احتیاج تھی۔ بعض جگہ تو ان کا ذکر لفظ اہل حدیث سے ہوا ہے اور بعض جگہ اصحاب حدیث سے بعض جگہ اہل اثر کے نام سے اور بعض جگہ محدثین کے نام سے۔ مرجع ہر لقب کا یہی ہے کہ چونکہ اس گروہ باشکوہ کو احادیث و آثار نبویہ سے ایک خاص انس و شفقت ہے۔ اس لئے ان کو ان پیارے القاب سے یاد کر

کے صرف آنحضرت ﷺ کی طرف منسوب کیا گیا- اور مقولہ "از مصطفٰے شنیدن واز دیگراں بریدن" اور مصرع

کسی کا ہو رہے کوئی نبی کے ہو رہے ہیں ہم

کو صادق کر دکھایا گیا- اور نسبت رسولؐ کو جو اس شعر ؎

اهل الحديث هم اهل النبي وان
لم يصحبوا نفسه انفاسه صحبوا

میں مذکور ہے- ثابت کر کے زبان حال سے آنحضرت ﷺ کی طرف سے چار دانگ عالم میں ڈنکا بجادیا- ؎

در سخن پنہاں شدم چون بوئے گل در برگ گل
ہر کہ دیدن میل دار د در سخن بیند مرا

چنانچہ مولانا حالی مرحوم اسی گروہ حق پژدہ کے وصف میں یوں رطب اللسان ہیں-

گروہ ایک جویا تھا علم نبی کا لگایا پتہ جس نے ہر مفتری کا
نہ چھوڑا کوئی رخنہ کذب خفی کا کیا قافیہ تنگ ہر مدعی کا
کئے جرح و تعدیل کے وضع قانوں
نہ چلنے دیا کوئی باطل کا افسوں

اسی دھن میں آساں کیا ہر سفر کو اسی شوق میں طے کیا بحر و بر کو
سنا خازن علم دیں جس بشر کو لیا اس سے جا کر خبر اور اثر کو
پھر آپ اس کو پرکھا کسوٹی پہ رکھ کر
دیا اور کو خود مزا اس کا چکھ کر

کیا فاش راوی میں جو عیب پایا مثالب کو چھانا مناقب کو تایا
مشائخ میں جو قبح نکلا جتایا ائمہ میں جو داغ دیکھا بتایا
طلسم ورع ہر مقدس کا توڑا
نہ ملا کو چھوڑا نہ صوفی کو چھوڑا

رجال اور اسانید کے ہیں جو دفتر   گواہ ان کی آزادگی کے ہیں یکسر
نہ تھا ان کا احساں یہ اک اہل دیں پر   وہ تھے اس میں ہر قوم و ملت کے رہبر
لبرٹی میں جو آج فائق ہیں سب سے
بتائیں کہ لبرل بنے ہیں وہ کب سے

مولانا حالی مرحوم کی یہ توصیف اس زمانے کے متعلق ہے۔ جب اسلامی سلطنت نہایت عروج پر تھی۔ اس کا پھریرا چار اطراف عالم میں لہرا رہا تھا۔ اس کے اقبال کا ہما سارے جہان پر سایہ افگن تھا۔ ترقی و تہذیب اس کی آستان بوسی سے فخر حاصل کرتی تھی اور تمدن و سیاست خوشامد سے اس کے پاؤں پڑتے تھے۔ حتی کہ دنیا کے بڑے بڑے جابر اور گردن کش بادشاہ سر سے فرعونیت و جبروت کی ہوا نکال کر اس کی حلقہ بگوشی و غلامی کو مایہ ناز و سرمایہ افتخار سمجھ چکے تھے اسی واسطے کہا گیا ہے۔ ع

لقب سلطان ہے غلامان محمدؐ کا

اور ایشیا' یورپ اور افریقہ کے اکثر ممالک ان کے زیر نگیں تھے۔

چین و عرب ہمارا ہندوستان ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہیں سارا جہاں ہمارا

پس اہل حدیث کو باعتبار زمانہ کے نیا فرقہ کہنا ایسا ہی ہے جیسا کہ بلحاظ اصول و مسائل کے اسے جدید قرار دینا۔ اگر ہم اہل حدیث کا ذکر کتب حدیث میں دکھائیں۔ تو شائد کسی کو وہم ہو کہ ان کتابوں میں ان کا ذکر کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ یہ کتابیں تو محدثینؒ ہی کی تصنیف ہیں۔ اس لئے ہم ان کے علاوہ دیگر فنون کی کتب کے حوالے بھی پیش کریں گے۔

علم حدیث کی کتابوں کے حوالے اس لئے مفید ہیں کہ زمانہ اسلام میں قرآن مجید کے بعد سب سے پہلے جس علم کی تدوین ہوئی وہ وہی ہے جو قرآن کریم کا توام ہے یعنی فن حدیث چنانچہ یہ امر تاریخی حوالوں سے اس فصل سے ظاہر ہو گا جس میں کتابت و تدوین حدیث کا بیان ہو گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

وجہ تسمیہ اہل حدیث :- اس موقعہ پر یہ بات خاص طور پر ملحوظ رہے - کہ چونکہ نام کا تقرر تمیز و تعارف کے لئے ہوتا ہے اور صدر اول و قرون ثانی میں یعنی صحابہؓ و تابعینؒ میں اختلاف کی بنا پر مذاہب کی بنیاد نہیں پڑی تھی اور امت کو مختلف فرقوں میں تقسیم کرنے کی حدیں نہیں کھینچی گئی تھیں بلکہ صرف کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کا تقید تھا اور آنحضرت ﷺ کے سوا کسی دیگر شخص کی شخصیت کو شریعت میں داخل نہیں کیا جاتا تھا- غرض کوئی دوسرا فرقہ تھا ہی نہیں اس لئے کسی سے ممتیز ہونے کے لئے الگ نام کی ضرورت نہیں پڑی تھی- حتی کہ جب مجتہدین کے اقوال کو حجت گردانا گیا- اور مختلف مذاہب کی بنیادیں قائم ہو گئیں تو جن لوگوں نے طرز اول اور زمانہ سابق کی ہر طرح کسی شخصیت کو دین میں داخل کرنے کے بغیر صرف کتاب و سنت سے دین حاصل کرنا اپنا دستور رکھا اور راویوں کی روایت اور ان کی درایت میں فرق کیا اور اپنے عمل و اعتقاد کی بنا صرف سمعیات (قرآن و حدیث) پر رکھی وہ اہل حدیث ' اصحاب حدیث ' اہل اثر اور محدثین کہلائے- چنانچہ یہ بات حجتہ اللہ کی طویل عبارت میں پہلے گذر چکی ہے اور باقی سب یا تو اپنے اپنے امام و مقتدا کی طرف منسوب ہوئے- جس کی شخصیت کو انہوں نے دوسرے فرقوں میں حد فاصل قرار دیا تھا اور اس کے مجتہدات کو بجائے خود اصل و سند مانا تھا- مثلاً حنفی و شافعی باعتبار امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کی طرف منسوب ہونے کے - اور یا اس مسئلے کی طرف منسوب ہوئے جس میں انہوں نے اصحاب حدیث سے اختلاف کیا- مثلاً قدریہ بسبب تقدیر کے منکر ہونے کے اور جبریہ بلحاظ جبر محض کے قائل ہونے کے اور مرجیہ بوجہ اعمال کو ایمان سے جدا کرنے اور محض ایمان پر امید نجات دلانے کے -

یہ اس شبہ کا جواب ہے جو بعض ناواقف پیش کیا کرتے ہیں کہ اہل حدیث اگر قدیم ہیں تو یہ لقب زمان صحابہ و تابعین میں کیوں مشہور نہیں ہوا-

اس اعتقادی و فروعی اختلاف سے پیشتر عصر صحابہؓ میں بھی ایک عظیم اختلاف ہوا تھا جس کی بنا امور سیاست پر تھی- لیکن بعد کو وہ بھی مذہبی و اعتقادی اختلاف بن

گیا اور امت میں ایک عظیم تہلکہ مچ گیا- مثلاً شیعہ کو اصل میں یہ اس گروہ کا نام تھا- جو امیر معاویہؓ کے مقابلہ میں حضرت علیؓ کا حامی تھا اور خارجی اس طائفہ کا نام تھا جو امر تحکیم میں حضرت علیؓ سے الگ ہو کر آپ پر اعتراض کرتا تھا[1] لیکن آج وہ معتقدات میں اہل سنت کے مدمقابل ہیں- اور اگر تاریخی سراغ لگائیں تو معلوم ہوگا کہ "اہل سنت وجماعت" کا ممتاز لقب انہی بدعی فرقوں کے مقابلے میں وضع کیا گیا تھا جیسا کہ سابقاً معلوم ہو چکا ہے-

آج کتب حدیث میں سب سے پرانی مؤطا امام مالک ہے- امام ہمام کی پیدائش مدینہ طیبہ میں پہلی صدی کے اخیر عشرہ ۹۳ھ میں خلیفہ ولید بن عبد المالک اموی کے عہد میں ہوئی اور وفات مدینہ طیبہ ہی میں عصر بنی امیہ کے بعد ۱۷۹ھ میں خلیفہ ہارون الرشید عباسی کے زمانہ میں ہوئی- اس وقت تک علم اسلامی تمام شمالی افریقہ کو فتح کر کے سپین وغیرہ ممالک یورپ میں لہرا رہا تھا- امام مالکؒ کا فیض حدیث ان تمام ممالک اسلامیہ میں پہنچ چکا تھا- چنانچہ مؤطا کا آخری نسخہ عام طور پر متداول ہے یحیٰی بن یحیٰی مصمودی کی روایت سے ہے- جو امام مالکؒ کے بلاواسطہ شاگرد تھے- اور اہل سپین سے تھے- موطا میں فرقہ بندی کا ذکر نہیں ہے اور نہ اس میں مسائل کا بیان بطور تردید فرقہ کے ہے-

(ا) امام مالک کے لائق شاگردوں میں سے ایک امام شافعیؒ ہیں جو ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۰۴ھ میں فوت ہوئے جس سے زمانہ تبع تابعین ختم ہو گیا- آپ اپنے سفر نامہ مولفہ امام سیوطی میں جو آپ نے اپنے شاگرد ربیع بن سلیمان مصری کو املا کرایا تھا فرماتے ہیں-

یلقانی الرجال واصحاب الحدیث منهم احمد بن حنبل و سفیان بن عینیه و اوزاعیؒ (رحلة الشافعی ص ١٤)

"مجھے عام لوگوں بھی ملتے تھے اور اصحاب حدیث بھی جن میں سے بعض یہ

---

[1] چنانچہ یہ امر باب اول کے ضمیمہ فصل سوم میں بالتفصیل مذکور ہو چکا ہے-

ہیں احمد بن حنبل اور سفیان بن عینیہ اور اوزاعیؒ [۱]

(۲) اسی طرح توالی التاسیس میں کئی جگہ امام شافعیؒ کی زبانی اور بعض جگہ تذکرہ مصنف یعنی (حافظ ابن حجر) کے الفاظ میں الفاظ اصحاب الحدیث اور اہل الحدیث مذکور ہیں۔ ان مواقع میں سے ایک موقع بہت لطیف ہے کہ مصنف علام نے اہل الحدیث کو روش و طریق و اجتہاد و حفظ نصوص میں اہل الرائے (کوفیوں) کے مقابلے میں ذکر کیا ہے چنانچہ امام شافعیؒ کے جامع الفقہ والحدیث ہونے کی بابت فرماتے ہیں فاجتمع له علم اهل الرای وعلم اهل الحدیث حافظ ابن حجر ۷۷۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۸۵۲ھ میں فوت ہوئے۔

(۳) کتاب جامع الترمذی تو اہل حدیث اور اصحاب الحدیث کے ذکر سے بھری پڑی ہے۔ چنانچہ ہم چند مواقع بطور نمونہ درج کرتے ہیں۔

جلد اول مطبوعہ مجتبائی دہلی ص ۴ سطر ۳' نیز ص ۶ سطر ۲۳' نیز ص ۹ اور سطر ۲۳' نیز ص ۱۰ سطر ۳۔

اسی طرح امام ترمذی "کتاب العلل" میں بھی کئی جگہ ذکر کرتے ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے ص اول سطر ۲۵ امام ابو عیسٰی ترمذی ۲۰۹ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۷۹ھ میں فوت ہوئے۔

(۴) کتب فقہ حنفی میں بھی اہل حدیث کو ایک "فرقہ" کر کے لکھا ہے۔ چنانچہ علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی ردالمحتار شرح الدر المختار جلد سوم ص ۲۹۳ و ص ۲۹۴ میں فرماتے ہیں۔

حکی ان رجلا من اصحاب ابی حنیفة خطب الی رجل من اصحاب الحدیث ابنته فی عهد ابی بکر الجوز جانی فابی الا ان

[۱] امام احمدؒ بغداد کے رہنے والے ہیں امام ابو سفیان بن عینیہؒ کوفہ کے اور امام اوزاعی شام کے جغرافیہ اور نقشہ ایشیا پر نظر رکھنے والے اصحاب جان سکتے ہیں کہ بغداد' کوفہ اور شام میں کس قدر بعد مسافت ہے۔ اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ امام شافعیؒ کے وقت میں جماعت اہل حدیث کہاں سے کہاں تک پھیلی ہوئی تھی۔ اللھم زد فزد۔

یترك مذهبا فیقراء خلف الامام ویرفع یدیه عند الانحناء و نحو ذلك فاجابه فزوجه (شامی جلد ثالث طبع مصر ص ۲۹۳)

"روایت ہے کہ قاضی ابو بکر جوزجانی کے عہد میں ایک حنفی نے ایک اہل حدیث سے اس کی بیٹی کا رشتہ مانگا تو اس (اہلحدیث) نے انکار کر دیا مگر اس صورت میں کہ وہ (حنفی) اپنا مذہب چھوڑ دے اور امام کے پیچھے (سورہ فاتحہ) پڑھے اور رکوع جاتے وقت رفع یدین کرے اور مثل اس کے (اہل حدیث کے دوسرے کام بھی کرے) پس اس (حنفی) نے اس بات کو منظور کر لیا تو اس (اہل حدیث) نے اپنی لڑکی اس کے نکاح میں دے دی۔"

قاضی ابو بکر جوزجانی تیسری صدی کے قاضی ہیں۔ آپ ابو سلیمان کے شاگرد ہیں اور بلاواسطہ امام محمد کے شاگرد تھے (الفوائد البھیہ ص ۱۲)

اس حوالہ سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ تیسری صدی میں بھی مستقل ایک گروہ موجود تھا۔ جس کا نام اصحاب حدیث تھا اور ان کے امتیازی مسائل میں سے قرات فاتحہ خلف الامام اور رکوع جاتے وقت رفع یدین تھے۔ کیا اس زمانہ میں بھی انہی مسائل کی وجہ سے اہل حدیث کے ساتھ عداوت نہیں کی گئی اور نہیں کی جاتی؟ جس کے جواب میں کہا جاتا ہے ؎

مکش بہ تیغ ستم والہان سنت را
نکردہ اند بجز پاس حق گناہے دگر

(۵) اسی طرح امام مسلم بن قتیبہ اپنی گراں قدر کتاب تاویل مختلف الحدیث میں معتزلہ، جہمیہ، روافض، اہل الرائے وغیرہا فرقوں کا ذکر کرنے کے بعد ان کے مقابلے میں ایک خاص عنوان اصحاب الحدیث کے ذکر میں مقرر کرتے ہیں اور اس میں فرماتے ہیں کہ اصحاب حدیث نے حق کو اس کے ملنے کی جگہوں سے تلاش کیا اور ان کو رسول اللہ ﷺ کی سنت کی پیروی کی وجہ سے قرب الٰہی حاصل ہو گیا۔ پھر فرماتے ہیں کہ اصحاب حدیث کی برکت سے حق ظاہر ہو گیا اور لوگ سنت نبویؐ کے مطیع و منقاد ہو

گئے اور رسول اللہ ﷺ کی احادیث پر فیصلے (اور عمل در آمد) کرتے تھے۔ بعد اس کے کہ وہ فلاں اور فلاں (اشخاص) کے اقوال پر فیصلے (اور عمل در آمد) کرتے تھے۔ اگرچہ وہ اقوال رسول اللہ ﷺ کی احادیث پر فیصلے (اور عمل در آمد) کرنے لگے ۲۱۳ھ میں بغداد یا کوفہ میں پیدا ہوئے اور ۲۷۶ھ میں بغداد میں فوت ہوئے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ امام ابن قتیبہؒ کے وقت میں اور ان سے پیشتر ان مذکورہ بالا فرقوں کے مقابلے میں ایک خاص فرقہ اصحاب حدیث کا موجود تھا۔ جن کا مذہب اقوال الرجال کے مقابلے میں احادیث رسول اللہ ﷺ کی پیروی تھی۔ اور یہی اہل حدیث کا امتیازی نشان ہے اور یہی اتباع حدیث کی خصوصی علامت ہے اور یہی صورت حضرات مقلدین اور اہل حدیث میں زیر نزاع ہے۔ جس پر وہ اہل حدیث کو غیر مقلد کہتے ہیں۔

(۶) اس کے بعد ہم ایک ایسے علم کا حوالہ پیش کرتے ہیں جسے مذہبی اختلافات سے کوئی بھی تعلق نہیں۔ اس میں بھی فرقہ اہل حدیث کا ذکر موجود ہے۔ چنانچہ تاریخ فرشتہ میں سلطان محمود غزنوی رحمتہ اللہ علیہ کے ذکر میں لکھا ہے۔

سلطان محمود نیز ابوالطیب سہل بن سلیمان معلوکی راکہ از ائمہ اہل حدیث بود برسم رسالت پیش ایلک خاں فرستادہ الخ۔ جلد اول مقالہ اول ص ۱۲۳[1]

سلطان محمود غزنویؒ کا زمانہ اسلام کے نہایت عروج و اقبال کا زمانہ ہے یہ سلطان عظیم الشان ۳۵۷ھ میں پیدا ہوا اور ۳۴ سال سلطنت کی۔

(۷) اس کے علاوہ اسی فن کا دوسرا حوالہ یہ ہے کہ علامہ بشاری مقدسی جنہوں نے ۳۷۵ھ میں ہندوستان کی سیاحت کی اپنے سفر نامہ میں حالات "منصورہ" علاقہ سندھ میں فرماتے ہیں۔

"یہاں کے ذمی بت پرست لوگ ہیں۔ مسلمانوں میں اکثر اہلحدیث ہیں۔"

(تاریخ سندھ جلد اول ص ۱۲۴)

---

[1] تفسیر بیضاوی۔ حاشیہ سیالکوٹی بر بیضاوی تفسیر کبیر وغیرہ میں بھی اہل حدیث کا ذکر بالتصریح ہے۔

اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ گروہ باشکوہ چوتھی صدی میں کثرت سے ہندوستان میں بھی موجود تھا۔

(۸) اس کے علاوہ اسی فن کی ایک اور مشہور و متداول کتاب تاریخ ابن خلدون کا حوالہ ہے اس میں علامہ موصوف صحابہ کے بعد کے زمانے کی نسبت فرماتے ہیں :

وانقسم الفقه فيهم الى طريقتين طريقة اهل الراى والقياس وهم اهل العراق وطريقة اهل الحديث وهم اهل الحجاز وكان الحديث قليلافي اهل العراق لما قد منا (مقدمه ص ۲۷۲ فصل فى علم الفقه)

اور منقسم ہو گئی ان میں فقہ دو طریقوں پر اہل رائے و قیاس کے طریقہ پر اور وہ اہل عراق ہیں اور اہل حدیث کے طریق پر اور وہ اہل حجاز ہیں۔ اور اہل عراق میں فن حدیث قلیل تھا۔ اس وجہ سے جو ہم نے جو بیان کی۔

اس کے بعد پھر اسی فصل میں فرماتے ہیں۔

ولم يبق الامذهب اهل الراى من العراق واهل الحديث من الحجاز (مقدمه ج ۱ - ص ۲۷۳)

"اور نہیں باقی رہا مگر مذہب اہل رائے کا عراق سے اور اہل حدیث کا حجاز سے۔"

(۹) اس کے بعد ہم ایک ایسے بزرگ کی عبارتیں نقل کرتے ہیں۔ جو اہل حدیث اور مقلدین میں برابر مسلم ہیں۔ ان سے مراد حضرت پیر صاحب سید عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ ہیں آپ اپنی مشہور کتاب غنیۃ الطالبین میں بہت جگہ اہل الاثر اور اہل حدیث کا ذکر کرتے ہیں چنانچہ آپ علامات "اہل بدعت" کی فصل میں تحریر فرماتے ہیں۔

"فعلامة اهل البدعة الوقيعة فى اهل الاثر"

(ص ۱۹۸ مطبوعه مطبع مرتضوى دهلى)

"بدعتیوں کی نشانی یہ ہے کہ وہ "اہل حدیث" کی غیبت و بدگوئی کرتے ہیں۔"

اس مقام پر "اہل الاثر" سے مراد اہل حدیث ہیں۔ شرح نخبہ جو اصول حدیث کی مشہور و متداول کتاب ہے اس کا پورا نام یہ ہے۔ شرح نخبة الفكر فى مصطلح اهل الاثر۔"

نیز یہ کہ فخرنا جناب مولوی عبد الحکیم صاحب فاضل سیالکوٹی اس عبارت کا ترجمہ فارسی ان الفاظ میں کرتے ہیں "پس نشان اہل بدعت عیب کردن ست در اہل حدیث۔"

اور اس فصل میں حضرت پیر صاحب نے جتنی دفعہ لفظ اہل الاثر لکھا ہے مولوی صاحب ممدوح نے سب جگہ اس کا ترجمہ اہل حدیث ہی لکھا ہے اور ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ اہل الاثر۔ اہل حدیث اور اصحاب حدیث سب اہل حدیث ہی کے لقب ہیں "لفظ بگذاری سوئے معنی روی"

عباراتنا شتى وحسنك واحد   وكل الى ذاك الجمال يشير

چنانچہ حضرت پیر صاحبؒ عبارت مندرجہ بالا کے کچھ آگے یہ ذکر کر کے کہ بدعتی لوگ "اہل حدیث" کے طرح طرح کے نام رکھتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

ولا اسم لهم الا اسم واحد وهو اصحاب الحديث (ص۱۹۸)

"اور ان کا تو صرف ایک ہی نام ہے یعنی اہل حدیث"[1]

---

[1] بعض مقلدین کہا کرتے ہیں کہ حضرت پیر صاحب قدس سرہ اور دیگر مصنفینؒ جنھوں نے اہل حدیث کی تعریف کی ہے اس سے ان کی مراد یہ وہابی لوگ نہیں۔ بلکہ گروہ محدثین ہے جو ائمہ حدیث تھے اور وہ مجتہد تھے اور مجتہد پر کسی دیگر کی تقلید واجب نہیں۔ ایسا کہنے والے حضرات تحقیق و فہم سے قاصر ہیں۔ ان کے قول سے تو یہ ثابت ہو گیا کہ محدثین کسی کے مقلد نہ تھے۔ اب یہ سوچنا چاہئے کہ ان کی محدثین کی روایات پر عمل کرنے والے ان کے زمانے میں غیر مجتہد بھی تھے یا نہیں؟ اس کا جواب نفی میں تو ہو سکتا نہیں۔ کیونکہ ان کی روایات کے دفاتر اب تک محفوظ ہیں۔ اور دنیا جہان کے مسلمان ان پر عمل کر رہے ہیں۔ حتی کہ حضرات مقلدین بھی اپنے مذہب کی تائید انہی دفاتر حدیث پیش کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ہدایہ۔ تو ان کے وقت میں ان پر عمل کرنے والے کیوں نہ تھے۔ اگر تھے اور ضرور تھے تو ثابت ہو گیا کہ بغیر کسی معین شخص کی تقلید کے احادیث نبویہ اور آثار صحابہؓ پر عمل کرنے والے لوگ ہر زمانہ میں چلے آئے ہیں۔ اس کی تائید میں شاہ عبد العزیز صاحبؒ سے کسی نے سوال کیا۔

اب بھی اہل حدیث کے مخالف ان کے کئی طرح کے نام رکھتے ہیں کوئی "نجدی" کہتا ہے کوئی "وہابی" کہہ کر بدنام کرتا ہے کوئی "غیر مقلد" کے نام سے یاد کرتا ہے۔ وہ یاد رکھیں کہ ایسا کرنے والوں کو حضرت پیر صاحب "بدعتی" کہتے ہیں۔ ہم ان سب جدید ناموں سے بیزار ہیں۔ سوائے اس اپنے پیارے لقب کے جس میں اس محبوب رب العالمین (ﷺ) کی طرف نسبت پائی جائے۔ یعنی اهل حديث النبي صلى الله عليه وسلم۔ ع

کسی کا ہو رہے کوئی نبی کے ہو رہے ہیں ہم

حضرت پیر صاحبؒ ۴۹۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۵۶۱ھ میں بغداد میں فوت ہوئے اور مولوی عبدالحکیم صاحب سیالکوٹی ۱۰۶۷ھ میں سیالکوٹ میں فوت ہوئے۔

اسی طرح حضرت پیر صاحبؒ اسی کتاب کے ص ۲۱۲ پر فرقہ ناجیہ کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ ان کا نام اصحاب الحدیث ہے۔ حضرت پیر صاحب کی بابت ہم الگ فصل میں ثابت کریں گے کہ آپ مقلد نہیں تھے بلکہ اہل حدیث تھے۔

(۱۰) امام المتکلمین امام فخر الدین رازی تفسیر کبیر میں بذیل آیت وان كنتم في ريب مما نزلنا على عبدنا (یقو پ ۱) اہل حدیث کا ذکر کرتے ہیں (جلد اول ص ۳۴۲ مطبوعہ مصر) امام رازیؒ ۶۰۶ھ میں فوت ہوئے ہیں۔ رحمہ اللہ

گزشتہ سے پیوستہ

سوال: محدثین علم فقہ پر عمل کرتے ہیں یا نہیں؟ بعض شخص کہتے ہیں کہ محدثین علم فقہ پر عمل نہیں کرتے۔

جواب: علمائے محدثین بیک مذہب از مذاہب مجتہدین نباشند پس بعضے اعمال ایشاں مطابق کتب فقہ می باشد و بعضے دیگر مطابق کتب دیگر۔ ص ۱۱۶ جلد دوم)

اس سے علمائے محدثین کا مسلک تو معلوم ہو گیا۔ اب عوام الناس جو مسلک محدثین پر عمل کریں ان کے لئے امام ابن حزم کا حوالہ ملاحظہ کریں جو اہل سنت کے ضمن میں حنابلہ و اہل حدیث کے بیان میں گذر چکا ہے۔ حافظ ابن حزم سپینی ہیں۔ جو ۴۵۶ھ میں فوت ہوئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ محدثین کے مسلک پر عام لوگ عمل کرنے والے پانچویں صدی میں سپین تک پھیلے ہوئے تھے اور اس میں یہ بھی مذکور ہے کہ وہ دنیا کے مشرق و مغرب میں پھیلے ہوئے ہیں۔

(۱۱) اسی طرح امام ابن تیمیہ جو جملہ فنون عربیہ میں مسلم امام ہیں۔اپنی بے نظیر کتاب منہاج السنۃ میں متعدد مقامات پر اہل الحدیث اور اصحاب الحدیث کے نام سے ایک مستقل فرقہ کا ذکر کرتے ہیں چنانچہ جلد ثالث ص ۲۳ میں جہمیہ' قدریہ' معتزلہ اور کرامیہ وغیرھا فرقوں کے تردیدی ذکر میں فرقہ اہل حدیث کا بھی ذکر کرتے ہیں جلد اول ص ۱۴۲اور جلد سوم ۲۴ میں بھی ذکر کرتے ہیں جس سے ثابت ہے کہ ان کے وقت میں ان فرقوں کے مقابلہ میں اہل حدیث کا بھی ایک فرقہ موجود تھا۔ منہاج السنۃ جامع ترمذی کی طرح اہل حدیث کے ذکر سے بھری پڑی ہے۔ لیکن ہم صرف دو ضروری اقتباس نقل کرتے ہیں۔ شیخ الاسلامؒ اختلاف امت کے ذکر میں اہل حدیث کا باہمی اختلاف بھی بیان فرماتے ہیں۔چنانچہ فرماتے ہیں۔

ثم بعد ذلك اختلاف اهل الحديث وهم اقل الطوائف اختلافافی اصولهم لان ميراثهم من النبوة اعظم من ميراث غيرهم فعصمهم حبل الله الذی اعتصموا به (جلد ثالث ص ۲۱)

"اس کے بعد اہل حدیث کا اختلاف ہے۔ جو سب فرقوں میں سے کم اختلاف رکھتے ہیں کیونکہ ان کی علمی وراثت جو نبوت سے ان کو ملی ہے دوسروں کی وراثت سے بہت عظیم ہے۔ان کو اللہ کی رسی (قرآن مجید) نے بچالیا۔جس سے وہ متمسک ہیں۔"

اس جگہ امام ممدوحؒ نے اہل حدیث کو ان کی خصوصی نسبت "وراثت نبوت" سے یاد کیا ہے۔

اسی طرح ایک دوسرے موقعہ پر علامہ حلی شیعی کے اعتراض کے جواب کے ضمن میں اہل حدیث کی تعریف ایسے پیرائے میں کرتے ہیں کہ اس سے بڑھ کر ہو نہیں سکتی چنانچہ فرماتے ہیں۔

من المعلوم لكل من له خبرة ان اهل الحديث من اعظم الناس بحثا عن اقوال النبی صلی الله عليه وسلم وطلبا لعلمها وارغب

الناس فی اتباعھا وابعد الناس عن اتباع الھوی فھم فی اھل الاسلام کاھل الاسلام فی اھل الملل (ص۱۷۹ جلد ثانی)

"جس شخص کو کچھ بھی خبر ہے اس کو معلوم ہے کہ اہل الحدیث رسول اللہؐ کے اقوال کی بابت سب سے زیادہ تحقیقات کرنے والے اور ان کے علم کے طالب اور ان کی پیروی میں سب سے زیادہ رغبت رکھنے والے ہیں۔ اور ہوا و ہوس کی اتباع میں سب سے زیادہ دور ہیں پس وہ (اہل حدیث) اہل اسلام میں ایسے ہیں جیسے دیگر ادیان میں اہل اسلام ہیں۔"

اس تعریف میں کمال یہ ہے کہ اہل حدیث کے ظاہر و باطن کا صحیح فوٹو کھینچ دکھایا ہے۔ اس میں نہ تو محض حسن ظنی و فرط محبت کے سبب غلو کیا ہے اور نہ اہل مدح کی طرح صرف لفاظی سے کام لیا ہے بلکہ جو کچھ واقعی حالت ہے وہی بیان کی ہے۔ جزاہ اللہ عنا خیر الجزاء

امام صاحب موصوف ٦٦١ھ میں پیدا ہوئے اور ۷۲۸ھ میں فوت ہوئے۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ

(۱۴) اس کے بعد ہم علم اصول کا بھی حوالہ درج کرتے ہیں۔ علم اصول میں توضیح تلویح کا رتبہ سب کو معلوم ہے۔ علامہ تفتازانی تلویح شرح توضیح میں فرماتے ہیں۔

وعلیہ عامۃ اھل الحدیث والشافعیۃ

اور اسی پر ہیں عام اہل حدیث اور شافعیہ (بھی) تلویح مصری جلد دوم ص ۴٦ بحث (اجماع)

بعض لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ پرانی کتابوں میں جہاں کہیں لفظ اہل حدیث یا اصحاب حدیث یا محدثین آتا ہے اس سے مراد شافعیہ ہوا کرتے ہیں۔ وہ علامہ کی اس عبارت کو انصاف سے دیکھیں کہ وہ کس طرح اہل حدیث کو شوافع کے مقابلے میں مستقل گروہ قرار دے کر ان کا مذہب نقل کرتے ہیں۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ علامہ کے زمانے میں شافعیہ وغیرہم مقلدین کے سوا ایک اور مستقل فرقہ بھی تھا جن

کو اہل حدیث کہا جاتا تھا اور وہ وہی ہیں جن کا دستور العمل قرآن و حدیث ہے۔اور خدا کے فضل سے ہم انہی میں سے ہیں۔ ؎

ما اہلحدیثیم دغارا نشنا سیم
باقول نبی چون و چرارا نشنا سیم

یہی علامہ تفتازانی شرح مقاصد میں شیعوں کی دلیل حدیث غدیر خم کی تحقیق میں فرماتے ہیں۔وقد قدح فی صحته کثیر من اهل الحدیث[1]

علامہ تفتازانی ۷۹۲ھ میں فوت ہوئے۔اور اس کتاب تلویح کی تصنیف سے ۷۵۸ھ میں فارغ ہوئے۔

(۱۳) اسی طرح امام ابن ہمام جو متاخرین حنفیہ میں سے درجہ اجتہاد تک پہنچے ہیں۔اپنی کتاب فتح القدیر شرح ہدایہ مطبوعہ نولکشور پریس میں متعدد مقامات پر اس گروہ حق پر وہ کا ذکر کرتے ہیں۔چنانچہ جلد اول میں ص ۲۲ و ص ۹۰ و ص ۱۱۵ و ص ۲۸۲ پر ان کا ذکر موجود ہے۔

امام کمال الدین ابن ہمام قریبا ۷۹۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۸۶۱ھ میں فوت ہوئے رحمہ اللہ۔

(۱۴) علامہ شامی جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔شرح در مختار میں فرماتے ہیں۔

قد علمت ان هذا لم یقل به الا الشافعی و عزاه الی جمهور اهل الحدیث (جلد اول ص ۷۰٦)

تم جانتے ہو کہ اس کے قائل صرف امام شافعی ہیں اور اس کو جمہور اہل حدیث کی طرف نسبت کیا ہے۔

(۱۵) جس طرح علامہ تفتازانی کی عبارت میں اوپر گذر چکا ہے کہ وہ اہل حدیث کو شوافع سے الگ کر کے لکھتے ہیں۔اسی طرح علامہ شامی بھی ایک دوسرے موقع پر اہل حدیث کو احناف وغیرھم فقہاء سے الگ رکھتے ہیں۔چنانچہ فتح القدیر سے خوارج کی

---

[1] شرح مقاصد مصری جلد دوم ص ۲۹۰۔

نسبت نقل کرتے ہیں۔

وحکم الخوارج عند جمہور الفقہاء والمحدثین حکم لبغاۃ وذہب بعض المحدثین الی کفرہم وقال ابن المنذر ولا اعلم احدا وافق اہل الحدیث علی تکفیرہم (ردالمختار جلد سوم ص۴۷۸)

"خارجیوں کا حکم جمہو فقہاء اور محدثین کے نزدیک باغیوں کا سا ہے اور بعض محدثین ان کو کافر کہتے ہیں۔ ابن المنذر کہتے ہیں میرے علم میں کوئی شخص خوارج کی تکفیر میں اہل حدیث سے موافق نہیں ہے۔"

اس سے ہمارا مطلب ایسا عیاں ہے کہ محتاج بیان نہیں۔ شیخ ابن ہمامؒ مصنف فتح القدیر کا ذکر اوپر گذر چکا ہے کہ وہ ۸۶۱ھ میں فوت ہوئے اس حوالہ میں یہ بھی لطف ہے کہ اہل حدیث کو اس گروہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ جو دوسرے فرقوں پر ان کے خلاف سنت عمل واعتقاد کی بنا پر حکم وفتویٰ لگانے والے ہیں نہ ان میں سے جن پر فتویٰ لگایا گیا۔ جیسا کہ آج کل اس کے برخلاف ہو رہا ہے اور ردالمختار کے مصنف علامہ سید محمد امین بن عابدین شامی تو زمانہ حال کے قریب ہی ہوئے ہیں۔

(۱۶) اسی طرح صاحب کشف الظنون حنفی نے علم اصول پر بحث کرتے ہوئے امام علاؤ الدین محمد بن احمد سمرقندی کا قول ان کی کتاب میزان الاصول سے نقل کیا ہے۔

واکثر التصانیف فی اصول الفقہ لاہل الاعتزال المخالفین لنا فی الاصول ولاہل الحدیث المخالفین فی الفروع رباب الالف ص ۱۱۴

یعنی اصول فقہ میں اکثر تصانیف معتزلوں کی ہیں جو اصول (عقائد) میں ہم سے مخالف ہیں اور اہلحدیث کی (تصانیف بھی) ہیں جو ہم سے فروع میں مخالف ہیں۔

اس حوالہ سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ حنفیوں اور اہل حدیث میں اختلاف صرف فروع میں ہے۔ عقائد میں نہیں ہے۔ پس حنفیوں کو اہل حدیث سے عناد و بغض نہیں رکھنا چاہئے۔ امام علاؤ الدین حنفیوں میں بڑے پائے کے بزرگ ہوئے ہیں۔

خصوصاً علم اصول میں بہت ماہر تھے۔ افسوس ہمیں ان کا زمانہ حیات و وفات نہیں ملا۔ ہاں صاحب کشف الظنون ۱۰۶۷ھ میں فوت ہوئے ہیں (فوائد بہیہ ص ۱۳)

ان حوالجات کے علاوہ کثرت سے اور بھی حوالے ہیں۔ جن کے ذکر سے طوالت کا اندیشہ ہے ان سے صاف ظاہر ہے کہ گروہ اہل حدیث (کثر اللہ سواد ہم) شروع سے علامہ شامی کے وقت تک برابر ہر صدی میں دنیا کے مختلف حصوں میں موجود رہا ہے اور علامہ شامی اسی کتاب میں شیخ محمد بن عبد الوہاب کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ لیکن وہ گروہ اہل حدیث کو اس کا پیرو قرار نہیں دیتے۔ چنانچہ یہ امر آئندہ فصل سے بخوبی ظاہر ہو جائے گا۔ انشاء اللہ پس اہل حدیث کو ایک نیا فرقہ اور قریباً ایک صدی یا دو صدی کی عمر والا کہنا تاریخی حالات کے رو سے بھی ویسا ہی غلط ہے جیسا کہ قرآن و حدیث کے دلائل کی رو سے تم والحمد للہ الملہم۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی اور فرقہ اہل حدیث

جب ہم نے تاریخی شہادتوں سے ثابت کر دیا کہ فرقہ اہل حدیث ایک قدیم گروہ ہے۔ جو ابتدائے اسلام سے آج تک برابر چلا آرہا ہے۔ تو یہی بات اس الزام کے دور کرنے کے لئے کافی ہے کہ یہ لوگ محمد بن عبدالوہاب نجدی رحمہ اللہ کے متبع نہیں ہیں۔ کیونکہ شیخ موصوف کی پیدائش ۱۱۱۵ھ میں اور وفات ۱۲۰۶ھ میں ہوئی۔ لیکن ہم اس فصل میں اس مذہبی مسئلہ کے ذکر سے اس الزام کو دور کرنا چاہتے ہیں۔ جس کے رو سے ہم دیگر مقلدین حنفیہ شافعیہ وغیرھم سے امتیاز رکھتے ہیں یعنی مسئلہ تقلید شخصی اور اسی ضمن میں ان الزامات کا جواب بھی دیں گے جو بعض شخصوں نے غلطی سے یا عناد سے شیخ ممدوح پر لگائے ہیں وہ محض اس وجہ سے کہ مسلمان کی نصرت مہما امکن واجب ہے۔ جب شیخ موصوف ان الزامات سے بری ہیں تو ان کا الزام لگاتے وقت اس آیت خداوندی کو خیال میں رکھ لینا چاہئے۔

والذین یوذون المومنین والمومنات بغیر ما اکتسبوا فقد احتملوا بھتانا واثما مبینا (احزاب پ ۲۲)

اور جو لوگ مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کو بغیر اس کے کہ انہوں نے قصور کیا ہو (ناحق کی تہمت لگا کر) ایذا دیتے ہیں تو وہ (جھوٹ) طوفان اور صریح گناہ کا بوجھ (اپنی گردن پر) اٹھا لیتے ہیں۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب حنبلی مذہب کے مقلد تھے۔ چنانچہ یہ بات ان کے اپنے خطبے سے بھی ظاہر ہے۔ جو انہوں نے حرم محترم میں ہر چہار مذہب کے نامی علماء کے سامنے بیان کیا کہ

ان مذھبنا فی اصول الدین مذھب اھل السنة والجماعة ونحن ایضا فی الفروع علی مذھب الامام احمد بن حنبل ولا ننکر من

قدر احد امن الائمة الاربعة (اتحاف ص ٤١٤)
بے شک ہمارا مذہب اصول میں تو اہلسنت و جماعت ہے- نیز ہم فروع میں امام احمد بن حنبلؒ کے مذہب پر ہیں اور جو شخص ائمہ اربعہ میں سے کسی کا بھی مقلد ہو ہم اسے برا نہیں جانتے-
شیخ محمد عبدالوہاب کا حنبلی المذہب ہونا خود علامہ شامی کو بھی مسلم ہے چنانچہ آپ باب البغاۃ میں فرماتے ہیں-

كما وقع في زماننا في اتباع عبد الوهاب الذين خرجوا من نجدو غلبوا على الحرمين وكانوا ينتحلون مذهب الحنابلة لكنهم اعتقدوا انهم هم المسلمون وان من خالف اعتقادهم مشركون استباحوا بذلك قتل اهل السنة وقتل علمائهم حتى كسر الله تعالى شوكتهم وخرب بلادهم وظفر بهم عساكر المسلمين عام ثلث و ثلثين ومائة والف (قوله كما حققه في الفتح) حيث قال وحكم الخوارج عند جمهور الفقهاء والمحدثين حكم البغاة وذهب بعض المحدثين الى كفرهم قال ابن المنذر ولا اعلم احدا وافق اهل الحديث على تكفيرهم (جلد سوم ص ٤٧٨)

جیسا کہ ہمارے زمانہ میں عبدالوہاب کے پیروں میں ہے جو نجد سے ظاہر ہوئے ہیں- اور انہوں نے حرمین پر بزور غلبہ حاصل کیا ہے اور اپنے آپ کو مذہب حنبلی کی طرف نسبت کرتے ہیں- لیکن وہ یہ اعتقاد رکھتے ہیں صرف ہم ہی مسلمان ہیں اور جو ہمارے اعتقاد کے خلاف ہیں وہ مشرک ہیں- اور اسی وجہ سے انہوں نے اہل سنت اور ان کے علماء کا قتل جائز جانا ہے- حتی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی شوکت توڑ ڈالی اور ان کے شہروں کو برباد کر دیا- اور مسلمانوں کے لشکروں کو ۱۲۳۳ھ میں ظفریاب کیا (قول مصنف کا کماحققه فی الفتح) جہاں اس نے کہا ہے کہ جمہور فقہاء اور محدثین کے نزدیک خوارج کا

حکم باغیوں کا حکم ہے اور بعض منکرین ان کے کفر کے بھی قائل ہوئے ہیں
ابن منذر کہتا ہے کہ میں نہیں جانتا کہ ان کی تکفیر پر کوئی اہل حدیث کے
موافق ہوا ہو۔

اس عبارت سے ہمارا اصل مقصود تو یہ ہے کہ علامہ شامی شیخ محمد بن عبدالوہاب کو برابر حنبلی قرار دیتے ہیں۔ اور ہم اہل حدیث سوائے آنحضرت ﷺ صاحب شرع کے کسی اور کی طرف نہ منسوب ہیں اور نہ نسبت کو پسند کرتے ہیں ہم تو کہتے ہیں ۔

کسی کا ہو رہے کوئی نبی کے ہو رہے ہیں ہم

اور خود حضرات مقلدین بھی ہم کو از راہ لطف غیر مقلدین ہی کہتے ہیں۔ پس غیر مقلد کہہ کر شیخ محمد بن عبدالوہاب کا مقلد کہنا ایں چہ ؟

لیکن اس اصل مقصود کے علاوہ دو باتیں اور بھی کہنے کی ہیں۔ اول یہ کہ علامہ شامیؒ وہابیوں کو باوجود ان کی نسبت سخت امور ذکر کرنے کے کافر کہنے سے پرہیز کرتے ہیں۔ پس جو لوگ ہم کو وہابی جان کر کافر کہتے ہیں وہ علامہ شامی کی تحریر کو دیکھیں اور خدا سے ڈریں ۔

بروز حشر گر پرسند خسرو را چرا کشتی؟
چہ خواہی گفت قربانت شوم تا من ہمان گویم

عجب تو یہ ہے کہ جو امور علامہ شامی نے وہابیوں کی طرف منسوب کئے ہیں وہ ہم میں نہ پائے گئے اور نہ ہم میں پائے جاتے ہیں۔

دوم یہ کہ علامہ شامی نے ان امور کی تحقیقات میں کوتاہی کی اور حقیقت امر پر غور نہیں کیا۔ اور صورت بدنامی کو اپنے دل میں عظیم جان کر بیچارے شیخ محمد بن عبد الوہاب پر کہہ دیا کہ اس نے اور اس کے اتباع نے اپنے مخالفوں کو مشرک قرار دیا۔ اور مسلمانوں اور ان کے علماء کے قتل کو مباح جانا۔ یہ امر علامہ سے غصہ میں لکھا گیا۔ اور دلیل غصہ کی ان کی وہ عبارت ہے جو نجدیوں کے حق میں لکھی ہے۔

حتی کسر الله شوکتهم وخرب بلادهم وظفر بهم عساکر

المسلمین۔ (ص ٤٧٨)

خدا نے ان کی حکومت کو توڑا اور ان کے شہروں کو برباد کر دیا اور مسلمانوں کی فوجوں کو ان پر غالب کیا۔

اہل ذوق سلیم شہادت دے سکتے ہیں کہ مصنف کے قلم سے ایسے کلمات کیسی حالت میں نکلتے ہوں گے۔ اول تو یہی دیکھنا چاہئے کہ علامہ شامی نے شیخ کا نام اس کے باپ کا نام قرار دیا۔ جو ان کی طبیعت کے قائم نہ رہنے کی دلیل ہے ورنہ اگر علامہ شامی ذرہ برابر بھی تحقیقات کرتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب خدا سے ڈرنے والا متدین و متبع سنت تھا کس طرح ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کو مشرک جانے اور ان کے قتل کو مباح خیال کرے۔

اگر کہا جائے کہ قبر پرستی وغیرہ امور شرکیہ کی وجہ سے مشرک کہا ہے تو یہ امر دیگر ہے۔ اس میں شیخ ممدوح منفرد نہیں ہیں علمائے حنفیہ بالاتفاق ان کے ہم آہنگ ہیں۔ اور خود علامہ شامی بھی اسی کتاب ردالمختار میں جابجا امور شرکیہ پر سخت فتوے لگاتے ہیں۔ چنانچہ بعض کو ہم نقل کرتے ہیں۔

کتاب الصوم میں قبروں پر نذر و نیاز چڑھانے کی حرمت کی وجوہ میں لکھتے ہیں۔

ومنها انه ظن ان المیت یتصرف فی الامور دون الله تعالی و اعتقاده ذلك کفر (شامی ج ٢ ص ٢٠٤)

دیگر وجہ یہ ہے کہ اس (قبر پر نذر چڑھانے والے) نے یہ سمجھا ہے کہ مردے امور (خیر و شر) میں خدا کے ورے متصرف ہیں اور اس کا یہ اعتقاد کفر ہے۔

دیگر یہ کہ درمختار میں فقہا کا مذہب نقل کیا ہے کہ جو شخص غیر اللہ کے تقرب کے لئے کوئی جانور ذبح کرے تو وہ ذبیحہ حرام ہے۔ اگرچہ ذبح کے وقت اس پر خدا کا نام پڑھا جائے پھر کہا ہے کہ جمہور کے نزدیک وہ شخص کافر ہو جاتا ہے چنانچہ کہا ہے۔

وفاعله جمهور هم قال کافر یعنی جمہور کا قول ہے کہ غیر اللہ کے قصد سے

ذبح کرنے والا کافر ہو جاتا ہے [1]

دیگر یہ کہ خود علامہ شامی شیخ محمد بن عبدالوہاب کے ذکر کے بعد بدعتی فرقوں کی تکفیر کے متعلق مفید و مفصل تحریر لکھتے ہیں اور بعض پر فتوی تکفیر جائز بھی جانتے ہیں۔

وذکر الحنفیة تصریحا بالتکفیر باعتقاد ان النبی یعلم الغیب لمعارضة قوله تعالی قل لا یعلم من فی السموت والارض الغیب الا الله (مسائرہ مصری ص ۲۰۲)

"حنفیوں نے اس امر کے اعتقاد پر کہ آنحضرت ﷺ غیب جانتے تھے بالتصریح کفر کا فتویٰ لگایا ہے کیونکہ یہ بات اس آیت خداوندی کے خلاف ہے (اے پیغمبر) ان سے کہہ دیجئے کہ زمین و آسمان میں جو کوئی بھی ہے ان میں سے سوائے خدا کے کوئی بھی غیب نہیں جانتا۔"

اسی طرح فتاوی قاضی خاں میں بھی لکھا ہے۔

رجل تزوج امرة بغیر شهود فقال الرجل للمرأة خدا و پیغمبر راگواه کردم) قالوا یکون کفرا لانه اعتقد ان الرسول صلی الله علیه وسلم یعلم الغیب وهو ماکان یعلم الغیب حین کان فی الاحیاء فکیف یعلم بعد الموت (قاضی خاں جلد٤ ص٤٦٨ مطبوعه نولکشور)

"کسی شخص نے کسی عورت سے بغیر گواہوں کے نکاح کیا تو وہ شخص اس عورت کو کہے کہ میں نے خدا اور رسول کو گواہ کیا تو فقہاء کہتے ہیں کہ یہ بات کفر ہے کیونکہ اس نے یہ اعتقاد رکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ غیب جانتے ہیں حالانکہ آپ اس وقت بھی غیب نہیں جانتے تھے جب زندوں میں تھے تو موت کے بعد یہ بات کس طرح ہو سکتی ہے۔"

اسی طرح قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ مالا بدمنہ میں کلمات کفر کے بیان میں فرماتے ہیں۔

---

[1] درمختار کتاب الذبائح۔

"ان عبارات سے ظاہر ہو گیا کہ اگر شیخ محمد بن عبد الوہاب نے قبر پرستی نذر لغیر اللہ اور ذبح لغیر اللہ اور آنحضرت ﷺ کو عالم الغیب جاننے وغیرھا امور شرکیہ کی بنا پر کسی کو کافر و مشرک کہا ہو تو وہ اس میں منفرد نہیں ہیں۔ بلکہ سب علمائے حنفیہ مع علامہ شامی کے اس امر میں ان کے ساتھ ہیں پس جو جواب علامہ شامی اور دیگر فقہاء کی طرف سے ہو گا۔ وہی شیخ محمد بن عبد الوہاب کی طرف سے ہو گا۔ لہذا بعد اس امر کے تسلیم کر لینے کے بھی شیخ محمد بن عبد الوہاب نے امور شرکیہ کی بنا پر کسی کو کافر و مشرک کہا ہے شیخ موصوف کو برا نہیں کہہ سکتے۔"

اس کے بعد ہم اصل امر کی تحقیق میں لکھتے ہیں کہ جس طرح زمانہ کے بعض جہال و حاسد ہمیشہ اہل حق پر افترا باندھتے رہے ہیں۔ اسی طرح شیخ محمد بن عبد الوہاب پر بھی بوجہ ان کی غیرت حق اور تردید شرک کے باندھے گئے۔ اور خاص ان کی زندگی میں بھی ان پر بہتان لگائے گئے۔ جن کے جواب میں شیخ موصوف نے حرم محترم میں ایک طویل خطبہ میں سب الزامات کو دفع کیا چنانچہ بالخصوص الزام تکفیر مسلمین کو بھی شمار کر کے کہتے ہیں۔

وانا نكفر الناس على الاطلاق اهل زماننا ومن بعدست مائة الامن هو على مانحن عليه ومن فروع ذلك انا لا نقبل بيعة احد الا اذا اقر عليه بانه كان مشركا وان ابويه ماتا على الشرك بالله (اتحاف ص ٤١٥)

"اور ہم پر ایک بہتان یہ ہے کہ ہم اپنے سوا اپنے زمانے کے سب لوگوں اور چھٹی صدی کے بعد کے سب لوگوں کو کافر جانتے ہیں اور پھر اس کے فروع میں سے ایک یہ ہے کہ ہم کسی کی بیعت قبول نہیں کرتے مگر اس صورت میں کہ وہ شخص صاف اقرار کرے کہ میں پہلے مشرک تھا اور میرے ماں باپ بھی شرک ہی میں مر گئے۔"

اس کے بعد سب الزامات کے جواب میں مجملاً لاکھ کی ایک ہی بات کہتے ہیں۔

فجميع الخرافات وما اشبهها لما استفهمنا عنها من ذكر ناكان

جوابنا علیه فی کل مسئلة سبحانك هذا بهتان عظیم فمن روی عنا شیئا من ذلك او نسبه الینا فقد کذب علینا وافتری ومن شاهد حالنا و حضر مجالسنا علم قطعا ان جمیع ذلك وضع علینا و افتراء اعداء الدین و اخوان الشیاطین تنفیرا للناس عن الاذعان لاخلاص التوحید لله تعالی بالعبادة وترك انواع الشرك الذی نص الله علی انه لا یغفره ویغفر مادون ذلك لمن یشاء (اتحاف ص ٤١٥)

”پس یہ سب اور اس قسم کے دیگر خرافات جب کوئی شخص ہم سے ان کی بابت دریافت کرے گا تو ہمارا ہر مسئلے کے بارے میں یہی ایک ہی جواب ہو گا- هذا بهتان عظیم یعنی اے اللہ تو پاک ہے- یہ بات بڑا بھاری طوفان ہے- پس جو شخص ہم سے ایسی باتیں نقل کرے یا ہماری طرف ان کو نسبت کرے تو اس نے ہم پر جھوٹ اور بہتان باندھا اور جو شخص ہمارے حال کا مشاہدہ کرے گا اور ہماری مجالس میں حاضر ہو گا وہ قطعی طور پر جان لے گا کہ ہم پر یہ سب کچھ دین کے دشمنوں اور شیطان کے بھائیوں نے جھوٹ اور افتراء باندھا ہے- تاکہ لوگوں کو خدا تعالیٰ کی خالص عبادت میں خالص توحید کے اختیار کرنے اور جملہ اقسام شرک کو ترک کرنے سے نفرت دلائیں جس کی نسبت خدا نے صاف کہہ دیا ہے کہ اسے (شرک کو) ہرگز نہیں بخشوں گا- اور اس کے سوا جس کو چاہوں گا بخش دوں گا-“

اس کے بعد خاتمہ کے قریب فرماتے ہیں-

نقول فیمن مات تلك امة قد خلت لها ما کسبت ولکم ما کسبتم ولا تسئلون عما کانوا یعملون ولا نقول بکفر من ثبت دیانته وشهر صلاحیته وعلمه وورعه وزهده وحسنت سیرته وبالغ فی نصح الامة او غیرها کا بن حجر الهیتمی المکی فانا نعلم کلامه فی الدر المنظم ولا ننکر سعة علمه الخ (اتحاف ص٤١٦)

"اور جو لوگ فوت ہو چکے ہیں ہمارا تو ان کی نسبت یہ قول ہے تلك امة الخ یعنی یہ وہ لوگ ہیں جو گذر چکے ہیں- ان کا کیا ان کے لئے اور تمہارا کیا تمہارے لئے- ان کے اعمال کے بارے میں تم سے سوال نہیں ہوگا اور جس شخص کی دینداری صحیح طور پر پائی گئی ہے اور اس کی صلاحیت و پرہیزگاری اور اس کا علم و زہد معروف ہو چکا ہے اور اس کی سیرت نیک ثابت ہو چکی ہے اور اس نے امت کی خیر خواہی میں نہایت کوشش کی ہے- اگر وہ اس مسئلہ میں یا کسی اور میں خطا پر بھی تھا- تو ہم اس کو کافر نہیں کہتے مثلاً ابن حجر ہیتمی مکی- کیونکہ ہم ان کی کتاب الدار المنظم میں ان کی تحریر کو بھی جانتے ہیں اور ان کے وسعت علم سے بھی انکار نہیں کرتے-"

شیخ صاحب کے اپنے خطبے سے معلوم ہو گیا کہ وہ ان الزاموں سے بالکل بری ہیں جن کی وجہ سے ان کے دشمن ان کو بدنام کرتے ہیں- پس معلوم ہوا کہ علامہ شامی سے بھی بوجہ ضعف انسانی کے ایک مسامحت ہو گئی ہے- ولنعم ما قیل- لكل عالم هفوة ولكل جواد كبوة عفا الله عنه وعن سائر المسلمين

حضرت سید عبدالقادر جیلانی (قدس سرہ) اہل حدیث تھے

عوام الناس کی طبیعتیں حجت خطابی سے اطمینان پا جاتی ہیں- یعنی اگر ان کو کسی مسلم بزرگ کا قول یا فعل نقل کر کے بتا دیا جائے- تو وہ تسلیم کر لیتے ہیں- اس لئے جب ہم عوام کی تسلی کے لئے کہتے ہیں کہ حضرت پیر صاحب رحمتہ اللہ علیہ بھی توحید اور اتباع سنت کی تاکید کرتے اور شرک و بدعت سے منع کرتے ہیں- نیز آپ قرات فاتحہ کو فرض اور آمین بالجہر کو سنت جانتے ہیں- تو وہ اپنے علماء کے سکھانے سے یہ جواب دیتے ہیں کہ حضرت پیر صاحب تو حنبلی مذہب کے مقلد تھے اور تم غیر مقلد ہو- اگر تم بھی کسی امام کی تقلید کرو تو یہ سب امور ادا کر لیا کرو- ورنہ نہیں- اول تو ان کو یہی سوچنا چاہئے کہ جب یہ حال ہے تو ہمارے اور ان کے درمیان نزاعی امر صرف تقلید شخصی ہوا- نہ کہ رفع یدین وغیرہ مسنون امر- لہٰذا مناسب نہیں کہ ان امور کے سبب ہم پر غضب ڈھائے جائیں اور مسجدوں سے نکالا جائے اور مقدمات کی صورت پیدا کر کے عدالت میں مسلمانوں کے ایمان و وقت اور مال و عزت کو برباد کیا جائے- ہاں صرف تقلید شخصی کو مبحث قرار دے کر امن و سلامتی سے اس پر گفتگو کر لی جائے- اگر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی تعلیم سے یہ ثابت ہو جائے تو اہل حدیث بھی اسے قبول کر لیں- ورنہ مقلدین بھی اس سے دست بردار ہو جائیں- اور دونوں متفق ہو کر واعتصموا بحبل اللہ جمیعا پر عمل کر کے ولا تفرقوا کی مخالفت سے بچ کر اسلامی جمعیت کا شیرازہ مضبوط کریں-

دیگر یہ کہ اگر طریق مذکور پر عمل مشکل ہو تو حضرت پیر صاحب ہی کے مذہب کی تحقیق کر لیں کہ وہ اہل حدیث تھے یا مقلد؟ سو معلوم ہو کہ ہمیں حضرت پیر صاحب کے قول سے کہیں نظر نہیں آیا کہ آپ نے رتبہ علم پر پہنچ کر کسی خاص امام کی تقلید کا

اقرار کیا ہو بلکہ آپ کی تصانیف میں خالص کتاب و سنت کی پیروی کی کئی عبارتیں پائی جاتی ہیں جن سے صاف عیاں ہے کہ آپ اہل حدیث تھے- کیونکہ اہل حدیث بھی خالص کتاب و سنت کی پیروی کو واجب جانتے ہیں اور ترک تقلید کے یہی معنی ہیں- اسی لئے مقلدین کتاب و سنت کے علاوہ کچھ اور کو بھی واجب جانتے ہیں جس کے ثبوت کے لئے ہم نے اوپر گذارش کی ہے کہ دونوں فریق کے علماء کتاب و سنت کی رو سے فیصلہ کر لیں- اگر خدا کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی سنت ہمارا ہاتھ اپنے سوا کسی اور کے ہاتھ میں دے دے تو بسم اللہ- ع

دل شاد و چشم ما روشن

"ہمیں تو کتاب و سنت کی پیروی سے غرض ہے- اور بس- ورنہ اگر خود اس لائن پر نہ آئیں تو کم از کم ہمیں تو معذور سمجھیں کہ جو بات نہ خدائے ذوالجلال نے واجب کی نہ اس کے رسول ﷺ نے ضروری قرار دی- وہ ہم اپنی طرف سے کسی طرح واجب کر لیں- حالانکہ اصول کی کتابوں میں لکھا ہے کہ کسی امر کا واجب کرنا صرف خدا اور رسول کا حق ہے- مجتہد کا حکم اظہار حکم ہے نہ ایجاد حکم- خیر یہ قصہ تو بہت لمبا ہے- ذرا حضرت پیر صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی عبارتیں بھی دیکھیں- کہ آیا وہ کتاب و سنت کی اتباع کے سوا کسی دیگر چیز کو بھی واجب الاتباع جانتے تھے-"

آپ کی دو کتابیں ہمارے ہاتھوں میں ہیں- فتوح الغیب اور غنیۃ الطالبین- فتوح الغیب تو علم طریقت کے متعلق ہے- اور غنیۃ الطالبین میں کچھ اس کا بیان بھی ہے- اور زیادہ تر علم شریعت کا ذکر ہے آپ فتوح الغیب کا دوسرا مقالہ ان الفاظ طیبہ سے شروع کرتے ہیں-

اتبعوا ولا تبتدعوا واطیعوا ولا تمرقوا ووحدوا ولا تشرکوا

(مقالہ ثانیہ ص ۱۱)

"سنت کی پیروی کرو اور بدعتیں مت نکالو خدا اور رسول کی اطاعت کرو اور دین سے باہر مت ہو' توحید مانو شرک مت کرو"

اور چھتیسویں مقالہ میں نہایت زور دار عبارت میں مع حوالہ آیات بتاکید فرماتے ہیں۔

واجعل الكتاب والسنة امامك واعمل بها ولا تغتر بالقال والقيل والهوس قال الله تعالى وما اتكم الرسول فخذوه وما نهكم عنه فانتهوا واتقوا الله ولا تخالفوه فتتركوا العمل بما جاء به وتخترعوا لانفسكم عملا وعبادة كما قال الله تعالى فى حق قوم ضلوا عن سواء السبيل ورهبانية ابتدعوها ما كتبناها عليهم ثم انه قد زكى هو نبيه ونزهه من الباطل فقال وما ينطق عن الهوى ان هو الا وحي يوحى اى ما اتكم به فهو من عندى لا من هواه ونفسه فاتبعوه ثم قال قل ان كنتم تحبون الله فاتبعونى يحببكم الله فبين ان طريق المحبة اتباعه قولا وفعلا (مقالہ ۳۶ ص ۱۶۷ تا ۱۶۹)

"قرآن و حدیث کو اپنا امام بنالے اور انہی پر عمل کیا کر اور کسی کے کہے سے دھوکا مت کھائیو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمادیا ہے جو تم کو رسول دے وہ لے لو اور جس سے ہٹائے ہٹے رہو اللہ سے ڈرو اور اس کی مخالفت نہ کرو کہ جو کچھ تم کو اس نے دیا ہے اسے تو چھوڑ دو اور نئی بدعتیں ایجاد کرنے لگو۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے ایک گمراہ قوم کے حق میں فرمایا ہے کہ انہوں نے رہبانیت نکالی ہم نے ان کو حکم نہ دیا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو پاک کرنے میں فرمایا کہ میرا رسول (ﷺ) اپنی خواہش سے نہیں بولتا بلکہ جو کچھ بولتا ہے وحی سے بولتا ہے یعنی جو کچھ تمہیں دیتا ہے وہ میرے پاس سے ہے نہ اس کی اپنی خواہش نفسانی سے پس تم اس کی پیروی کرو۔ پھر فرمایا تو اے نبی کہہ دے اگر تم خدا سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو۔ خدا تم سے محبت کرے گا۔ بتادیا کہ محبت کی راہ اتباع ہے۔ قول میں اور عمل میں۔"

اسی طرح دوسری کتاب یعنی غنیۃ الطالبین میں فرماتے ہیں۔

فالمرید من کانت فیه هذه الجملة وا تصف هذه الصفة فهو ابدا مقبل علی الله عز و جل واطاعة مول عن غیره واجابه یسمع من ربه عز و جل فیعمل بمّا فی الکتاب والسنة ویصم عما سوی ذلك

"مرید وہ ہے جس میں یہ سب صفات ہوں اور اس صفت سے موصوف ہو۔ پس وہ ہمیشہ اللہ کی طرف راغب اور غیر کی طرف معرض ہو گا خدا کی سنے گا۔ قرآن اور سنت نبویہ پر عمل کرے گا اور اس کے سوا باقی سے کان بند کرے گا۔" (غنیۃ مترجم فارسی ص ۵۷۹)

اگر کہا جائے کہ بعض مصنفین نے آپ کو حنبلی لکھا ہے تو اول اس کا جواب یہ ہے کہ انہوں نے حضرت پیر صاحب کے اپنے قول سے نہیں لکھا۔ دیگر یہ کہ بعض اصحاب حدیث کو لوگوں نے کثرت موافقت کے سبب بعض ائمہ کی طرف منسوب کیا ہے۔ حالانکہ وہ ان کے مقلد نہیں تھے۔ چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں۔

وکان صاحب الحدیث قد ینسب الی احد المذاهب لکثرة موافقة له کالنسائی والبیهقی ینسبان الی الشافعی (حجة الله مصری جلد اول ص ۱۵۲)

"اہل حدیث بھی کبھی کسی مذہب کی طرف منسوب کئے جاتے تھے۔ بوجہ کثرت موافقت کے جیسے کہ نسائی اور بیہقی امام شافعی کی طرف نسبت کئے جاتے ہیں۔"

اسی طرح ہو سکتا ہے کہ کسی نے حضرت پیر صاحب کو بھی کثرت موافقت کے سبب حنبلی کہہ دیا ہو۔ ورنہ تقلید زیر نزاع سے حضرت پیر صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی شان بہت بلند ہے۔ وہ اپنی تصانیف میں عام طور پر حدیث سے سند پکڑتے ہیں اور محض امام احمدؒ کے قول کو بطور دلیل نہیں لاتے حالانکہ مقلد کی دلیل اس کے امام کا قول ہے۔ جیسا کہ کتب اصول میں مصرح ہے اور انشاء اللہ بحث تقلید میں مفصل مذکور ہو

گا-بلکہ آپ کی تصانیف میں کئی ایک مسائل ایسے ہیں جن میں حدیث کی موافقت میں آپ نے امام احمدؒ کے قول کو اختیار نہیں کیا اور یہی "ترک تقلید" ہے-؎

ہوتے ہوئے مصطفیٰ کی گفتار
مت دیکھ کسی کا قول و کردار

مثلاً امام احمدؒ سورہ فاتحہ کو نماز میں فرض قرار نہیں دیتے (ملاحظہ ہو جامع ترمذی باب ماجاء فی ترك القرأة خلف الامام اذا جهر) لیکن حضرت پیر صاحبؒ سورہ فاتحہ کو نماز کا رکن کہتے ہیں (دیکھو غنیۃ الطالبین مترجم فارسی ص ۴)

اگر محض کسی دوسرے شخص کے لکھ دینے سے کوئی شخص مقلد بن جاتا ہے تو شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ اور ان کے شاگرد رشید حافظ ابن قیمؒ کو بھی لوگ حنبلی کہتے ہیں- حالانکہ رد تقلید میں ان کی تصانیف مشہور عالم ہیں- اور اسی وجہ سے وہ ہدف ملامت ہیں زندگی میں وہ سخت امتحان میں ڈالے گئے- قید کئے گئے- امام ابن تیمیہؒ تو آخری دفعہ ایسے قید کئے گئے کہ مر کر ہی چھوٹے اگر وہ مقلد ہوتے تو ان مصائب و مظالم کا تختہ مشق نہ بنائے جاتے-

دیگر یہ کہ جس طرح فروع میں چار مذہب حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی مشہور ہیں اسی طرح اصول (عقائد) میں تین مسلک ہیں- اشعریہ، ماتریدیہ اور حنابلہ پس یہ حضرات یعنی شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن قیمؒ اور سید عبدالقادر جیلانیؒ بلحاظ اصول (عقائد) کے حنبلی تھے- نہ بلحاظ فروع کے کہ ان کو مقلد بمعنی معروف کہا جائے- چونکہ لفظ حنبلی دونوں (اصول و فروع) میں یکساں تھا اس لئے ان حضرات کے اسماء گرامی کے ساتھ ساتھ لفظ حنبلی لکھا ہونے سے کسی نے ان کو حنبلی بلحاظ فروع سمجھ لیا ہو تو یہ اس کی اپنی سمجھ ہے جو درست نہیں- ورنہ ان کی تصانیف تقلید شخصی زیر نزاع کے بالکل برخلاف شہادت دیتی ہیں- اور یہ بات کئی ایک علماء کے حالات میں ملتی ہے کہ وہ از روئے اصول کسی مذہب کے پیرو تھے اور از روئے فروع کسی دوسرے کے- مثلاً علامہ زمخشری کہ رئیس المعتزلہ کہے جاتے تھے اور باوجود اس کے حنفی بھی تھے- تو اس

کی یہی وجہ ہے کہ وہ ازروئے عقائد معتزلی تھے اور ازروئے فروع حنفی تھے اور اصول میں اشعری تھے (تاریخ کامل واقعات ۴۶۶ھ) پس اسی طرح یہ حضرات مذکورین فروع میں اہل حدیث تھے اور اصول میں حنبلی اور اہل حدیث میں سے بہت سے لوگ اسی طریق کے تھے اور ہیں۔ اگرچہ اشعری بھی بہت ہوئے فافہم۔

بعض لوگ امام بخاریؒ اور امام ترمذیؒ وغیرہما محدثین کو بھی شافعی المذہب کہہ دیتے ہیں جن لوگوں نے ان کی تصنیفات نہیں پڑھیں اور ان کو ان کی جلالت شان معلوم نہیں ہوئی اگر وہ کہیں تو تعجب نہیں۔ تعجب تو ان پر ہے جو باوجود کتب حدیث کی تدریس اور علوم کی خدمت میں عمر کا ایک معتد بہ حصہ صرف کر چکنے کے کم علموں کے ہم صفیر بن جاتے ہیں۔ کیا ان کو معلوم نہیں کہ امام بخاریؒ اور امام ترمذیؒ اپنی جامع میں اختلاف مذاہب کا بیان عالمانہ و مجتہدانہ طریق سے کرتے ہیں یا مقلدانہ ؟ اور اگر ان کا اجتہاد کسی سابق امام مثلاً امام شافعیؒ کے مطابق و موافق ہوا ہے تو یہ ان کے اس امام کا مقلد ہونے کی دلیل نہیں کیونکہ اجتہاد میں موافقت اور چیز ہے اور تقلید اور چیز۔ جیسا کہ حجۃ اللہ کی عبارت سے سابقاً گذر چکا فافھم و لا تکن من القاصرین۔

اہل حدیث و دیگراں

ناظرین کرام! جب آپ فصول سابقہ میں پڑھ چکے کہ علم کی کمی اور نصوص سے بے پرواہی اور درباری مناصب اور شاہی خطابات کی رغبت اور آپس میں ایک دوسرے سے کدو کاوش کے سبب تقلید کی جڑ جم گئی۔ اور اس کا درخت سلطنت کی آبیاری سے خوب پھیل گیا۔ اور اس نے ایک جہان کو اپنے سایہ میں لے لیا۔ اور آپ یہ بھی معلوم کر چکے کہ اس وقت بھی ایک گروہ سنت نبویؐ پر مضبوطی سے قائم رہا اور حسب وصیت حضرت خیر البریہ عضوا علیها بالنواجذ (ترمذی) حدیث نبوی کو محکم طور پر پکڑے رہا۔ جیسا کہ جناب شاہ صاحب کی عبارت میں گذر چکا اور حدیث صحیح لا تزال طائفة من امتی الخ کے مطابق یہ گروہ حق پژدہ ہر زمانہ میں برابر چلا آیا ہے۔ تو اب معلوم کرنا چاہئے کہ ان قلیل التعداد متبعین سنت کا تعلق دوسرے فرقوں سے کیا رہا اور دوسرے ان سے کیسے سلوک سے پیش آئے اور پھر انہوں نے ان سے کیا برتاؤ کیا۔

سو معلوم ہو کہ جیسا کہ ہوائے زمانہ کے خلاف چلنے والوں کو قسم قسم کی شدائد و مصائب کا نشانہ اور طرح طرح کی ملامتوں اور بدگوئیوں اور انواع و اقسام کے بہتانوں اور افتراؤں کا آماجگاہ بننا پڑتا ہے کہ کبھی تو ابنائے زمانہ اہل حق کے دلائل سے تنگ آ کر ان پر فتوے جڑ جڑ کر ان کی شکایتیں حکومت میں پہنچاتے اور ان پر زمین تنگ کر دیتے ہیں جیسا کہ سید المحدثین امام عالی مقام محمد بن اسمٰعیل بخاری علیہ الرحمتہ اللہ الباری سے کیا گیا۔ اور کبھی ان پر اتہام و بہتان لگا لگا کر عوام الناس کو ان کے برخلاف بھڑکا کر ان سے بدظن بنا دیتے ہیں کہ کوئی ان سے ہدایت نہ پا سکے۔

اسی طرح غریب اہل حدیث بھی روش زمانہ و تقلید کے خلاف چلنے کے سبب طرح طرح کی اذیتوں کا تختہ مشق بنائے گئے۔ ان کے لئے مکروہ نام تجویز کئے گئے کہ لوگ ان سے نفرت کریں۔ جب انہوں نے تقلید کا بندہ گلے میں نہ ڈالا تو اس کے عوض میں ان کو قید

خانہ میں بند کیا گیا۔ اور چونکہ وہ آنحضرت ﷺ کی اتباع سے ذرہ بھی نہ ہٹے تھے اس لئے ان کے اس رسوخ و جماؤ کو نقل مکانی و جلاوطنی سے بدلا گیا۔ فلدرھم و علی اللہ اجرھم۔

ان غریبوں نے ان سب مصائب کو نہایت استقلال سے برداشت کیا اور اپنی بے گناہی کے لئے زبان حال سے یوں کہتے رہے ۔

مکش بہ تیغ ستم والہان سنت را
نکردہ اند بجز پاس حق گناہ دگر!

وطن سے خارج ہوئے۔ لیکن اتباع سنت سے قدم باہر نہ رکھا۔ قید کئے گئے مگر غیر کی تقلید کا بند گلے کا ہار نہ بنایا۔ بدنما' بدنام ہوئے' طعنے سہے' نشانہ بنے لیکن جس کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا اس سے منہ نہ موڑا۔ دام میں پھنسے دم نکلنے کو ہوا مگر رسول اللہ ﷺ کا دامن نہ چھوڑا۔ و مما قلت ۔

فدائے سنت احمدؐ جو اپنا نام کرتے ہیں
وہی دارین میں اپنے کو خوش انجام کرتے ہیں

اگر ہم ان امور کو واقعات سے ثابت نہ کریں تو شائد کوئی محض تخیلات اور بیجا شکایات سمجھے اس لئے حوالجات ذیل بلاحظہ ہوں۔

حضرت سید عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ جن کا اہل حدیث ہونا سابقاً ثابت ہو چکا ہے اپنی کتاب غنیۃ الطالبین میں فرماتے ہیں کہ قدریہ و معتزلہ تو (اس) فرقہ ناجیہ کا نام مجبرہ (جبریہ) رکھتے ہیں اور مرجیہ لوگ ان کو شکاکیہ کہتے ہیں اور رافضی ان کو ناصبی کے نام سے پکارتے ہیں اور جہمیہ و نجاریہ ان کو مشبہ کہتے ہیں اور باطنیہ ان کو حشویہ سے یاد کرتے ہیں۔

ویسمیھا الباطنیۃ حشویۃ لقولھا بالاخبار وتعلقھا بالاثار وما اسمھم الا اصحاب الحدیث واھل السنۃ علی مابینا (غنیہ مترجم فارسی ص ۲۱۲)

''کیونکہ وہ آنحضرت ﷺ کی احادیث کے قائل ہیں' اور روایات سے تعلق

رکھتے ہیں اور ان کا کوئی نام بھی نہیں مگر ایک ہی نام یعنی اصحاب الحدیث (حدیث والے) اور اہل سنت (سنت والے) جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔"

اس سے ظاہر ہے کہ ہر زمانے کے بدعتی لوگ اہل حدیث کے طرح طرح کے نام تراشتے چلے آئے ہیں۔ اس وقت یہ نام تھے اور اب یہ ہیں کہ کوئی وہابی نجدی کہتا ہے کوئی لا مذہب بناتا ہے کوئی غیر مقلد کہہ کر پکارتا ہے اور یہ سب کچھ توحید و سنت کو مضبوطی سے پکڑنے اور روش زمانہ (تقلید) کے چھوڑنے کے سبب ہے۔ حالانکہ وہ بیچارے سوائے اس نام کے جس میں خدا اور رسول کی نسبت پائی جائے کسی نام پر راضی نہیں۔ ع

کسی کا ہو رہے کوئی نبی کا ہو رہے ہیں ہم

(۲) رئیس الاحرار شیخ الاسلام ابن تیمیہ الحرانی کی حریت و آزادی اور ترک تقلید کے متعلق دھواں دھار تقریریں مشہور انام ہیں۔ آپ جس طرح سب علوم عقلیہ و نقلیہ میں امام ہیں۔ اسی طرح حریت و آزادی میں بھی پیشوا ہیں۔ اور لطف یہ کہ مصائب و ابتلاء اور دشمنوں کی بدگوئی کے نشانہ خاص اور مشارالیہ مخصوص ہیں ان کی زندگی کن کے ہاتھوں مصیبتوں میں کٹی اور کیوں؟ اسی لئے کہ وہ نصوص شرعیہ کو پیش نظر رکھ کر علم خداداد سے کام لیتے تھے اور کسی کی رائے کے پابند نہ تھے۔ جس سے علمائے زمانہ مخالف ہو گئے۔ اور ان کی ایذا رسانی میں ہر طرح کی ممکن تجویز کو عمل میں لانے لگے چنانچہ حافظ ذہبیؒ جن کا فضل و کمال علوم حدیثیہ و تاریخیہ کے متعلق مسلم کل ہے آپ کے ترجمہ میں فرماتے ہیں۔

وقد انفرد و بفتاوی نیل من عرضه لاجلها و هی مغمورة فی بحر علمه فالله تعالی لیسامحه ویرضی عنه ما رایت مثله (تذکرة الحفاظ ص ۲۵۹)

"اور فتووں میں متفرد ہوئے ہیں۔ جن کی وجہ سے آپ کی بے عزتی کی گئی۔ اور وہ فتاویٰ آپ کے علم کے سمندر میں ڈوبے ہوئے تھے۔ پس اللہ تعالیٰ

آپ کو معاف کرے اور آپ سے راضی ہو- میں نے آپ کی مثل کوئی نہیں دیکھا-"

چنانچہ ان کا شاگرد رشید علامہ محمد بن شاکر کتبیؒ جس نے آپ کے اکثر واقعات بچشم خود دیکھے اور آپ کی زبانی اپنے کانوں سنے تھے- اپنی مشہور کتاب فوات الوفیات میں آپ کے ترجمہ میں اس ذکر کے بعد کہ علماء و فقرائے زمانہ یہ خیال کر کے کہ (شیخ الاسلام) امام ابن تیمیہؒ ہمارے طریقہ کے خلاف چلتا ہے اور ہماری جماعت کو توڑتا ہے یوں رقمطراز ہے-

فاوصلوا الى الامراء امره واعمل كل منهم فى كفره فكره فرتبوا محاضر والبوا الر ويبضة للسعى بها بين الاكابر وسعوا فى نقله الى حضرة المملكة بالديار المصرية فنقل واودع السجن ساعة حضوره واعتقل وعقد والا راقة دمه مجالس وحشد والذلك قوما من عمار الزوايا و سكان المدارس (مطبوعه مصر ص۳۹)

پس ان (علماء و فقراء) نے (متفقہ کوشش سے) آپ کا معاملہ حکام تک پہنچایا- اور ان میں سے ہر ایک نے اپنی فکر آپ کے کفر میں چلائی- پس انہوں نے محضر نامے مرتب کئے اور عوام کو بھڑکایا کہ ان محضر ناموں کو بڑے بڑے لوگوں کے پاس جلد لے جائیں اور بہت کوشش کی کہ آپ کو دیار مصریہ کے دربار حکومت میں لے جائیں چنانچہ آپ وہاں لے جائے گئے اور حاضری کے ساتھ ہی قید خانہ میں ڈالے گئے اور باندھے گئے (دشمنوں نے) آپ کی خونریزی کے لئے بھی مجالس مقرر کیں اور ہر قسم کے لوگ کیا گوشہ نشین (فقراء) اور کیا ساکنان مدارس (علماء) جمع کئے-

شیخ الاسلام کے مصائب یہیں تک ختم نہ ہو گئے بلکہ ایک جگہ سے نکلے تو دوسری جگہ پھنسے اور وہاں سے چھوٹے تو تیسری جگہ بند ہوئے' یہاں تک کہ آخری بار تو ایسے پھنسے کہ مر کر ہی چھوٹے- چنانچہ علامہ مذکور عبارت مذکورہ کے ذرا آگے فرماتے ہیں-

ثم لم یخل بعد ذلك من فتنة بعد فتنة ولم ینتقل طول عمره من محنة الا الی محنة الی ان فوض بعد امره الی بعض القضاة ما تقلد احتقاله ولم یزل بحبسه ذلك الی حین ذهابه الی رحمة الله تعالی وانتقاله (ص ۴۰)

"پھر اس کے بعد آپ ایک نہ ایک فتنہ میں ضرور مبتلا ہوتے رہے۔ اور اپنی عمر ایک مصیبت سے نکل کر دوسری بلا میں واقع ہوتے رہے یہاں تک کہ آپ کا معاملہ ایک قاضی صاحب کے سپرد ہوا جنہوں نے اپنی قضا آپ کے باندھ لینے (قید کر دینے) ہی پر چلائی اور اپنے انتقال اور اللہ کی رحمت کی طرف چلے جانے تک اسی میں قید میں رہے۔"

اسی طرح حافظ شمس الدین ذہبیؒ تذکرۃ الحفاظ میں آپ کے ترجمہ میں فرماتے ہیں۔

وقد امتحن و اوذی مرات و حبس بقلعة مصر والقاهر والا سکندریه و بقلعة دمشق مرتین وبها تو فی فی عشرین من ذی القعدة سنة ثمان و عشرین و سبعمائة فی قاعه معتقلا (جلد رابع ص ۲۸۹)

"(امام ابن تیمیہؒ) بہت دفعہ امتحان میں پڑے اور ایذا دیئے گئے اور مصر اور قاہرہ اور اسکندریہ کے قلعہ میں قید کئے گئے اور وہیں قاعہ (دمشق کے قلعہ) میں ۲۰ ذیقعدہ ۷۲۸ھ کو قید ہی میں فوت ہوئے۔"

اس تصویر کا دوسرا رخ :- مخالفین کی پے در پے ریشہ دوانیوں اور سازشوں اور حکام کی متواتر بے انصافیوں اور بے طرح سختیوں پر بھی حضرت شیخ الاسلامؒ کے پاک و بے غبار دل میں مسلمان والیان حکومت اور علمائے امت کی خیر خواہی میں ذرہ بھر بھی فرق نہ آیا۔ وہ ان شدید مظالم کے باوجود بھی ان دو ہر فریق بلکہ عامہ مسلمین کی نصرت و حمایت میں اسی طرح دل و جان اور مال و بدن سے کوشاں رہتے جیسے کہ اعزاز و اکرام کی صورت میں متصور ہو سکتا ہے واقعات شاہد ہیں کہ حضرت امام ممدوح نے بارہا نہایت شجاعت سے فی سبیل اللہ جہاد کر کے جماعت کفار کو پائمال کیا۔ چنانچہ ہم چند واقعات

بطور فہرست ترتیب وار لکھتے ہیں۔

(۱) ۶۹۹ھ میں نوبہ غازان میں جنگ کیا۔

(۲) ۷۰۰ھ میں جب کفار تاتار نے شام میں فتنہ برپا کیا تو امام ممدوح نے ارکان دولت کو جہاد کی ترغیب دے کر کھڑا کیا اور اسی مہم کے لئے مصر کا سفر کیا اور دربار مصر میں اس مصیبت عظمٰی کی فریاد کی اور اراکین سلطنت کو غیرت دلا دلا کر اور جہاد کے اجر عظیم اور بے حساب ثواب سنا سنا کر آمادہ جہاد کیا اور پھر ایک جمعیت کے ساتھ شام میں مراجعت کر کے اور بنفس خود شریک جنگ ہو کر تاتاریوں کے فتنہ کو فرو کیا۔ اور ان کے امنڈتے ہوئے سیلاب کو روک دیا۔ جزاه الله عن سائر المسلمين جزاء حسنا

(۳) ۷۰۰ھ میں شقحب میں جو دمشق کے قریب ایک مقام ہے شجاعت کے وہ جوہر دکھائے کہ سبحان اللہ۔ اس جنگ میں بھی خلیفہ و سلطان اور اعیان ارکان دولت کو ترغیب و تحریص سے کھڑا کیا اور مسلمانوں کو کفار کے فتنے سے بچالیا۔ اس جنگ میں آپ سے بہت سی کرامتیں ظاہر ہوئیں۔ اور استجابت دعا بارہا ظہور میں آئی۔

(۴) ۷۰۴ھ میں کسروانیوں سے جہاد کیا اور کامل فتح حاصل کر کے ان کی بیخ کنی کر دی۔

غرض کسی نازک سے نازک موقع پر بھی مسلمانوں کی خیر خواہی سے پیچھے نہیں ہٹے۔ شاید یہ کہا جائے کہ یہ حکام انہیں میں سے تو تھے جن کے ہاتھوں جگہ بجگہ قید ہوئے تھے تو پھر ان کی نصرت میں کیوں لگ جاتے تھے۔ یا یوں کہیے کہ جن کی نصرت کرتے تھے ان کی مرضی کی خلاف ورزی کر کے قید کیوں ہو جاتے تھے؟ اور جو علماء عصر عوام الناس کو بھڑکا کر ان سے محضر نامے پر دستخط کراتے تھے علامہ موصوف ان علماء اور عوام کی خیر خواہی اور ہمدردی کا دم کیوں بھرتے تھے؟

اصل بات یہ ہے کہ آپ نہایت حق پرست تھے۔ اپنے خداداد علم سے کام لیتے تھے اور حق کے مقابلے میں کسی کی پرواہ نہ کرتے تھے۔ خواہ اس راست روی سے کسی کو نقصان پہنچے خواہ نفع۔ محبت تھی تو بس اللہ کے لئے اور بغض تھا تو بس اسی کے واسطے۔

آپ کا عمل آنحضرت ﷺ کی اس حدیث پر تھا کہ

عن تمیم الداری ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال الدین النصیحۃ قلنا لمن قال للہ ولکتابہ ولرسولہ ولائمۃ المسلمین وعامتھم (صحیح مسلم جلد اول ص ٥٤)

"آپ نے فرمایا کہ دین تو بس خیر خواہی کا (نام) ہے لوگوں نے عرض کیا کس کی؟ فرمایا خدا کی اور اس کی کتاب کی اور اس کے رسول کی اور خلفاء اسلام کی عام مسلمانوں کی۔"

عام علماء حدیث نے بیان کیا ہے کہ چار حدیثوں پر مدار اسلام ہے۔ایک ان میں سے یہ حدیث الدین النصیحۃ ہے۔امام نووی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث مدار اسلام کا چوتھا جز نہیں ہے بلکہ یہ اکیلی مدار اسلام ہے۔پس جب آنحضرت ﷺ اس میں ائمہ مسلمین یعنی خلفائے اسلام کی خیر خواہی کو مدار اسلام میں داخل کریں تو امام ابن تیمیہ "کسی آڑے وقت پر اسلامی سلطنت کی بد خواہی کیسے کر سکتے ہیں۔ان کی تمنا تو یہ تھی کہ ان کی جان ان کا مال' ان کی عزت و آبرو سب کچھ اسلامی حکومت کی خیر خواہی میں لگ جائے تو دل کو چین اور کلیجہ کو ٹھنڈک پہنچے۔

نکل جائے دم تیرے قدموں کے نیچے
یہی دل کی حسرت یہی آرزو ہے

اگر ان پر ظلم کیا یا ان کو ناحق قید کیا تو بعض ان لوگوں نے جن کے ہاتھ میں اس وقت زمام حکومت تھی نہ کہ اسلام کے شاہانہ اقتدار نے۔ان ظالموں کا استبدادی ہاتھ کم از کم ان کی موت سے کٹ سکتا تھا' چنانچہ کٹ گیا' لیکن اگر ان پر خفگی کی وجہ سے اسلامی سلطنت کے خلاف ہاتھ اٹھایا جائے یا ان کی نصرت میں تساہل و تکاسل کیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلام کا شاہانہ اقتدار (معاذ اللہ) زائل ہو جائے۔لہٰذا ضروری تھا کہ اپنے نفسانی جذبات کو دبا کر ہمہ تن نصرت اسلام میں مصروف ہو جاتے' اس کی مثال یہ ہے کہ میاں بیوی میں کچھ ناراضی ہوئی رات کو چور آیا میاں نے جی میں کہا بلا

سے سب کچھ لے جائے مجھے کیا- گھر کی چیزیں کس کام کی' زیور ہے تو عورت کے استعمال کا' قیمتی پارچات ہیں تو اسی کے پہننے کے- میرے لئے تو سادہ لباس ہے سو اس کو تو کوئی لے جائے گا نہیں- اور بیوی نے خیال کیا کہ مجھے کیا- کمائی ہے تو میاں کی اور قرض ہے تو اسی کے سر' نہ ہو گا تو اور لا کر دے گا- غرض ہر ایک اپنے اپنے غصہ میں رہے اور مشترکہ خانگی نفع کو عارضی رنجش کے سبب خیال میں نہ لائے جس سے دائمی حرمان نصیب ہوا- اگر خدا ان کو سمجھ دیتا کہ بھئی! یہ گھر دونوں کا ہے اس کا اثاثہ ہونے سے دونوں کو آرام ہے اور اس کے نقصان سے دونوں کو تکلیف تو اس وقت شور پکار کر کے یا مقابلہ کر کے چور کو ہٹا لیتے- آپس کی رنجش آخر دور ہو ہی جاتی آج نہ سہی کل سہی- ہمیشہ کے عذاب وافسوس اور حسرت و تاسف میں تو نہ پڑتے- پس امام ہمام کی دور اندیش نظر اسی بات پر تھی کہ اسلامی حکومت کی حمایت و حفاظت میرا فرض ہے اور عدل و انصاف ان لوگوں کا فرض ہے جن کے ہاتھ حکومت ہے- اگر وہ اپنا فرض ادا نہیں کرتے تو میں ان کی وجہ سے اپنے فرض کی ادائیگی میں میں کیوں قاصر رہوں؟

امام نووی نے اس حدیث کی شرح میں خلفاء اسلام کی خیر خواہی میں ان امور کو بھی شمار کیا ہے-

وترك الخروج عليهم و تالف قلوب الناس لطاعتهم

"کہ ان پر چڑھائی نہ کی جائے اور لوگوں کے دلوں کو ان کی اطاعت کی طرف مائل کیا جائے-"

پھر اس کے بعد امام خطابی سے نقل کیا ہے-

ومن النصيحته لهم الصلوة خلفهم و الجهاد معهم واداء الصدقات اليهم وترك الخروج بالسيف عليهم اذا ظهر منهم حيف او سوء عشرة (شرح صحیح مسلم للنووی جلد اول ص ٥٤)

"خلفائے مسلمین کی خیر خواہی میں سے ہے ان کے پیچھے نماز ادا کرنا- اور ان کی ماتحتی و معیت میں جہاد کرنا اور ان کو زکوٰۃ و صدقات کا (اسلامی خدمات کے

لئے) ادا کرنا- اور جب ان سے کچھ بے انصافی اور بد نظمی ظاہر ہو تو اس وقت بھی ان پر تلوار سے چڑھائی کرنے سے رکے رہنا-

غرض شیخ الاسلام پکے موحد' سچے دیندار تھے- جن کے جذبات کی نرم و گرم کیفیت شریعت کی ماتحتی میں تھی- جب کوئی والئے حکومت کوئی خلاف شرع کام کرتا تو یہ اس کو نصیحت کرتے' جس سے اس کو چڑ آتی اور بہانہ طلب کر کے آپ کو قید کر دیتا- لیکن آپ تھے کہ جب سلطنت اسلامی پر کسی غیر کا سایہ بھی دیکھتے تو اپنا فرض ایمانی سمجھ کر حمایت کو کھڑے ہو جاتے کیونکہ اسلامی حکومت کی نصرت و حمایت شرعاً واجب ہے اگرچہ والیان حکومت ظالم و فاسق ہوں-

پس حضرت شیخ الاسلام سلطنت اسلامی کی نصرت واجب سمجھتے تھے- اس وجہ سے کہ یہ خدا اور اس کے رسول کا حکم ہے نہ اس وجہ سے کہ ان کے وظیفہ خوار ہوں تو کریں ورنہ دست کش رہیں تعس عبد الدرهم ان اعطى رضي وان لم يعط سخط اس طرح ان علماء کی خیر خواہی کو بھی سمجھ لیجئے جو حکام کے پاس شکایتیں کر کر کے آپ کو قید کروا دیتے تھے بلکہ آپ کے خون کے پیاسے تھے' ان کی خیر خواہی بھی اسی حدیث کی رو سے وہ اپنا فرض جانتے تھے-

آپ کا بار بار جہاد میں شریک ہونا تو سلطنت اسلامیہ اور عامہ مسلمین کی ہمدردی اور خیر خواہی کی مثال ہے- اب خاص ان لوگوں کے حق میں آپ کے اخلاق دیکھئے جو ان کی چغلیاں کر کر کے زنداں میں بھجواتے تھے کہ جب شیخ الاسلام کو موقع ملا تو باوجود اس کے کہ خود سلطان والا شان نے آپ سے آپ کے دشمنوں کے قتل کی نسبت مشورہ کیا تو آپ نے اس کو اس سے روکا' چنانچہ علامہ صلاح الدین کتبی فرماتے ہیں-

ثم توجهه الى مصر واجتماعه بالسلطان في مجلس حفل فيه القضاة واعيان الامراء واكرامه له اكراما عظيما ومشاورته في قتل بعض اعدائه و امتناع الشيخ من ذلك (فوات الوفيات ص ۴۰ جلد اول)

"پھر آپ کا مصر کی طرف واپس جانا' اور سلطان کے ساتھ ایک مجلس میں

جمع ہونا جس میں دربار کے قاضی اور بڑے بڑے حکام جمع تھے اور سلطان کا آپ کی نہایت تعظیم کرنا اور آپ سے آپ کے بعض دشمنوں کے قتل کر دینے کا مشورہ کرنا اور حضرت شیخ الاسلام کا سلطان کو ایسا مشورہ نہ دینا' یہ سب باتیں ہیں کہ ان کے ذکر سے کئی جلدیں لکھی جاسکتی ہیں۔"

اس میں حضرت شیخ انبیاء علیہم اسلام کے قدم بقدم ہیں۔ چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام نے جب اپنے بھائیوں پر اختیار پایا۔ تو آپ نے لا تثریب علیکم الیوم کہہ کر پچھلے ماجرے کو لپیٹ دیا[1] اور اسی طرح آنحضرت ﷺ نے جب فتح مکہ پر کفار قریش پر قابو پایا اور وہ بطور اسیران جنگ آپ کے سامنے پیش ہوئے تو آپ نے ان کو اذھبوا فانتم الطلقاء[2] کہہ کر معاف کر دیا۔

غرض اہل حدیث اور دیگروں (ہر دو) کی تصویر آپ کے سامنے ہے یہ یہ ہیں اور وہ وہ۔

(۳) ائمہ اہل حدیث میں سے دوسرے بزرگ جن سے لوگ اسی سلوک سے پیش آئے جو عاشقان سنت نبویہ کا خاص حصہ ہے حافظ ابن حزم رحمہ اللہ ہیں آپ کا نام علی اور کنیت ابو محمد ہے اور اپنے جد اعلیٰ حزم کی طرف مضاف ہو کر ابن حزم کے نام سے مشہور ہیں آپ ۳۸۴ھ میں ملک سپانیہ (سپین اندلس) کے شہر قرطبہ کارڈوا (CORDVA) میں پیدا ہوئے جمیع علوم عقلیہ ونقلیہ میں درجہ امامت پر پہنچے۔ آپ باتفاق کل ان چند بزرگوں میں سے ہیں جو جمیع فنون عربیہ میں امام ہوئے ہیں۔ آپ کو ایسے دیگر ائمہ سے ایک خاص امتیاز بھی ہے کہ آپ ملک سپین میں دولت عامریہ کے وزیر سلطنت بھی تھے باوجود اس قدر ریاست اور حکومت کے نہایت درجہ کے عابد' زاہد اور متواضع و متقی تھے۔ چونکہ طبیعت میں آزادی اور طبع میں جولانی بہت تھی اس لئے اپنی تحقیقات سے کام لیتے اور ملکہ خداداد کی بے قدری وناشکری نہیں کرتے تھے۔

---

[1] آج (جو ملامت کا وقت ہے۔ اس وقت بھی) تم پر کوئی ملامت نہیں۔

[2] جاؤ تم آزاد ہو۔

سنت نبوی کے عاشق تھے اور اس پر عمل کرنے میں کسی امام و مجتہد کی پروانہ نہ کرتے تھے اور تقلید کو حرام جانتے تھے- چنانچہ اپنے اس مسئلہ کو اپنی کتاب ''الفصل'' میں مفصل بیان کیا ہے لہٰذا ان علماء نے جو تقلید کے پابند تھے- آپ پر طرح طرح کے الزام تراشنے شروع کیے کہ یہ شخص ائمہ دین کی تحقیر کرتا ہے اور ان کے خلاف چلتا ہے- پس ادھر تو عوام کو آپ کے پاس جانے سے روکا اور ادھر سلاطین کو خوف دلایا کہ یہ شخص خطرناک ہے- چنانچہ آپ کو جلاوطن کیا گیا اور آپ موضع لبلہ کے میدان میں ۲۷' ۲۸ شعبان ۴۵۶ھ کو فوت ہو گئے- انا للہ وانا الیہ راجعون [1]

(۴) اسی طرح استاد الہند حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ سے ہوا کہ آپ نے جب ''حجتہ اللہ'' اور ''انصاف'' اور ''عقد الجید'' میں تقلید و اتباع سنت کے متعلق محققانہ مضامین لکھے اور قرآن مجید اور مؤطا امام مالک کا ترجمہ کر کے لوگوں کو قرآن و حدیث کی طرف رغبت دلائی تو علماء زمانہ کا ایک گروہ آپ کے مخالف ہو گیا- آپ کے خلاف مشورے کر کے لوگوں کو آپ کے پاس جانے سے روکا اور آپ کے قتل کے درپے ہو گئے لیکن خدا تعالیٰ نے آپ کو ان کے شر سے محفوظ رکھا- چنانچہ ہم آپ کے بعض حالات اسی کتاب کے باب ''ہندوستان اور علم و عمل بالحدیث'' میں بیان کریں گے-

(۵) ایسا ہی اہل حدیث کے مسلم پیشوا حضرت میاں صاحب مرحوم (شیخنا و شیخ الکل حضرت شمس العلماء سید نذیر حسین صاحب محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ) سے سلوک کیا گیا کہ بوجہ آپ کے تارک تقلید و متبع سنت ہونے کے آپ کو ہر طرح سے ستایا گیا- اور ایذا رسانی میں کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑا گیا- لیکن حضرت میاں صاحب ممدوح نے مخالفین سے کبھی انتقام نہیں لیا- بلکہ نہایت صبر و سکون سے اشاعت سنت و درس حدیث میں لگے رہے- جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کی زندگی ہی میں علم حدیث اور

---

[1] تنبیہ- آپ کا مسلک اور طریق اجتہاد اہل حدیث کے طریق اجتہاد کی فصل میں ذکر کیا جاوے گا انشاء اللہ تعالیٰ-

مذہب اہلحدیث ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل گیا- اور مخالف و موافق تمام آپ کے کمالات علمیہ و فضائل عملیہ پر متفق ہو گئے- اور آپ کی وفات پر امام احمد بن حنبلؒ کے مقولہ الفرق بیننا وبین اھل البدع یوم الجنائز کی تصدیق ہو گئی- اور جب آپ کا جنازہ اٹھایا گیا تو کثرت ازدہام سے شہر دہلی کے کشادہ رستے بھی تنگ ہو گئے- ہزارہا لوگ بارش کی طرح آنسو بہاتے ہوئے جنازے کے ساتھ ساتھ جاتے تھے- آپ کے دیکھنے والے اور ہمارے بیان کی تصدیق کرنے والے سینکڑوں ہزاروں مسلمان ابھی تک زندہ موجود ہیں غفر اللہ لنا ولھم[1]

غرض اہلحدیث بیچارے ہمیشہ اپنے مخالفین کے قولی و فعلی مظالم کے تختہ مشق بنے رہے اور یہ بے نفس ہمیشہ کفوا ایدیکم[2] پر عمل پیرا رہے- اور بمقتضائے آیت وعباد الرحمن الذین یمشون علی الارض ھونا واذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلاما[3] (فرقان پ۱۹) اور بمجوائے حدیث صحیح بخاری المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ (کتاب الایمان) قولاً و فعلاً دوسروں کو ایذا دینے سے بچتے رہے- خدائے دو جہان ان کو نیک جزا عطا کرے کما قال انما یوفی الصٰبرون اجرھم بغیر حساب (زمر پ۲۳)

❀ ❀ ❀

[1] یہ سارا نقشہ ہم سے ہمارے دوست حاجی نبی بخش صاحب بزاز سیالکوٹی نے بیان کیا- جو ان دنوں اپنی تجارت پارچہ کے لئے دہلی گئے ہوئے تھے اور شامل جنازہ تھے میں اس وقت جلسہ ندوۃ العلماء کی تقریب پر امرتسر میں تھا-

[2] بند کرو ہاتھ اپنے

[3] اور رحمان کے بندے وہ ہیں جو چلتے ہیں اوپر زمین کے آہستہ اور جب مخاطب ہوتے ہیں- جاہلوں سے تو کہہ دیتے ہیں سلام-

اہل حدیث کا مذہب اصولاً و فروعاً

اصل دین آمد کلام اللہ معظم داشتن
پس حدیث مصطفےٰ برجاں مسلم داشتن

نیز ؎

ہوتے ہوئے مصطفےٰ کی گفتار
مت دیکھ کسی کا قول و کردار

اور یہ دراصل آنحضرت ﷺ کے خطبہ کا ترجمہ ہے۔ جو صحیح مسلم وغیرہ کتب حدیث میں مروی ہے کہ آپ حمد الٰہی کے بعد کہا کرتے تھے۔

اما بعد فان خیر الحدیث کتاب اللہ و خیر الھدی ھدی محمد صلی اللہ علیہ وسلم وشر الامور محدثاتھا وکل بدعة ضلالة

(صحیح مسلم جلد اول ص ٢٨٥)

کلاموں میں سب سے بہتر خدا کی کتاب (قرآن مجید) ہے اور عادتوں اور طریقوں میں سب سے بہتر محمد ﷺ کی عادت اور طریق ہے اور سب سے برے امر وہ ہیں جو نئے نکالے جائیں اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

پس اہل حدیث کا اعتقادی و قلبی اور علمی و عملی مذہب یہی ہے۔

ازالہ شبہ :۔ اس مقام میں شاید آپ یہ کہیں کہ قرآن و حدیث تو ہر فرقہ کے نزدیک اصول شرع مانے گئے ہیں۔ پھر اہل حدیث ان کو اپنے امتیازی نشان کس طرح قرار دے سکتے ہیں۔ نیز یہ کہ اصول مذکورہ ثلاثہ کے رو سے کوئی فرقہ بھی جدید نہیں کہلا سکتا۔ کیونکہ ہر کوئی اپنے آپ کو آنحضرت ﷺ ہی کا امتی جانتا اور کہتا ہے۔ اور اپنے اصول (عقائد) اور فروع (اعمال) کو رسول اللہ ﷺ کے مقرر کردہ تعلیم کردہ قرار دیتا ہے۔ غرض ہر کوئی اسی جمال محمدیؐ کا شیفتہ و فریفتہ ہے ؎

عبارتنا شتي و حسنك واحد و كل الى ذاك الجمال يشير

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

جس گلستاں کے تم گل تر ہو-! خار اس بوستاں کے ہم بھی ہیں

اس شبہ کا ازالہ یوں ہے کہ بے شک بادی النظر میں ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ ہر فرقہ بزعم خود قرآن و حدیث ہی کی پیروی کرتا ہے-اور انہی کو اصول شرع اور واجب الاتباع جانتا ہے-اور اپنے آپ کو اپنے مسلک میں سوائے رسول اللہ ﷺ کے کسی اور کا متبع خیال نہیں کرتا- لیکن بنظر تعمق و تحقیق دیکھا جائے تو سب فرقے اہل حدیث کے سوا اس شعر کے مصداق ثابت ہوتے ہیں ؎

و كل يدعي و صلا لليلٰى و ليلي لا تقرلهم بذاكا

ہم نہیں کہتے کہ مولوی عبداللہ چکڑالوی بانی فرقہ اہل قرآن کی طرح دوسرے فرقوں نے بھی سرے ہی سے حدیث نبوی کو بالکل ساقط الاعتبار قرار دیا ہے-بلکہ ہم کہتے ہیں کہ اہل حدیث کی طرح کسی فرقے نے بھی حدیث نبوی کو رائے و قیاس اور اجتہاد و استنباط پر امتیازی فوقیت نہیں دی- ہر ایک نے باوجود کسی حدیث کے مرتبہ صحت پر پہنچ جانے کے اس کی تسلیم میں کچھ نہ کچھ چون و چرا کی ہے- کسی نے مخالفت قیاس کا عذر کیا اور راوی (صحابی) کو غیر فقیہہ کہہ دیا اور کسی نے معارض قرآن دے کر ٹال دیا- اور کسی نے خلاف عقل کہہ کر رد کر دیا- اور کسی نے محض اس خیال سے کہ ہمارے امام و مقتدا نے اس حدیث کو نہیں لیا اس کی تعلیم سے سر پھیر دیا-

غرض ہر ایک نے بمقتضائے "چوں نبر دند بہ حقیقت پے رہ افسانہ زدند" اس کی اتباع میں کوئی نہ کوئی روڑا اٹکا دیا- (جیسا کہ ہر فرقے کی کتب اصول سے ظاہر ہے) اور بموجب حدیث نبوی لا يومن احدكم حتى يكون هواه تبعا لما جئت به[1] (مشکوٰۃ) اپنی ہوا اور اس خواہش کو ترک نہ کیا اور اسی وجہ سے باوجود آنحضرت ﷺ کے امتی

---

[1] تم میں سے کوئی بھی مومن نہیں ہو گا جب تک کہ وہ اپنی خواہش اس شے کے تابع نہ کر دے جو میں لے کر آیا ہوں-

ہونے کے اپنے آپ کو براہ راست آپ کی طرف منسوب نہ کر کے غیر سے نسبت جوڑ لی۔

بندہ عشق شدی ترک نسب کن جامی
کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہر ایک کے سامنے حدیث نبوی سے ورے ایک باطنی سد حائل ہے۔جو اسے حدیث تک پہنچنے سے روکے ہوئے ہے۔

لیکن اہل حدیث (اعلی اللہ منازلھم) نے برخلاف ان سب کے نہ تو کسی اور کی طرف اپنے آپ کو منسوب کیا۔اور نہ آنحضرت ﷺ کی حدیث پاک کی متابعت میں کسی کے قیاس ورائے کی موافقت کی شرط لگائی بلکہ نہایت سیدھے طور پر ٹھیک اسی طرح جس طرح رسول اللہ ﷺ دینیات میں بحیثیت رسول اللہ ہونے کے اپنی اطاعت واتباع کراتے اور صحابہ کرام بحیثیت امتی ہونے کے بلاچوں وچرا آپ کی اتباع کرتے تھے۔

ما اہلحدیثیم دغارا نشناسیم   باقول نبی چون و چرارا نشناسیم

اہلحدیث نے حدیث نبوی کو بموجب آیت و ما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی[1] (نجم پ ۲۷) وحی خدا اور بموجب آیت ثم ان علینا بیانہ[2] (قیامت پ ۲۹) اسے بیان و تفسیر قرآن جانا جیسا کہ مسند دارمی میں حضرت حسانؓ۔

عن حسانؓ قال کان جبرئیل ینزل علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم بالسنۃ کما ینزل علیہ بالقران (دارمی ص ۷۷)

سے مروی ہے کہ حضرت جبرئیلؑ آنحضرت ﷺ پر جس طرح قرآن کی وحی لے کر آتے تھے اسی طرح سنت کی وحی بھی لاتے تھے۔

---

[1] اور (ہمارا پیغمبر) اپنی خواہش سے نہیں بولتا جو کچھ وہ بولتا ہے وہ (خدا کی) وحی ہوتی ہے جو (اس کی طرف) کی جاتی ہے۔

[2] پھر (تعلیم الفاظ کے بعد) اس کا بیان بھی ہمارے ذمہ ہے۔

خصوصیت اہل حدیث دربارہ اتباع حدیث

اہل حدیث کے سوائے دوسرے فرقوں میں تعظیم حدیث کے متعلق اتنی کسر رہ گئی کہ ہر ایک نے حدیث نبوی کو اصول شرع سے مان کر اپنے مخصوص مقتدا وامام کے اقوال کو عملاً دو وجہ سے اصول قرار دیا۔ اول یہ کہ اگر کوئی قول کسی وجہ سے مخالف حدیث پڑ گیا تو حدیث کی تاویل کر دی لیکن اس قول کی تائید سے نہیں ہٹے۔ دوئم یہ کہ اگر کسی مقتدا وامام نے کسی ایسی روایت سے تمسک کیا جو عند التحقیق ضعیف بلکہ منکر بلکہ باتفاق محدثین غیر ثابت و بے اصل یا غیر مرفوع ہے تو اس کا حال معلوم ہو جانے پر بھی اس امام کے مقلدین نے اس قول کو نہیں چھوڑا۔ ان سے صاف ظاہر ہے کہ ان لوگوں نے عملی طور پر حدیث کو مرجع شرع نہیں جانا۔ گو اعتقاداً لفظاً حدیث کے قائل ہو گئے ہیں۔ ایک اور بات بھی ہے کہ ہر فرقے کے متاخرین نے احادیث نبویہ کو ملحوظ رکھنے کے بغیر اپنے اپنے امام و مقتدا کے اقوال کو اصول قرار دے کر ان پر تخریجات و تفریعات کا دروازہ کھول دیا جس سے عام علماء اس وہم میں پڑ گئے کہ یہ تخریجات بھی امام کے قول ہیں اور انہوں نے کتب فقہ کی ہر جزئی کو وحی آسمانی کی طرح سمجھ لیا۔ اس سے بخوبی روشن ہے کہ ائمہ کے اقوال کو حدیث کی طرح اصول قرار دیا گیا۔ اس بحث کو حضرت شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ میں بالتفصیل ذکر کیا ہے (جلد اول طبع مصر باب حکایۃ حال الناس الخ کے ضمن میں فصل ومما یناا سب ھذا المقام میں ص ۱۵۳ سے ص ۱۶۱ تک)

لیکن اہل حدیث نے اعتقاداً و عملاً سر مو حدیث نبوی سے تجاوز نہیں کیا۔ حدیث صحیح کے ہوتے نہ تو کسی امتی کی مخالفت کی (خواہ وہ کیسا ہی بزرگ و برگزیدہ ہو) پرواہ کی اور نہ کسی ضعیف حدیث پر اپنے احتجاج کی بنیاد رکھی۔ اس کی شہادت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہر فرقہ نے اپنے مذہب کے مخصوص مسائل کو مدون کیا اور ان

کتابوں کو اپنے مذہب کی کتابیں قرار دیا۔ اور ان کے خلاف دوسری کتابوں کو دوسرے مذاہب سے منسوب کیا۔ لیکن اہل حدیث نے نہ تو کوئی مخصوص مسائل الگ کئے' اور نہ ان میں تصنیف کر کے ان کتابوں کو اپنے فرقہ کی مخصوص کتابیں قرار دیا بلکہ ان کی ساری ہمت جمع احادیث نبویہ اور ان کی شرح و بیان اور تنقید و پڑتال میں خرچ ہوئی گویا انہوں نے اپنی زندگی کا مقصد یہی سمجھا کہ حدیث نبوی کی خدمت انجام دیں۔ اس کی اشاعت کریں۔ اقوال الرجال کی بجائے اقوال الرسول کو رواج دیں اور ہر ایسی کتاب سے الگ رہیں جس میں حدیث نبوی کی مخالفت پائی جائے۔ ہمارے اس بیان پر کیا کوئی ہمیں بتا سکتا ہے؟ کہ اہل حدیث نے فلاں تصنیف ایسی کی ہے جو انہی سے مخصوص ہے اور دیگر فرقے بحیثیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی ہونے کے اور باوجود حدیث نبوی کو اصول شرع تسلیم کرنے کے اس پر عمل نہیں کر سکتے۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جو اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہر سعادت مند' صاحب عقل و دانش کو اہل حدیث کی طرف مائل کرے گا کہ بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کی تعظیم و تعمیل جیسی اس فرقہ کی نظر میں ہے کسی اور کی نظر میں نہیں ہے۔ بس یہی امر اہل حدیث کا خصوصی و امتیازی نشان ہے جس نے ان کو حدیث نبوی کی طرف منسوب کرایا اور اس کا خادم خاص بنا دیا۔ اللھم احینی فیھم وامتنی فیھم واحشرنی فی زمرتھم ان کے خلاف ہم ہر فرقے کی مخصوص کتاب کی نسبت کہہ سکتے ہیں کہ وہ اسی فرقے کی کتاب ہے دوسرے مسلمانوں کو اس سے کوئی خاص تعلق نہیں۔ حتی کہ اگر ان میں سے کسی نے احادیث نبویہ کو بھی جمع کیا ہے تو بس اپنے دائرے کی حد بندی کے لئے۔ جو احادیث صحیحہ اپنے مذہب کے خلاف پائیں ان کی تو تاویل کر دی اور اپنے مذہب کے موافق احادیث ضعیفہ اور آثار موقوفہ کی ایسی بھرمار کر دی کہ گویا ان لوگوں کے لئے جو علم حدیث میں فرد مایہ ہیں روایات کا دریا بہا دیا ہے ملاحظہ ہو شرح معانی الآثار للطحاوی۔

غرض اس حیثیت سے کہ سنت آنحضرت ﷺ کو امام و مقتدا بنایا جائے علم حدیث

کی خدمت نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث نبوی کی عام اشاعت کے وقت بھی یہ لوگ علم سنت میں کم مایہ رہے الا ماشاء اللہ

اس دائرہ حد بندی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر فرقہ ادعا کرنے لگا کہ جب تک ہمارے مخصوص مسلک کو اختیار نہ کرو گے تب تک ہدایت یافتہ نہ کہلا سکو گے جیسا کہ ہم سے پیشتر کی امتوں یہود و نصاری کی نسبت فرمایا کہ وہ کہتے ہیں کہ تم یہودی یا نصرانی ہو جاؤ تو ہدایت پا جاؤ گے۔ وقالوا کونوا ھودا او نصاری تھتدوا (پ ۱ البقرہ)

لیکن اہل حدیث ہر ایک سے یہی کہتے ہیں کہ یہ سب باتیں پیغمبر صاحب سے ادھر کی ہیں اس سے اوپر چڑھو اور صحابہ کا طریق اختیار کرو۔ حدیث نبوی کی اتباع کرو جیسا کہ مذکورہ بالا قول یہود و نصاری کے جواب میں وارد ہے۔

قل بل ملة ابراھیم حنیفا (پ ۱ البقرہ)

"اے پیغمبر ان سے کہہ دو (کہ یہودیت و نصرانیت کی پیروی نہیں) بلکہ ابراہیم (خلیل اللہ) کی ملت اختیار کرو۔ جو حنیف (موحد) تھے۔"

جس اصول پر قرآن مجید نے یہود و نصاری کو جواب دیا ہے اسی بنا پر اہل حدیث سب کو کہتے ہیں کہ تم پیغمبر معصوم کی اطاعت کرو اور غیر معصوم کی اطاعت کو اپنے اوپر لازم نہ کر لو۔ اور مخصوص حد بندی کے دائرے سے نکل کر شاہراہ محمدی پر آجاؤ اور خوش خرام ہو کر نعرے لگاؤ ؎

ہوتے ہوئے مصطفے کی گفتار
مت دیکھ کسی کا قول و کردار

زمانہ نبوت میں صرف اتباع قرآن وحدیث

اب ہم اسی امر یعنی "مذہب اہل حدیث" کو کہ شریعت اسلامیہ کا مصدر و مرجع اور منتہی صرف وحی الٰہی یعنی قرآن وحدیث ہے موضوع کتاب کے لحاظ سے تاریخی طور پر ثابت کرتے ہیں کہ زمان نزول وحی سے لے کر بہترین زمانوں کے اختتام تک خالص قرآن وحدیث کی پیروی ہوتی تھی اور ان کے مقابلے میں کسی اور چیز کو شریعت نہیں جانا جاتا تھا حتی کہ ان نیک زمانوں کے بعد تقلید کی بنیاد رکھی گئی اور فرقہ بندی کی حدیں کھینچی گئیں۔ اس پر بھی ایک طائفہ برابر اسی روش پر چلا آیا اور وہ اب تک موجود ہے۔ خود منصب رسالت پر نظر کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی موجودگی میں آپ کے مقابلے میں کوئی بھی قابل اتباع نہیں ہو سکتا تھا۔ گو یہ امر محتاج بیان نہیں لیکن ہم زمانہ تاریخ کو شروع سے اخیر تک برابر دکھانے کے لئے اس زمان برکت نشان کی حالت و کیفیت بھی ذکر کرتے ہیں۔ سورت آل عمران میں فرمایا ہے۔

پہلی دلیل :۔

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ ویغفرلکم ذنوبکم واللہ غفور رحیم ' قل اطیعوا اللہ والرسول فان تولوا فان اللہ لا یحب الکفرین (سورہ آل عمران پ ۳)

"(اے پیغمبر! ان سے) کہہ دیں کہ اگر تم خدا سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو۔ خدا تم کو دوست رکھے گا۔ اور تم کو تمہارے گناہ بخش دے گا (اور) اللہ بخشنہار (اور) مہربان ہے (ان سے یہ بھی) کہہ دیں کہ فرمانبرداری کرو اللہ کی اور اس کے رسول کی۔ پس اگر اس سے پھر جائیں تو (جان رکھیں کہ) بے شک خدا کافروں سے محبت نہیں کرتا۔"

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کی "اتباع' اطاعت" دو چیزوں کا امر کیا

ہے "اتباع" (پیروی) فعل میں موافقت کرنے کو اور "اطاعت" (فرمانبرداری) حکم بجالانے کو کہتے ہیں- چنانچہ گوسالہ پرست یہود کے ذکر میں حضرت ہارون نبی اللہ علیہ السلام کی نسبت ذکر کیا کہ انہوں نے گوسالہ پرست لوگوں سے شروع میں کہہ دیا تھا کہ بھائیو!

ولقد قال لھم ھارون من قبل یا قوم انما فتنتم به وان ربكم الرحمن فاتبعوني واطيعوا امري (طه پ ۱٦)

"تم اس (گوسالہ) پر مفتون ہو گئے ہو- حالانکہ تمہارا رب تو وہ ہے جس کی شان "رحمٰن" ہونا ہے پس تم میری اتباع (پیروی) کرو اور میرے حکم کی اطاعت کرو-"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اتباع فعل کے متعلق ہے اور اطاعت امر کے اور چونکہ حدیث نبوی کی اصل تقسیم بھی دو ہی طرح پر ہے- بعض میں تو آنحضرت ﷺ کے افعال کا ذکر ہے اور بعض میں اقوال کا- اس لئے خدائے برحق نے بھی ہر دو میں آنحضرت ﷺ کی موافقت کو واجب ٹھہرانے کے لئے ہر ایک کے لئے الگ الگ لفظ اتباع واطاعت فرمایا-

اس سے بآسانی معلوم ہو سکتا ہے کہ اللہ جل شانہ آنحضرت ﷺ کے ہر فعل وہر قول کو بلا استثناء وبلا شرط واجب الانقیاد قرار دیتا ہے خواہ اس کے متعلق قرآن شریف میں منصوص حکم مذکور خواہ نہ ہو اور اسے بالاستقلال رکن شرع ٹھہراتا ہے-

اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ خدا کی شریعت کے امین ہیں اور عصمت آپ کے لئے امر لازم ہے- پس جب آپ نے کوئی ایسا امر یا کوئی ایسا فعل کیا جسے خدا نے برقرار رکھا اور اس کی اصلاح نہیں کی تو وہ یقیناً غلطی سے پاک ہے اور خدا تعالیٰ کو اپنے بندوں کے لئے بطور شرع مقرر کرنا منظور ہے- ورنہ خدا تعالیٰ اس کی بابت آنحضرت ﷺ کو متنبہ کر کے اس کی اصلاح کر دیتا جیسا کہ جناب ابراہیم علیہ السلام کی اتباع واقتداء میں فرمایا-

لقد كان لكم اسوة حسنة في ابراهيم والذين معه اذ قالوا لقومهم

انا براء منکم ومما تعبدون من دون الله کفرنا بکم وبدا بیننا وبینکم العدواة والبغضاء ابدا حتی تومنوا باالله وحده الا قول ابراهیم لابیه لاستغفرن لك وما املك لك من الله من شئی

(الممتحنہ پ ۲۸)

"(مسلمانو) تمہارے لئے ابراہیم اور اس کے ساتھیوں میں پیروی (کا) نیک (نمونہ) ہے۔ جب انہوں نے اپنی قوم سے (صاف) کہہ دیا کہ بے شک ہم تم سے اور ان سے جن کو تم خدا کے سوائے پوجتے ہو بیزار ہیں۔ ہم تمہارے (دین) سے منکر ہیں اور ہمارے اور تمہارے درمیان عداوت اور بغض ظاہر ہو چکا ہے یہاں تک کہ تم خدا کو اکیلا کر کے مانو۔ مگر ابراہیم کے اس قول میں جو اس نے اپنے باپ سے کہا کہ میں تیرے لئے بخشش مانگوں گا اور میں تیرے لئے خدا سے کسی چیز کا مالک نہیں ہوں۔"

اس کے نظائر قرآن شریف میں متعدد ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بعض امور میں آنحضرت ﷺ کو اصلاحی حکم دیا پیشتر اس کے کہ آپ کا اصلاح کردہ قول یا فعل رواج پائے اور وہی اصلاحی حالت اب امت کے لئے شریعت ہے۔

ازالہ وھم :۔ یہ اصلاح منافی عصمت نہیں بلکہ مثبت عصمت ہے۔ چنانچہ کتب عقائد میں مرقوم ہے کہ عصمت ایک دماغی ملکہ ہے۔ جو

العصمة ملكة نفسانية تمنع عن الفجور وتتوقف على العلم بمثالب المعاصى ومناقبا لطاعات وتتاكد فى الانبياء بتتابع الوحى على التذكر والاعتراض على مايصدر عنهم سهوا والعتاب على ترك الاولى[1]

"بدکاری سے روکتا ہے اور گناہوں کی برائیوں اور نیکیوں کی خوبیوں کے جاننے پر موقوف ہے اور انبیاء علیہم السلام میں ان کی یاددہانی کے لئے پے در

---

[1] طوالع ص ۵۶۴ بر حاشیہ مواقف ج اول مطبوعہ استنبول۔

پے وحی کے آنے اور ان سے جو کچھ سہواً ہو جائے اس پر (جناب باری سے) اعتراض ہونے اور ترک اولے پر تنبیہ ہونے سے (یہ ملکہ) اور پختہ ہو جاتا ہے۔"

رجوع بمطلب :- حاصل یہ کہ آنحضرت ﷺ کے وہ اقوال و افعال بھی جن کے متعلق خدا نے قران کریم میں منصوصی حکم نہیں بھیجا۔ تقریر الٰہی کی مہر و تصدیق سے شریعت الٰہی ہیں اور یہ اس تقریر سے زیادہ مضبوط ہے جو صحابہ کے کسی قول و فعل کی نسبت آنحضرت ﷺ سے ظہور میں آئے اور حقیقت میں اس کی تہ میں یہی "دست غیبی" کام کرتا ہے کہ اگر خدا تعالیٰ کو اس قول و فعل کی اصلاح مقصود ہوتی جو کسی صحابی نے آنحضرت ﷺ کے حضور میں کیا اور آپ نے اسے برقرار رکھا تو ضرور خدائے تعالیٰ اپنی شریعت کے امین اور اپنے بندوں کے درمیان اپنے سفیر رسول اللہ ﷺ کو اس کے متعلق وحی بھیجتا۔ اس کے نظائر بھی قران و حدیث میں کئی ایک ہیں۔ پس حدیث کی تیسری قسم یعنی تقریری حدیث بھی اسی آیت کی تقریر میں حدیث قولی و فعلی کے ساتھ دلیل شرعی ثابت ہو گئی۔ والحمد للہ۔

اور علم حدیث میں انہی تینوں کو آنحضرت ﷺ کی طرف منسوب جانا گیا ہے یعنی حدیث قولی' حدیث فعلی اور حدیث تقریری۔ چنانچہ مقدمہ مشکوۃ میں مرقوم ہے۔

الحديث في اصطلاح جمهور المحدثين يطلق على قول النبي صلى الله عليه وسلم وفعله وتقريره و معنى التقرير انه فعل احد او قال شيئا في حضرته صلى الله عليه وسلم ولم ينكر ولم ينه عنه بل سكت وقرره.

جمہور محدثین کی اصطلاح میں لفظ حدیث آنحضرت ﷺ کے قول و فعل و تقریر پر بولا جاتا ہے اور تقریر کے معنی یہ ہیں کہ کسی نے آنحضرت ﷺ کے سامنے کوئی فعل کیا یا کوئی بات کہی تو آنحضرت ﷺ نے نہ تو اسے برا منایا اور نہ اس سے منع کیا بلکہ اس پر خاموش رہے اور (اسے) برقرار رکھا۔

دوسری دلیل :-

دوسری دلیل جس سے صاف ثابت ہے کہ زمان وحی میں مدار شریعت صرف خدا کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی سیرت پر تھا اور بعد کے لئے بھی آپ اسی کی تاکید فرما گئے یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ

ترکت فیکم امرین لن تضلوا ما تمسکتم بهما کتاب الله وسنة رسوله (مؤطا)

"میں تمہارے درمیان دو بھاری چیزیں چھوڑ چلا ہوں جب تک تم ان کو مضبوط پکڑ رکھو گے ہرگز گمراہ نہ ہو گے اللہ کی کتاب (قرآن مجید) اور اپنی سنت (طریق عمل)"

اس حدیث سے ہمارا مدعا مہر نیمروز کی طرح ثابت ہے جس پر زیادہ تشریح کی ضرورت نہیں۔

تیسری دلیل :-

فلا وربك لا یومنون حتی یحکموك فیما شجر بینهم ثم لا یجدوا فی انفسهم حرجا مما قضیت ویسلمو تسلیما (نساء پ ۵)

"واللہ یہ لوگ ہرگز باایمان نہ ہوں گے جب تک اپنے نزاعات میں (اے نبیؐ) آپ کو اپنا حکم نہ بنادیں پھر تیرے فیصلے سے اپنے دل میں ذرہ بھر حرج محسوس نہ کریں (دل سے اور عمل سے) پوری طرح تسلیم کر لیں۔"

اس آیت میں تین امروں کو نہایت تاکید سے داخل ایمان کیا ہے۔ اول اپنی خصومتوں میں آنحضرت ﷺ کو حکم و منصف قرار دینا اور ظاہر ہے کہ حکم سند ہوا کرتا ہے۔ ورنہ اس کے حکم بنانے کے کیا معنی؟ دوم جو کچھ آپ فیصلہ فرمادیں اسے بدل و جان منظور کر لینا۔ ہم اس امر کو ذرا توضیح سے بیان کرنا چاہتے ہیں۔ سوم اس فیصلے کو عملی طور پر بجالانا۔

عام طور پر حکم کے فیصلے کا اثر ظاہری تعمیل کے متعلق ہوتا ہے دل اور زبان سے

اس کی حقانیت کا اعتراف و اقرار ضروری نہیں ہوتا- چنانچہ مقدمات عدالت میں ماتحت عدالتوں کی اپیل میں یہ عنوان لکھا جاتا ہے اپیل بناراضی حکم فلاں مجسٹریٹ یا منصف درجہ فلاں-

لیکن آنحضرت ﷺ کے فیصلے کا اثر صرف تعمیل پر نہیں بلکہ یہاں زبان شکایت بھی بند رکھنے کا حکم ہے- بلکہ دل میں شکایت کا خیال بھی جمانا گناہ عظیم ہے- آپ کا فیصلہ آخری اور قطعی ہے جس کی نہ تو کہیں اپیل ہو سکتی ہے اور نہ اس پر نظرثانی کی درخواست روا ہے- اس کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے فیصلے کی نسبت خود خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے:

انا انزلنا الیك الكتاب بالحق لتحكم بین الناس بما ارمك الله

(نساء پ ۵)

(اے نبیؐ) ہم نے یہ کتاب (قرآن) آپ کی طرف حق کے ساتھ اتاری ہے کہ آپ لوگوں میں اس کے موافق فیصلہ کریں جو آپ کو خدا دکھادے (سمجھادے)

اس آیت کے ذیل میں امام رازی نے فرمایا-

قال المحققون هذه الایة تدل علی انه علیه الصلوة والسلام ماكان یحكم الا بالوحی والنص (تفسیر کبیر جلد ثالث ۳۱۷)

"محققین نے کہا ہے کہ یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ آنحضرت ﷺ سوائے وحی اور نص کے فیصلہ نہیں کرتے تھے-"

اور چونکہ آیت بالا یعنی فلا وربك میں جسے ہم اصل دلیل میں لا کر بیان کر رہے ہیں لفظ قضیت فرمایا ہے- لہٰذا ان دونوں مذکورہ بالا آیتوں کو ملا کر معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ قرآن مجید کے قاضی ہیں جیسا کہ سنن دارمی ص ۷۷ میں امام یحییٰ بن کثیر سے مروی ہے کہ قال السنة قاضیة علی كتاب الله (ص ۷۷) ترجمہ: آنحضرت ﷺ کی سنت قرآن کی قاضی ہے-

تنبیہ :- بعض اشخاص جن کو احادیث رسول اللہ ﷺ سے خاص انس و شغف نہیں- اس روایت کی نسبت نہایت تعجب و استبعاد سے کہا کرتے ہیں کہ حدیث کو یہ رتبہ قضا ان روایت پرست اہل حدیثوں نے دے دیا ہے اور کتاب اللہ کی بے قدری کر دی ہے- ایسے نازک خیال' خوش فہم اصحاب آیت بالا کے لفظ قضیت کو دیکھ کر اپنے تعجب کو دور کر دیں کہ یہ منصب قضا خود خدائے تعالیٰ کا عطا کردہ ہے نہ کہ ہمارا خود ساختہ اللھم صل علی سیدنا محمد والہ واصحابہ وبارک وسلم ان آیات سے صاف واضح ہو گیا ہے کہ زمان برکت نشان میں سوائے وحی آسمانی کے شریعت کا مرجع کچھ نہ تھا اور یہ کسی طرح بھی تصور میں نہیں آسکتا کہ رسول برحق کے ہوتے اس کے ساتھ کسی دیگر کا اتباع بھی واجب ہو-

وحی آسمانی کی دو قسمیں ہیں- جلی اور خفی- جلی تو قرآن مجید ہے- جو جبرئیل فرشتے کی معرفت لفظاً نازل ہوا اور خفی حدیث پاک ہے جسے خدا تعالیٰ نے آیت بالا میں بما ارمك الله سے تعبیر کیا اور اس کی بنا پر آپ کی قضا کو قطعی و نافذ قرار دیا اور آنحضرت ﷺ کے وہ فیصلے کتب حدث میں معتبر سندوں سے مندرج ہیں اور علاوہ بریں ہر زمانے میں عملی طور پر شائع رہے ہیں- پس ہمارا یہ کہنا کہ شریعت کا مدار صرف قرآن اور حدیث پر ہے بالکل درست ہے-

عصر صحابہ بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

عہد سعادت مہد کے بعد عصر صحابہ ہے- اس میں خصوصاً خلافت راشدہ میں برابر آنحضرت ﷺ کے وقت کی روش قائم رہی اور اس میں فرق نہیں آیا- صرف اتباع "کتاب و سنت" سے واسطہ تھا- ان کے مقابلہ میں کسی دوسری چیز کی کچھ بھی حقیقت نہ تھی- اس فصل کو ہم ذرا تفصیل سے بیان کرنا چاہتے ہیں کیونکہ صحابہ سابقین امت ہیں- ان کی روش پچھلی امت سے زیادہ قابل اعتبار ہے بلکہ ان کے لئے قابل اقتدا ہونی چاہیے-

تفصیل ذیل کے واقعات کی صورت میں ملاحظہ ہو-

آنحضرتؐ کی وفات پر سب سے پہلا اختلاف ایسے امر میں ہوا جو نظام امت کا مدار کار تھا یعنی امر خلافت ۔ انصار مدینہ اپنی خدمات اسلام کی بناء پر مدعی خلافت تھے اور مہاجرین اپنی جاں نثاریوں کی بنا پر ۔ حضرت ابو بکرؓ نے خطبہ پڑھا اور اس میں فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ قریش ولاۃ ھذا الامر (تاریخ طبری) یعنی اس امر (خلافت) کے والی قریش ہیں ۔

اس حدیث کے پیش ہونے سے پیشتر صحابہ کی رائیں مختلف تھیں اور ہر فریق اپنی اپنی قیاسی وجوہات پیش کرتا تھا لیکن اس حدیث کے سننے پر سب نے گردنیں جھکا دیں اور اختلاف چھوڑ دیا اور حضرت ابو بکرؓ کو خلیفہ منتخب کر لیا ۔ اگر صحابہ اس حدیث نبویؐ کو اپنی راؤں پر فوقیت و ترجیح نہ دیتے تو خدا جانے کیا کیا فساد اٹھتے ۔ اور نوبت جنگ و قتال پر پہنچ کر کیا سے کیا ہو جاتا ۔ یہ حدیث نبویؐ ہی کی برکت تھی کہ امت مرحومہ فساد و تباہی سے بچ گئی ۔

دوسرا اختلاف آنحضرتؐ کے دفن کے متعلق ہوا ۔ بعض کہتے تھے بیت المقدس میں دفن کئے جائیں جہاں دیگر انبیاء کی قبریں ہیں ۔ بعض کہتے تھے کہ بقیع میں اپنے صحابہ کے ساتھ دفن کئے جائیں اور بعض کہتے تھے کہ اپنی مسجد ہی میں دفن کئے جائیں ۔ سب کی بنا قیاسیات پر تھی اس پر بھی حضرت صدیق اکبرؓ نے کہا میں نے آنحضرتؐ کو فرماتے سنا ماقبض نبی الایدفن حیث قبض (طبری) یعنی جہاں پر کسی نبی کی روح قبض کی گئی وہ اسی جگہ دفن کیا گیا ۔ اس پر سب نے اپنی اپنی رائے چھوڑ دی اور آپ کا بسترہ اٹھا کر اس کے نیچے آپ کی قبر تیار کی گئی ۔ اللھم صلی علی محمد وعلی الہ واصحابہ وبارك وسلم ۔

یہ خاص واقعات ہیں ۔ اب اس زمانے کا عام دستور بھی دیکھ لیجئے ۔

خلافت صدیقی :-

مسند دارمی میں میمون بن مہران تابعی سے روایت ہے کہ :

عن میمون بن مهران قال كان ابو بكرؓ اذا ورد عليه الخصم نظر

فی کتاب الله فان وجد فیه ما یقضی به بینهم قضی به وان لم یکن فی الکتاب وعلم من رسول الله صلی الله علیه وسلم فی ذلك الامر سنة قضی به فان اعیاه خرج فسال المسلمین وقال اتانی کذ او کذا فهل علمتم ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قضی فی ذلك بقضاء فربما اجتمع الیه النفس کلهم یذکر من رسول الله صلی الله علیه وسلم فیه قضاء فیقول ابو بکر الحمد لله الذی جعل فینا من یحفظ علی نبینافان اعیاه ان یجد فیه منه من رسول الله صلی الله علیه وسلم جمع رؤس الناس وخیارهم فاستشادر فاذا اجتمع رائهم علی امر قضی به (مسند دارمی ص ۳۲، ۳۳)[1]

جب حضرت ابو بکرؓ صدیق کے سامنے کوئی مقدمہ پیش ہوتا تو (پہلے) آپ کتاب اللہ میں نظر کرتے اگر اس میں پاتے تو اسی کے مطابق فیصلہ کرتے اور اگر کتاب اللہ میں نہ پاتے اور رسول اللہ کی سنت پاتے تو اسی کے موافق فیصلہ کرتے اور اگر کسی طرح ان کو کچھ نہ ملتا تو دیگر صحابہ سے پوچھتے اور کہتے کہ میرے پاس یہ معاملہ آیا ہے تم کو اس بارے میں کچھ معلوم ہے کہ رسول اللہؐ نے کیا فرمایا ہے؟ بعض دفعہ سب لوگ ان کو بتاتے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس میں یہ فیصلہ کیا تھا۔ یہ سن کر حضرت ابو بکرؓ کہتے خدا کی تعریف ہے جس نے ہم میں ایسے لوگ پیدا کر رکھے ہیں جو ہمارے نبی کے اقوال ہمارے لئے یاد رکھ کر ہم کو سناتے ہیں اور اگر ان کو حدیث نہ ملتی تو اکابر صحابہ کو جمع کرکے

---

[1] اس حدیث کے راوی میمون بن مہران بزرگ تابعی ہیں خلیفہ عمر بن عبد العزیز ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ چنانچہ ان کو جزیرہ کے خراج اور قضا پر مقرر کیا۔ امام احمد ان کی بہت تعریف کیا کرتے تھے انہوں نے خود تو حضرت ابو بکرؓ کا زمانہ نہیں پایا۔ لیکن حضرت ابو ہریرہؓ حضرت عائشہؓ حضرت عبد اللہ بن عباس حضرت ابن عمر حضرت ابن زبیرؓ وغیرہ صحابہ جنہوں نے آنحضرت ﷺ کے بعد لمبی عمریں پائیں روایت کرتے ہیں (تہذیب التہذیب وغیرہ) پس خلافت صدیقی کا دستور العمل ان کو انہی حضرات سے معلوم ہوا ہے۔

ان سے مشورہ کرتے۔ پھر جس امر پر وہ متفق ہو جاتے اس پر فیصلہ کر دیتے۔

ہم نے اس روایت کو اس مقام پر اس غرض کے لئے پیش کیا ہے کہ عصر صحابہ میں قران و حدیث کے ہوتے ہوئے کسی دیگر امر کی طرف رجوع نہیں کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ اس روایت سے یہ امر بھی ظاہر ہے کہ حضرت ابو بکرؓ عامہ صحابہ کی مجلس منعقد کرنے کے بعد اگر اس امر میں کوئی حدیث نہ پاتے تو خواص صحابہؓ کی طرف جو قوت اجتہاد و استنباط رکھتے تھے رجوع کرتے اور دریافت طلب امر کی مشکل کو حل کرتے تھے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ حاضرین میں سے کسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس پیش آمدہ امر کی نسبت کچھ یاد ہو خواہ وہ صحابی فقیہ و مجتہد ہو خواہ نہ ہو۔ پس اگر حاضرین میں سے کسی کو بھی کوئی منصوص حکم معلوم نہ ہوتا تو اجتہاد کے لئے فقہائے صحابہ کی طرف رجوع کرنا پڑتا۔ اس سے دو مفید نتیجے ظاہر ہیں۔

اول یہ کہ حفظ نصوص اور روایت حدیث کے لئے فقاہت و اہلیت اجتہاد شرط نہیں ہے۔

دوم یہ کہ اجتہادی امور میں کسی معین شخص کی رائے کی پابندی کا زمان صحابہ میں دستور نہیں تھا۔

اس مقام پر یہ امر بھی قابل یاد رکھنے کے ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ، صحابہؓ میں سب سے افضل و اعلم و افقہ تھے پھر بھی اکیلی اپنی رائے پر اعتماد نہیں کرتے تھے۔

بعض وقت حدیث میں کسی آیت قرآنی کی تخصیص وارد ہوتی ہے۔ اہل حدیث کے نزدیک اس تخصیص کو آیت قرآنی سے مستثنیٰ رکھنا چاہئے۔ اس کی تفصیلی بحث گو اس فصل میں کی جائے گی جس میں علم اصول پر بحث ہو گی۔

لیکن ہم اس مقام پر یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ خلاف صدیقی میں قرآن شریف سے تمسک کرتے وقت بھی حدیث نبویؐ کی کہاں تک رعایت رکھی جاتی تھی۔ صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ

ان فاطمة بنت رسول الله صلى الله عليه وسلم سالت ابا بكر الصديقؓ بعد وفاة رسول الله صلى الله عليه وسلم ان يقسم لها ميراثها ما ترك رسول الله صلى الله عليه وسلم مما افاء الله عليه فقال لها ابو بكرؓ ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال لانورث ما تركنا صدقة الحديث[1]

"آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد آپ کی بیٹی حضرت فاطمۃ الزہرا نے حضرت ابو بکر صدیقؓ سے رسول اللہ ﷺ کے ترکہ میں سے میراث کا حصہ طلب کیا تو حضرت ابو بکر صدیقؓ نے کہا آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ ہماری (گروہ انبیاء کی) وراثت نہیں چلتی جو کچھ بھی ہم چھوڑ جائیں وہ (راہ خدا میں) صدقہ ہوتا ہے۔"

حضرت فاطمہؓ کی نظر عموم آیت قرآنی یوصیکم اللہ فی اولادکم الایہ (النساء پ ۴) پر تھی جیسا کہ ترمذی کی روایت میں مصرح ہے کہ انہوں نے حضرت صدیق اکبرؓ سے کہا فمالی لاارث ابیؐ یعنی کیا وجہ ہے کہ میں اپنے باپ کی وراثت نہ پاؤں۔"[2]

لیکن حضرت صدیق اکبرؓ نے حدیث نبوی سے سمجھا دیا کہ آیت قرآنی میں یوصیکم کے مخاطب امتی ہیں نبی نہیں۔ جس پر حضرت خاتونؓ جنت خاموش ہو گئیں۔ اور پھر اس بارے میں کلام نہ کیا[3] اور اسی لئے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے بھی اپنے عہد خلافت میں فیصلہ صدیقی میں کوئی تغیر نہیں کیا۔

دیگر خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیقؓ کو آنحضرت ﷺ کی قرارداد کا اس قدر پاس و لحاظ تھا کہ امور عبادت و تشریع کے علاوہ امور مشورہ جن میں مصلحت وقت کے لحاظ کا بھی اختیار ہے۔ ان میں بھی آپ آنحضرت ﷺ کے نقش قدم سے تل بھر نہ ہٹتے

---

1. صحیح بخاری پ ۱۲۔ باب فرض الخمس کتاب الجہاد۔
2. ترمذی کتاب السیر ص ۱۹۴۔
3. صحیح بخاری و فتح الباری۔

تھے- چنانچہ جب جیش اسامہ کی روانگی میں بوجہ آنحضرت ﷺ کی وفات شریف کے توقف پڑ گیا- اور بعد فراغت کے صحابہ میں مشورہ ہوا- تو عام رائے یہ تھی کہ آنحضرت ﷺ اور مانعین زکوٰۃ وغیرہ اسباب کی وجہ سے جماعت مسلمانان یکجا مدینہ طیبہ ہی میں رہنا چاہئے- اس پر حضرت صدیقؓ نے فرمایا-

والذی نفسی بیدہ لو ظننت ان السباع تختطفنی لا نفذت جیش اسامة کما امر النبی صلی اللہ علیہ وسلم[1]

خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر مجھے یہ ڈر بھی ہو کہ مجھے درندے اچک لے جائیں گے- تو بھی اسامہ کے لشکر کو روانہ کر کے رہوں گا جیسا کہ نبی ﷺ نے امر کیا تھا-

اس کے علاوہ اور آثار بھی ہیں جن سے صاف واضح ہے کہ صحابہ صرف خدا اور رسولؐ کے حکم کو واجب التعمیل جانتے تھے اور اپنے میں سے کسی کے قول و فعل کو بلا شرط حجت و دلیل نہ مانتے تھے- چنانچہ حافظ ابن قیمؒ نے اپنی بے نظیر کتاب اعلام الموقعین جلد اول ص ۱۹' ۲۱ میں حضرات ابو بکر صدیق' عمر فاروق' عثمان ذی النورین وغیرہم رضی اللہ عنہم اجمعین کے بعض اقوال نقل کئے ہیں-"

عن ابن ابی ملیکة قال ابو بکر رضی اللہ عنہ ای الارض تقلنی وای سماء تظلنی ان قلت فی ایة من کتاب اللہ برای وبمالا اعلم

(ص ۱۹)

عبد اللہ بن ابی ملیکہ (تابعی) کہتے ہیں کہ حضرت صدیق اکبرؓ نے کہا مجھے کونسی زمین بر قرار رکھے گی اور کونسا آسمان مجھ پر سایہ کرے گا اگر میں اللہ کی کتاب کی کسی آیت میں کچھ اپنی رائے سے کہوں جس کا مجھے علم نہیں-

خلافت فاروقی :-

اسی طرح حضرت فاروق اعظمؓ سے عبد اللہ بن ابی جعفر روایت کرتے ہیں کہ

---

[1] تاریخ کامل لابن اثیر جلد ۲' ص ۱۲۷-

آپ نے فرمایا:

قال عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ السنۃ ماسنہ اللہ ورسولہ صلی اللہ علیہ وسلم ولا تجعلوا خطاءَ الرأی سنۃ للامۃ (ص ۱۹)

سنت تو بس وہی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول ﷺ نے مقرر کر دیا اور تم رائے کی خطا کو امت کے لئے سنت نہ ٹھہراؤ۔

خلافت عثمانی :-

اسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ایک طویل ذکر میں مروی ہے۔

فاقبل عثمان رضی اللہ عنہ علی الناس فقال انہیت عنہا انی لم انہ عنہا انما کان رایا اشرت بہ فمن شاء اخذہ ومن شاء ترکہ (ص ۲۰)

کہ آپ نے عام لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ کیا میں نے تم کو متعہ حج سے منع کیا ہے؟ میں نے اس سے منع نہیں کیا۔ یہ میری رائے تھی جس کا میں نے اشارہ کیا پس جو چاہے اسے لے لے اور جو چاہے اسے چھوڑ دے۔

اس کے بعد حافظ ابن قیم فرماتے ہیں۔ پس حضرت عثمان کو دیکھئے کہ وہ اپنی رائے کی نسبت صاف فرماتے ہیں۔

فھذا عثمان یخبر عن رایہ انہ لیس بلازم للامۃ الاخذ بہ بل من شاء اخذبہ ومن شاء ترکہ بخلاف سنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فانہ لا یسع احد ترکھا لقول احد کائنا من کان (ص ۲۰)

کہ اس کا اختیار کر لینا امت پر واجب نہیں بلکہ جو چاہے اسے اختیار کرے اور جو چاہے ترک کرے۔ بر خلاف آنحضرت ﷺ کی سنت کے کہ کسی دیگر کے قول کی وجہ سے خواہ وہ کوئی ہو اس کے ترک کرنے کی کسی کو بھی گنجائش نہیں۔

اسی طرح حبر امت حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:

عن ابی فزارۃ قال قال ابن عباس انما ھو کتاب اللہ وسنۃ رسول

الله صلی الله علیه وسلم فمن قال بعد ذلك برایه فلا ادری افی حسناته یجد ذلك فی سیاته۔ (ص ۲۱)

"(شریعت) تو صرف وہی ہے کہ بس اللہ کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت۔ اور جو کوئی ان کے بعد اپنی رائے سے کچھ کہے تو میں نہیں جانتا کہ وہ شخص اسے اپنی نیکیوں میں پائے گا یا بدیوں میں۔"

اسی طرح سنن دارمیؒ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے۔

قال ابن عمرؓ لجابر بن زید انك من فقهأ البصرة فلاتفت الا بقرآن ناطق او سنة ماضية فان قلت غير ذلك هلكت واهلكت[1]

آپ نے حضرت جابر بن زید سے کہا تم فقہاء بصرہ سے ہو۔ پس سوائے منطوق قرآن اور سنت ثابتہ کے کسی دوسری چیز سے فتوی نہ دینا۔ اگر دیا تو خود بھی ہلاک ہو گے اور دوسروں کو بھی ہلاک کرو گے۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہ بھی مروی ہے کہ

عن عبد الله بن عباس اما تخافون ان تعذبوا او يخسف بكم ان تقولوا قال رسول الله صلى الله عليه وسلم وقال فلان[2]

آپ نے فرمایا۔ لوگو! تم کو اس بات کا ڈر نہیں کہ تمہارے اس قول پر تم کو کوئی عذاب ہو یا زمین میں دھنسا دیئے جاؤ کہ تم کہو کہ رسول اللہ ﷺ نے بھی فرمایا اور فلاں نے بھی کہا۔

اسی طرح انہیں سے دوسری روایت یہ ہے کہ

عن ابن عباس قال من احدث رايا ليس فى كتاب الله ولم تمض به من سنة رسول الله صلى الله عليه وسلم على ما هو منه اذا لقى الله[3]

---

[1] مسند دارمی ص ۳۳۔

[2] حجۃ اللہ بحوالہ دارمی مطبوعہ مصر جلد اول ص ۱۴۹۔

[3] مسند دارمی ص ۳۲۔

جس نے کوئی ایسی رائے نکالی جو نہ تو کتاب اللہ میں ہے اور نہ اس پر آنحضرت ﷺ کی سنت کی شہادت ہے تو معلوم نہیں کہ جب وہ خدا کے سامنے ہوگا تو کس حال پر ہوگا۔

غرض اسی قسم کی روایات کثرت سے ہیں جن سے صاف ظاہر ہے کہ عہد صحابہ میں سوائے قرآن و حدیث کے کوئی شے واجب الاتباع نہیں سمجھی جاتی تھی بلکہ اس کے مقابل میں رائے و قیاس کو بہت برا جانتے تھے۔واللہ الہادی

زمانہ تابعین میں بھی صرف اتباع وحی :۔

عصر صحابہ کے بعد تابعین کا زمانہ ہے۔اس میں بھی قرآن و حدیث کے ہوتے دوسری چیز پر عمل نہیں ہوتا تھا اور کسی دوسرے کے قول و فعل کو بلا سند حجت نہیں مانا جاتا تھا چنانچہ سنن دارمی میں ہے۔

عن الاوزاعی قال کتب عمر بن عبد العزیز انه قال لا رایٔ لاحد فی کتاب الله وانما رأی الائمة فیما لم ینزل فیه کتاب ولم تمض فیه سنت من رسول الله صلی الله علیه وسلم ولا رأی لاحد فی سنة سنها رسول الله صلی الله علیه وسلم (دارمی ص ٦٢)

بروایت امام اوزاعی منقول ہے کہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے فرمان جاری کیا کہ خدا کی کتاب (قرآن) میں کسی کی رائے کی گنجائش نہیں ہے اور اماموں کا "قیاس" صرف اس بات میں جائز ہے جس کے متعلق نہ تو قرآن میں کوئی حکم نازل ہوا ہو اور نہ رسول اللہ ﷺ سے کوئی سنت ثابت ہو اور جو سنت رسول اللہ ﷺ نے جاری کر دی ہو اس میں کسی کی رائے کا اعتبار نہیں ہے۔

خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کا یہ قول اصل میں قرآن شریف کی آیت سے ماخوذ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وما کان لمؤمن ولا مؤمنة اذا قضی الله ورسوله امرا ان یکون لهم الخیرة من امرهم ومن یعص الله ورسوله فقد ضل ضلالا مبینا (الاحزاب پ ۲۲)

"کسی ایماندار مرد اور عورت کا حق نہیں کہ جب خدا اور اس کا رسول (ﷺ) کسی کام کا فیصلہ کر دیں تو پھر ان کو خود اپنے کاموں میں کچھ اختیار رہے اور جو کوئی اللہ اور رسول کی نافرمانی کا مرتکب ہوگا پس وہ سیدھی راہ سے دور بھٹک گیا۔

اسی طرح سنن دارمی میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کا ایک خطبہ بھی مروی ہے جس میں آپ نے کتاب و سنت کا اتباع اور خلفاء و علمائے امت کے اقوال کی حقیقت کھول کر بیان کر دی ہے۔"

عن عبید اللہ بن عمران عمر بن عبد العزیز خطب فقال یا ایھا الناس ان اللہ لم یبعث بعد نبیکم نبیا ولم ینزل بعد ھذا الکتاب الذی انزل علیہ کتاباً فما احل اللہ علی لسان نبیہ فھو حلال الی یوم القیمۃ الا وانی لست بقاض ولکنی منفذ ولست بمبتدع ولکنی متبع ولست بخیر منکم غیرانی اثقلکم حملا الا وانہ لیس لاحد من خلق اللہ ان یطاع فی معصیۃ اللہ الا ھل بلغت[1]

"حضرت عمر بن عبدالعزیز (اموی خلیفہ) نے ایک روز خطبہ پڑھا۔ فرمایا اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبی کے بعد کوئی نبی پیدا نہیں کیا اور نہ قرآن کے بعد کوئی کتاب نازل کی۔ پس جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے ذریعہ سے حلال بتایا ہے وہ تو قیامت تک حلال ہے اور جو حرام کیا ہے وہ بھی قیامت تک حرام ہے۔ سنو! میں قانون بنانے والا نہیں ہوں بلکہ خدا اور رسول کے احکام کو جاری کرنے والا ہوں اور میں بدعتی بھی نہیں ہوں بلکہ میں متبع ہوں اور نہ تم لوگوں سے اچھا ہوں۔ ہاں میرے کندھوں پر تم سے زیادہ بوجھ ہے۔ سنو! کسی بندے کا حق نہیں کہ اللہ کی معصیت میں اس کی اطاعت کی جائے پس سن رکھو کہ میں نے پہنچادیا۔

خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے عہد میں وحی ربانی کا یہاں تک پاس تھا کہ جب آپ

---

[1] دارمی ص ۶۲۔

نے آنحضرت ﷺ کی احادیث کے کتابت میں جمع کر لینے کا فرمان جاری کیا (جس کی تفصیل تدوین علم حدیث میں ہوگی انشاء اللہ) تو ساتھ ہی یہ تاکید بھی کر دی تھی کہ

ولا یکتب الاحدیث النبی صلی اللہ علیہ وسلم[1] (بخاری کتاب العلم)

سوائے آنحضرت ﷺ کی حدیث پاک کے اور کچھ نہ لکھا جائے۔

خلیفہ عمر بن عبدالعزیز تابعی ہیں۔ چالیس برس کی عمر میں رجب ۱۰۱ھ میں فوت ہوئے۔ آپ بالاتفاق پہلی صدی کے مجدد ہیں۔

مسند دارمی میں ایک اور روایت ہے جس سے صاف واضح ہے کہ تابعین کے وقت میں حدیث نبوی کے سامنے کسی اور کا نام لینا بھی موجب عبرت ہوتا تھا۔

عن قتادۃ قال حدث ابن سیرین رجلا بحدیث النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال الرجل قال فلان کذا و کذا فقال ابن سیرین احدثك عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم وتقول قال فلان کذا و کذا لا اکلمك ابدا۔[2]

قتادہ تابعی کہتے ہیں کہ امام محمد بن سیرین نے کسی شخص سے آنحضرت ﷺ کی حدیث بیان کی تو اس شخص نے کہا فلاں شخص (اس امر میں) ایسا ایسا کہتا ہے اس پر امام محمد بن سیرین نے کہا میں تو تجھ کو آنحضرت ﷺ کی حدیث سناتا ہوں اور تو (اس کے مقابلہ میں) کہتا ہے کہ فلاں شخص ایسا ایسا کہتا ہے۔ میں تجھ سے کلام نہیں کروں گا۔

قتادہ اور محمد بن سیرین دونوں تابعی ہیں قتادہ حضرت ابو قتادہ صحابی کے بیٹے ہیں۔ آپ ۱۱۰ھ کے بعد فوت ہوئے اور محمد بن سیرین بھی جو روایت میں ایسے محتاط تھے کہ روایت بالمعنی کے قائل ہی نہ تھے ۱۱۰ھ میں فوت ہوئے۔

ان روایات سے بخوبی معلوم ہو گیا کہ زمانہ تابعین میں صرف قرآن و حدیث پر

---

[1] بخاری کتاب العلم۔

[2] دارمی ص ۶۳۔

عمل تھا اور ان کے مقابلہ میں اور کچھ نہ سنا جاتا تھا اور انہی کو حجت شرعی مانا جاتا تھا- جن تابعین کا ذکر اوپر آ چکا ہے ان کے علاوہ دیگر ائمہ تابعین بھی ہیں مثل ابو بکر بن محمد بن حزم المتوفی ۱۲۰ھ اور خواجہ حسن بصریؒ ۱۱۰ھ اور امام زہریؒ المتوفی ۱۲۴ھ اور فقہائے سبعہ مدینہ جن کے اسمائے گرامی اس نظم میں ہیں-

اذا قیل من فی العلم سبعة ابحر
روایتهم لیست عن العلم خارجة
فقل هم عبید الله عروة قاسم
سعید ابو بکر سلیمان خارجة

یہ ساتوں بزرگ مدینہ طیبہ میں ایک ہی زمانے میں تھے- اکثر ان میں سے ۹۴ھ میں فوت ہوئے تو اس سال کا نام ہی "عام الفقہاء" پڑ گیا- آخر باری باری ۱۰۶ھ یا ۱۰۷ھ تک تمام زندگی کی صف لپیٹ کر رخصت ہو گئے (رحمہم اللہ اجمعین)- یہ سب مذکورہ بالا امام سنت نبوی کے عاشق تھے- اور سوائے قرآن و حدیث کے کسی اور شے کی طرف التفات نہ کرتے تھے- ان کی زندگی کے واقعات اور ان کے پاک کلمات اس بات کے شاہد ہیں-

زمانہ اتباع تابعین :- زمانہ تابعین کے بعد اتباع تابعین کا زمانہ آیا- اس عہد تک امت میں اختلاف ہوتے ہوتے بہت سے فرقے بن چکے تھے اور ایک انقلاب عظیم ہو چکا تھا- خیالات میں آزادی اور رائے و قیاس کی پیروی رائج ہو چکی تھی بہت سے لوگ صحابہ کے طریق سے اکھڑ کر دیگر راہوں میں جا چکے تھے جن کا کچھ ذکر سابقا ہو چکا ہے- سنت و بدعت میں ایسا اختلاط ہو چلا تھا کہ اگر محدثین شکر الله سعیهم نہ اٹھ کھڑے ہوتے اور کمر ہمت نہ باندھ لیتے تو یہود و نصاریٰ کی طرح عہد نبوت کے دین کا پتہ لگانا سخت مشکل ہو جاتا ہے- یہی وہ زمانہ ہے جس میں ائمہ حدیث نے احادیث نبویہؐ کو اپنے صفحات سینہ سے صفحات کاغذ پر نقل کرنا شروع کر دیا اور امت کو بدعت کے سیلاب سے بچا لیا- جزاهم الله عنا خیر الجزاء

سب سے پہلے اس ضرورت کو خلیفہ عمر بن عبد العزیز تابعیؒ نے محسوس کیا اور مدینہ منورہ کے عامل ابو بکر بن حزمؒ تابعی کو حکم کیا کہ آنحضرت ﷺ کی احادیث کو دیکھ بھال کر جمع کر لو[1] خلیفہ عمر بن عبد العزیز کا زمانہ خلافت گو بہت قلیل ہوا۔ لیکن اس سے ائمہ حدیث کی توجہ جمع احادیث کی طرف مصروف ہو گئی۔ اور آپ کے بعد تدوین حدیث کا سلسلہ برابر جاری ہو گیا۔ اتباع تابعین میں سے نامور علمائے حدیث جنہوں نے مختلف بلاد میں جمع و کتابت حدیث کے کام کو شروع کر کے پیچھے آنے والوں کے لئے تصنیف کا رستہ کھول دیا یہ ہیں۔

مکہ معظّمہ میں ابن جریج رومی مکیؒ۔ عبد المالک بن عبد العزیز اموی مولاہم۔ یہ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۵۰ھ میں فوت ہوئے۔

مدینہ منورہ میں امام مالکؒ مدنی نے مؤطا تصنیف کی جو آج تک موجود اور علمائے حدیث کی آنکھ کا تارا ہے امام مالکؒ ۹۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۷۹ھ میں مدینہ طیبہ ہی میں فوت ہوئے اور بقیع میں دفن کئے گئے۔ خاکسار نے آپ کی قبر کی زیارت کی ہے۔

شام میں امام اوزاعیؒ نے جن کا نام عبد الرحمٰن بن عمر ہے۔ یہ ۸۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۵۷ھ میں بیروت یا بعلبک میں فوت ہوئے۔

بصرہ میں سعید بن ابی عروبہؒ اور حماد بن سلمہؒ اور ربیع بن صبیح نے طرح تصنیف ڈالی۔ سعید بن ابی عروبہ ۱۵۶ھ میں فوت ہوئے اور حماد بن سلمہ ۱۶۷ھ میں فوت ہوئے اور ربیع علاقہ سندھ میں ۱۶۰ھ میں فوت ہوئے۔

یمن میں معمر نے احادیث کو کتابی صورت میں جمع کیا۔ یہ امام مالکؒ کی طرح امام زہری کے شاگرد ہیں اپنے زمانہ کے بڑے عالم تھے۔ ۱۵۳ھ میں فوت ہوئے۔

کوفہ میں امام سفیان ثوری نے تصنیف کی جو ۷۷ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۶۱ھ میں

---

[1] جمع و کتابت حدیث کا مفصل بیان دوسرے حصے میں ہو گا۔ انشاء اللہ اس وقت ہمیں صرف یہ منظور ہے کہ جمع کی کیفیت کا مختصر سا خاکہ کھینچ کر یہ دکھا دیں کہ اتباع تابعین کے زمانہ میں بھی عمل بالسنۃ ہی ملحوظ تھا۔

فوت ہوئے- نیز محمد بن اسحٰق نے کتاب المغازی لکھی- محمد بن اسحاق ۱۵۱ھ میں فوت ہوئے- اسی زمانہ میں امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ بھی تھے- آپ نے علم حدیث میں تو کوئی کتاب نہیں لکھی- مگر عقائد میں آپ نے دو کتابیں (۱) فقہ اکبر[ل] (۲) اور کتاب العالم والمتعلم- آپ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۵۰ھ میں فوت ہوئے- آپ بھی اہل حدیث تھے- چنانچہ آپ کا قول مشہور ہے اذا صح الحدیث فھو مذھبی (شامی جلد اول ص ۷۰)

مصر میں امام لیث بن سعد مصری ہوئے- آپ کثیر التصانیف ہیں قریباً ۹۶ھ میں پیدا ہوئے- امام مالکؒ کے ہم استاد ہیں- امام زہری وغیرہ سے حدیث روایت کی ۱۷۵ھ میں مصر میں فوت ہوئے- خاکسار نے سفر مصر میں آپ کی قبر کی زیارت کی (شرک و بدعت کی سب رسوم ادا ہوتی ہیں) یہ سب بزرگ پہلی صدی میں پیدا ہوئے اور دوسری میں فوت ہوئے- اس سے صاف ظاہر ہے کہ دوسری صدی کے پہلے نصف ہی میں علم حدیث کا بہت سا ذخیرہ جمع ہو گیا تھا- اس زمانہ کے بعد دیگر ائمہ جنہوں نے اپنی زندگی بس خدمت سنت میں ہی لگا دی یہ ہیں-

(۱) امام سفیان بن عیینہؒ کوفہ اور مکہ میں تھے- ۱۰۷ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۸ھ میں فوت ہوئے-

(۲) امام عبداللہ بن مبارک ۱۱۳ھ یا ۱۱۹ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۸۱ھ میں فوت ہوئے انہوں نے علم حدیث میں متعدد کتابیں لکھیں-

(۳) امام اسمٰعیل بن علیہ بصریؒ ۱۱۰ھ میں پیدائش اور ۱۹۳ھ میں وفات ہوئی-

(۴) امام محمد بن ادریس الشافعی المطلبی الہاشمی المکیؒ ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۰۴ھ میں مصر میں فوت ہوئے- آپ بالاتفاق دوسری صدی کے مجدد ہیں[ل] آپ نے علم

[ل] مولانا شبلی مرحوم سیرۃ النعمان میں لکھتے ہیں- فقہ اکبر کیا کوئی بھی امام صاحب کی تصنیف نہیں واللہ اعلم-

[ل] مفتاح السعادت مطبوعہ حیدر آباد دکن جلد دوم ص ۹۴- ۱۲منہ نیز اتحاف النبلاء مقصد دوم ص ۳۴۵-

حدیث میں نئے سرے سے جان ڈال دی۔ حدیث نبوی کے پرکھنے اور سمجھنے میں کچھ غلط فہمیاں ہونے لگیں تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو پیدا کر دیا۔ آپ نے سب سے پہلے علم اصول فقہ میں تصنیف کر کے اس فن کی بنیاد ڈالی[1] مختلف احادیث میں جمع و تطبیق کا فن بالکل اچھوتا تھا۔ سب سے پہلے آپ ہی نے اس مضمون کو لکھا[2] اور اس کے اصول و قواعد بیان کیے۔ مرسل روایت کو امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ مطلقاً حجت جانتے تھے۔ کیونکہ ان کے زمانہ میں سلسلہ روایت میں آنحضرت تک واسطے کم تھے۔ امام شافعیؒ تک واسطے زیادہ ہو گئے۔ نیز آپ نے دیکھا کہ روایۃ التباعی عن التابعی عن التابعی کی مثالیں بھی بہت ہیں اس لئے آپ نے اس کے متعلق چھان بین کی[3] علم حدیث کی نصرت کی وجہ سے آپ کا لقب "ناصر الحدیث" پڑ گیا۔ رحمہ اللہ۔ خاکسار نے سفر مصر میں آپ کی قبر کی زیارت کی اور مسجد جامع شافعیؒ میں نماز جمعہ ادا کی۔

(۶) امام یزید بن ہارون واسط میں تھے۔ ۱۱۸ھ میں پیدا اور ۲۰۶ھ میں فوت ہوئے۔

(۷) امام عبدالرزاق بن ہمام صنعانیؒ ۱۲۶ھ میں پیدا اور ۲۱۱ھ میں ۸۵ سال کی عمر میں فوت ہوئے۔ انہوں نے بھی اس فن میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔

یہ سب بزرگ حدیث نبوی کے شیدائی اور سنت کے فدائی تھے۔ قرآن و حدیث کے مقابلے میں کسی شے کی حقیقت کچھ بھی نہیں سمجھتے تھے اور کسی خاص شخص کی رائے اور قیاس کی پابندی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ رحمہم اللہ اجمعین۔

قرون مشہود لھا بالخیر:۔ یہی وہ زمانے ہیں جن کی بابت حدیث شریف میں

---

[1] کشف الظنون جلد اول ص ۱۱۴ بحث علم اصول و اتحاف النبلاء مقصد دوم ص ۳۴۵۔

[2] اتحاف النبلاء میں یہ بھی ہے کہ امام عبدالرحمٰن بن مہدی نے (جو کبار محدثین سے ہیں) امام شافعیؒ کو لکھا کہ ہمارے لئے ایسی کتاب تصنیف کیجئے جس میں قرآن شریف کے مطالب اقوال اخیار کے ساتھ ہوں اور حجیت اجماع اور قرآن و حدیث کے ناسخ و منسوخ کا بیان ہو۔ پس آپ نے کتاب الرسالۃ تصنیف کیا۔ یہ عاجز کہتا ہے یہ رسالہ امام شافعیؒ کی کتاب الام کے ابتداء میں مصر میں چھپ گیا ہے اور میرے پاس موجود ہے۔ اس میں بڑے بڑے دقیق مسائل حل کیے ہیں۔

[3] اس کی تفصیل کتب اصول حدیث میں مذکور ہے۔

شہادت وارد ہے کہ یہ بہتر زمانے ہیں۔ اور اسی بنا پر ان کو قرون مشہود لہا بالخیر کہتے ہیں چنانچہ صحیح بخاری میں ہے۔

عن عمران بن حصین قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیر امتی قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم قال عمران فلا ادری اذکر بعد قرنہ مرتین او ثلاثا ثم ان بعد کم قوم یشھدون ولا یستشھدون ویخونون ولا یؤتمنون وینذرون ولا یفون ویظھر فیھم السمن [1]

حضرت عمران بن حصین صحابیؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میری امت میں سے سب سے بہتر میرے زمانے کے لوگ ہیں پھر وہ جو ان کے بعد ہوں گے۔ حضرت عمران صحابیؓ کہتے ہیں کہ مجھے یاد نہیں رہا کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے زمانے کے بعد دو زمانوں کا ذکر کیا یا تین کا (پھر فرمایا کہ) تمہارے بعد ایسے لوگ ہوں گے جو خود گواہی دیں گے حالانکہ ان سے گواہی طلب نہ کی جائے اور خیانت کریں گے اور امین نہ جانے جائیں گے اور نذریں مانیں گے لیکن پوری نہ کریں گے اور ان میں تعیش و آرام طلبی کے سبب نخوت و موٹاپن ظاہر ہو جائے گا۔

توضیح:- آنحضرت ﷺ کا عہد مبارک ۱۱ھ تک اور صحابہؓ کا عصر سعادت ۱۱۰ھ تک اور تابعین کا زمانہ ۱۸۰ھ تک اور اتباع تابعین کا عہد ۲۲۰ھ تک رہا۔[2]

تابعین تک تو روایت مذکورہ بالا میں یقینی الفاظ ہیں اور تبع تابعین کا زمانہ شکی طور پر مذکور ہے۔ اگرچہ ہم کو تابعین تک دائرہ محدود کرنے کی گنجائش ہے۔ کیونکہ آنحضرت کے الفاظ صحابہ کو مخاطب کر کے یہ ہیں ثم ان بعد کم قوم یعنی پھر تمہارے بعد ایک

---

[1] بخاری دہلوی جلد اول ص ۵۱۵۔

[2] ان سب زمانوں کی حد بندی کے لئے دیکھو فتح الباری جزء ۱۴۔ ص ۳۵۳ مطبوعہ دہلی اور تدریب الراوی ص ۲۰۹ و ص ۲۱۵ مطبوعہ مصر۔

قوم ہو گی- اور ظاہر ہے کہ صحابہؓ اور تابعینؒ کا زمانہ تو دیکھا- لیکن تبع تابعینؒ کا نہیں دیکھا- مگر پھر بھی ہم نے میدان کو وسیع کر کے ان سب زمانوں کے متعلق تاریخی طور پر دکھا دیا کہ ان سب نیک زمانوں میں کتاب و سنت ہی کو اصول سمجھا جاتا تھا- اور کسی دوسری چیز کو ان کے سامنے ہرگز نہیں رکھا جاتا تھا-

تقلید کا شیوع اور اس کے وجوہ

ان تین نیک زمانوں کے بعد ایسا زمانہ آیا کہ بموجب مضمون حدیث مذکور کے خیانت و کذب کی عام اشاعت ہوئی- خود رائی اور اتباع ہوا کی کوئی حد نہ رہی- نصوص سے بے پرواہی کر کے جو جی میں آیا اسے مذہب قرار دیا- اور ڈیڑھ اینٹ کی جدا مسجد بنا کر امت کو کئی فرقوں میں بانٹ دیا- اس زمانہ میں سنت و بدعت کا اختلاط ایسا ہو چلا تھا اور سچی اور جھوٹی اور صحیح و ضعیف روایتوں میں ایسی بے تمیزی ہو چلی تھی کہ اگر محدثین (شکر اللہ مساعیہم) نہ اٹھ کھڑے ہوتے اور احیائے سنت اور رد بدعت کے لئے کمر ہمت نہ باندھ لیتے تو یہود و نصاری کے دین کی طرح عہد نبوت کے دین کا پتہ لگانا سخت مشکل ہو جاتا- اسی زمانہ میں قرآن و حدیث کے ساتھ غیروں کے فتاوی بھی جوڑے جانے لگے تھے- حتی کہ اسی بے جوڑ جوڑ سے ائمہ کے اقوال کو اصول مان کر ان پر تفریعات و تخریجات شروع ہو گئیں جس سے ادنی و اوسط طبقے سے تو حفظ و روایت نصوص اٹھ گئی- اور اعلی طبقہ سے ملکہ اجتہاد و قوت استنباط معدوم ہو کر تقلید کی تخم ریزی ہو گئی اور اس کا درخت ایسا پھولا پھیلا کہ سلطنت کے ساتھ سارے جہان کو سائے میں لے لیا- دوسروں کے اقوال پر قناعت ہونے لگی اور قرآن و حدیث میں خود نظر کرنی متروک ہو گئی- چنانچہ حافظ ذہبیؒ[1] (المتوفی ۷۴۸ھ) جو ساتویں آٹھویں صدی کے مشہور امام اور مسلم کل مورخ و محدث ہیں اپنی بے مثل کتاب تذکرۃ الحفاظ میں طبقہ ثامنہ کے ذکر کے بعد فرماتے ہیں-

---

[1] امام ذہبیؒ تذکرہ میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے ترجمہ کے اخیر میں فرماتے ہیں- و کل امام یوخذ من قوله ویترك الا الامام المتقین الصادق المصدوق الامین المعصوم صلوات الله وسلامه علیه فیا لله العجب من عالم یقلد اماما بعینه فی ما قال مع علمه بما یرد علی مذهب امامه من النصوص النبویة ولا حول ولا قوة الا بالله (تذکرہ ج ۱- ص ۱۴'۱۵)

فلقد تفانوا اصحاب الحديث وتلاشوا تبذل الناس بطلبه يهزء بهم اعداء الحديث والسنة يسخرون منهم وصار علماء العصر في الغالب عاكفين على التقليد في الفروع من غير تحرير لها الخ

(تذکرہ جلد ۲ ص ۱۱۱)

اصحاب حدیث یکے بعد دیگرے مرتے گئے اور (جو بچے وہ) حقیر سمجھے جاتے تھے۔لوگوں نے علم حدیث کی نگہداشت چھوڑ دی اور حدیث و سنت کے دشمن محدثین کو ٹھٹھے اور مخول میں اڑانے لگے اور اس زمانہ کے اکثر علماء فروع (عملیات) میں بغیر تحقیقات کے تقلید[1] پر جم گئے۔

اس کے بعد اس روش میں روز افزوں ترقی ہوتی گئی۔کیونکہ عوام کی طبیعت میں پست ہمتی اور اوساط میں دوسرے کا سہارا پکڑنا اکثر ہے۔اس سے تقلید کی جڑ مضبوط ہو گئی۔چنانچہ حافظ مذکور رحمہ اللہ الغفور طبقہ تاسعہ کے ذکر کے بعد فرماتے ہیں۔

وكذلك كان في هذا الوقت خلق من ائمة اهل الراى والفروع وعدد من اساطين المعتزلة والشيعة واصحاب الكلام الذين مشوا وراء المعقول واعرضوا عما سلف من التمسك بالاثار النبويه وظهر في الفقهاء التقليد وتناقض الاجتهاد (جلد دوم ص ۲۱۲)

"اسی طرح اس زمانے میں اہل رائے اور اہل فروع (فقہاء) کے بہت سے امام تھے۔اور کئی ایک معتزلوں' شیعوں اور متکلمین کے سردار بھی تھے جو کہ فن معقولات کے پیچھے لگے۔اور انہوں نے آثار نبویہؐ سے تمسک کرنے سے جو سلف کا طریق تھا۔روگردانی کی اور فقہاء میں تقلید اور تناقض اجتہاد ظاہر ہو گیا۔"

اس طبقہ میں تیسری صدی تک کے علماء حدیث کا ذکر ہے۔بس اس صدی میں تقلید کی تخم ریزی ہوئی اور ہوتے ہوتے آخر چوتھی صدی میں مختلف مذاہب کی مستقل

---

[1] یہ تاریخی بیان ہے۔مسئلہ تقلید کی.... مستقل بحث ان شاء اللہ الگ فصل میں کی جاوے گی۔

حدیں کھینچ گئیں۔اور ہر گروہ کا ایک مذہب معین پر جم جانا اور اسی کی پابندی لازم جاننا آئین زمانہ یا فیشن قرار پایا۔ یعنی مذاہب مختلفہ میں سے کسی خاص مذہب کو اختیار کرنا جزو مذہب سمجھا جانے لگا اور صحابہ و تابعین و اتباع تابعین رحمہم اللہ اجمعین کے دستور و روش کو فراموش کر دیا گیا۔

حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ مرحوم حجۃ اللہ میں فرماتے ہیں۔

اعلم ان الناس كانوا قبل المائة الرابعة غير مجمعين على التقليد الخالص لمذهب واحد بعينه قال ابو طالب المكى فى قوت القلوب ان الكتب والجموعات محدثة والقول بمقالات الناس والفتيا بمذهب الواحد من الناس واتخاذ قوله والحكاية له من كل شئى والتفقه على مذهبه لم يكن الناس قديما على ذلك فى القرنين الاول والثانى (انتهى) اقول وبعد القرنين حدث فيهم شئى من التخريج غير ان اهل المائة الرابعة لم يكونوا مجتمعين على التقليد الخالص على مذهب واحد والتفقه له والحكاية لقوله كما يظهر من التتبع بل كان فيهم العلماء والعامة وكان من خبر العامة انهم كانوا فى المسائل الاجتماعية التى لا اختلاف فيها بين المسلمين او جمهور المجتهدين لا يقلدون الاصاحب الشرع وكانوا يتعلمون صفة الوضوء والغسل والصلوٰة والزكوٰة ونحو ذلك من ابائهم ومعلمى بلدانهم فيمشون على حسب ذلك واذا وقعت لهم واقعة استفتوا فيها اى مفت وجد وامن غير تعيين مذهب وكان من خبر الخاصة انه كان اهل الحديث منهم يشتغلون بالحديث فيخلص اليهم من احاديث النبى صلى الله عليه وسلم واثار الصحابة مالا يحتاجون معه الى شئى اخر فى المسئلة من حديث مستفيض او صحيح قد عمل به بعض الفقهاء

ولا عذر لتارك به و اقوال متظاهرة لجمهور الصحابة مما لا يحسن مخالفتها فان لم يجد في المسئلة ما يطمئن به قلبه لتعارض النقل وعدم وضوح الترجيح ونحو ذلك رجع الى كلام بعض من مضى من الفقهاء فان وجد قولين اختار اوثقهما سواء كان من اهل المدينة او من اهل الكوفة وكان اهل التخريج منهم يخرجون فيما لا يجدونه مصرحا ويجتهدون في المذهب وكان هؤلاء ينسبون الى مذهب اصحابهم فيقال فلان شافعي و فلان حنفي وكان صاحب الحديث ايضا قد ينسب الى احد المذهب لكثرة الموافقة له كالنسائي والبيهقي فينسبان الى الشافعي فكان لا يتولى القضاء ولا الافتاء الا مجتهد ولا يسمى الفقيه الا مجتهد ثم بعد هذه القرون كان ناس اخرون ذهبوا يمنيا وشمالا (حجة الله مطبوعه مصر جلد اول ص ۱۵۲)

جان لو کہ امت محمدیہ کے لوگ چوتھی صدی سے پیشتر بعینہ کسی خاص معین مذہب کی تقلید پر جمع نہیں تھے (شیخ) ابو طالب مکیؒ (اپنی کتاب) "قوت القلوب" میں کہتے ہیں کہ کتب (فقہ) اور مجموعہائے (فتاوی) سب نئی چیزیں ہیں- اور (احکام میں) دوسرے لوگوں کے فتووں کو نقل کر دینا اور کسی ایک (امام) کے مذہب پر فتوی دینا اور ہر امر میں اسی کے مذہب کے مطابق دین کو سمجھنا قدیم ایام یعنی پہلی اور دوسری صدی کے لوگ اس آئین پر نہ تھے (انتہی) (شاہ صاحب فرماتے ہیں) میں کہتا ہوں کہ دو صدیوں کے بعد ان میں کسی قدر تخریج شروع ہوئی مگر چوتھی صدی کے لوگ کسی خاص مذہب کی تقلید پر اور اسی کے مطابق دین میں فقاہت حاصل کرنے پر اور اسی قول کو نقل کرنے پر مجتمع نہ تھے جیسا کہ پڑتال کرنے سے ظاہر ہے- بلکہ ان میں علماء بھی تھے اور عامیوں کی یہ بات تھی کہ وہ اجماعی مسائل میں جن

میں مسلمانوں میں یا جمہور مجتہدین میں اختلاف نہیں ہے- سوائے صاحب شرع کے کسی کی پیروی نہیں کرتے تھے اور وضو اور غسل اور نماز اور زکوۃ کا طریق اپنے باپ دادوں اور اپنے شہر کے معلموں سے سیکھ لیتے تھے- پس اس کے مطابق عمل کرتے تھے- اور جب ان کو کوئی واقعہ پیش آ جاتا تھا- تو بغیر تعین کسی خاص مذہب کے جس مفتی کو پاتے اس سے حکم (شرع) دریافت کر لیتے تھے- اور خاص لوگوں کی یہ بات تھی کہ ان میں سے اہل حدیث تو حدیث (رسول اللہ ﷺ) سے مشتغل ہوتے تھے- پس ان کو آنحضرت ﷺ کی ایسی خالص حدیثیں یا صحابہؓ کے ایسے خالص آثار مل جاتے جن کے ہوتے وہ اس مسئلہ میں کسی اور شے کے محتاج نہ رہتے یا تو وہ حدیث مشہور ہوتی ہے- یا ایسی صحیح جس پر بعض فقہاء نے عمل کیا ہوتا اور اس کو ترک کرنے والے کا کوئی عذر باقی نہ رہتا یا جمہور صحابہ کے وہ اقوال جو ایک دوسرے کے موید ہوں جن کی مخالفت مستحسن نہیں- پس اگر وہ اہل حدیث اس مسئلہ میں کوئی ایسی روایت نہ پاتا جس سے اس کا دل مطمئن ہو جائے- بوجہ تعارض نقل کے اور ترجیح کی وجہ واضح نہ ہونے اور اسی طرح کسی اور وجہ سے تو وہ کسی گذشتہ فقیہ (دین کی سمجھ والے) کے کلام کی طرف رجوع کرتا- پس اگر اس میں بھی وہ قول پاتا تو جو انسان ان میں سے اوثق ہوتا اسے اختیار کر لیتا- برابر تھا کہ اہل مدینہ کا ہو یا اہل کوفہ کا اور جو ان میں سے اہل تخریج تھے وہ ان مسائل میں تخریج کرتے تھے جن میں (امام کی) صراحت نہ پاتے تھے اور اجتہاد فی المذہب کی طرف نسبت کئے جاتے تھے- پس کہا جاتا تھا کہ فلاں شافعی ہے اور فلاں حنفی ہے- اور کوئی اہل حدیث بوجہ کثرت موافقت کے کسی ایک مذہب کی طرف نسبت کیا جاتا تھا- مثلاً امام نسائی اور امام بیہقی کہ یہ دونوں امام شافعی کی طرف منسوب ہیں اور اس زمانہ میں قضاء پر اور افتاء پر صرف مجتہد ہی مقرر ہوتا تھا- پھر اس زمانہ کے بعد

ایسے لوگ ہوئے جو (ادھر ادھر) دائیں بائیں چلے گئے۔

حضرت شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ جب زمانے میں ایسا انقلاب ہو گیا تو لوگوں میں چند باتیں پیدا ہو گئیں۔

ومنها انهم اطماء نوا بالتقليد ودب التقليد في صدورهم دبيب النمل وهم لا يشعرون (ص ۱۵۳)

ایک ان میں تقلید ہے کہ لوگ اس پر مطمئن ہو گئے اور وہ ان کے دلوں میں چیونٹی کی چال چلی اور ان کو شعور بھی نہ ہوا۔

اس طوفان بے تمیزی کے کے وقت بھی زمانہ بالکل خالی نہیں ہو گیا تھا۔ بلکہ ایک گروہ اسی پرانی چال سے براہ راست اتباع قرآن و حدیث پر قائم رہا اور انقلاب کی آندھی ان کے ٹمٹماتے چراغ کو گل نہ کر سکی۔ چنانچہ ان لوگوں کی نسبت بھی حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

ولا اقوال كليا مطردا فان لله طائفة من عباده لا يضرهم من خذلهم وهم حجة الله في ارضه وان قلوا ولم يات قرن بعد ذلك الا وهو اشد فتنة واوفر تقليد او اشد انتزاعا للامانة من صدور الرجال حتى اطماء نوابترك الخوض في امر الدين و بان يقولوا انا وجدنا اباء نا على امة وانا على اثارهم مقتدون والى الله المشتكى ووهو المستعان وبه الثقة وعليه التكلان.

یہ حکم میں بہر حال کلی طور پر نہیں لگاتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے بندوں سے ایک گروہ وہ بھی ہے کہ جو کوئی ان کا ساتھ چھوڑ دے تو ان کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا۔ اور وہ گروہ اللہ تعالیٰ کی زمین میں اس کی حجت ہیں۔ گو وہ تھوڑے ہوتے ہیں اور زمانہ کے بعد کوئی زمانہ نہ آیا مگر وہ فتنہ میں زیادہ سخت اور تقلید میں بہت وافر اور لوگوں کے سینوں سے امانت کے سلب کرنے میں بہت شدید ہوا۔ حتی کہ لوگ دینی امور میں غور و خوض کے ترک کرنے پر اور اس

بات کے کہہ دینے پر مطمئن ہو گئے کہ ہم نے اپنے آباواجداد کو اسی طریق پر پایا ہے- اور ہم تو انہیں کے نقش قدم پر چلنے والے ہیں- اور اس امر کی شکایت اللہ ہی کی طرف ہے- اور اسی سے مدد مطلوب ہے' اور اسی پر اعتبار و اعتماد ہے-

شاہ صاحب نے جس گروہ کی نسبت یہ کہا ہے کہ "وہ زمین میں حجتہ اللہ ہے اور جس نے ان کو چھوڑا وہ ان کا کچھ نہ بگاڑ سکا-" اس سے مراد فرقہ اہل حدیث ہے جس کا ذکر اوپر کی عبارات میں برابر کر رہے ہیں- اور اس میں اس حدیث کی طرف اشارہ ہے جو صحیح بخاری و صحیح مسلم کی روایت سے سابقاً گذر چکی ہے-

اصحاب تخریجات نے جب اپنے مقتداؤں کے اقوال کو اصول بنا کر ان پر تفریعات شروع کر دیں تو اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ ہوتے ہوتے نصوص شرعیہ سے بے پرواہی اور ناواقفی ہو جائے اور آخر کار یہ نوبت آجائے کہ ائمہ کے اقوال کو بالاستقلال دلیل مانا جائے اور ان کی دلیل و سند طلب نہ کی جائے- آخر یہ ہو کر رہا- اور اس سے تقلید کی جڑ مضبوط ہو گئی- چنانچہ حنفی علماء اصول تقلید کی بنا اسی بات پر رکھتے ہیں کہ اجتہاد مطلق ائمہ اربعہ پر ختم ہو گیا[1] جس کا آخری سال ۲۴۰ھ یعنی امام احمدؒ کی وفات ہے- اور اجتہاد فی المذہب علامہ نسفیؒ المتوفی ۷۳۵ھ پر ختم ہو گیا[2]

لہذا اب کوئی شخص براہ راست نصوص شرعیہ سے کوئی زائد حکم استنباط نہیں کر سکتا- اور نہ بغیر وساطت مجتہدین کے ان پر عمل کر سکتا ہے- حتی کہ بعض نے تو یہاں

[1،2] چنانچہ فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت میں بحرالعلوم لکھنوی فرماتے ہیں-

ثم ان من الناس من حکم بوجوب الخلو من بعد العلامة النسفی واختتم الاجتهاد به وعنوا الاجتهاد فی المذهب واما الاجتهاد المطلق فقالوا اختتم بالائمة الاربعة حتی اوجبوا تقلید واحد من هولاء علی الامة وهذا کله هوس من هو ساتهم لم یاتوا بدلیل ولا یعباء بکلامهم وانما هم من الذین حکم الحدیث انهم افتوا بغیر علم فضلوا واضلوا ولم یفهموا ان هذا الاخبار بالغیب فی خمس لا یعلمهن الا الله تعالی (فواتح مطبوعہ مصر مع مستصفی للامام الغزالیؒ ص ۳۹۹ و ص ۴۰۰ جلد ثانی)

تک بھی لکھ دیا ہے کہ اگر ہم کو کوئی ایسی حدیث ملے جو از روئے روایت و درایت بالکل صحیح و غیر منسوخ ہو لیکن اس پر کسی مجتہد نے عمل نہ کیا ہو تو ہم اس کو اختیار نہیں کریں گے۔ جب یہ خیال راسخ ہو گیا۔ تو انصاف فرمائے کہ نصوص شرعیہ کی حفاظت کا کیا فائدہ؟ اور ان کی آموخت سے کیا حاصل؟ بس اس خیال سے رہی سہی قوت بھی جاتی رہی۔ اور حدیث یقل العلم ویظہر الجہل (بخاری) یعنی علم کم ہو جائے گا اور جہالت غالب ہو جائے گی۔ واقعات کی رو سے یہ بھی ثابت ہو گئی پھر اس کا لازمی نتیجہ یہی تھا کہ نصوص (قرآن و حدیث) سے بے پرواہی کی جائے اور ان میں غور و فکر ترک کر کے اور تقلید کا رعب جما کر دماغ کی قوت استنباط اور ملکہ اجتہاد کو معطل و بے کار کر دیا جائے۔ سو ہو کر رہا۔ ہمارے نزدیک تقلید کی جڑ پکڑنے اور جلد شائع ہونے کی ایک وجہ علمی کمزوری اور دماغ کی نارسائی ہے۔ چنانچہ علامہ ابن خلدون اپنی تاریخ کے مقدمے میں فرماتے ہیں۔

ولما صار مذهب كل امام علما مخصوصا عند اهل مذهبه ولم يكن لهم سبيل الى الاجتهاد والقياس فاحتاجوا الى تنظير المسائل في الالحاق وتفريقها عند الاشتباه بعد الاستناد الى الاصول المقدرة من مذهب امامهم وصار ذلك كله يحتاج الى ملكة راسخة يقتدر بها على ذلك النوع من التنظير اوا التفرقة و اتباع مذهب امامهم فيهما ما استطاعوا وهذه الملكة هي علم الفقه لهذا العمد (مقدمه ص ۲۷۵)

اور جب ہر امام کا مذہب اس مذہب والوں کے نزدیک ایک مخصوص علم ہو گیا۔ اور ان کے لئے اجتہاد و قیاس کی کوئی سبیل نہ رہی تو وہ (مسائل کو) اپنے امام کے مقررہ اصول کی طرف مستند کرنے کے بعد الحاق (ایک مسئلے کو دوسرے سے ملانے) میں اس کی نظیر بنانے اور اشتباہ کے وقت ان میں فرق بتانے کے محتاج ہوئے اور ان سب میں ایسے پختہ ملکہ کی حاجت پڑی جس سے اس قسم

کی تنظیر اور تفرقہ پر قدرت حاصل ہو اور ان دونوں امور (تنظیر و تفریق) میں جہاں تک کر سکے ان کو اپنے امام کی پیروی کرنی پڑی اور یہی ملکہ اس زمانے کا علم فقہ تھا۔

اسی لئے ان لوگوں میں جنہوں نے تقلید شخصی کو پختہ پکڑ لینے کے سبب اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا تھا۔ متاخرین میں صاحب دماغ آدمی کمتر پیدا ہوئے۔ اور اگر قدرت نے اپنے خزانہ بخشش سے کسی کو کچھ بخش بھی دیا تو اس نے بھی بوجہ اپنے اختیار کردہ مذاہب کے کہ اب اجتہاد کی ضرورت نہیں نہ تو اس نعمت سے خود فائدہ اٹھایا نہ لوگوں کو پہنچایا اور تصانیف میں سوائے ان اقوال کے اعادہ و تکرار کے جو ان کے اسلاف فرما گئے تھے کچھ نہ لکھ سکے۔ مثلاً کمال الدین ابن ہمام المتوفی ۸۶۱ھ کو ایک طرف تو ان کے وفور علم۔ وسعت نظر اور دقت فہم کی بنا پر یہ کہا جاتا ہے بلغ رتبۃ الاجتہاد[1] تک پہنچ گئے تھے لیکن دوسری طرف اس لئے کہ وہ ۵۳۷ھ کے یعنی علامہ نسفی کے بعد پیدا ہوئے۔ ان کو اس کثرت علم۔ وسعت نظر اور دقت فہم سے دائرہ تقلید سے باہر کام لینے کی اجازت نہیں ملی۔ الا اس صورت میں کہ اقوال ماضیہ کی نصرت میں کچھ کہیں لکھوائے ان او تیتم ھذا فخذوہ وان لم توتوہ فاحذروا (مائدہ پ ۶) (اگر تم کو یہ بات جو ہم کہتے ہیں ملے تو اسے لے لو اور اگر یہ نہ ملے تو بچے رہنا) زمانہ کا یہ انقلابی اثر اور نصوص سے یہ بے پرواہی خاص اسی دائرہ میں ہوئی جنہوں نے تقلید اختیار کر لی تھی ورنہ وہ لوگ جو طرز اول پر قائم رہے۔ اور جنہوں نے عمل بالحدیث کے لئے صرف انہی قواعد علمیہ و شرعیہ کی رعایت ضروری جانی جو فہم خطاب اور دلالت کلام کے متعلق بعض عقلی اور بعض عرفی ہوتے ہیں۔ اور قرآن و حدیث سے ان کا استنباط ہو سکتا ہے۔ اور کسی مجتہد کی وساطت کو غیر ضروری جان کر تقلید لازم نہیں کر لی تھی۔ وہ بفضل خدا برابر نصوص شرعیہ کی حفاظت میں کمربستہ رہے۔ اور تحریر و تقریر ہر دو طریق سے اشاعت سنت میں کوشاں رہے اور سچ پوچھیے تو آج انہی کے دم قدم کی برکت سے

---

[1] شامی جلد سوم کتاب العتق باب التدبیر ص ۵۲ نیز باب نکاح الرقیق ص ۶۲۰ جلد دوم۔

کتب حدیث کا اور سنت نبویہ کا بقا ہے۔(جزاھم اللہ عنا خیر الجزا)

ان کی تصانیف زندہ گواہ ہیں کہ نصوص شرعیہ کی حفاظت کے بعد ان کے صحیح محامل کے سمجھنے اور ان کو براہ راست اصول قرار دے کر ان سے مسائل استنباط کرنے میں وہ کہاں تک کامیاب ہوئے؟ گویا ان کے واقعات نے اس یکطرفہ اجماع کو کہ وحی آسمانی کی طرح اجتہاد کا دروازہ بھی بند ہو چکا ہے غلط ثابت کر دیا۔

وجوہ اشاعت تقلید: (۲) حضرت شاہ صاحب نے حجۃ اللہ اور انصاف میں تقلید کے شائع ہونے کی دیگر وجوہ بھی بیان کی ہیں۔ طالب تفصیل ان کتابوں کا مطالعہ کر لے ہم اس مقام پر بعض کا ذکر کرتے ہیں۔

ہم سابقاً ذکر کر آئے ہیں کہ خلیفہ مامون کے کھلے دربار میں علمی مناظرے ہوتے تھے۔ اور وہ سب عموماً عقلیات و علم کلام کے متعلق تھے۔ بعد کے زمانوں میں یہ افتاد فقہی مسائل میں منقلب ہو گئی اور خلفاء کے سامنے امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے خلافیات میں بحث ہونے لگی۔ پس شاہی دربار کی اس مجلس میں شمولیت حاصل کرنے اور اس علمی گفتگو میں حصہ لینے کے لئے ضروری تھا کہ ان دونوں اماموں میں سے کسی ایک کے مسلک میں منسلک ہو کر رہیں۔

(۳) اس کے ساتھ اس وجہ کو بھی ملا لینے سے یہ بات اور صاف ہو جاتی ہے۔ کہ قرون اولے کے لوگ دنیا سے معرض ہونے کے سبب حکام کی صحبت سے مجتنب رہتے تھے۔ جیسا کہ خود امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کے واقعات سے ظاہر ہے۔ اس اعراض و بے پرواہی کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ خلفاء و حکام اپنے امور میں ان پاک نفوس کی طرف خود رجوع کرتے تھے۔ لیکن بعد زمانہ کے سبب استغناء و تعفف میں کمی ہو گئی تو علماء بجائے مطلوب ہونے کے طالب ہو گئے اور حکام کی صحبت اور ان سے رسوخ حاصل کرنے میں اعزاز و اکرام سمجھنے لگے اور یہ علم و عمل کی کمی کا نتیجہ تھا۔ تو اب ضرور تھا کہ جاہ طلبی کے لئے کسی مسلم امام و بزرگ کی طرف منسوب ہو کر رسوخ حاصل کریں اسی لئے ان لوگوں کو جو مقربین احکام ہوتے "صدر الشریعۃ" اور "تاج الشریعۃ"

اور ''شمس الائمہ'' کے خطابات سے یاد کیا جاتا اور جو ان سے اعراض رکھتے وہ فقر و درویشی کی حالت میں کسی حجرے یا زاویہ میں درس و تدریس میں لگے رہتے یا جمع احادیث کے لئے بادیہ پیمائی اور صحرا نوردی میں زندگی گذار دیتے۔ حالانکہ دونوں کے علمی و عملی کمالات میں دن رات کا فرق تھا۔

اور اگر ان میں سے کوئی کبھی ایسا کلمہ حق کہہ دیتا جو حکومت کے خلاف منشا ہوتا تو پابجولاں قیدو بند میں ڈال دیا جاتا جہاں سے بس اس کا جنازہ ہی نکلتا۔ یا اسے جلاوطن کر دیا جاتا یا نہایت سختی سے اسے پیٹا جاتا۔ امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ، امام بخاریؒ، امام ابن حزمؒ، امام ابن تیمیہؒ کے واقعات اس کے شاہد ہیں۔ رحمہم اللہ اجمعین۔

اس کے ساتھ چوتھی وجہ یہ بھی ملا لیں کہ مباحثہ کے وقت رد و تردید میں عصبیت غالب آجاتی ہے تو دوسرے کی مخالفت کے لئے خواہ مخواہ کھینچ تان کر کے دوسرا پہلو اختیار کرنا پڑتا ہے۔ جس کے الزام سے بچنے کے لئے کسی پہلے امام کے قول کا سہارا پکڑنا پڑتا ہے۔ پس دربار شاہی کے مناظرات میں یہ نظارہ بھی ہوا کرتا تھا۔

(۵) نیز یہ وجہ ہوئی کہ علاوہ شاہی مناظرات کے خود دربار قضا کے فیصلہ جات میں جب فقہاء میں مزاحمت ہوتی اور ایک دوسرے کی تردید کرتا تو سلسلہ کلام کو منقطع کرنے کے لئے کسی مسلم بزرگ سے موافقت ضروری سمجھی جاتی جس سے رفتہ رفتہ اقوال الرجال پر فتویٰ ہونے کے سبب تقلید کی جڑ جم گئی۔

(۶) نیز یہ کہ زمانہ رسالت سے دوری کے سبب جو قاضیوں میں بھی انصاف نہ رہا۔ تو ان کے فیصلے کا کیا اعتبار؟ لہٰذا ضرور تھا کہ وہ اپنے فیصلہ کو دوسرے کی نظر میں وقیع بنانے کے لئے کسی پہلے امام و مقتدا کے قول سے استناد کریں۔ جس سے آخر کار یہ ہو کر رہا کہ اقوال الرجال بالاستقلال شرعی سند سمجھے جانے لگے۔ اور یہ عین تقلید ہے۔

غرض ہر زمانے کے انقلابات اور کوائف پر نظر کرنے والے اصحاب آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ قول بالتقلید زمانہ نبوت کے بہت عرصہ بعد حادث ہوا۔ اور اس کا بڑا سبب ان امور کا پیدا ہو جانا ہے۔ جو امتداد زمانہ سے پیدا ہو جایا کرتے ہیں اور وہ قرآن مجید میں

امم سابقہ کے حالات میں جگہ جگہ مذکور ہیں-اور ہم شروع کتاب میں فصل اول میں
کسی قدر تفصیل سے بیان کر آئے ہیں-

اہل حدیث کا طرز استدلال وطریق اجتہاد

اوپر کے بیان میں جب یہ ذکر کیا گیا کہ محدثینؒ نصوص شرعیہ کی حفاظت کے علاوہ ان کے صحیح محمل کے سمجھنے اور صرف نصوص ہی کو اصول قرار دے کر ان سے مسائل استنباط کرنے میں کہاں تک کامیاب ہوئے۔ تو اب مناسب ہے کہ اہل حدیث کے اس خاص طرز استدلال اور طریق اجتہاد کو بھی بیان کر دیں۔ جس کی وجہ سے وہ آنحضرت ﷺ کی صحیح مراد سے ذرہ بھر بھی نہیں ہٹکے۔

اس سے اس بات پر بھی روشنی پڑے گی جو ہم فصول سابقہ میں بیان کر آئے ہیں کہ عمل بالحدیث میں اہل حدیث کے سوا دوسرے فرقوں نے کسی ایسے امر کی بھی رعایت ضروری جانی جو ان کے خیال میں عمل بالحدیث کے لئے بمنزلہ شرط تھا اور آخر کار وہ عمل بالحدیث کے سامنے ایک آڑ اور اوٹ ہو گیا۔ جس سے ان کے دلوں پر سنت کے محبت وشوق کا جلوہ نوری جو درمیانی حجابات کے اٹھ جانے کی صورت میں پڑ سکتا تھا نہ پڑ سکا۔

نیز یہ امر واضح ہو جائے گا کہ باوجود اس کے کہ اہل حدیث بھی آیات واحادیث سے استنباط واستخراج کرتے ہیں پھر بھی ان کا نام اہل حدیث ہی ہے اور اہل رائے نہیں ہے اور باوجود اس کے کہ دوسرے بھی حدیث نبویؐ کو ایک اصل اور ماخذ قرار دیتے ہیں۔ لیکن ان کو اہل حدیث نہیں کہتے بلکہ کسی کو تو اہل ہوی اور کسی کو اہل رائے کہتے ہیں۔

بفضل خدا یہ فصل عمل بالحدیث میں اہل حدیث کی خصوصیت کے واضح کرنے میں اور دوسرے لوگوں کو اہل حدیث کی طرف مائل کرنے میں عجب موثر ثابت ہو گی والاستعداد والسعادۃ شرط للاستفادۃ محدثین کے استنباط میں ایک خاص کمال ہے

جو کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوا کہ یہ پاک نفوس دائیں بائیں جھانکنے کے بغیر از خود قیاسی اصول وضع کرنے کے سوا براہ راست سنت مطہرہ سے ایسے سہل اور صاف طریق سے استنباط کرتے ہیں کہ باندا ق طبیعت کو جو کسی خارجی اثر سے دبی نہ ہو۔ سکون و تسلی ہو کر صاف نظر آنے لگ جاتا ہے کہ ہاں شارع علیہ السلام نے اس امر کو ضرور ملحوظ رکھا ہے۔ اور یہ بات آپ کے پاک کلمات کی جامعیت اور وحی من عند اللہ ہونے کی دلیل ہے ورنہ کسی کلام کو قیاسی اصول کے سانچے میں ڈھال کر کسی مسئلے کا استخراج کر لینا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ لیکن اس میں اتنا تردد باقی رہ جاتا ہے کہ خدا جانے یہ اجتہاد شارع علیہ السلام والتحیہ کو امر تشریع میں منظور بھی تھا یا نہیں۔

محدثین کو آنحضرت ﷺ کی صحیح مراد سمجھنے کا یہ ملکہ آنحضرت ﷺ کی حدیث کی محبت اور شب و روز اسی کے شغل و توغل سے نصیب ہوا اور قاعدہ ہے کہ غلبہ محبت کی وجہ سے محبّ و محبوب کا رنگ آجاتا ہے اور محبوب کے کلام کو اور اس کے اشارات و رموز کو جیسا اس کا محبّ سمجھتا ہے کوئی دوسرا نہیں سمجھ سکتا۔ ؎

میان عاشق و معشوق رمزیست کراماً کاتبین راہم خبر نیست

محدثین نے آنحضرت ﷺ کے خطابات کے سمجھنے میں صرف انہی قواعد علمیہ و شرعیہ کی رعایت ضروری جانی جو فہم خطاب کے لئے بعض عقلی اور بعض عرفی ہوتے ہیں اور سب سے اوپر یہ کہ جس طرح کسی خاص فن میں خاص اصطلاحی معانی کے وقت ان الفاظ کے لغوی و عرفی معانی ترک کر دئے جاتے ہیں۔ اسی طرح اگر کسی لفظ کے مفہوم میں شریعت مطہرہ نے کچھ توسیع یا تقید کر دی ہے تو محدثین اس لفظ کے معنی و مفہوم میں شرعی تصرف کا لحاظ ضروری جانتے ہیں۔ اور اس کے مقابلہ میں حقیقت لغوی اور استعمال عرفی پر بس نہیں کرتے مثلاً صوم، صلوٰۃ اور حج و زکوٰۃ کہ لغت میں ان کے معانی علی الترتیب یہ ہیں بندش، دعا، قصد اور پاکیزگی۔

لیکن شریعت میں ان سے ایک خاص ہیئت و وقت کی بندش یعنی روزہ اور ایک خاص ہیئت و آداب کی دعا و عبادت یعنی نماز اور ایک خاص مقام کا قصد یعنی بیت اللہ

شریف کا- اور ایک خاص قسم کی پاکیزگی متعلق مال کے یعنی صدقہ مفروضہ مراد ہے- اگرچہ شرعی اور لغوی و عرفی معانی میں مناسبت باقی رہتی ہے- لیکن ان کی حدود میں فرق آجاتا ہے- اسی طرح لغت میں "رکوع" کے معنی ہیں انحنا یعنی جھکنا- اور شریعت میں ایک خاص ہیات و حالت میں جھکنے کو رکوع کہتے ہیں چنانچہ قاموس میں ہے-

والرکوع فی الصلوۃ ان یخفض راسه بعد قومته القراء حتی تنال راحتاہ رکبتیه او حتی یطمئن ظهره (قاموس اللغة)

نماز میں "رکوع" اس کا نام ہے کہ قومہ قرأت (قیام) کے بعد سر کو اتنا جھکائے کہ دونوں ہتھیلیاں دونوں گھٹنوں پر ہوں اور پشت مطمئن (ہموار) ہو-

اسی طرح لغت میں سجدہ کے معنی جھکنے 'عاجزی کرنے کے بھی ہیں اور کھڑے ہونے کے بھی ہیں چنانچہ قاموس میں ہے سجد خضع و انتصب ضد یعنی سجدہ کے معنی گرا اور کھڑا ہوا (دونوں ہیں) اور یہ لفظ ذوات الاضداد میں سے ہے جن کے معنی آپس میں ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں- لیکن شریعت میں سجدہ اسے کہتے ہیں کہ دونوں ہاتھ اور دونوں گھٹنے اور دونوں پاؤں کی انگلیوں کے سرے زمین کے ساتھ لگے ہوں اور پیشانی مع ناک زمین پر لگی ہو تاکہ پیٹ کے بل لیٹ کر یا کسی اور طرح سے پیشانی زمین پر رکھنے سے فرق ہو جائے-

تو اب جس جگہ شریعت میں سجدے اور رکوع کا حکم ہوگا وہاں اہل حدیث کے نزدیک ان کے لغوی معنی پر بس نہیں ہوگی بلکہ اگر شرعی مفہوم کے رو سے ادا کئے جائیں گے تو سجدہ و رکوع کہلائیں گے ورنہ نہیں اور ظاہر ہے کہ رکوع میں گھٹنوں پر ہاتھ رکھنے اور پشت کو ہموار کرنے کی قید اور سجود میں دونوں ہاتھ اور دونوں گھٹنے اور دونوں پاؤں زمین سے لگے رہنے کی قید ان کے مفہوم لغوی پر زائد امر ہے- یہ اسی لئے ہے کہ خطابات شرعیہ میں مفہوم شرعی کا لحاظ ضروری ہوتا ہے اور صرف مفہوم لغوی پر بس نہیں ہوتی-

حدیث میں ایسی نماز کو شمار نہیں رکھا جس میں رکوع و سجود میں اور ان دونوں سے اٹھنے کی حالت میں پیٹھ سیدھی نہ کی جائے چنانچہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا-

لا تجزی صلوۃ لایقیم الرجل فیھا صلبه فی رکوعه و سجوده (دارقطنی)
"وہ نماز کفایت نہیں کرتی جس میں آدمی اپنی پشت رکوع و سجود میں درست نہ کرے۔"

نیز یہ کہ صحیح بخاری وغیرہ میں جو مذکور ہے کہ ایک شخص رکوع سجود وغیرہ ارکان نماز درست طور پر ادا نہیں کرتا اور آنحضرت اس کو بار بار فرماتے تھے ارجع فصلی فانك لم تصل "یعنی نماز پھر لوٹا کر پڑھ کیونکہ تو نے نماز نہیں پڑھی۔" تو اس کی بھی یہی وجہ تھی کہ اس کی نماز میں یہ ارکان ہیات شرعی سے ادا نہ ہوتے تھے ورنہ حقیقت لغوی تو وہاں بھی موجود تھی۔

قاعدہ "الخاص لا یحتمل البیان": (۱) لیکن اس کے مقابلے میں حضرات حنفیہ کا مذہب بالکل جدا ہے۔ وہ پہلے ایک قاعدہ بناتے ہیں اور اس کے مطابق قرآن کا مفہوم مقرر کرتے ہیں پھر اس قاعدے پر جزئیات مسائل کو متفرع کرتے ہیں جزئیات آنحضرت ﷺ کے بیان اور طریق عمل کے موافق ہوں یا نہ ہوں اس سے غرض نہیں۔ عدم موافقت کی صورت میں اس روایت کے قبول کرنے میں چند ایک عذر بنا رکھے ہیں۔ ان میں سے کوئی پیش کر دیا جاتا ہے چنانچہ ہم ان قواعد و عذرات کو مثالوں سے سمجھاتے ہیں۔

پہلی مثال مسئلہ تعدیل ارکان: (۱) حضرات احناف کے نزدیک نماز میں رکوع و سجود فرض تو ہیں لیکن صرف ان کی لغوی حد تک۔ اطمینان و اعتدال از روئے لغت ان کی ماہیت میں داخل نہیں ہیں تو یہ فرض بھی نہیں ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی شخص بغیر اطمینان و اعتدال کے رکوع سجود کرے تو اس کی نماز فاسد و باطل نہیں ہو گی بلکہ ناقص ہو گی جس کی تلافی سجدہ سہو سے ہو سکتی ہے اس امر کی دلیل کوئی آیت یا حدیث (قول فعلی) نہیں ہے۔ بلکہ ایک قاعدہ ہے۔ جو انہوں نے خود بنایا ہے کہ جو لفظ مفہوم المعنی ہو اس کے لئے کسی زائد بیان کی ضرورت نہیں چنانچہ منار متن نور الانوار میں ہے الخاص لا یحتمل البیان لکونه بینا (ص ۱۵) یعنی جو لفظ خاص ہو وہ کسی بیان کا محتاج نہیں کیونکہ

وہ خود واضح ہے اور پھر اس پر یہ مسئلہ تفریع کیا ہے۔

فلا یجوز الحاق التعدیل بامر الرکوع والسجود علی سبیل الفرض (منار ص ۱۵)

پس رکوع اور سجود کے حکم کے ساتھ تعدیل (ارکان) کو بھی فرضیت کے طور پر ملحق کرنا جائز نہیں۔

اس متن کی شرح میں صاحب نورالانوار فرماتے ہیں۔

بیانہ ان الشافعی یقول تعدیل الارکان فی الرکوع والسجود فرض لحدیث اعرابی خفف فی الصلوٰۃ فقال لہ قم فصل فانک لم تصل ھکذا قالہ ثلثا ونحن نقول ان قولہ تعالی وارکعوا[1] واسجدوا خاص وضع لمعنی معلوم لان الرکوع ھو الانحناء عن القیام والسجود ھو وضع الجبھۃ علی الارض والخاص لا یحتمل البیان حتی یقال ان الحدیث لحق بیانا للنص المطلق فلا یکون الانسخا وھو لایجوز بخبرا لواحد فینبغی ان تراعی منزلۃ کل من الکتاب والسنۃ فما ثبت بالکتاب یکون فرضا لانہ قطعی وما ثبت بالسنۃ یکون واجبا لانہ ظنی۔ (نورالانوار ص ۱۵، ۱۶)

اس کا بیان اس طرح ہے کہ (امام) شافعی کہتے ہیں کہ رکوع و سجود میں تعدیل ارکان فرض ہے اس اعرابی والی حدیث کی رو سے جس نے نماز ہلکی کر کے پڑھی تھی تو آنحضرتؐ نے اسے فرمایا تھا کہ اٹھ اور نماز پھر پڑھ کیونکہ تو نے نماز ادا نہیں کی۔ آنحضرت ﷺ نے اس کو تین دفعہ اسی طرح فرمایا تھا۔ اور ہم (حنفی) کہتے ہیں کہ خداتعالیٰ کا امر ارکعو اور اسجدو اخاص ہے جو معلوم معنی کے لئے وضع کیا گیا ہے کیونکہ رکوع قیام سے ٹیڑھا ہونے کو اور سجود

---

[1] مصنف علام نے اس حوالہ میں وار کعوا میں ولو سہوا لکھ دی ہے اور ایسا ہی اس نے بھی جس نے ان کی اقتدا کی کیونکہ قرآن شریف میں اس موقع پر واو نہیں ہے (سورہ حج رکوع اخیر)۔

پیشانی زمین پر رکھنے کو کہتے ہیں اور (لفظ) خاص محتمل بیان نہیں ہوتا جو کہا جائے کہ نص (آیت) مطلق ہے اور حدیث مذکور اس کے بیان کے لئے ہے (اگر ایسا کیا جائے) تو سوائے نسخ (حکم قرآن) کے اور کیا ہوگا اور یہ بات[1] خبر واحد سے جائز نہیں۔ پس مناسب ہے کہ قرآن و سنت میں سے ہر ایک کے مرتبے کی رعایت رکھی جائے پس جو قرآن سے ثابت ہوا وہ فرض ہے کیونکہ قطعی ہے اور جو کچھ سنت سے ثابت ہوا وہ واجب ہے کیونکہ سنت ظنی ہے۔

یہ عبارت ہمارے مقصود کے اثبات میں ایسی عیاں ہے کہ محتاج بیان نہیں۔ مصنف مرحوم نے حضرت امام شافعیؒ کا مذہب نقل کیا کہ وہ تعدیل ارکان کو بھی فرض جانتے ہیں اور ان کی دلیل وہی حدیث مسئ[2] بیان کی۔ پھر اپنا مذہب ذکر کیا کہ ہم تعدیل ارکان کو فرض نہیں بلکہ واجب جانتے ہیں اور دلیل میں کوئی آیت نہیں۔ حدیث نہیں بلکہ اپنا ایک قاعدہ بیان کیا کہ چونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم ارکعوا اور اسجدوا۔ معلوم المعنیٰ ہے اور جو لفظ معلوم المعنیٰ ہو وہ محتمل بیان نہیں ہوتا۔ اس لئے امر خداوندی مفہوم لغوی کی حد تک محدود رہے گا اور آنحضرت ﷺ نے جو کچھ فرمایا وہ اس کے درجے کا یعنی فرض نہیں ہوگا۔ بلکہ اس سے کم رتبے کا یعنی واجب ہوگا اور حدیث کے مقابلے میں یہ عذر کر دیا کہ اول تو آیت مطلق نہیں ہے کہ اس کے بیان کی ضرورت ہو دیگر یہ کہ حدیث بجز واحد ہے جو ظنی الثبوت ہے۔ اور اس سے قرآن کا حکم منسوخ نہیں ہو سکتا گویا اس کے یہ معنی ہیں کہ رکوع و سجود کے متعلق جو کچھ آنحضرت نے بحیثیت شارع وامین وحی ہونے کے فرمایا وہ امر الٰہی کا بیان نہیں ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ امام شافعیؒ اور ان کے موافق دیگر محدثین حدیث مسئ اور دیگر احادیث کے نقشے کو زیر نظر رکھ کر اور آنحضرت ﷺ کے بار بار لم تصل

---

[1] یعنی نسخ الکتاب بالسنتہ۔

[2] یعنی ایسے شخص کے ذکر والی حدیث جس نے ایسے برے طریق سے پڑھی تھی کہ آنحضرت ﷺ نے اسے نماز لوٹانے کو فرمایا تھا۔ جس کا ذکر صحیح بخاری کے حوالے سے اوپر گذر چکا ہے۔

(تو نے نماز نہیں پڑھی) فرمانے کو ملحوظ رکھ کر کہتے ہیں کہ چونکہ آنحضرت ﷺ نے اس شخص کو بار بار فرمایا انك لم تصل یعنی تو نے نماز نہیں پڑھی تو اس کے یہی معنی ہیں کہ وہ نماز جس کا حکم خدا نے اس میری معرفت فرمایا ادا نہیں ہوئی۔ اس لئے تم پھر پڑھو اور میرے ہدایت کردہ طریق کے مطابق پڑھو تاکہ صحیح طور پر ادا ہو اور شمار میں آسکے۔ اگر ان امور کی رعایت جو وہ ترک کرتا تھا۔ شرعاً فرض نہ ہوتی فرض سے کم درجہ کی یعنی واجب ہوتی تو آنحضرت ﷺ اسے بار بار پڑھنے کا حکم نہ کرتے بلکہ جبر نقصان اور اس کے تدارک کی صورت یعنی سجدہ سہو کا حکم فرماتے جیسا کہ حضرات حنفیہ کا مذہب ہے۔

نہ تو یہ تھا کہ وہ شخص رکوع و سجود ترک کر دیتا تھا اور نہ یہ تھا کہ ان کی لغوی معنی کی حد (انحناء اور پیشانی زمین پر رکھنا) کو پورا نہ کرتا تھا۔ بلکہ تھا تو یہ تھا کہ وہ تعدیل ارکان نہیں کرتا تھا اسی لئے آپ نے اسے ہر ایسے رکن کی نسبت فرمایا حتی تطمئن راکعا حتی تطمئن قائما -- حتی تطمئن ساجد احتی تطمئن جالسا (صحیح بخاری)

لہٰذا تعدیل ارکان کا حکم ویسا ہی فرض ہے جیسا خود رکوع اور سجدہ اور قومہ اور جلسہ کا یا یوں کہئے کہ خدا نے نماز میں جس رکوع و سجدے کا حکم کیا ہے۔ اس کی عملی صورت یہ ہے کہ تعدیل و اطمینان سے کیا جائے۔ لیکن حضرات احناف اس حدیث کو مع اس جملہ خصوصیات کے خاطر میں نہ لا کر اپنے قاعدہ الخاص لا یحتمل البیان سے ایک تل برابر بھی نہیں ہٹ سکے۔ اور مراد خدا اور مراد رسول میں فرق جانا حالانکہ آنحضرت ﷺ مبین و شارح قرآن ہیں جس کے یہ معنی ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں اپنے بندوں سے جو کچھ فرمایا ان سے کہا کہ وہ ایسا کریں آنحضرت ﷺ اس مراد خداوندی کے بیان کرنے والے ہیں چاہے آپ اپنی زبان مبارک سے فرمادیں اور چاہے اپنے طریق عمل سے بتلا اور سمجھادیں چنانچہ خدا تعالیٰ نے فرمایا۔

وانزلنا الیك الذکر لتبین للناس مانزل الیهم (نحل پ ۱۴ آیت ۴۴)

(اے پیغمبر!) ہم نے یہ ذکر (نصیحت نامہ یعنی قرآن) آپ کی طرف اس

لئے اتارا ہے کہ آپ لوگوں کے (علم و عمل کے) لئے وہ احکام جو ان کی طرف اتارے گئے ہیں نہایت صفائی سے کھول کر بیان کر دیں۔

جب آنحضرت ﷺ کا منصب تبیین قرآن ہے تو خدا اور رسول کے فرمودہ میں فرق کرنا کیسے جائز ہوا؟ یا للہ العجب

اس وقت ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ محدثین جو کچھ کہتے ہیں نصوص قرآنیہ اور آثار نبویہ کی متابعت میں کہتے ہیں۔ پہلے قواعد بنا کر پھر نصوص کو ان کے پیچھے نہیں لگاتے۔ لیکن دوسری طرف پہلے قواعد بنائے جاتے ہیں اور پھر نصوص کو ان کے سانچے میں ڈھالا جاتا ہے اور جزئیات کو ان پر متفرع کیا جاتا ہے تاکہ ان اصول و عقائد اور ان جزئیات کا سلسلہ ورابطہ منقطع نہ ہو جائے۔ آثار نبویہؐ کی رعایت رہے یا نہ رہے۔ وھل ھذا الاعکس الموضوع۔

ہم نے محدثین کرام اور حضرات احناف کے طریق اجتہاد اور طرز استدلال میں جو یہ فرق بتایا ہے حضرت شاہ ولی اللہ (علیہ رحمتہ اللہ) اس کی نسبت فرماتے ہیں۔

باید دانست کہ سلف در استنباط مسائل و فتاوی بر دو وجہ بودند اول آنکہ قرآن و حدیث و آثار صحابہ جمع میکردند و از نجا استنباط می نمودند و ایں طریقہ اصل راہ محدثین است و دیگر آنکہ قواعد کلیہ کہ جمعے از ائمہ تنقیح و تہذیب آن کردہ اندیاد گیرند ـ بے ملاحظہ ماخذ آنہا ـ پس ہر مسئلہ کہ واردمی شد جواب آن از ہماں قواعد طلب می کردندو ایں طریقہ اصل راہ فقہاست[1]

اسی طرح حضرت شاہ صاحب حجتہ اللہ میں اہل رائے کے مصداق کی نسبت فرماتے ہیں۔

بل المراد من اهل الرائ قوم توجهوا بعد المسائل المجمع عليها

---

[1] مصفی شرح فارسی موطا جلد اول ص ۴۔

بین المسلمین اوبین جمهور هم الی التخریج علی اصل رجل من المتقدمین فکان اکثر امرهم حمل النظیر علی النظیر والرد الی اصل من الاصول دون تتبع الاحادیث والاثار[1]

بلکہ اہل رائے سے وہ قوم مراد ہے جو ان مسائل کے بعد جو مسلمانوں میں بالاتفاق یا ان میں اکثر کے نزدیک مسلم ہیں۔ متقدمین میں سے کسی شخص کے (مقرر کردہ) اصول پر تخریج مسائل کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کا کام احادیث و آثار کی پڑتال کے بغیر زیادہ تر نظیر کو نظیر پر قیاس کرنا اور اصول میں کسی قاعدے کی طرف لوٹانا ہی رہا۔

حضرت شاہ صاحبؒ سے پیشتر علامہ شہرستانی جو امام ابو حنیفہؒ کے بڑے حامی ہیں الملل والنحل میں حضرات احناف کے اہل رائے سے ملقب ہونے کی وجہ میں فرماتے ہیں۔

وانما سمّوا اصحاب الرأی لان عنایتهم بتحصل وجه من القیاس والمعنی المستنبط من الاحکام وبناء الحوادث علیها وربما یقدمون القیاس الجلی علی احاد الاخبار وقد قال ابو حنیفةؒ علمنا هذا رای وهو احسن ما قدرنا علیه فمن قدر علی غیر ذلك فله مارٰای ولنا ما رایناه[2]

ان کا نام اصحاب رای اس لئے ہوا کہ ان کی توجہ کسی قیاسی وجہ اور احکام میں کسی اجتہادی معنی کو حاصل کرنے اور پھر ان پر حوادث کو قیاس کرنے کی طرف ہے اور کبھی تو یہ بھی کرتے ہیں کہ قیاس جلی کو احادیث احاد پر مقدم کر دیتے ہیں حالانکہ خود امام ابو حنیفہؒ کا قول ہے کہ ہمارا یہ علم (فقہ) رائے ہے اور یہ وہ بہتر سے بہتر (صورت) ہے جس پر ہم قادر ہو سکے۔ اور جو اس

---

[1] حجۃ اللہ مصری جلد اول ص ۱۶۰ فصل بعد باب حکایۃ حال الناس الخ۔
[2] شہرستانی علی ہامش کتاب الفصل جلد ۲ ص ۴۶۔

کے سوا پر قادر ہو سکے اس کے لئے وہی جائز ہے اس کے لئے وہ جو اس نے سمجھا اور ہمارے لئے وہ جو ہم نے سمجھا۔

ان حوالجات کو ملحوظ رکھ کر ایک نظر صحیح بخاری پر رکھیں اور دوسری حسامی' نور الانوار اور اصول بزدوی پر' اور دیکھیں کہ ان دونوں گروہوں کے طرز استدلال اور طریق استنباط میں کتنا فرق ہے کس نے استنباط کے وقت کتاب و سنت کو پیشوا بنایا ہے اور کس کے طریق اجتہاد سے یہ لازم آتا ہے کہ اگر بالفرض جزئیات حدیثیہ یا نصوص نبویہؐ موجود نہ بھی ہوتیں تو بھی ان کو استخراج مسائل میں کوئی مشکل پیش نہیں آسکتی تھی۔ یعنی نصوص نبویہ کی رعایت و حفاظت ان کے نزدیک ضروری نہیں۔ اسی لئے ان کے اصحاب تخریجات میں سے اکثر بزرگ ایسے بھی گذرے ہیں جو علم حدیث میں مہارت نہ رکھتے تھے۔[۱]

امام بخاریؒ اور صحیح بخاری کی تصنیف :

صحیح بخاری جو صحت روایات کے علاوہ جزئیات کی کثرت اور براہ راست سنت چاہا مطہرہ اور احادیث معتبرہ سے استنباط کرنے اور صحت و سہولت استخراج و دقت اجتہاد میں جملہ کتب مولفہ پر فوقیت رکھتی ہے حضرت شاہ صاحب اس کی خصوصیات میں فرماتے ہیں کہ اہل حدیث نے پہلے پہل جو علم حدیث کی تدوین شروع کی تو اسے چار فنون میں مدون کیا۔ سنن میں جن کو فقہ بھی کہتے ہیں مثل موطا امام مالک اور جامع سفیان کے اور فن تفسیر میں مثل کتاب ابن جریج کے اور فن سیرت میں مثل محمد بن اسحٰق کی کتاب کے اور فن زہد و رقاق میں مثل کتاب ابن مبارک کے۔ پس امام بخاری

---

[۱] اس کے لئے حجۃ اللہ کے باب الفرق بین اہل حدیث و اصحاب الرای میں سے آخری صفحہ و ذلك انه لم يكن عندهم من الاحاديث سے اخیر تک پڑھنا چاہیے۔ نیز مولوی عبدالحئؒ صاحب لکھنوی نے بھی عمدۃ الرعایہ میں اس کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں ومن الفقهاء من ليس لهم حظ الاضبط المسائل الفقهيه من دون المهارة فى الروايات الحديثية (ص ۱۳ ج ۱) نیز حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے فتاوی میں مجتہدین فی المذہب کی علمی قابلیتوں کے متعلق یہی فرق بتلایا ہے۔

اللهم اغفر لكاتبه ولمصنفه ولمن سعى فيه ولو الديهم اجمعين – آمين

نے کہ ان ہر چہار فنون کو ایک ہی کتاب میں جمع کر دیں- پھر یہ کہ صرف وہی حدیثیں لکھیں جن کی بابت امام بخاری کے وقت اور اس سے قبل کے علمائے (حدیث) نے صحت کا حکم لگایا تھا- نیز صرف مرفوع اور مسند احادیث لکھیں- اور جو کچھ اس میں جنس آثار (موقوفہ) وغیرہ سے ہے وہ تبعاً ہے نہ اصالتہً اور اسی لئے (امام ممدوح نے) اپنی (اس) کتاب کا نام الجامع الصحیح المسند رکھا یعنی سب فنون کو جمع کرنے والی صحیح اور مرفوع روایتوں کے بیان کرنے والی کتاب-

اس کے بعد فرماتے ہیں-

واراد ایضا ان یفرغ جھدہ فی الاستنباط من حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ویستنبط من کل حدیث مسائل کثیرۃ جدا وھذا امر لم یسبقہ احد الیہ غیرہ غیرانہ استحسن ان یفرق الاحادیث فی الابواب ویودع فی تراجم الابواب سرا لاستنباط-[1]

نیز امام بخاری نے یہ چاہا کہ اپنا سارا زور رسول اللہ ﷺ کی حدیث سے استنباط کرنے میں لگا دیں اور ہر حدیث سے نہایت کثرت سے احکام مستنبط کریں اور یہ ایسی بات ہے کہ امام بخاری سے پہلے کسی اور نے نہیں کی- لیکن امام ممدوح نے یہ مناسب جانا کہ ان احادیث کو مختلف ابواب (کے ذیل میں) متفرق طور پر ذکر کریں- اور استنباط کے نکات اور رموز تراجم ابواب میں رکھیں[2] (تاکہ ہر ایک حدیث سے بہت سے مسائل مستنبط ہونے کے الگ الگ عنوان قائم ہو جائیں)-

دوسری مثال آنحضرتؐ کا طریق بیان اور طرز عمل :-

(۲) محدثین قواعد زبان عرب اور آنحضرت ﷺ کے بیان و طریق عمل کے علاوہ آپ کے طریق سخن، طرز بیان اور طریق عمل کا لحاظ بھی ضروری جانتے ہیں کیونکہ متکلم کی

[1] شرح تراجم ابواب بخاری مصنفہ شاہ صاحب ص ۲، ۳-

[2] وللہ در ھذا الامام الھمام ما ادق فیھم-

مراد کے صحیح طور پر سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی روز مرہ کی عادت گفتگو بلکہ سنت فعلی اور طریق عمل کا بھی لحاظ رکھا جائے۔ مثلاً کسی امر کے لازم اور ضروری ہونے کے لئے آنحضرت ﷺ کے کلام پاک میں کہیں تو یہ پایا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ فلاں کام بغیر فلاں کام کے لئے نہیں ہے مثلاً آپ نے فرمایا۔

لا صلوة لمن لم یقرا ء بفاتحة الکتاب (صحیح بخاری)

اس شخص کی نماز نہیں ہوتی جو (اس میں) سورت فاتحہ نہیں پڑھتا۔

کہ اس میں سورہ فاتحہ کی حیثیت نماز میں ایسی قرار دی ہے کہ اس کے بغیر نماز ہوتی ہی نہیں[1] اور کہیں اس طرح پایا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا۔

لا تجزی صلوة لا یقیم الرجل فیھا صلبه فی رکوعه و سجوده (دارقطنی)

"کہ وہ نماز کفایت نہیں کرتی جس میں آدمی رکوع و سجود میں اپنی پشت سیدھی نہ کرے۔"

کہ اس میں رکوع و سجود کے علاوہ ان میں اطمینان و اعتدال کو ایسا ضروری گردانا ہے کہ بغیر ان کے آدمی نماز سے عہدہ برآہی شمار نہیں ہوتا۔

اور کبھی یوں پایا گیا کہ آپ نے فرمایا۔

من قام رمضان ایمانا و احتسابا غفر له ماتقدم من ذنبه (مشکوٰة)

جس شخص نے ایمان اور نیت ثواب سے رمضان میں قیام کیا یعنی نماز تراویح پڑھی اس کے سابقہ گناہ سب بخشے گئے۔

کہ اس میں نماز کو قیام سے تعبیر کیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ حالت قیام نماز میں ایک ایسا امر ہے جس پر نماز کا نام ہے تو یہ ایک ضروری رکن ہے۔

اور کسی جگہ اس طرح فرمایا۔

تحریمھا التکبیر و تحلیلھا التسلیم (ترمذی)

---

[1] نیز حضرت شاہ صاحب "مصفی" میں فرماتے ہیں اما تتبع نصوص و اشارات شرع پس مثال آں لا صلوة لمن لم یقرء بفاتحة الکتاب۔ الخ (ص ۲۰ جلد اول)

نماز میں اللہ اکبر کہہ کر داخل ہوں اور سلام سے خارج ہوں۔

کہ اس میں تکبیر تحریمہ نماز میں داخل ہونے کے لئے اور سلام یعنی السلام علیکم ورحمتہ اللہ کہنا نماز سے فارغ ہونے کے لئے ضروری ہے۔

ان امور مذکورہ بالا یعنی قرات سورہ فاتحہ۔اطمینان واعتدال، قیام، تکبیر تحریمہ اور سلام کے متعلق یہ تو آپ کے اقوال ہیں جو مختلف عنوانوں سے بیان کیے گئے ہیں اور ادھر آپ کے افعال میں ایسا کبھی نہیں پایا گیا کہ ان امور میں سے کوئی امر بھی آپ نے اختیاراً و عمداً ترک کیا ہو۔لہٰذا محدثین کے نزدیک یہ سب امور نماز کے ارکان ہیں اور اس کی شرعی ماہیت میں داخل ہیں کہ ان میں سے کوئی بھی ترک کردیا جائے تو نماز صحیح نہیں ہو گی۔ لیکن فقہائے حنفیہ کے نزدیک ان میں سے قرات سورہ فاتحہ اور تعدیل ارکان اور خاتمہ پر سلام فرض نہیں ہیں۔حالانکہ ان سب امور میں آنحضرت ﷺ کے اقوال وافعال ایک ہی حیثیت سے پائے گئے ہیں پس ان میں سے بعض کو فرض اور بعض کو واجب اور بعض کو سنت قرار دے کر فرق کرنا درست نہیں[1] اور اپنے اصول مستخرجہ اور قواعد مقررہ کی بنا پر احادیث رسول اللہ ﷺ میں اچا پچیاں نکالنا متبعین سنت کی علامت نہیں ہے[2]

تیسری مثال:۔

یہ ہے کہ اصول شاشی میں ہے۔

[1] صاحب ہدایہ وغیرہ نے جو دلائل ووجوہات پیش کئے ہیں ان کو ضعیف ورکیک جان کر نظر انداز کیا گیا ہے اور قابل جواب نہیں سمجھا گیا فافہم۔

[2] حافظ ابن قیمؒ نے اعلام الموقعین میں ایک طویل فہرست ان احادیث کی دی ہے جو قائلین قیاس نے بوجہ مخالفت قیاس ترک کردی ہیں اور پھر کہا ہے کہ اسی طرح اور بھی بہت سی احادیث ہیں جن کو قائلین قیاس نے چھوڑ دیا ہے۔حالانکہ وہ سب صحیح ہیں اور قیاس کے خلاف بھی نہیں ہیں۔ بلکہ ان کی اپنی سمجھ کی غلطی ہے کہ ان کی سمجھ پیغمبر صادقؑ کے بیان کے مطابق نہیں اتری وکم من عائب قولا صحیحا وافتہ من الفہم السقیم چنانچہ یہ امر آئندہ بیان کردہ مثالوں سے بخوبی واضح ہو جائے گا۔

وكذلك قوله تعالى حتى تنكح زوجا غيره خاص في وجود النكاح من المراة فلا يترك العمل به لماروى عن النبي عليه السلام انه قالا ايما امراة نكحت نفسها بغير اذن وليها فنكاحها باطل باطل باطل (اصول شاشي بحث الخاص)

یعنی اسی طرح خداتعالی کا قول حتی تنکح زوجا غیرہ (صرف) عورت کے ایجاب سے نکاح کے منعقد ہو جانے میں خاص ہے۔ پس اس پر عمل کرنا اس روایت کے روسے جو نبی ﷺ سے مروی ہے کہ جو عورت ولی کی اجازت کے بغیر اپنا نکاح کرے گی تو اس کا نکاح باطل ہو گا' باطل ہو گا' باطل ہو گا' ترک نہیں کیا جائے گا۔

یہ عبارت اپنا مطلب بیان کرنے میں صاف ہے کہ جب قرآن شریف سے سمجھا جاتا ہے کہ صرف عورت کے ایجاب سے نکاح منعقد ہو سکتا ہے تو اگرچہ حدیث میں ایسے نکاح کو باتاکید شدید باطل کہا گیا ہے پھر بھی اس کی پرواہ نہیں ہے۔ کیونکہ لفظ تنکح مونث کا صیغہ ہے اور اس میں فعل نکاح کی نسبت عورت کی طرف کی گئی ہے۔ اس لئے بالغہ عورت اپنا نکاح خود بخود بغیر ولی کی اجازت کے بھی کر سکتی ہے اور حدیث میں جو مذکور ہے کہ ایسا نکاح باطل ہے اس کا اعتبار نہیں کیونکہ اگر اس کا اعتبار کیا جائے تو آیت قرآنی ترک ہو جاتی ہے کیونکہ فعل نکاح اپنے معنی میں خاص یعنی معلوم المعنی ہے۔ جو محتاج بیان نہیں۔ پس حدیث مذکور کو ترک کر دیا جائے گا اور قرآن مجید کی آیت کو پکڑ لیا جائے گا۔ چنانچہ فصول الحواشی شرح اصول الشاشی میں اسی عبارت بالا کی شرح میں لکھا ہے۔

ونحن تركنا الخبر الواحد بمقابلة الخاص من الكتاب

(فصول ص ٢٦)

"اور ہم نے (حنفیہ نے) اس حدیث کو جو خبر واحد ہے ترک کر دیا ہے بمقابلہ قرآن مجید کے خاص کے"

تنبیہ :-

ظاہر میں تو سمجھا جائے گا کہ قرآن مجید کی عظمت کو قائم رکھنے کے لئے ہر چیز کو جو کسی نہج سے بھی معارض قرآن ہو ترک کر دیا جاتا ہے لیکن حقیقت میں اپنے مقرر کردہ قاعدہ (خاص) کے مقابلہ میں حدیث نبوی (ﷺ) سے انکار کرنے کا ایک مہذب حیلہ ہے۔

اللہ اللہ کس قدر جرات ہے جس امر کو آنحضرت ﷺ تین دفعہ بتاکید فرماویں اسے معارض قرآن کہہ کر ٹالدیا جائے پھر اس کے معنی تو یہ ہیں کہ آنحضرت ﷺ باوجود افصح العرب ہونے کے نہ تو اپنی زبان جانتے تھے اور نہ باوجود رسول اللہ اور معلم شریعت ہونے کے قرآن سمجھتے تھے۔ زبان عربی کے ماہر ہوئے تو عجمی اور قرآن کے عالم ہوئے تو امتی۔ استغفر اللہ ثم استغفر اللہ

اگر یہ عذر کر دیا جاتا کہ یہ حدیث صحیح نہیں یا یہ کہہ دیا جاتا کہ آنحضرت ﷺ کی مراد ابطال سے ابطال حقیقی نہیں تو اتنا مضائقہ نہ تھا صرف علمی تحقیقات کا اختلاف رہتا۔ لیکن ناظرین آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور ہے۔ والعیاذ باللہ۔

جواب اچھا جناب والا! اگر آیت میں نکاح کی نسبت عورت کی طرف کرنے سے ولی کی شرطیت اس سے زائد ہو کر قابل رد ہے تو آیت میں بالغہ نابالغہ کا بھی تو فرق نہیں ہے اور مرد کی قبولیت کا بھی ذکر نہیں ہے اور حضور شاہدین (دو گواہوں) کا بھی ذکر نہیں ہے۔ پس جس طرح عورت بغیر ولی کی اجازت کے استقلالاً اپنے اختیار سے نکاح کر سکتی ہے اسی طرح اس کا نکاح بغیر شہادت شاہدین کے بھی درست سمجھا جانا چاہئے اور مرد کی قبولیت کے بغیر بھی نکاح منعقد ہو جانا چاہئے۔ حالانکہ یہ سب صورتیں آپ کے نزدیک نادرست ہیں نہ تو آپ صغیرہ کو بغیر ولی کی اجازت کے اختیار نکاح دیتے ہیں اور نہ مرد کی قبولیت کے بغیر آپ نکاح جائز جانتے ہیں اور نہ شاہدین کے بغیر آپ کوئی نکاح درست جانتے ہیں چنانچہ ہدایہ متن ہدایہ میں ہے۔

ولا ینعقد نکاح المسلمین الا بحضور شاهدین (هدایہ جلد ۲ کتاب النکاح)

''اور مسلمانوں کا نکاح (کم از کم) دو گواہوں کی حاضری کے بغیر منعقد نہیں ہوتا۔''

اور اس کی شرح میں ہدایہ میں کہا ہے۔

اعلم ان الشهادة شرط فی باب النکاح لقوله علیه السلام لانکاح الا بشهود (هدایه جلد دوم ص۲۸٦)

معلوم ہوا کہ معاملہ نکاح میں شہادت شرط ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نکاح درست نہیں ہوتا مگر گواہوں سے۔

اس مقام پر کم از کم دو گواہوں کی حاضری شرط رکھی ہے اور اس کے ثبوت میں ایک حدیث بیان کی ہے۔ لیکن اس کی تخریج حسب عادت ذکر نہیں کی یعنی یہ نہیں بتایا کہ اس حدیث کو کس امام حدیث نے روایت کیا۔ خیر صاحب ہدایہ نے تو نہیں بتایا لیکن خاتمہ الحفاظ عسقلانیؒ ''تخریج ہدایہ میں اس کی بابت فرماتے ہیں۔

لم اره بهذا اللفظ یعنی میں نے اس حدیث کو ان الفاظ کے ساتھ کہیں نہیں دیکھا۔

سبحان اللہ! ایسی حدیث سے استناد کرنا جو حفاظ محدثین کے دیکھنے میں بھی نہ آئی ہو اور ایسی حدیث سے انکار کر دینا جسے امام احمدؒ، امام ابو داؤدؒ، امام ترمذیؒ، امام ابن ماجہؒ وغیرھم بڑے بڑے ائمہ حدیث نے روایت کیا ہو اور امام ترمذی نے اسے حسن کہا ہو۔ حدیث نبوی کو بالاستقلال دلیل شرعی جاننے والے کے نزدیک نہایت تعجب خیز ہے۔

اصل بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ چونکہ بالغہ عورت کے نکاح میں ولی کی اجازت اپنے امام کے نزدیک ضروری نہیں اس لئے وہ قابل تسلیم نہیں۔ اگرچہ حدیث میں صاف مذکور ہے اور چونکہ حضور شاہدین اپنے امام کے نزدیک ضروری ہے۔ اس لئے اسے شرط قرار دیا گیا۔ اگرچہ وہ حدیث جس سے استناد کیا گیا ہے بے اصل محض ہے۔

اس کے بعد ہم یہ بھی ذکر کر دینا مناسب جانتے ہیں کہ امام زیلعی حنفیؒ نے بھی تخریج ہدایہ میں اس حدیث شہود کی تخریج میں نہیں بتایا کہ کس امام حدیث نے روایت

کیا-بلکہ صرف اسی قدر کہہ کر اس کا بے اصل ہونا ظاہر کر دیا غریب بھذا للفظ اور اس کے بعد کے مضمون کو دیگر احادیث سے ثابت کیا ہے-چنانچہ وہ عبارت یوں ہے-

وفی الباب احادیث منھا ما اخرجه ابن حبان فی صحیحه عن سعید بن یحیی بن سعید الاموی ثنا حفص بن غیاث عن ابن جریج عن سلیمان بن موسی عن الزھری عن عروة عن عائشة قالت قال رسول الله لا نکاح الا بولی و شاھدی عدل وما کان من نکاح علی غیر ذلك فھو باطل فان تشاجروا فالسلطان ولی من لاولی له انتھی[1]

"اس کی بابت کئی ایک (دیگر) احادیث (بھی) ہیں جن میں سے ایک یہ (بھی) ہے جسے ابن حبان نے اپنی صحیح میں سعید بن یحییٰ اموی سے روایت کیا-اس نے کہا ہم سے حفص بن غیاث نے حدیث بیان کی-اس نے ابن جریج سے اس نے سلیمان بن موسیٰ سے اس نے امام زہری سے اس نے عروہ سے اس نے حضرت عائشہؓ سے-حضرت عائشہؓ نے کہا کہ رسول اللہ (ﷺ) نے فرمایا کہ نکاح نہیں ہوتا مگر ولی اور دو عادل گواہوں سے اور جو نکاح اس کے سوا ہو وہ باطل ہے اور اگر اولیاء آپس میں اختلاف کریں تو سلطان اسلام ہر اس شخص کا ولی ہے جس کا کوئی ولی نہیں-"

اس کے بعد امام ابن حبان کا قول اس کے بعض راویوں کی نسبت ذکر کر کے اخیر میں بطور فیصلہ امام ابن حبان ہی سے نقل کیا ہے-

ولا یصح فی ذکر الشاھدین غیر ھذا الخبر (انتھی کلامه ص ۲)

اس حدیث کے سوا دیگر کوئی حدیث (نکاح کے) دو گواہوں کے ذکر میں صحیح ثابت نہیں ہے-

ہم اس مقام پر اس حدیث سے صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے اور

---

[1] نصب الرایہ للامام الزیلعی جلد دوم ص ۲-

جس طرح اس میں حضور شاہدین کا ذکر ہے اسی طرح ولی کی ضرورت بھی مذکور ہے۔ پس ایک امر کو لے لینا اور دوسرے کو چھوڑ دینا۔ ایں چہ ؟

طرفہ یہ کہ بقول امام ابن ہمامؒ کے حضور شاہدین کے بارے میں اس کے سوا دیگر کوئی حدیث صحیح نہیں۔ لیکن اشتراط والی حدیث مذکور الفوق کا مضمون دیگر احادیث سے بھی ثابت ہے۔ تلك اذا قسمة ضيزى۔

اس کے بعد ہم اس عقدہ کو کھولتے ہیں جو صاحب اصول شاشی نے حدیث[1] زیر بحث کی نسبت فرمایا کہ یہ خبر واحد ہے سو معلوم ہو کہ یہ خبر واحد نہیں کیونکہ اشتراط ولی کے مضمون کو کوئی تیس صحابہ نے آنحضرت ﷺ سے روایت کیا ہے۔

چنانچہ "الروضۃ الندیہ" شرح "الدرر البہیہ" میں شیخ شخنا حضرت نواب صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کے ضمن میں فرماتے ہیں۔

قال الحاكم قد صحت الرواية فيه عن ازواج النبى صلى الله عليه وسلم عائشة وام سلمة و زينب بنت جحش ثم سرد تمام ثلثين صحابيا (روضہ مطبوعہ مصر ص ۱۸۶)

"امام حاکم نے کہا کہ اس امر میں آنحضرت ﷺ کی ازواج مطہرات حضرت عائشہ وام سلمہ و زینب بن جحش کی روایات صحیح ثابت ہو چکی ہیں (امام حاکم نے) تیس اصحابوں کے نام بہ ترتیب ذکر کیے ہیں۔"

یہ تو صحابہ کی تعداد ہے اور ان کے بعد تو ہر زمانہ میں اس کے راوی زیادہ ہی زیادہ ہوتے گئے۔ اگر ہم ان سب کا نقشہ بنا کر بتائیں تو مضمون بہت طویل ہو جائے۔

دیگر یہ کہ آنحضرت ﷺ سے لے کر مابعد کے زمانوں تک مسلمانوں کا تعامل اس کثرت کے ساتھ ملایا جائے تو مسئلہ اشتراط ولی متواترات شرعیہ میں شمار ہو سکتا ہے۔ اور بالخصوص فقہاء حنفیہ کے نزدیک بھی کم از کم اسے مشہور تو ضرور مانا جا سکتا ہے۔ پس اس سے قرآن مجید پر زیادت بالاتفاق جائز ہو سکتی ہے۔ کیونکہ مشہور حدیث

[1] یعنی ایما امرأة نکحت بغیر اذن ولیها فنکاحها باطل۔

سے کتاب اللہ کی □ اور اس پر زیادت حضرات حنفیہ کے نزدیک بھی مسلم ہے۔ دیگر یہ کہ اصول شاشی میں بحث خاص ہی میں اس مسئلہ زیر بحث میں چند سطور پیشتر مذکور ہے۔

فان امکن الجمع بینهما بدون تغیر فی حکم الخاص یعمل بهما[1]

"پس اگر خاص کا حکم بدلنے کے بغیر ان دونوں میں جمع ممکن ہو تو دونوں پر عمل کیا جائے گا۔"

اس کے مطابق ہم کہتے ہیں کہ آیت و حدیث زیر بحث میں جمع ممکن ہے اور تنکح کے خاص ہونے میں کوئی تغیر نہیں آتا۔ پس حدیث مذکور متروک نہیں ہو سکتی۔ تفصیل اس کی یوں ہے کہ شریعت مطہرہ کے نصوص کے استقراء سے معلوم ہے کہ عقد ارکان شرعی یہ امور ہیں۔ (۱) عورت کی طرف سے ایجاب (۲) اس کے ولی کی اجازت (۳) مرد کی طرف سے قبول (۴) کم از کم دو گواہ (۵) اور کسی قدر مہر بھی۔

صغیرہ اور کنیز کے لئے تو بالاتفاق ولی و مولیٰ کی ضرورت ہے۔ اختلاف صرف بالغہ کی نسبت ہے کہ اس کے لئے ولی کی اجازت ضروری ہے یا نہیں۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ضروری نہیں اور امام مالکؒ اور امام شافعیؒ و امام احمدؒ رحمہم اللہ اجمعین کے نزدیک اس کے لئے بھی ولی کی ضرورت ہے۔ سیدنا امام ابو حنیفہؒ کی طرف سے ایک دلیل یہ ہے کہ لفظ قرآنی تنکح میں نسبت فاعلی عورت کی طرف ہے۔ پس بالغہ عورت اپنا نکاح آپ کر سکتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم میں فعل عورت کی طرف سے اس لئے نسبت کیا گیا کہ چونکہ انعقاد و نکاح کے لئے منکوحہ بالغہ کی رضا بھی مجملہ شرائط کے ہے۔ اس لئے علم معانی کی رو سے اس کی طرف فعل کی اسناد جائز ہے۔ پس تنکح کی اسناد سے صرف اتنا ثابت ہو سکتا ہے کہ اپنے عقد نکاح میں بالغہ عورت کو بھی دخل ہے۔ اس میں حصر کی کوئی دلیل نہیں کہ امر نکاح صرف اسی کے ہاتھ میں ہے۔ کیونکہ ایسے

---

[1] اصول شاشی بحث خاص

قضیہ ایجابیہ میں صرف مذکور کا ثبوت ہوتا ہے۔ اور اس سے ماعدا کی نفی لازم نہیں آتی۔ کما تقرر فی کتب المنطق فافہم ولا نکن من القاصرین۔

اور حدیث مذکور میں یہ بتایا گیا ہے کہ عورت کی منظوری کے علاوہ ولی کی اجازت بھی ضروری ہے۔ چنانچہ عورت کی منظوری لفظ نکحت سے اور ولی کی اجازت لفظ اذن سے ظاہر ہے۔ پس جس طرح شاہدین کی حاضری مفہوم آیت سے زائد ہے جو اسی حدیث اور اس قسم کی دیگر احادیث سے ثابت ہے۔ لہذا اسے بھی تسلیم کر لینا چاہئے۔

غرض یہ کہ حدیث میں بھی قرآنی امر کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ یعنی یہ نہیں کیا گیا کہ بالغہ عورت امر نکاح میں بے اختیار محض ہے۔ جس سے مفہوم قرآنی میں تغیر آجاتا ہو۔ بلکہ مفہوم قرآنی کو ثابت رکھ کر اس سے ایک زائد امر بھی بتایا ہے۔ لہذا برعایت دیگر جمیع احادیث جن میں شرائط نکاح مذکور ہیں آیت تنکح سے یہ مراد ہو گی کہ وہ عورت برعایت ارکان شرعیہ نکاح شرعی کرے یہ نہیں کہ جس طرح چاہے کر لے۔

تنبیہ: ہاں اتنی بات ضرور ہو گی کہ ہماری تحریر کے مطابق تنکح میں نکاح سے شرعی نکاح مراد ہو گا نہ لغوی۔ اور حنفیہ اور اہل حدیث ہر دو کے نزدیک حقیقت شرعی حقیقت لغوی و عرفی پر مقدم ہوتی ہے کما تقدم و تقرر فی الاصول۔

اور شرط ولی کو اس مقام پر اس آیت میں اس لئے ذکر نہیں کیا کہ شروط بلاغت میں سے یہ بھی ہے کہ متکلم مقتضائے حال کو ملحوظ رکھے اور اس کے مطابق کلام کرے اور کسی امر کے ذکر کی ضرورت و عدم ضرورت اکثر متکلم کے ارادہ کے ماتحت ہوتی ہے پس خدا تعالیٰ حکیم کے نزدیک یہ مقام مقتضی ذکر نہیں اور اس سے تھوڑا آگے اولیاء کو صاف الفاظ میں خطاب کر کے فرمایا۔

فلا تعضلوھن ان ینکحن ازواجھن اذا تراضوا بینھم بالمعروف

(پ ۲ سورہ بقرہ)

"جب مطلقہ عورتوں کی عدت پوری ہو جائے اور وہ اپنے (طلاق دینے والے) خاوندوں سے آپس کی رضامندی سے پھر نکاح کرنا چاہیں تو تم ان کو

اس بات سے نہ روکو۔"

اس جگہ لا تعضلوھن میں فاولیاء کو خطاب ہے۔اگر اولیاء کو بالغہ کے نکاح میں کچھ حق نہ ہوتا تو ان کو لا تعضلوھن سے خطاب نہ کیا جاتا۔ بلکہ بے اختیار محض قرار دے کر ساقط الاعتبار کہہ دیا جاتا' اور ان ینکحن میں نکاح کو عورتوں کی طرف نسبت کر کے ان کا حق ایجاب سمجھا دیا ہے اور تراضوا بینھم میں عورت کا ایجاب اور مرد کا قبول بتایا ہے۔

پس جہاں مناسب جانا صرف ایک بات ذکر کی اور جہاں مناسب جانا دوسرے امر بھی ذکر کر دئے و کان اللہ علیما حکیما کیونکہ ان سب کو امر نکاح میں دخل ہے اور یہی معنی ہیں حدیث الثیب احق بنفسھا من ولیھا[1] کے کہ ثیبہ کا حق ولی کی نسبت زیادہ ہے یہ نہیں کہ ولی بے اختیار محض ہے کیونکہ احق اسم تفصیل کے بعد من وارد ہے۔اور اسم تفصیل کا ایسا استعمال مقابلہ کے لئے آتا ہے۔امام نووی اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں۔

اجاب اصحابنا عنہ بانھا احق ای شریکۃ فی الحق[2]

"ہمارے اصحاب (شوافع) نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ وہ (عورت) احق یعنی حقدار ہونے میں شریک ہے۔"

حاصل کلام یہ کہ فعل کے اسناد کے لئے اتنی بات کافی ہے کہ بالغہ عورت کی رضا بھی منجملہ شرائط نکاح کے ہے۔باقی رہا ولی کا بھی دخل سو یہ اس کے خلاف نہیں۔ہاں زائد ہے جس کا لحاظ دیگر آیات میں برابر رکھا گیا ہے۔اور حدیث میں اس کا ذکر صراحت اور صفائی سے کر دیا گیا ہے۔کیونکہ آنحضرت ﷺ مبین قرآن ہیں۔یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے پاک کلام کے ذریعہ جو کچھ چاہا۔اسے بیان کرنے والے ہیں۔چاہے اپنی زبان وحی ترجمان سے بیان کر دیں۔چاہے اپنے طریق عمل سے بتا دیں جیسا کہ فرمایا۔

---

[1] صحیح مسلم ج ا ص ۴۵۵۔

[2] جلد اول

وانزلنا الیك الذكر لتبین للناس مانزل الیهم (نحل پ ١٤)

"اے پیغمبر! ہم نے یہ نصیحت نامہ یعنی قران شریف آپ کی طرف اس لئے اتارا ہے کہ آپ لوگوں کے لئے وہ احکام جو ان کی طرف (عمل کے لئے) اتارے گئے ہیں واضح طور پر بیان کر دیں۔"

هذا والله یهدی من یشاء الی صراط مستقیم۔

چوتھی مثال: یہ ہے کہ اصول شاشی میں بحث عام میں کہا ہے۔

وكذلك قوله تعالى وامهاتكم التى ارضعنكم يقتضى بعمومه حرمة نكاح المرضعة وقد وردفى الخبر لا تحرم المصة ولا المصتان ولا الاملاجة ولا الا ملاجتان ولم يمكن التوفيق ههنا فيترك الخبر[1]

اور اسی طرح خدا تعالیٰ کا یہ قول (وامهاتكم التى ارضعنكم) اپنے عموم سے مرضعہ کے نکاح کی حرمت کی مقتضی ہے اور حدیث میں وارد ہوا ہے ایک بار یا دو بار پستان کا چوسنا یا ایک بار یا دو بار پستان بچے کے منہ میں ڈالنا (نکاح کو) حرام نہیں کرتا۔ اس مقام پر آیت اور حدیث میں موافقت ممکن نہیں پس حدیث کو چھوڑ دیا جائے گا۔ (معاذ اللہ)

یہ عبارت بھی اپنے مطلب میں صاف ہے کہ حدیث نبویؐ کو کلیتہً متروک قرار دے دیا گیا ہے بلکہ صاحب ہدایہ مرحوم نے تو اس سے بھی سخت لکھ دیا۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

وماروٰہ مردود بالكتاب او منسوخ به[2]

"امام شافعی نے جو حدیث مذکور روایت کی ہے وہ قرآن مجید سے مردود ہے یا منسوخ۔"

منسوخ کہنا تو بڑی بات نہیں۔ لیکن سنت صحیحہ ثابتہ کو مردود کہنا بہت ثقیل ہے۔ (عفا اللہ عنا وعنہ)

---

[1] اصول شاشی بحث عام ص ۶۔

[2] ہدایہ کتاب الرضاع جلد ۱ ص ۳۲۹۔

امام نووی شرح صحیح مسلم میں اسی حدیث کے ذیل میں ایک ایسے ہی اعتراض کے جواب میں لکھتے ہیں۔

(ومنها) ان بعضهم زعم انه مضطرب وهذا غلط ظاهر وجسارة علی ردالسنن بمجرد الهوی و توهین صحیحها لنصرة المذاهب وقد جاء فی اشتراط العدد احادیث کثیرة مشهورة والصواب اشتراطه[1]

"ایک ان میں سے یہ ہے کہ بعض نے یہ گمان کیا کہ یہ حدیث مضطرب ہے اور یہ بالکل صاف غلط ہے اور (اپنے اختیار کردہ) مذاہب کی نصرت کے لئے محض اپنی خواہش سے (رسول اللہ ﷺ) کی سنتوں کو رد کر دینے اور صحیح سنن کو ضعیف قرار دے دینے پر جرات ہے۔ حالانکہ عدد (رضعات) کے شرط ہونے کے متعلق بہت سی مشہور احادیث وارد ہوئی ہیں۔ اور درست یہی ہے کہ (عدد رضعات) شرط ہے۔"

اور اس سے کچھ پہلے دعوی نسخ کے متعلق فرماتے ہیں۔

(ومنها) ان بعضهم ادعی انها منسوخة وهذا باطل لا یثبت بمجرد الدعوی (ص ٤٦٨)

"ان میں سے ایک یہ ہے کہ بعض نے ان کی منسوخی کا دعوی کیا ہے اور وہ بالکل باطل ہے جو خالی دعوی سے ثابت نہیں ہو سکتا۔"

اس کے بعد ہم یہ بھی ظاہر کر دینا چاہتے ہیں کہ یہ حدیث بلا شک صحیح ہے۔ امام مسلم کے علاوہ اس حدیث کو دیگر ائمہ حدیث نے بھی روایت کیا ہے مثلاً امام ترمذی نے اپنی جامع میں حضرت عائشہؓ سے روایت کیا۔ اور پھر کہا وفی الباب عن ام الفضلؓ وابی هریرةؓ و زبیرؓ الخ اور امام دار قطنی نے اپنی سنن میں حضرت عائشہؓ اور حضرت ام الفضلؓ (حضرت عباسؓ کی بیوی) اور حضرت ابو ہریرہؓ سے اور حضرت زید بن ثابت سے

---

[1] صحیح مسلم مع نووی جلد اول ص ٤٦٨۔

اور امام ابن ماجہ نے حضرت ام الفضلؓ اور حضرت عائشہؓ سے اور امام ابوداؤد نے حضرت عائشہؓ سے اور امام نسائی نے مجتبیٰ میں حضرت ام الفضلؓ سے امام محمد نے اپنے موطا میں اس حدیث مذکورہ بالا کو تو روایت نہیں کیا۔ لیکن حضرت عائشہؓ کی دوسری روایت کو امام مالکؒ کے واسطہ سے روایت کیا ہے۔ جس میں پانچ رضعات کا ذکر ہے اور اسے دیگر محدثین نے بھی روایت کیا ہے۔ پس عدد رضعات کی حدیث کو جسے بہت سے محدثین نے کئی ایک صحابہؓ سے بہت سے سلسلہ اسناد سے روایت کیا ہو۔ مخالف قرآن قرار دے کر ٹال دینا حدیث نبوی کی سخت بیقدری ہے۔ اللھم احفظنا۔

جمع بین الایۃ والحدیث: اس کے بعد ہم اصل امر کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ آیت حرمت رضاع اور حدیث عدد رضعات میں مخالفت نہیں ہے۔ بلکہ حدیث مبین قرآن ہے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھایا کہ خدا تعالیٰ کے نزدیک محرم نکاح وہ رضاع ہے جو پانچ بار چوسا ہو۔ لیکن اگر پستان منہ میں لے کر ایک یا دو بار چوسا جائے تو خدا کے نزدیک اس کا اعتبار نہیں ہے۔

اس دلیل سے جو ہم سابقہ کئی دفعہ ذکر کر آئے ہیں کہ آنحضرت ﷺ خدا تعالیٰ کی مراد بیان کرنے والے ہیں جیسا کہ آیت وانزلنا الیك الذکر لتبین للناس مانزل الیھم (نحل' پ ۱۴) سے ظاہر ہے۔ اور وہ بیان بھی خدا تعالیٰ کا تعلیم کردہ ہے۔ جیسا کہ فرمایا ثم ان علینا بیانہ (القیامتہ پ ۲۹) یعنی پھر یہ کہ (اے پیغمبر آپ کو) قرآن کا بیان (سمجھا دینا) بھی ہمارا ذمہ ہے۔

اس آیت رضاعت سے حنفیوں کی صورت استدلال یہ ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے عدد رضاعت کا ذکر نہیں کیا بلکہ صرف رضاع پر حکم حرمت لگایا ہے۔ اس لئے قلیل و کثیر کا فرق معتبر نہیں۔ پس جو حدیث اس کے معارض ہو گی۔ اور اس میں کثیر و قلیل کا فرق بتایا ہو گا۔ وہ متروک و مردود ہو گی۔ (معاذ اللہ)

الجواب وباللہ توفیق الصواب: ہم حنفیہ کی اس وجہ استدلال میں چند نقوص و معارضات پیش کرتے ہیں۔

اول یہ کہ صاحب اصول شاشی نے جو اس آیت کو عام کہا ہے یہ درست نہیں۔ کیونکہ جب صورت استدلال کی یہ ہوئی کہ آیت میں صرف رضاع پر حکم حرمت لگایا گیا ہے اور عدد رضعات کا ذکر نہیں ہے۔ تو آیت و حدیث میں مطلق اور مقید کا مقابلہ ہوا نہ کہ عام و خاص کا۔ فافہم

یہ بات صرف ہمیں ہی نہیں کھٹکی۔ بلکہ شارح اصول شاشی صاحب فصول الحواشی کو بھی کھٹکی ہے۔ چنانچہ وہ اس عبارت مذکورہ بالا کی شرح کے بعد اخیر میں یوں تنبیہ کرتے ہیں۔

وھذا مثال نادر فتامل[1]

"یعنی یہ مثال اجنبی ہے پس تامل کر لینا چاہئے۔"

اور مفتاح الحواشی میں اس پر حاشیہ دیا ہے۔

قولہ "وھذا مثال نادر فتامل" وجہ التامل ان الارضاع فی النص مطلق فالتقیید بالکثیر یکون تقیید المطلق بالخبر الواحد لا تخصیص العام فایرادہ ھھنا غیر مستقیم ویمکن ان یجاب عنہ بانہ عام بالنظر الی المبدأ فایرادہ فی کلا الموضعین مستقیم

"وجہ تامل کی یہ ہے کہ نص (قرآنی) میں ارضاع کا جو ذکر ہے وہ مطلق ہے۔ پس اسے کثیر کے ساتھ مقید کرنا مطلق کو خبر واحد سے مقید کرنا ہے۔ عام کو خاص کرنا نہیں پس اس مثال کا اس جگہ وارد کرنا درست نہیں ہے۔ اور ممکن ہے کہ اس (اعتراض) کا یہ جواب دیا جائے کہ نص باعتبار مبداء کے عام ہے۔ پس اس کا دونوں محلوں میں وارد کرنا درست ہے۔"

اگرچہ صاحب مفتاح نے اس کے بر محل ہونے کی ایک وجہ ذکر بھی کر دی ہے۔ لیکن "یمکن" کے لفظ سے خود ہی اس کے ضعف کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے اور آگے چل کر انشاء اللہ ہم اس پر کچھ اور بھی لکھیں گے۔ بہر حال شاشی کا اسے عام قرار دینا خود حنفیہ کے نزدیک بھی تسلی بخش نہیں ہے۔

دوم یہ کہ آیت میں اگر عدد رضعات کا ذکر نہیں تو کئی ایک دیگر امور بھی مذکور نہیں ہیں۔ اور وہ حنفیہ کے نزدیک امر رضاع میں حدیث ہی سے ثابت ہو کر قابل اعتبار ہیں۔

پہلا امر یہ ہے کہ آیت میں صرف شیر مادر اور دودھ کی بہن کی حرمت کا ذکر ہے اور دودھ کی جہت سے باقی رشتوں کا حکم مذکور نہیں اور حدیث میں وارد ہے۔ یحرم من الرضاعة ما یحرم من النسب (صحیح مسلم)

پس حدیث میں قرآن سے زائد حکم ہے اور اسے حنفیہ نے تسلیم کیا ہے چنانچہ "ہدایہ" اور اس کی شرح ہدایہ میں ہے۔

> ولا بامه من الرضاعة ولا باخته من الرضاعة لقوله تعالی وامهاتكم التی ارضعنكم واخواتكم من الرضاعة ولقوله علیه السلام یحرم من الرضاع ما یحرم من النسب[۲]
>
> "اور (نکاح حلال نہیں) دودھ کی ماں اور نہ دودھ کی بہن سے قول خداوندی وامهاتكم التی ارضعنكم واخواتكم من الرضاعة کے حکم سے۔ اور رسول اللہ ﷺ کے قول یحرم من الرضاعة ما یحرم من النسب کے حکم سے۔ یعنی اس حکم سے کہ جو رشتے نسب سے حرام ہیں وہ رضاع سے بھی حرام ہیں۔"

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ صاحب ہدایہ نے ماں اور بہن کے علاوہ باقی رضاعی رشتوں کی حرمت حدیث سے لی ہے۔ ہاں وہ اس کے جواب میں کہہ سکتے ہیں کہ یہ حدیث کئی ایک صحابیوں سے مروی ہونے کے سبب مشہور ہے۔ سو ہم نے عدد رضعات والی حدیث کی نسبت بھی ثابت کر دیا ہے کہ وہ بھی کئی ایک صحابہ سے مروی ہے۔ فتساویا۔

---

[۱] فصول الحواشی ص ۳۶۔

[۲] ہدایہ جلد ۲ ص ۲۸۸ کتاب النکاح فصل بیان المحرمات۔

دوسرا امر یہ ہے کہ آیت رضاع میں یہ امر مذکور نہیں ہے کہ دودھ کتنی عمر میں پیا جائے کہ حرمت نکاح کے متعلق اس کا اعتبار کیا جائے- ہاں یہ بات حدیث میں مذکور ہے چنانچہ "ہدایہ" اور اس کی شرح ہدایہ میں ہے-

واذا مضت مدة الرضاع لم يتعلق بالرضاع تحريم لقوله عليه السلام لا رضاع بعد الفصال (ھدایہ جلد ۲ ص ۳۲۹)

"اور جب رضاع کی مدت گذر جائے- تو رضاع کے متعلق حرمت کا حکم نہیں رہتا- آنحضرت ﷺ کے اس حکم کی وجہ سے کہ دودھ چھڑانے کی عمر کے بعد رضاع کا اعتبار نہیں ہے-"

فقہائے حنفیہؒ نے اس حدیث سے آیت قرآنی پر زیادت کو بلا تردد قبول کر لیا ہے- حالانکہ محدثین کے نزدیک اس حدیث کی سند صحیح مسلم کی حدیث "لا تحرم المصة ولا المصتان" کے برابر نہیں ہے- جس کو انہوں نے قرآن پر زائد سمجھ کر متروک و مردود قرار دیا- (معاذ اللہ)

اس مقام پر ہم صاحب مفتاح کے امکانی جواب کا جواب بھی ذکر کرتے ہیں جس کا اوپر وعدہ کیا گیا تھا- کہ اگر اس آیت کو بلحاظ مبداء کے عام قرار دے کر عام اور مطلق دونوں کی مثال قرار دیتے ہیں تو اس عموم میں رضیع کبیر کی شیر مادر بھی داخل ہے- پس اس کو آیت کے حکم میں کیوں نہیں لیا- اور کیوں ایسی حدیث جو اخبار احاد میں ہونے کے علاوہ اسناد میں بھی رفعاً متفق الصحۃ نہیں ہے قرآن پر زیادت کر لی- تلك اذا قسمة ضيزى- اس تفریق کی وجہ یہ ہے کہ رضاع کبیر کا اعتبار ان کے امام نے کیا تو انہوں نے بھی کر لیا گو متفق الصحۃ حدیث سے ثابت نہیں ہے- اور عدد رضعات کا اعتبار ان کے امام نے نہ کیا تو انہوں نے بھی نہ کیا اس کی طرف التفات نہ کیا- اگرچہ وہ کئی ایک متفق الصحۃ احادیث سے ثابت ہے-

پانچویں مثال: یہ ہے کہ فقہائے حنفیہ کے اصول کا ایک قاعدہ ہے جو صحابی غیر مجتہد ہو اس کی روایت اگر من کل الوجوہ قیاس کے خلاف ہو تو وہ روایت قابل ترک

ہوتی ہے۔ چنانچہ اصول شاشی میں ہے۔

والقسم الثاني من الرواية هم المعروفون بالحفظ والعدالة دون الاجتهاد والفتوى كابي هريرة وانس بن مالك فاذا صحت رواية مثلهما عندك فان وافق الخبر القياس فلا خفاء في لزوم لعمل به وان خالفه كان العمل بالقياس اولى مثاله ماروى ابوهريرة الوضوء مما مسته النار فقال له ابن عباس ارأيت لوتوضات بماء سخين اكنت تتوضاء منه فسكت وانمارده بالقياس اذ لوكان عنده خبر لرواه وعلى هذا ترك اصحابنا رواية ابي هريرة في مسئلة المصراة و باعتبار اختلاف الرواية قلنا شرط العمل بخبر الواحد ان لا يكون مخالفا للكتاب والسنة المشهورة وان لا يكون مخالفا لظاهر قال عليه السلام تكثر لكم الاحاديث بعدى فاذا روى لكم عني حديث فاعرضوه على كتاب الله فما وافق فاقبلوه وما خالف فردوه[1]

"دوسری قسم راویوں کی جو حفظ اور عدالت (تقویٰ) میں تو معروف (و مشہور) ہیں لیکن اجتہاد اور فتویٰ میں معروف نہیں ہیں مثلاً حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت انسؓ پس جب کوئی روایت ان جیسے (اصحاب) سے تیرے نزدیک صحیح ثابت ہو جائے اگر وہ حدیث قیاس کے موافق ہو تو اس کے لازم العمل ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اور اگر (وہ حدیث) قیاس کے خلاف ہو تو قیاس پر عمل کرنا بہتر ہوگا۔ مثال اس کی وہ حدیث ہے جو حضرت ابوہریرہؓ نے روایت کی آگ پر پکی ہوئی چیز کھا لینے سے وضو (نیا) کرنا چاہئے اس پر ابن عباسؓ نے کہا کہ اگر تم گرم پانی سے وضو کرو تو کیا تم پھر اس کی وجہ سے بھی تازہ وضو کرو گے؟ تو ابوہریرہ (سن کر) چپ ہو گئے (معلوم ہوا کہ ابن

---

[1] اصول شاشی ص مطبع مجتبائی دہلی۔

عباسؓ کے پاس کوئی حدیث ہوتی تو اس کو روایت کرتے اسی بنا پر ہمارے اصحاب (حنفیہ) نے ابوہریرہؓ کی روایت دربارہ مسئلہ مصراۃ کو قیاس کے مقابلہ میں ترک کر دیا اور باعتبار راویوں کے اختلاف کے ہم نے کہا کہ خبر واحد پر عمل کرنے کی شرط یہ ہے کہ وہ قرآن اور سنت مشہورہ کے خلاف نہ ہو (چنانچہ) آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میرے بعد تمہارے پاس احادیث کثرت سے بیان ہوں گی۔ پس جب تمہارے پاس میری طرف سے کوئی حدیث پیش ہو تو اسے کتاب کے سامنے کرنا پس جو اس کے موافق ہو اسے قبول کر لینا۔ اور جو اسکے خلاف ہو اسے رد کر دینا۔"

اس عبارت کے متعلق ہم کسی قدر تفصیل سے بیان کرنا چاہتے ہیں کیونکہ نفس مسئلہ کے علاوہ اس کی زنجیر کی ایک ایک کڑی غلط اور بے قاعدہ ہے۔

(۱) نفس مسئلہ کی تحقیق کہ آیا حفظ اور عدالت کے علاوہ راوی کے لئے فقہ و اجتہاد بھی ضروری ہے؟

(۲) آیا یہ اصول امام ابوحنیفہؒ کا وضع کیا ہوا ہے یا کسی اور کا؟

(۳) حضرت ابوہریرہؓ فقیہ اور مجتہد تھے یا نہ تھے؟

(۴) حضرت ابن عباسؓ کا اعتراض حضرت ابوہریرہؓ پر کس جہت سے تھا؟ آیا حدیث کو قیاس کے خلاف سمجھا جیسا کہ مصنف نے سمجھایا کچھ اور بات تھی؟

(۵) تحقیق حدیث مصراۃ

(۶) خبر واحد کا مخالف کتاب و سنت مشہورہ و خلاف ظاہر ہونا

(۷) حدیث تکثر لکم الاحادیث بعدی۔۔۔الخ کی تحقیق

(۸) وہ مثالیں جن میں حنفیہ نے خود اس اصول کا خلاف کیا۔

پس ان رؤس ثمانیہ کی تحقیق سے منکشف ہو جائے گا کہ اپنے ایک خود ساختہ قاعدہ کی ترویج کے لئے کس قدر بے ضابطگیاں کرنی پڑیں جن سے سنت صحیحہ کو بے پرواہی سے ٹال دینا نہایت آسان ہو گیا۔ سنت رسول اللہ ﷺ ہاتھ سے چھوٹے لیکن

اپنے بزرگوں کا بتایا ہوا قاعدہ نہ ٹوٹے۔اللہم اغفر

امر اول۔ نفس مسئلہ کی تحقیق: امر اول کا بیان صاحب نور الانوار کے لفظوں میں یوں ہے۔

والراوی ان عرف بالفقه والتقدم فی الاجتهاد کالخلفاء الراشدین والعبادلة کان حدیثه حجة یترك به القیاس وان عرف بالعدالة والضبط دون الفقه کانس وابی هریرة ان وافق حدیثه القیاس عمل به وان خالفه لم یترك الا بالضرورة (ص ۱۷۸)

"راوی حدیث اگر فقہ اور اجتہاد میں شہرت و تقدم رکھتا ہو۔ جیسے خلفاء راشدین اور عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن عباس اور عبد اللہ بن زبیر (رضی اللہ عنہم) تو ایسے راوی کی حدیث حجت ہو گی۔اس حدیث کے ساتھ قیاس متروک کیا جائے گا۔اور اگر راوی میں عدالت اور ضبط ہو مگر فقہ نہ ہو جیسے انسؓ خادم رسول اللہ ﷺ اور ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہما) (جو غیر فقیہ تھے) ایسے راوی کی حدیث اگر قیاس کے موافق ہو گی تو اس پر عمل کیا جائے گا اور اگر مخالف ہو گی تو قیاس نہ چھوڑا جائے گا سوائے ضرورت خاص کے۔"

ناظرین غور کریں کہ اس شرط کا نتیجہ کیسا بھیانک ہے جو علمائے اصول نے خود ہی بتادیا ہے کہ حضرت انسؓ اور ابو ہریرہؓ جیسے خادمان خاص کو بے فقہ کہہ کر کتنی حدیثوں کو قیاس مجتہد کے مقابلہ میں مسترد کیا گیا ہے۔اناللہ۔

امر دوم: امر دوم کا بیان اس طرح ہے کہ یہ اصول یعنی اشتراط فقہ راوی امام ابو حنیفہ کا وضع کیا ہوا نہیں بلکہ عیسیٰ بن ابان کا ہے جو امام محمدؒ کے شاگرد تھے[1]

چنانچہ صاحب نور الانوار میں فرماتے ہیں۔

ثم هذه التفرقة بین المعروف بالفقه والعدالة مذهب عیسی بن

---

[1] عیسیٰ ابن ابانؒ ۲۲۱ھ میں بصرہ میں فوت ہوئے (الفوائد البہیہ ص ۱۶)

ابان وتابعه اکثر المتاخرین واما عند الکرخی ومن تابعه من اصحابنا فلیس فقه الراوی شرطا لتقدم الحدیث علی القیاس بل خبر کل راو عدل مقدم علی القیاس اذا لم یکن مخالفا للکتاب والسنة المشهورة.[1]

"راوی فقیہ اور عادل میں یہ فرق...... عیسیٰ بن ابان کا مذہب ہے۔ اور اکثر متاخرین نے اس کی پیروی کی ہے لیکن امام کرخیؒ اور ہمارے اصحاب میں سے جو اس کے پیرو ہوئے ہیں ان کے نزدیک راوی کی فقاہت شرط نہیں ہے کیونکہ حدیث قیاس پر مقدم ہے۔ بلکہ ہر ایک حدیث جو عادل راوی کی روایت سے ہو قیاس پر مقدم ہے۔ جب کہ وہ کتاب اللہ اور سنت مشہورہ کے خلاف نہ ہو۔"

(۲) اسی طرح رئیس الحنفیہ امام ابن الہمام جو حنفیوں کے نزدیک رتبہ اجتہاد پر مانے گئے ہیں۔[2] اپنی کتاب تحریر میں اور محقق ابن امیر الحاج اس کی شرح "التقریر والتحبیر" میں فرماتے ہیں۔

(مسئلة) اذا تعارض الخبر الواحد والقیاس (لاجمع) بینهما ممکن (قدم الخبر مطلقا عند الاکثر) منهم ابو حنیفه والشافعی و احمد[3]

"جب خبر واحد اور قیاس میں ایسا تعارض ہو کہ ان دونوں میں جمع ممکن نہ ہو تو اکثر ائمہ کے نزدیک حدیث کو بہر حال مقدم کیا جائے گا۔ ان میں سے امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ اور امام احمدؒ ہیں۔"

---

[1] ص ۱۷۹، ۱۸۰۔ نور الانوار بحث السند

[2] شیخ ابن ہمام کا یہ درجہ "در مختار" اور اس کی شرح شامی میں مذکور ہے اور ہماری اس کتاب تاریخ اہل حدیث کسی گذشتہ فصل میں بھی اس کا ذکر ہو چکا ہے۔

[3] التقریر جلد ثانی ص ۲۹۸ مطبوعہ مصر۔

اسی طرح کشف الاسرار شرح[1] اصول بزدوی میں اس مسئلہ کے متعلق بسط سے بیان کرنے کے بعد کہا ہے۔

وقد ثبت عن ابی حنیفة رحمه الله انه قال ماجاء ناعن الله وعن رسولهٗ فعلی الراس والعین ولم ینقل عن احد من السلف اشتراط الفقه فی الراوی فثبت ان هذا القول مستحدث۔[1]

امام ابو حنیفہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جو کچھ ہمیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے پہنچ جائے وہ سر آنکھوں پر (منظور) ہے اور سلف (امت) میں سے راوی کی فقاہت کا شرط ہونا کسی سے بھی منقول نہیں۔ پس ثابت ہو گیا کہ یہ قول نیا (بدعت) ہے۔

کشف الاسرار میں اس مسئلہ کے متعلق جو مبسوط بحث لکھی ہے اس کا ذکر کر کے بعض مقالات علامہ تفتازانی نے بھی شرح توضیح میں لکھے ہیں۔ چنانچہ فرمایا۔

واما ثالثا فلانه نقل عن کبار الصحابة انهم ترکوا القیاس بخبر الواحد الغیر المعروف بالفقه وقد نقل صاحب الکشف ما یشیر الی ان هذا الفرق مستحدث وان خبرالواحد مقدم علی القیاس من غیر تفصیل[2]

تیسرے اس وجہ سے کہ بڑے بڑے صحابہ سے منقول ہے کہ انہوں نے غیر فقیہ صحابی کی خبر سے قیاس کو ترک کر دیا اور صاحب کشف الاسرار نے ایسا نقل کیا جس میں یہ اشارہ ہے کہ یہ فرق بدعت ہے اور نیز یہ کہ خبر واحد بہر حال قیاس پر مقدم ہے۔

---

[1] صاحب کشف الاسرار امام ابو حنیفہ کا قول دربارہ متابعت قرآن و حدیث نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ فقاہت راوی کی شرط سلف میں سے کسی سے بھی منقول نہیں۔ لہٰذا یہ بات نئی گھڑی ہوئی اور بدعت ہے۔ پس اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ امام ابو حنیفہؒ اس قول کے قائل نہ تھے۔ (کشف الاسرار جلد ثانی ص ۷۰۳ مطبوعہ مصر)

[2] تاریخ مصری جلد ۱ ص ۱۴)

اخیر میں ہم امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی عبارت نقل کرتے ہیں- جو خاص اس مسئلہ کے علاوہ بعض دیگر اصول حنفیہ کی نسبت بھی ہے کہ ان سب اصول کی روایت حضرت امام ابو حنیفہؒ اور ان کے بزرگ شاگردوں (امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ) سے ہرگز صحیح نہیں ہے- اور ان پر محافظت کرنا متقدین حنفیہ کا دستور نہیں تھا جیسا کہ امام بزدویؒ کرتے ہیں- چنانچہ فرماتے ہیں-

(ومنها) انی وجدت بعضهم یزعم ان بناء الخلاف بین ابی حنیفة والشافعی رحمهما الله علی هذه الاصول المذکورة فی کتاب البزدوی و نحوه وانما الحق ان اکثرها اصول مخرجة علی اقوالهم وعندی ان المسئلة القائلة بان الخاص مبین ولا یلحقه البیان وان الزیادة نسخ وان العام قطعی کالخاص وان لا ترجیح بکثرة الروایة وانه لا یحب العمل بحدیث غیر الفقیه اذا انسد باب الرای وان لا عبرة بمفهوم الشرط ولوصف اصلا وان موجبا لامر هو الوجوب البتة وامثال ذلك اصول مخرجة علی کلام الائمة وانهار لا تصح بها روایة عن ابی حنیفة وصاحبیه وان لیست المحافظة علیها والتکلف فی جواب مایرد علیها من صنائع المتقدمین فی استنباطهم کما یفعله البزدوی وغیره احق من المحافظة علی خلافها والجواب عما یرد علیه (حجة الله مصری جلد اول ص ۱۵۹، ۱۶۰)

ان میں سے ایک یہ ہے کہ میں نے بعض کو پایا جو یہ گمان کرتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعی (رحمہما اللہ) کے اختلاف کی بنا اس اصول پر ہے جو کتاب بزدوی و غیرہ میں مذکور ہیں اور حق یہ بات ہے کہ اکثر کی ان اصول میں سے ان کے اقوال سے تخریج کی گئی ہے- اور میرے نزدیک یہ مسئلہ کہ خاص بذات خود واضح ہوتا ہے اس کو بیان کی ضرورت نہیں ہوتی- اور یہ کہ

زیادت بھی ایک قسم کا نسخ ہے اور یہ کہ عام مثل خاص کے قطعی ہوتا ہے اور یہ کہ راویوں کی کثرت سے ترجیح نہیں ہو سکتی۔ اور نیز یہ کہ جب رائے اور قیاس کا دروازہ بند ہو جائے تو غیر فقیہ (صحابی) کی روایت پر عمل کرنا واجب نہیں اور یہ کہ مفہوم اور شرط اور وصف کا ہرگز اعتبار نہیں اور یہ کہ امر کا تقاضا ضرور ضرور وجوب ہی ہے اور مثل ان کے دیگر اصول ایسے ہیں جن کی ائمہ کے کلام سے تخریج کی گئی ہے۔ اور ان اصول کی روایت امام ابو حنیفہؒ اور آپ کے صاحبین (امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ) سے صحیح طور پر ثابت نہیں اور یہ کہ ان اصول کی نگہبانی کرنا اور ان اعتراضوں کے جواب میں جو ان پر وارد ہوتے ہیں تکلف کرنا جس طرح بزدویؒ وغیرہ کرتے ہیں اپنے استنباطوں میں متقدمین کا دستور نہیں تھا اور وہ ان کے خلاف پر محافظت کرنے اور ان کے جواب سے جو ان پر وارد ہوتے ہیں زیادہ حقدار نہیں ہیں۔

ان حوالجات سے بخوبی ظاہر ہو گیا ہے کہ محدثین کے علاوہ خود حضرات حنفیہ بھی صریحاً لکھتے ہیں کہ اشتراط فقہ راوی کا اصول حضرت امام ابو حنیفہؒ کا مقرر کردہ نہیں ہے۔ بلکہ عیسیٰ بن ابان کا ایجاد کردہ ہے اور اس سے پیشتر کسی بھی امام نے یہ بات نہیں کی۔

اب ہم اس کی وجہ بیان کرتے ہیں کہ عیسیٰ بن ابان نے یہ اصول کیوں وضع کیا۔

عیسیٰ بن ابان ابتداء میں اہل حدیث تھے۔ امام محمدؒ کی صحبت میں رہ کر ان سے متاثر ہو گئے[1] خیالات میں انقلاب ہوا۔ تو اختلاف کے وقت نئے اختیار کردہ طریق کے مقابلہ میں جو روایات آئیں۔ ان کی تحقیقات میں اس شرط کا بڑھانا ضروری خیال کیا کہ جو صحابہ غیر فقیہ ہوں باوجود ان کے صادق و عادل ضابطہ ہونے کے قیاس[2] (اپنی رائے)

---

[1] عیسیٰ ابن ابان کے اس تبدیل طریق کا ذکر ''الفوائد البہیہ'' میں موجود ہے۔ ص ۶۱۔

[2] قیاس سے مراد ہم نے عیسیٰ بن ابان کی ذاتی رائے اس لئے بیان کی ہے کہ حقیقت میں کوئی بھی صحیح حدیث عقل صحیح اور قیاست شرعی کے خلاف نہیں ہوتی جو کچھ اختلاف ہوتا ہے وہ قیاس

کے مقابلہ میں ان کی روایت کو ٹھکرا دیا جائے۔اللھم احفظنا۔

امر سوم :۔ یہ کہ حضرت ابوہریرہؓ فقیہ و مجتہد تھے یا عامی ؟ سو اس کا بیان اس طرح ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ کے مجتہد ہونے سے انکار کرنا علم حدیث و روایت کے مطالعہ کی کمی کا نتیجہ ہے۔ورنہ جو شخص اسفار حدیث پر نظر رکھتا ہو۔اسے بغیر تسلیم کے چارہ نہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ فقہائے صحابہ میں سے تھے۔تمام اسباب اجتہاد ان کو قدرت نے عطا کئے تھے۔اور وہ صحابہؓ کی جماعت میں برابر صاحب فتوی اور صاحب اجتہاد تھے۔اس بات کا اقرار خود حنفیہ شراح اصول کو بھی ہے۔ جنہوں نے علم حدیث پڑھا۔ اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایات و اجتہادات کو نظر غور سے دیکھا۔چنانچہ ہم بعض کی عبارتیں نقل کرتے ہیں۔علامہ ابن ہمامؒ جو متاخرین حنفیہ میں درجہ اجتہاد تک پہنچے۔اور مذہب حنفی کے خاص الخواص حامیوں میں سے ہیں فتح القدیر شرح ہدایہ میں فرماتے ہیں۔

والمائة الالف الذین توفی عنهم صلی الله علیه وسلم لا یبلغ عدة المجتهدین الفقهاء منهم اکثر من عشرین کالخلفاء والعبادلة و زید بن ثابت و معاذ بن جبل و انس و ابی هریرة و قلیل والباقون یرجعون الیهم و یستفتون منهم[1]

اور ایک لاکھ اصحاب جن کو چھوڑ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہوئے۔ان میں سے مجتہدین کی گنتی بیس سے زیادہ تک نہیں پہنچتی مثلاً خلفاء اربعہ اور عبادلہ اور زید بن ثابت اور معاذ بن جبل اور انس اور ابوہریرہ اور کچھ اور تھوڑے سے۔اور باقی سب کا رجوع انہی (مجتہدین صحابہ) کی طرف تھا۔ اور وہ انہی سے فتوی پوچھا کرتے تھے۔

گذشتہ سے پیوستہ

کرنے والے شخص کی رائے سے ہوتا ہے۔سو حدیث کا مرتبہ اس سے بہت بلند ہے کہ وہ کسی خاص شخص کے قیاس کے خلاف ہونے کے سبب درجہ اعتبار سے ساقط ہو جائے۔ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذھدیتنا۔

[1] فتح القدیر شرح ہدایہ نولکشوری جلد دوم ص ۱۴۱

اسی طرح علامہ عبدالعزیز بخاری حنفیؒ نے تو کشف الاسرار شرح "اصول بزدوی" میں نہایت زور سے حضرت ابوہریرہؓ کا مجتہد ہونا لکھا ہے اور اس کے انکار کرنے والے کی تردید کی ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔

علی انا لا نسلم ان ابا هريرة رضی الله عنه لم يكن فقيها بل كان فقيها ولم يعدم شيئا من اسباب الاجتهاد وقد كان يفتی فی زمان الصحابة وما كان يفتی فی ذلك الزمان الافقيه مجتهد وكان علية اصحاب رسول الله صلی الله عليه وسلم رضی الله عنهم وقد دعا النبی (صلی الله عليه وسلم) له بالحفظ فاستجاب الله تعالی له فيه حتی انتشرفی العالم ذكره وحديثه وقال اسحق الحنظلی ثبت عندنا فی الاحكام ثلاثة الأف من الاحاديث روی ابو هريرة منها الف وخمس مائة وقال البخاری روی عنه سبع مائة نفر من اولاد المهاجرين و الانصار وقد روی جماعة من الصحابة عنه فلا وجه الی رد حديثه بالقياس[1]

(اس کے بعد یہ کہ) ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ ابوہریرہؓ فقیہ نہ تھے بلکہ (ہم کہتے ہیں) کہ وہ فقیہ تھے۔اور اسباب اجتہاد میں سے کوئی سبب بھی ایسا نہ تھا جو ان میں موجود نہ ہو۔اور وہ صحابہ کے زمانہ میں فتویٰ دیا کرتے تھے۔اور اس زمانہ میں سوائے مجتہد کے کوئی فتویٰ نہ دیا کرتا تھا۔اور آپ رسول اللہ ﷺ کے عالی قدر اصحاب میں سے تھے۔اللہ تعالیٰ ان سب سے راضی ہو اور آنحضرت ﷺ نے ان (ابوہریرہؓ) کے حق میں حافظہ کی دعا کی تھی۔پس اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں آپ کی دعا قبول فرمائی اور ساری دنیا میں ان کا ذکر اور ان کی حدیث پھیل گئی۔اور امام اسحاق حنظلی نے کہا کہ ہمارے پاس (مسائل) احکام میں کل تین ہزار حدیثیں ثابت ہوئی ہیں۔جن میں سے

[1] کشف الاسرار ص ۷۰۳ مطبوعہ مصر جلد ثانی

ڈیڑھ ہزار (صرف) حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے ہیں اور امام بخاری نے کہا کہ حضرت ابوہریرہؓ سے مہاجرین اور انصار کی اولاد میں سے سات سو شخصوں نے روایت کی۔ اور صحابہ کی (بھی) ایک جماعت نے ان سے روایت کی پس ان کی حدیث کو قیاس سے رد کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔

ان حوالہ جات سے معلوم ہو گیا کہ حضرت ابوہریرہؓ معمولی نہیں بلکہ خاص درجہ کے مجتہد تھے اور جن حنفیوں نے آپ کے اجتہاد کا انکار کیا ہے۔ علم حدیث میں فردمایہ ہونے کے سبب کیا ہے۔

امر چہارم: یعنی حضرت ابن عباسؓ کے اعتراض کی تحقیق یوں ہے کہ نہ تو انہوں نے حضرت ابوہریرہؓ کو غیر فقیہ سمجھ کر اعتراض کیا اور نہ اس حدیث کو خلاف قیاس جان کر رد کیا۔ یہ بات تو کسی عام صحابی سے بھی بعید ہے چہ جائیکہ ابن عباسؓ جیسے جلیل القدر متبع سنت کی نسبت ایسا خیال کیا جائے حاشا و کلا توبہ استغفر اللہ۔

کشف حقیقت: اصل بات یہ ہے کہ اس حدیث کے متعلق دونوں صحابیوں (حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابوہریرہؓ) میں فہم مطلب میں اختلاف تھا حضرت ابوہریرہؓ اس کو ظاہر پر حمل کرتے تھے یعنی وضو سے وضوئے متعارف مراد لیتے تھے۔ اور حضرت ابن عباسؓ اس جگہ وضو سے صرف ہاتھ اور منہ کا اندرونی حصہ صاف کرنا یعنی کلی کرنا مراد لیتے تھے۔ اس لئے حضرت ابن عباسؓ نے نظائر سے سمجھایا کہ جب گرم پانی وغیرہ سے وضو متعارف جائز ہے۔ تو آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو کس طرح ٹوٹ جائے گا۔ لہٰذا اس حدیث میں وضو سے مراد وضوئے متعارف نہیں۔ بلکہ صرف ہاتھ (جس سے کھایا) اور منہ (جس میں کھایا) ان ہر دو کو صاف کرنا یعنی دھو لینا مراد ہے اور بس۔ جو کچھ ہم نے فہم مطلب کے اختلاف کی نسبت لکھا وہ بعد کے علماء میں بھی برابر چلا آیا۔ چنانچہ لغت حدیث "نہایہ ابن اثیر" میں لفظ وضو کے ذیل میں لکھا ہے۔

وقد یراد بہ غسل بعض الاعضاء ومنہ حدیث توضؤا مما غیرت

النار ارادبه غسل الايدى والافواه من الزهومة وقيل اراد به وضوء الصلوٰة وذهب اليه قوم من الفقهاء[1]

"یعنی اور کبھی وضو سے صرف بعض اعضاء کا دھونا مراد ہوتا ہے اور اس معنی میں حدیث "توضوأ مما غيرت النار" ہے یعنی یہ حدیث اس شے کے کھانے سے وضو کرو جسے آگ نے متغیر کیا ہو اس حدیث میں "توضواء" سے مراد ہاتھ اور منہ کا دھونا ہے۔ بوجہ چکنائی کے اور بعض نے کہا کہ اس سے مراد نماز کا وضو ہے اور اس طرف بھی فقہاء کی جماعت گئی ہے۔"

حضرت ابن عباس نے اس حدیث میں جو معنی مراد لئے ہیں ان کی تائید دیگر احادیث مرفوعہ سے بھی ہوتی ہے چنانچہ سنن ابی داوٗد میں ہے۔"باب الوضوء من اللبن "اس لفظ میں وضو صاف لکھا ہے پھر اس کے بعد حضرت ابن عباس کی روایت سے ذیل کی روایت ذکر کی ہے۔

عن ابن عباس ان النبی صلی الله علیه و اٰلهٖ وسلم شرب لبنا فدعا بماء فتمضمض ثم قال انه له دسما[2]

"کہ آنحضرت ﷺ نے دودھ نوش فرمایا۔ تو پانی طلب کیا پس کلی کی اور فرمایا کہ اس میں چکنائی ہوتی ہے۔"

اس روایت میں صاف مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ نے دودھ پیا بعد ازاں کلی کر لی۔ اور فرمایا کہ اس میں چکنائی ہوتی ہے۔ گویا کلی کرنے کی وجہ سمجھادی۔

اس سے زیادہ یہ کہ وضو کا لفظ محض ہاتھ دھونے اور کلی کرنے کے لئے خاص آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک سے دیگر احادیث سے بھی ثابت ہے۔ چنانچہ مشکوۃ میں بحوالہ ترمذی وابوداوٗد حضرت سلمان فارسی سے روایت ہے کہ۔

فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم بركة الطعام الوضوء قبله

---

[1] نہایہ ابن اثیر جلد ۴ بذیل لفظ وضو

[2] سنن ابی داوٗد

والوضوء بعده رواه الترمذی وابو داؤد[1]

"رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ کھانا کھانے سے پہلے بھی وضو کر لینے اور اس کے پیچھے بھی وضو کر لینے سے کھانے میں برکت ہوتی ہے۔"

اس حدیث کے ذیل میں شراح حدیث وضوء سے مراد غسل الیدین والفم[2] لکھتے ہیں۔

اس سے بھی زیادہ یہ کہ ترمذی میں حضرت عکراش سے ایک روایت کے ضمن میں ہے کہ

ثم اتینا بماء فغسل رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم یدیه ومسح ببلل کفیه وجهه وزراعیه وراسه وقال یا عکراش هذا الوضوء مما غیرت النار[3] (رواہ الترمذی)

"ہم پانی لائے تو آنحضرت ﷺ نے دونوں ہاتھ دھوئے۔ اور اپنے ہاتھ کی تری سے منہ اور دونوں بازوؤں اور سر کو چھوا اور فرمایا اے عکراش! آگ لگی ہوئی چیز سے وضو کرنا یہی ہے۔"

اس حدیث سے صاف معلوم ہو گیا کہ وضو کا لفظ اس طہارت کے علاوہ بھی بولا جاتا ہے۔ جو "نماز" کے لئے مخصوص ہے۔

پس اسی طرح حضرت ابن عباسؓ آگ پر پکی ہوئی چیز کے کھانے کی حدیث "وضو" کے لفظ کو صرف کلی کرنے اور ہاتھ دھو لینے پر محمول کرتے تھے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ انہوں نے حضرت ابوہریرہؓ کو غیر فقیہ جان کر اور ان کی روایت کو خلاف قیاس جان کر رد کر دیا تھا درست نہ رہا۔ وللہ الحمد

پانچواں امر : تحقیق حدیث مصراۃ

---

[1] مشکوٰۃ کتاب الاطعمہ

[2] مشکوٰۃ مذکورہ بالا حاشیہ بین السطور نیز حاشیہ منقول از مرقاۃ شرح مشکوٰۃ از ملا علی قاری حنفی۔

[3] مشکوٰۃ کتاب الاطعمہ ۱۲

عن ابی ھریرۃ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لا تصروا الابل والغنم فمن ابتاعھا بعد ذلك فھو بخیر النظرین بعد ان یحلبھا ان رضیھا امسکھا وان سخطھا ردھا وصاعا من تمر. متفق علیہ (منتقی)

بروایت بخاری و مسلم حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اونٹنی اور بکری کے تھنوں میں دودھ بند نہ کرو اور جو ایسی حالت کے بعد اس جانور کو خریدے تو اسے دونوں امروں میں سے ایک کا اختیار ہے بعد اس کے کہ اسے دوہ (کر آزما) لے اگر اسے پسند ہو تو رکھ لے اور اگر ناپسند ہو تو واپس کر دے اور ایک صاع[1] کھجوریں (ساتھ دیوے)

تصریہ سے یہ مراد ہے کہ جانور کے تھنوں میں دودھ روک رکھا جائے بعض لوگ ایسا کرتے ہیں- تاکہ اس جانور کا دودھ زیادہ معلوم ہو اور خریدار اسے شوق سے خرید لے- چونکہ اس میں دھوکہ پایا جاتا ہے اس لئے آنحضرت ﷺ نے اس سے روکا اور فرمایا کہ جو شخص ایسا جانور خریدے تو اسے واپسی کا اختیار ہے اور یہ بھی فرمایا کہ اگر واپس کرے تو اس دودھ کے عوض جو اس نے دوہ کر حاصل کیا ہے ایک صاع کھجوریں بھی ساتھ دیوے- اس حدیث کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ کے علاوہ دیگر ائمہ حدیث نے بھی روایت کیا ہے مثلاً امام مالک، امام ابوداؤد، امام ترمذی اور امام نسائی رحمہم اللہ اجمعین

رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث اپنے مطلب میں بالکل صاف ہے اور اس کی حکمت اور معقولیت عیاں ہے کہ آپ دھوکے فریب کے سودے سے منع فرماتے ہیں- اور یہ حکم آپ کے منصب ویزکیھم[2] (جمعہ پ ۲۸) کے بالکل مناسب ہے-

---

[1] ایک صاع عراقی کا وزن چار سیر انگریزی کے برابر ہوتا ہے اور حجازی صاع کا وزن قریباً پونے تین سیر کے برابر- امام ابویوسفؒ نے صدقہ فطر میں عراقی چھوڑ کر امام مالکؒ کی موافقت میں حجازی کو اختیار کیا (نافع کبیر حاشیہ جامع صغیر از مولانا عبدالحیٔ صاحب لکھنوی ص ۲۵ نوٹ نمبر ۸)-

[2] یعنی سورہ جمعہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرا رسول لوگوں کا تزکیہ کرتا ہے ایسے ایسے احکام سکھاتا ہے جس سے لوگ اعتقادی و اخلاقی و عملی خباثتوں اور ظاہری اور باطنی گندگیوں سے پاک ہو جائیں نیز اپنی پاک مصاحبت سے ان لوگوں کو قلبی اور عملی آلودگیوں سے پاک کرتا ہے-

اس حدیث میں دو حکم ہیں "خیار رد" یعنی واپس کر دینے کا اختیار اور واپسی پر دودھ کے عوض ایک صاع طعام کا ساتھ ادا کرنا۔

حنفیہ کرامؒ نے ان دونوں باتوں سے انکار کیا ہے نہ تو وہ واپسی کے اختیار کے قائل ہیں اور نہ طعام کے کیونکہ حدیث ان کے نزدیک قیاس کے برخلاف ہے اور حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے اور وہ ان کے نزدیک مجتہد نہیں تھے اور غیر مجتہد صحابی کی جو روایت خلاف قیاس ہو وہ ان کے ہاں مقبول نہیں۔

اس حدیث کی صحت میں جو امام بخاری اور مسلم کی متفقہ روایت سے ہو۔ کیا کلام ہو سکتا ہے؟ حافظ ابن حجرؒ صحیح حدیث کے مراتب مرتبہ اولیٰ کے ضمن میں لکھتے ہیں۔

ویلتحق بهذا التفاضل ما اتفق الشيخان على تخريجه [1]

یعنی مرتبہ اولیٰ کی فضیلت میں وہ احادیث بھی شامل ہیں جن کو شیخین (امام بخاری و مسلم) نے بالاتفاق روایت کیا ہو۔

اور مولوی عبداللہ صاحب ٹونکی حنفی اس کے حاشیہ بین السطور میں شیخان کے لفظ پر لکھتے ہیں۔ "البخاری و مسلم"

ہر چند یہ کہ حدیث درجہ اولیٰ میں ہے۔ لیکن تقلید ایک ایسی زبردست تحریک ہے کہ اس کا بند دلائل کی قوت قاہرہ سے بھی بمشکل ٹوٹتا ہے۔

اسناد کی رو سے اس حدیث میں کوئی جرح نہیں ہو سکتی۔ اصول محدثین کے رو سے اس میں کوئی قدح نہیں تھی۔ اس لئے مذہبی پاسداری سے اس سنت صحیحہ کے رد کرنے میں اتنے حیلے تراشے گئے کہ اس حدیث کے راویوں کی جلالت قدر پر نظر رکھنے والا اور آنحضرت ﷺ کی اس حکیمانہ و عادلانہ تعلیم کی خوبی کو نظر عزت و قدردانی سے دیکھنے والا اور اصول تمدن میں اس حکم کے نہایت ہی مفید ہونے اور عام لوگوں کو دھوکے فریب کے ضرر سے بچانے بلکہ خود دھوکہ دینے والے کو باطنی خباثت اور اخلاقی بدباطنی سے پاک رکھنے کو سمجھنے والا۔ منصف مزاج انسان حیران رہ جاتا ہے کہ الٰہی کیا دنیا میں

[1] شرح نخبہ ص ۲۷

اس دل و دماغ کے آدمی بھی ہیں جو اس حکم کو خلاف قیاس کہہ کر رد کر دیتے ہیں- ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ هديتنا-

پہلے ہم اس حدیث (مصراة) کے متعلق محدثین کی بعض عبارتیں لکھتے ہیں- ان سے آپ کو پتہ لگ جائے گا کہ سنت رسول اللہ ﷺ کے حقیقی قائل اور اس پر دل و جان سے عامل کون ہیں؟ اور اسے صرف اپنی موافقت و مطلب براری کے وقت محض تائیدی طور پر نقل کرنے والے کون ہیں؟ خاتمۃ الحفاظ حافظ ابن حجر فتح الباری میں فرماتے ہیں-

(۱) وقد اخذ بظاهر هذا الحديث جمهور اهل العلم وافتى به ابن مسعود و ابوهريرة ولا مخالف لهم من الصحابة وقال به من التابعين ومن بعدهم من لا يحصى عدده

اس حدیث کے ظاہر کو جمہور اہل علم نے لیا ہے اور اسی کے مطابق ابن مسعود اور ابو ہریرہؓ (صحابیوں) نے فتویٰ دیا اور جماعت صحابہ میں سے ان کا کوئی بھی مخالف نہیں- اور اسی کے مطابق تابعین اور ان کے بعد کے ائمہ میں سے اتنی تعداد کے ائمہ نے کہا جن کی گنتی نہیں ہو سکتی-

(۲) وقال ابن السمعاني في الاصطلام التعرض الى جانب الصحابة علامة على خذلان فاعله بل هو بدعة وضلالة وقد اختص ابوهريرة بمزيد الحفظ لدعاء الرسول الله صلى الله عليه وسلم.

ابن سمعانی نے "اصطلام" میں کہا کہ صحابہ کی جانب تعرض کرنا اس کے کرنے والے کے لئے خذلان (اللہ تعالیٰ کا ساتھ نہ ہونے) کی علامت ہے- بلکہ یہ بات ایک بدعت اور گمراہی ہے اور حضرت ابو ہریرہؓ تو آنحضرت ﷺ کی دعا کی برکت سے زیادہ حفظ سے مخصوص تھے-

(۳) وقال ابن عبدالبر هذا الحديث مجمع على صحته وثبوته من جهة النقل واعتل من لم ياخذ به باشياء لاحقيقته لها-

امام ابن عبد البرؒ نے کہا کہ اصول روایت کے رو سے اس حدیث کی صحت و ثبوت پر (ائمہ حدیث کا) اجماع ہے اور اس شخص نے جس نے اسے تسلیم نہیں کیا۔ایسے عذر کیئے ہیں جن کی حقیقت کچھ بھی نہیں۔

(۴) والکتاب والسنة فی الحقیقة هما الاصل والآخران مردودان الیهما السنة اصل والقیاس فرع فکیف یرد الاصل بالفرع بل الحدیث الصحیح اصل بنفسه فکیف یقال ان الاصل یخالف نفسه

حقیقت میں قرآن و حدیث ہی اصول (شرع) ہیں اور باقی دونوں (اجماع و قیاس) کو انہیں کی طرف لوٹایا جاتا ہے۔پس سنت (رسول ﷺ بالا ستقلال) اصل ہے اور قیاس فرع ہے پس اصل کو فرع سے کس طرح رد کر سکتے ہیں بلکہ حدیث تو بذات خود ایک اصل ہے پس یہ قول کس طرح صحیح ہو سکتا ہے کہ کوئی اصل اپنے آپ کے خلاف ہو۔

(۵) قال ابن عبد البر هذا الحدیث اصل فی النهی عن الغش واصل فی ثبوت الخیار لمن ولیس علیه بعیب واصل فی انه لا یفسد اصل البیع واصل فی ان مدة الخیار ثلاثة ایام واصل فی تحریم التصریة و ثبوت الخیار بها

حافظ ابن عبد البر نے کہا کہ یہ حدیث کھوٹ اور دغا کی ممانعت کے متعلق اصل ہے نیز اس شخص کی واپسی کے اختیار کے لئے اصل ہے جس پر فریب کی رو سے عیب ظاہر نہ کیا گیا ہو نیز اس بارے میں اصل ہے کہ بیع تمام ہو جاتی ہے اور فاسد نہیں ہوتی[۲] نیز اس امر میں اصل ہے کہ واپسی کے اختیار کی مدت تین دن ہیں نیز[۳] تصریہ کی حرمت اور اس کی وجہ سے ثبوت خیار میں اصل ہے۔

---

[۱] فتح الباری مطبوعہ دہلی جزء ثامن ص ۳ ۷ ۳ زیر احادیث ممانعت تصریہ
[۲] کیونکہ اگر بیع تمام نہ ہوتی تو آپ رکھ لینے کا اختیار نہ دیتے۔
[۳] صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ واپسی کا اختیار تین دن تک ہے۔

اسی طرح حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ اسی حدیث کے ضمن میں فرماتے ہیں۔

واعتذر بعض من لم يوفق للعمل بهذا الحديث قاعدة عند نفسه فقال كل حديث لا يرويه الاغير الفقيه اذا انسد باب الراى فيه يترك العمل به[1]

"اور بعض نے جن کو (جناب خداوندی سے) اس حدیث پر عمل کرنے کی توفیق نہیں ملی اپنے پاس سے ایک قاعدہ گھڑ کر عذر کر دیا ہے کہ جو حدیث کوئی غیر فقیہ راوی روایت کرے جب اس کے متعلق قیاس کا دروازہ (بالکل) بند ہو جاتا ہو تو اس حدیث پر عمل نہیں کیا جائے گا۔"

ان عبارتوں سے واضح ہے کہ محدثین کو سنت رسول اللہ ﷺ کی کتنی رعایت اور حمایت ہے کہ اس کی خلاف ورزی کرنے والے پر حلیم سے حلیم اور متین[2] سے متین شخص) کی طبیعت بھی ہل گئی ہے۔

اس کے علاوہ ایک یہ بھی سوچنے کا مقام ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کے بعض شاگرد مثلاً امام زفرؒ بھی اس امر میں محدثین کے ساتھ ہیں اور بموجب ایک روایت کے امام ابو یوسفؒ بھی اس امر میں محدثین کے موافق ہیں چنانچہ علامہ عینی حنفیؒ نے اسے خود لکھا ہے اور علامہ عبد العزیز بخاریؒ نے کشف الاسرار شرح اصول بزدوی میں اس کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

ونقل عن ابى يوسف فى بعض اماليه انه اخذ بحديث المصراة واثبت الخيار للمشترى (ص ۷۰۳ جلد دوم)

اس کے بعد ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ اچھا صحابی غیر فقیہ کی روایت کو تو آپ نے اس کے مخالف قیاس ہونے کی صورت میں متروک العمل قرار دیا۔ لیکن جب آپ فقیہ و مجتہد صحابی کی روایت کو ہر چند کہ وہ مخالف قیاس ہو تسلیم کرتے ہیں اور قیاس کو ترک

---

[1] حجۃ اللہ مصری جلد دوم ص ۱۰۳۔

[2] مراد حضرت شاہ صاحبؒ۔

کر دیتے ہیں تو اگر حضرت ابو ہریرہؓ کی موافقت میں ایک اعلیٰ درجہ کا مجتہد صحابی بھی یہی فتوے دیوے تو پھر تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ حضرت ابو ہریرہؓ بے سمجھی سے روایت نہیں کر رہے اور نیز یہ کہ ان کی یہ روایت قیاس کے بھی خلاف نہیں ہے۔

امام بخاریؒ بھی کتنے دور اندیش ہیں کہ جو کچھ آپ (حنفیہ) پیچھے کہنے والے ہوتے ہیں۔ وہ ان کو پہلے ہی کھٹک جاتا ہے۔ لیجئے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کے بعد امام بخاریؒ حضرت عبد اللہ بن مسعود کا فتویٰ نقل کرتے ہیں جن کی فقاہت و روایت کا اعتبار حنفی مذہب میں خصوصیت سے ہے۔

عن[1] عبد الله بن مسعود قال من اشترى شاة محفلة فردها فليرد معها صاعا من تمرونهي النبي صلى الله عليه وسلم ان تلقى البيوع.

عبد اللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں جس نے ایسی کوئی بکری خریدی جس کا دودھ اس کے تھنوں میں روکا ہوا تھا تو اگر وہ شخص اس بکری کو واپس کرے تو اس کے ساتھ ایک صاع تمر کھجور بھی دیوے۔ اور آنحضرت ﷺ نے اس بات سے بھی منع کیا ہے کہ (باہر سے) مال (لانے والوں) کو آگے سے جا کر ملیں (اور ان کی شہر کے نرخ سے ناواقفی کی حالت میں خرید لیں)۔

حافظ ابن حجرؒ اس روایت کی نسبت فرماتے ہیں۔

واظن ان لهذه النكتة اورد البخاري حديث ابن مسعود عقب حديث ابي هريرة اشارة منه الى ان بن مسعود قد افتى بوفق حديث ابي هريرة فلو لا ان خبرابي هريرة في ذلك ثابت لما خالف ابن مسعود القياس الجلي في ذلك۔[2]

میرے خیال میں امام بخاریؒ حضرت ابن مسعودؓ کی حدیث حضرت ابو ہریرہؓ

---

[1] صحیح بخاری حامل فتح الباری مطبوعہ دہلی جزو ثامن ص ۳۷۳۔
[2] فتح الباری جزء ثامن ص ۳۷۱۔

کی حدیث کے پیچھے اس نکتہ کے لئے لائے ہیں کہ اس بات کی طرف اشارہ کریں کہ حضرت ابن مسعودؓ نے بھی حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث کے موافق فتویٰ دیا ہے پس اگر حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث صحیح و ثابت نہ ہوتی تو حضرت ابن مسعودؓ اس بارے میں قیاس جلی[1] کے خلاف نہ کرتے۔

اس امر کی طرف حضرت شاہ صاحبؒ بھی راوی غیر فقیہ والے عذر کارد کرتے ہوئے ارشاد کرتے ہیں۔

وھذہ القاعدۃ علی ما فیھا لا تنطبق علی صورتنا ھذہ لانہ اخرجہ البخاری عن ابن مسعود ایضا و ناھیك بہ[2]

اور یہ قاعدہ بذات خود غلط ہونے کے علاوہ ہماری اس پیش افتادہ صورت پر منطبق بھی نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس حکم کو امام بخاریؒ نے ابن مسعودؓ سے بھی روایت کیا ہے اور تیرے لئے کافی ہے یعنی ابن مسعودؓ کا مجتہد ہونا مسلم کل ہے اس میں کسی کو کلام نہیں۔

حضرت ابن مسعودؓ کی روایت کے متعلق ہم اس مقام پر ایک اور □ نکتہ بھی لکھتے ہیں کہ حضرت ابن مسعودؓ کا یہ فتوی دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو انہوں نے آنحضرت ﷺ سے سنا اور اس وقت اس کو آپ کی طرف مسند کر کے روایت نہیں کیا یا وہ اپنے اجتہاد و قیاس سے کہتے ہیں۔

شق اول: یعنی آنحضرت ﷺ سے سن کر کہا ہو تو حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کے متعلق جو عذر تھا وہ جاتا رہا کیونکہ ابن مسعودؓ بالاتفاق مجتہدین صحابہ کے ان چند افراد میں سے ہیں جن کا شمار انگلیوں پر ہو سکتا ہے اور علامہ ابن ہمامؒ کی عبارت سے ان کے اسماء اوپر منقول ہو چکے ہیں کہ بیس سے زیادہ نہیں ہیں۔

اور اگر شق ثانی ہے تو بھی حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کی نسبت یہ عذر جاتا رہا کہ

---

1. حافظ صاحب نے اس جگہ قیاس جلی کا لفظ الزاماً کہا ہے۔
2. حجۃ اللہ مصری جلد ۲ ص ۱۰۳۔

وہ قیاس کے خلاف ہے کیونکہ اگر قیاس کے خلاف ہوتی تو ایسے جلیل القدر صحابی مجتہد کا قیاس اس کے موافق کیوں پڑتا۔

لیکن ہماری تحقیق یہ ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ اجتہاد سے فتویٰ نہیں دیتے بلکہ آنحضرت ﷺ سے سن کر کہتے ہیں اور آپ کی طرف اسناد نہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ بعض دیگر صحابہ بھی اور بالخصوص ابن مسعودؓ کی بھی عادت سے پایا گیا ہے کہ وہ بعض اوقات مسئلہ کا ذکر کر دیتے تھے اور اسے آنحضرت ﷺ کی طرف مسند نہیں کرتے تھے۔ حالانکہ وہ حدیث مرفوع و مسند ہوتی تھی اور اس امر کو علمائے حدیث بخوبی پہچانتے ہیں اور چنداں محتاج ثبوت و بیان نہیں۔ چنانچہ اصول بزدوی میں ہے۔

وقد كانوا يسكتون عن الاسناد[1]

"اور صحابہ کبھی اسناد سے خاموش رہتے تھے۔"

ہماری تحقیق کی بنا دو باتوں پر ہے۔

اول اس پر کہ اس میں صاعامن تمر بھی موجود ہے جو ابوہریرہؓ کی مرفوع روایت میں ہے۔ اور یہ بیان مقدار ہے اور مقادیر کا تقرر قیاس سے نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک شرعی حکم ہے جس کا تقرر صرف اللہ و رسول ؐ کا حق ہے۔ قیاس سے حکم شرعی کی علت و حکمت کو سمجھا کرتے ہیں۔ مقادیر شرعیہ اور احکام شرع مقرر نہیں کیے جاتے پھر تو منصب تشریع میں شرکت ہو جائے گی (و نعوذ باللہ من ذلك)

چنانچہ اس اصولی مسئلہ کو حضرت شاہ صاحبؒ نے "حجۃ اللہ" میں بالاستقلال نہایت مبسوط اور مدلل بیان کیا ہے۔ پس جس طرح ابوہریرہؓ نے آنحضرت ﷺ سے سن کر اس مسئلہ کو ذکر کیا۔ اسی طرح حضرت ابن مسعودؓ نے بھی آنحضرت ﷺ کی زبان وحی ترجمان سے سن کر ذکر کیا۔ ایک نے مسند ذکر کیا اور ایک نے مسند ذکر نہیں کیا۔ مسئلہ ایک ہی ہے اور وہ قیاس کے متعلق نہیں ہے۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ یہی مسئلہ ابن ماجہ میں حضرت ابن مسعودؓ سے رفعاً بھی مروی ہے گو رفع کی اس

---

[1] بحث تقلید الصحابی۔ ج ۳۔

تصریح میں محدثین کو کلام ہے۔اور اسی لئے امام المحدثین امام بخاریؒ نے اسے اپنی صحیح میں رفعاً روایت نہیں کیا لیکن علامہ عینی حنفی باوجود مذہب حنفی کی بے حد حمایت کرنے کے اسے تسلیم کرتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ اسے تسلیم کر کے اپنے مذہب سے مدافعت الزام کرتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں۔

وقد نهى النبي صلى الله عليه وسلم عن التصرية وروى ابن ماجه من حديث ابن مسعود انه قال اشهد على الصادق المصدوق ابي القاسم صلى الله عليه وسلم انه قال بيع المحفلات خلابة ولا تحل الخلابة لمسلم انتهى قلت والكل مجمعون على ان التصرية حرام وغش وخداع[1]

"آنحضرت ﷺ نے تصریہ سے منع فرمایا' اور امام ابن ماجہ نے حضرت ابو مسعودؓ سے روایت کیا کہ انہوں نے کہا کہ میں صادق مصدوق ابوالقاسم محمد رسول اللہ ﷺ پر (دل و جان سے) شہادت دیتا ہوں کہ آپ نے فرمایا محفلات (وہ جانور جن کا دودھ تھنوں میں روک رکھا جائے) کی بیع (ایک قسم کا) فریب ہے اور کسی مسلمان کے لئے فریب حلال نہیں (علامہ عینی کہتے ہیں) میں کہتا ہوں کہ اس امر پر سب متفق ہیں کہ تصریہ حرام ہے اور دغا اور فریب ہے۔"

دوسری بات جس پر ہماری تحقیق کی بنا ہے یہ ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ کی روایت کا اخیر حصہ صحیح بخاری میں بھی مرفوع ہے وہ یہ ہے۔

ونهى النبي صلى الله عليه وسلم عن تلقي البيوع

اور منع کیا نبی ﷺ نے ان لوگوں کو آگے سے جا کر ملنے سے جو باہر سے بیع کی چیزیں لائیں۔

جس طرح یہ حکم حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت کا ایک ٹکڑا ہے اسی طرح

[1] عمدۃ القاری للعینی جلد ۵ ص ۵۱۲

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کا بھی ایک ٹکڑا ہے یعنی جس طرح حضرت ابن مسعودؓ کی روایت میں "بیع مصراۃ" یعنی دودھ بند کئے ہوئے جانور کی بیع اور ممانعت تلقی رکبان دو امروں کی نسبت حکم ہیں اسی طرح حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں بھی یہ دونوں امر موجود ہیں اور کچھ اور احکام بھی ہیں چنانچہ وہ روایت بھی امام بخاریؒ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت کے ساتھ لکھ دی ہے اور وہ اس طرح ہے۔

عن ابی هريرة ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال لا تلقوا الركبان ولا يبيع بعضكم على بيع بعض ولا تناجشوا ولا يبيع حاضر لباد ولا تصروا لغنم ومن ابتاعها فهو بخير النظرين بعد ان يحلبها ان رضيها امسكها وان سخطها ردها وصاعا من تمر[1]

یعنی حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم آگے جا کر نہ ملو مال لانے والے قافلوں کو اور کوئی شخص دوسرے کے سودے پر سودا نہ کرے اور قیمت بڑھانے کے لئے (نمائشی) خریدار نہ بنو اور کوئی شہری باہر والے کے لئے نہ بیچے اور بکری وغیرہ کے تھنوں میں دودھ نہ روک رکھو۔ اور جو شخص ایسا جانور خریدے تو وہ دودھ کو دیکھ لینے کے بعد دو امروں میں سے ایک کا مختار ہے۔ اگر اسے پسند ہو تو رکھ لے اور اگر ناپسند ہو تو واپس کر دے اور (واپسی کی صورت میں) اس دودھ کے عوض اصل مالک کو ایک صاع کھجوریں بھی دیوے۔

اس روایت سے امام ہمام والا مقام نجم المحدثین سراج المجتہدین نے سمجھا دیا کہ گو ابن مسعودؓ کی روایت میں تصریح بالرفع نہیں ہے۔ لیکن وہ اصل میں مرفوع ہی ہے کیونکہ دونوں صحابیوں کی روایت میں دونوں امر مذکور ہیں۔

اللہ اکبر! امام بخاری علیہ رحمتہ اللہ الباری بھی دور رس اور کیسے دقیقہ شناس اور فن حدیث کے کیسے نکتہ داں ہیں۔ اللهم اجزه عن امة نبيك جزاء حسنا وافرا۔

---

[1] بخاری حامل الفتح دہلوی جزء ۸ ص ۳۷۳

حاصل کلام یہ کہ یہ مسئلہ محض حضرت ابوہریرہؓ ہی سے منقول نہیں کہ اسے مخالف قیاس سمجھ کر رد کر دیا جائے بلکہ ایک مجتہد صحابی سے بھی منقول ہے۔ جس کا اعتبار حنفی مذہب میں خصوصیت سے ہے۔

امام ابو حنیفہ کے مذہب کی تحقیق

اب اس پانچویں نمبر میں بحث کا کچھ حصہ باقی رہ گیا- یعنی اس بارے میں امام ابو حنیفہؒ کے مذہب کی تحقیق- سو معلوم ہو کہ اول تو ہم اصولا یہ کہتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ اس بات کے قائل ہی نہیں تھے کہ صحابی غیر فقیہ کی روایت جو قیاس کے خلاف ہو قابل ترک ہوتی ہے اس کا کچھ بیان تو سابقا نمبر دوم میں ہو چکا اور باقی اب کیا جاتا ہے- اس کو ہم دو طرح پر بیان کرتے ہیں-

اول اس طرح کہ دیگر جزئیات کو دیکھ کر کہہ سکتے ہیں کہ حضرت امام ابو حنیفہؒ حدیث کے ہوتے قیاس کو ترک کر دیتے تھے- خاص کر ابو ہریرہؓ کی روایت ہی سے کئی مسائل میں قیاس کے خلاف اور حدیث کے موافق عمل کیا- چنانچہ خاتمہ الحفاظ اسی مسئلہ کی تحقیقات کے ضمن میں فرماتے ہیں-

واعتذر الحنفية عن الاخذ بحديث المصراة باعذارشتى فمنهم من طعن في الحديث لكونه من رواية ابي هريرة ولم يكن كابن مسعود وغيره من فقهاء الصحابة فلا يوخذ بما رواه مخالفا للقياس الجلي

اور حنفیوں نے اس حدیث مصراۃ کے ماننے میں چند ایک عذر کیے ہیں- کسی نے تو حدیث میں یہ طعن کر دیا کہ وہ ابو ہریرہؓ کی روایت سے ہے اور وہ ابن مسعودؓ وغیرہ فقہائے صحابہ کی طرح نہ تھے- پس جو کچھ انہوں (ابو ہریرہؓ) نے قیاس جلی کے خلاف روایت کیا اسے نہیں لیا جائے گا- (جل جلالہ)

لرواية كلام اذى قائله به نفسه وفي حكايته غنى عن تكلف الرد عليه وقد ترك ابو حنيفةؒ القياس الجلي لرواية ابي هريرة و امثاله

كما فی الوضوء بنبيذ التمر ومن القهقهة فی الصلوة وغير ذلك

(فتح الباری دهلوی جزء۸ ص ۳۷۱)

"اور یہ ایسا کلام ہے کہ اس کے قائل نے اس سے اپنے آپ کو دکھ میں ڈالا۔ اور صرف اس کا ذکر کر دینا ہی اس کے رد کی تکلیف سے غنی کر دیتا ہے اور بیشک امام ابو حنیفہؒ نے قیاس جلی کو حضرت ابو ہریرہؓ اور ان جیسے دیگر صحابہ کی روایت کے مقابلہ میں ترک کر دیا ہے۔ جیسے کہ نبیذ تمر سے وضو کرنے۔ اور نماز میں قہقہہ مار کر ہنسنے سے وضو کے ٹوٹ جانے اور دیگر مسائل میں۔"

اور حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں۔

واصلوا لايجب العمل بحديث غير الفقيه اذا انسد باب الراى وخرجوا من صنيعهم فی ترك حديث المصراة ثم ورد عليهم حديث القهقهة وحديث عدم فساد الصوم بالاكل ناسيا فتكلفوا فی الجواب وامثال ماذكرنا كثيرة لا تخفى على المتتبع ومن لم يتتبع لاتكفيه الاطالة فضلا عن الاشارة ويكفيك دليلا على هذا قول المحققين فی مسئلة لايجب العمل بحديث من اشتهر بالضبط والاشارة دون الفقه اذا انسد باب الراى كحديث المصراة ان هذا مذهب عيسى بن ابان و اختاره كثير من المتاخرين وذهب الكرخیؒ وتبعه كثير من العلماء الى عدم اشتراط فقه الراوى لتقدم الخبر على القياس قالوا لم ينقل هذا القول عن اصحابنا بل المنقول عنهم ان خبر الواحد مقدم على القياس الا ترى انهم عملوا بخبرابی هريرة فی الصائم اذا اكل او شرب ناسيا او ان كان مخالفا للقياس حتى قال ابو حنيفةؒ لو لا الرواية لقلت بالقياس[1]

اور فقہائے حنفیہ نے ایک یہ قاعدہ بنایا کہ غیر فقیہ کی حدیث پر عمل کرنا

---

[1] حجۃ اللہ مصری ج ۱ ص ۱۶۰

واجب نہیں ہو گا جبکہ اس سے قیاس کا دروازہ بند ہوتا ہو اور انہوں نے "حدیث مصراۃ" کو ترک کر کے ایسا کر کے بھی دکھا دیا۔ پھر ان کے اس قاعدہ پر حدیث قہقہہ اور بھولے سے کھا لینے والے کا روزہ نہ ٹوٹنے کی حدیث سے جو الزام وارد ہوا تو انہوں نے اس کے جواب میں تکلف سے کام لیا اور جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اس کی مثالیں بہت ہیں۔ ڈھونڈ بھال کرنے والے پر مخفی نہیں اور جو پڑتال اور تلاش نہ کرے اسے اشارہ کیا طویل بیان بھی کافی نہیں اور تیرے لئے محض **محققین** کا یہ قول کافی ہے۔ جو انہوں نے کہا کہ یہ مسئلہ کہ جو (صحابی) قوت حافظہ اور تقویٰ اور دینداری میں مشہور ہو لیکن فقہ و اجتہاد میں معروف نہ ہو تو اس کی حدیث پر جب کہ اس سے قیاس کا دروازہ بند ہوتا ہو عمل کرنا واجب نہیں مثلاً "حدیث مصراۃ۔" یہ مذہب عیسیٰ ابن ابان کا ہے اور بہت سے متاخرین نے (اس کی پیروی میں) اس امر کو اختیار کیا ہے۔ اور امام کرخیؒ کا مذہب یہ ہے کہ راوی کا مجتہد ہونا شرط نہیں ہے کیونکہ حدیث (صحیح) قیاس پر (بہرحال) مقدم ہے اور بہت سے علماء نے امام کرخیؒ کی پیروی کی ہے ان کا قول یہ ہے کہ یہ قاعدہ ہمارے مشائخ (حنفیہ) سے منقول نہیں ہے بلکہ ان سے تو یہ منقول ہے کہ (صحیح) خبر واحد (بہرحال) قیاس پر مقدم ہے۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ انہوں نے حضرت ابوہریرہؓ ہی کی اس حدیث پر (برابر) عمل کیا کہ روزہ دار جب بھول کر کچھ کھا لے یا پی لے (تو اس کا روزہ نہیں ٹوٹتا) اگرچہ یہ قیاس کے خلاف ہے حتی کہ امام ابو حنیفہؒ نے کہہ دیا کہ اگر (اس بارے میں) یہ روایت نہ ہوتی تو میں قیاس سے فتویٰ دیتا۔

دوسرا طریق امام ابو حنیفہؒ کے مذہب کی تحقیق کا یہ ہے کہ حافظ ابن حجر کے کلام میں اوپر گذر چکا ہے کہ جماعت صحابہ میں اس امر میں حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابن مسعودؓ کے مخالف کوئی نہیں تھا' اور امام ابو حنیفہؒ کا مذہب ہے کہ جس امر میں قرآن و

حدیث سے دلیل نہ ملے اور جماعت صحابہ میں بھی اختلاف نہ ہو اس میں آپ صحابہ کے اقوال سے باہر نہیں جاتے[1] پس جس امر میں حدیث مرفوع بھی موجود ہو اور اس میں ایک ایسے مجتہد صحابی کا فتوی بھی ہو جس کی عظمت ان کے دل میں بغائت ہے اور اس امر میں جماعت صحابہ میں بھی اختلاف نہ ہو تو اس کی خلاف ورزی امام ابو حنیفہؒ کا مذہب نہیں ہو سکتا۔

چھٹا امر :- یعنی خبر واحد کے لئے موافقت کتاب و سنت مشہور کا شرط ہونا سو اس کا بیان اس طرح ہے کہ یہ قاعدہ تو سنہرا ہے لیکن حقیقت میں سنت صحیحہ کو ٹال دینے کا خفیہ اور مہذب حیلہ ہے کیونکہ یہ قاعدہ اس حدیث پر چسپاں نہیں ہوتا۔ قرآن مجید کی کوئی آیت یا آنحضرت ﷺ کی کوئی صحیح و مشہور حدیث یا کم از کم صحیح خبر واحد ایسی نہیں جس میں اس "حدیث مصراۃ" کے خلاف حکم مذکور ہو اور اسے اس کا مخالف کہہ کر رد کر دیا جائے۔ علمائے حنفیہ نے اس امر میں جو کچھ لکھا ہے وہ کتاب و سنت کے بعض احکام سے نتائج اخذ کر کے ایک حکم کو اپنے ذہن میں جما لیا ہے پھر اس حدیث کے حکم کو اس اپنے سمجھے ہوئے ذہنی حکم کے خلاف قرار دے کر حدیث رسول اللہ ﷺ کو ٹال دیا ہے اور اس روش سے آنحضرت ﷺ نے منع فرمایا ہے چنانچہ وارد ہے کہ

سمع النبی صلی اللہ علیہ وسلم قوما یتدارؤن القران فقال انما هلك من كان قبلكم بهذا ضربوا كتاب الله بعضه ببعض وانما نزل كتاب الله يصدق بعضه بعضا فلا تكذبوا بعضه ببعض فما علمتم منه فقولوا و ماجهلتم فكلوه الى عالمه[2] (رواه احمد وابن ماجه)

آنحضرت ﷺ نے کچھ لوگوں کو قرآن میں جھگڑا کرتے سنا تو آپ نے فرمایا کہ تم سے پہلے لوگ اسی روش کی وجہ سے ہلاک ہوئے کہ انہوں نے کتاب

---

[1] اس امر کو ہم سابقا فرقہ مرجیہ کے ضمن میں حضرت امام ابو حنیفہؒ کے ذکر میں بہ تفصیل بیان کر چکے ہیں۔

[2] مشکوۃ کتاب العلم ص ۲۷

اللہ کی بعض آیات کو بعض سے ٹکرایا اور کتاب اللہ کی آیات تو ایک دوسری کی تصدیق کرتی ہوئی نازل ہوئیں پس تم بعض کو بعض سے نہ جھٹلاؤ جو بات تم کو کتاب اللہ سے معلوم ہو جائے وہ کہہ دو اور جو معلوم نہ ہو اسے اس کے جاننے والے کے سپرد کر دو (یعنی خود اس میں لب کشائی نہ کرو)

پس جائز نہیں کہ نصوص کتاب و سنت کو آپس میں ٹکرا کر بعض کو بعض سے رد کر دیں۔ اس کے بعد یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ شرط مذکورہ بالا کے معنی یہ نہیں ہیں کہ کسی آیت یا سنت مشہورہ سے جو کچھ کسی نے اجتہاد سے مستنبط کیا ہو' اس کی موافقت ضروری ہے۔ بلکہ اس کے معنی تو یہ ہیں کہ جو حکم اس خبر واحد میں مذکور ہے کسی آیت قرآنی یا سنت مشہورہ مقبولہ میں اس کے خلاف مذکور نہ ہو۔ مثلاً "حدیث تصریہ" میں دو حکم ہیں۔

ایک تصریہ پر مشتری کو واپسی کا اختیار دوم واپسی کی صورت میں ایک صاع کھجور کا ساتھ ادا کرنا۔ پس اس کی مخالفت میں کوئی ایسی آیت یا حدیث مشہور (یا کم از کم صحیح خبر واحد ہی سہی) پیش کر دی جائے۔ جس میں ان دونوں حکموں کے خلاف حکم ہو یعنی اس میں تصریہ پر واپسی کا حق زائل کیا گیا ہو۔ اور دودھ مفت میں ہضم کر جانا فرمایا ہو اور ہم نہایت یقین سے کہتے ہیں کہ قرآن و حدیث میں کسی ایسی نص نہ ملے گی' اور نہ آج تک علمائے حنفیہ کو ملی ہے۔ ورنہ وہ اپنی اجتہادی قوت کو صرف کرنے پر مجبور نہ ہوتے۔

علامہ عینی حنفیؒ نے شرح صحیح بخاری میں جس قدر امور ذکر کئے ہیں۔ وہ سب استنباطی ہیں۔ جن کی موافقت اللہ کے رسول اور اس کی شرع کے امین و مبین صلوات اللہ علیہ وسلامہ پر لازم گردانی عکس موضوع ہے۔ اور یہی توضیح ہے فتح الباری کی اس عبارت کی جو سابقا گذر چکی ہے یعنی فكيف يرد الاصل بالفرع یعنی حدیث رسول اللہ ﷺ کو جو اصل ہے قیاس سے جو فرع ہے کس طرح رد کر سکتے ہیں؟

باوجود اس کے پھر بھی علمائے حدیث ان میں سے ایک ایک کا جواب دے کر

سبکدوش ہو چکے ہیں- اور حافظ ابن عبد البرؒ کے کلام سے انہی کی نسبت "لا حقیقۃ لہا" یعنی وہ بالکل بے حقیقت ہیں کا حکم گذر چکا ہے اور فتح الباری اور نیل الاوطار اور اعلام الموقعین میں بالتفصیل مذکور ہیں-

ساتواں امر: یعنی روایت تکثر لکم الاحادیث عنی.... الخ کا جواب یہ ہے کہ یہ روایت بالکل جھوٹی اور موضوع ہے اور صاحب اصول شاشی کی فن حدیث سے بے خبری کی دلیل ہے اور اصول شاشی کے بعض محشی تو ایسے بھی ہوئے جنہوں نے اس کا پتہ صحیح بخاری میں بتایا ہے حالانکہ یہ روایت صحیح بخاری میں نہ ہے اور نہ ہو سکتی ہے- کیونکہ یہ حقیقت میں موضوع ہے اور اس بات کو خود حنفیہ نے تسلیم کیا ہے- چنانچہ علامہ تفتازانی تلویح میں اسی مسئلہ یعنی خبر واحد کے سلسلہ میں حدیث مصراۃ کے ذکر کے بعد اس روایت کی نسبت فرماتے ہیں-

واستدل علی ذلك بقوله علیه السلام یکثر لکم الاحادیث من بعدی فاذا روی لکم عنی حدیث فاعرضوه علی کتاب الله فما وافق فاقبلوه وما خالفه فردوه واجیب بانه خبر واحد وقد خص منه البعض اعنی المتواتر والمشهور فلا یکون قطعیا فکیف یثبت به مسئلة الاصول علی انه مما یخالف عموم قوله تعالی ما اتکم الرسول فخذوه (ومانهکم) وقد طعن فیه المحدثون بان فی روایة یزید بن ربیعة وهو مجهول وترك فی اسناده واسطة بین الاشعث وثوبان فیکون منقطعاو ذکر یحیی بن معینؒ انه حدیث وضعته الزنا دقة وایراده البخاری اياد فی صحیح لا ینافی الا نقطاع

"اس بات پر آنحضرت ﷺ کے اس قول سے استدلال کیا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا' میرے بعد تمہارے پاس میری بہت سی احادیث بیان کی جائیں گی پس جب تمہارے پاس میری طرف سے کوئی حدیث روایت کی جائے تو اسے "کتاب اللہ" پر پیش کرنا- پس جو اس کے موافق ہو اسے قبول کر لینا اور

جو اس کے خلاف ہو اسے رد کر دینا- اور اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ یہ خبر واحد ہے اور اس سے بعض اقسام حدیث یعنی حدیث متواتر اور حدیث مشہور مخصوص ہیں- پس یہ (حدیث) قطعی نہیں ہو سکتی- پس اس سے اصول کا یہ مسئلہ کس طرح ثابت ہو سکتا ہے علاوہ اس کے یہ بھی ہے کہ یہ (حدیث) ما اتکم الرسول فخذوہ یعنی جو کچھ تم کو رسول اللہ ﷺ دیویں لے لو کے عموم کے خلاف ہے- اور محدثین نے اس میں طعن بھی کیا ہے- کیونکہ اس کے راویوں میں سے یزید بن ربیعہ ہے اور وہ مجہول ہے- اور اس کی اسناد میں اشعث اور ثوبان کے درمیان ایک واسطہ متروک ہے- پس یہ (روایت) منقطع ہے- اور امام یحییٰ بن معین نے کہا یہ حدیث زندیقوں (بے دین لوگوں) نے جعلی بنائی ہے- اور امام بخاریؒ کا اس کو اپنی صحیح میں روایت کرنا اس کے منقطع ہونے کے منافی نہیں"[1] (تلویح مطبوعہ مصر جلد ۲ ص ۹)

آٹھواں امر: حدیث مصراۃ کا حکم معقول و حکیمانہ اور عدل و انصاف کا پیمانہ ہے- پہلے قیاس شرعی کی حقیقت سمجھ لینی ضروری ہے- اور وہ یہ ہے کہ ہمارے سامنے ایسا امر آجاوے جس کے حکم کے لئے کوئی خاص نص شرعی قرآن یا حدیث سے ہمیں معلوم نہیں- پس ہم کتاب و سنت میں نظر کر کے کوئی ایسی نص معلوم کریں جس سے اس پیش افتادہ امر کو تعلق ہو- اور ان دونوں میں ایک علت جامعہ پائی جائے- پس اس علت جامعہ کی وجہ سے ہم اس پیش افتادہ امر پر وہی حکم لگادیں جو اس منصوص امر میں شارع علیہ السلام کی طرف سے لگا ہوا ہے- پس یہ ہے حقیقت قیاس شرعی کی- چنانچہ توضیح میں ہے-

---

[1] علامہ تفتازانی کا اس روایت کو امام بخاری کی تخریج قرار دینا بالکل غلط ہے- بھلا یہ منکر موضوع روایت صحیح بخاری میں کیسے ہو سکتی ہے علامہ نے بعض محشیوں کی پیروی سے بغیر تحقیق کے ایسا لکھ دیا ہے اور ایسی باتیں کتب فقہ میں بہت ہیں کہ ان کی نقل در نقل غلط ہی ہوتی گئی- مثلاً صاحب نور الانوار نے لکھا کہ قرآن میں ہے وارکعوا واسجدوا حالانکہ قرآن میں اس طرح ہے یا ایھا الذین امنوا ارکعوا واسجدوا الآیہ اور فقہاء سے غلط ہی نقل کئے جاتے ہیں-

هو تعدية الحكم من الاصل الى الفرع بعلة متحدة لا تدرك بمجرد اللغة[1]

"قیاس یہ ہے کہ اصل (یعنی نص قرآن و حدیث) کا حکم فرع (امر پیش افتادہ) پر علت جامعہ کی وجہ سے لگایا جائے جس کا ادراک مجرد لغت سے نہ ہو۔"

اور علامہ تفتازانی اس کی شرح میں فرماتے ہیں۔

وفي الشرع مساواة الفرع للاصل في علة حكمه

اور شریعت میں قیاس نام ہے فرع کا اصل کے مساوی ہونے کا علت حکم میں

اور شیخ ابن ہمام حنفی "تحریر" میں فرماتے ہیں۔

وفي الاصطلاح مساواة محل لاخر في علة حكم له شرعي لا تدرك من نصه بمجرد اللغة[1]

"یعنی اصطلاح میں قیاس یہ ہے کہ ایک محل دوسرے کے مساوی ہو اس کے حکم شرعی کی علت میں جو مجرد لغت سے معلوم نہ ہو سکتا ہو۔"

اور حضرت شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ حجتہ اللہ میں فرماتے ہیں۔

تمثيل صورة بصورة في علة جامعة بينهما.[2]

"یعنی قیاس تمثیل ہے ایک صورت کی دوسری صورت سے اس علت جامعہ میں جو دونوں کے درمیان ہو۔"

ان سب عبارتوں کا حاصل مطلب قریباً ایک ہی ہے۔ اور امر مشترک زیر تحقیق میں سب متفق ہیں۔

ان سب عبارتوں سے واضح ہو گیا ہے کہ قیاس و اجتہاد کی ضرورت اس امر میں پڑتی ہے جس میں نص شرعی معلوم نہ ہو یا موجود نہ ہو۔ اور یہ بھی کہ قیاس کی بنا نصوص

---

1. ص ۵۲ جلد ۲۔
2. ص ۱۱۷ ج ۳ مطبوعہ مصر۔
3. ص ۱۳۵ جلد ۱ مطبوعہ مصر۔

قرآن و حدیث پر ہے جس سے غیر منصوص کا حکم اخذ کیا جاتا ہے۔ اور اس ضرورت کو رفع کیا جاتا ہے اس لئے اھل اصول بالاتفاق کہتے ہیں کہ قیاس مظہر حکم ہوتا ہے نہ کہ مثبت حکم[1] یعنی قیاس سے اس حکم کو ظاہر کیا جاتا ہے۔ جو نصوص شرعیہ میں ملحوظ شارع ہے۔ نہ کہ نئے سرے سے کسی حکم کی ایجاد۔ چنانچہ صاحب توضیح فرماتے ہیں۔

وھذا ما قالوا ان القیاس مظھر للحکم لا مثبت[2]

پس قیاس شرعی یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی خاص نص شرعی کو اجتہاد و استنباط سے رد کر دیا جائے۔

خلاصۃ المرام یہ کہ قیاس شرعی یہ ہے کہ منصوصات قرآن و حدیث کو اصل بنا کر غیر منصوص کا حکم معلوم کیا جائے یہ نہیں کہ نصوص قران و حدیث کو جو اصول شرع ہیں اپنے استنباط سے رد کر دیا جائے وھل ھذا الا عکس الموضوع یعنی اس سے تو اصل حقیقت ہی پلٹ جائے گی۔ اور اصل (قران و حدیث) فرع ہو جائے گا۔ اور فرع (قیاس) اصل ہو جائے گی۔ جیسا کہ فتح الباری سے سابقاً حافظ ابن عبد البرؒ کے قول سے گذر چکا۔

اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ حدیث مصراۃ اصالتہً نصوص شرعیہ میں سے ہے۔ اور اپنے ثبوت کے لئے کسی قیاس کی محتاج و ممنون احسان نہیں۔ لیکن چونکہ ہر حکم شرعی اپنے اندر ایک مصلحت و حکمت رکھتا ہے جس میں بندگان خدا کی دنیوی و اخروی یا اخلاقی بہتری ہوتی ہے۔ ہم اس حکمت کے متعلق بھی کچھ لکھتے ہیں تاکہ ہمارے ناظرین کو اس کی معقولیت اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے۔

سو معلوم ہو کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جانور کو اس کے تھنوں میں دودھ روک کر بیچنے سے منع کرتے ہیں۔ اور اگر کوئی اس طرح کر کے جانور کو بیچ دیوے تو آپ اس خریدار کے لئے واپس کر دینے کا حق ثابت کرتے ہیں۔ تو اس میں آپ

---

[1] توضیح و نور الانوار۔

[2] ص ۵۳ ج ۲ مطبوعہ مصر ۱۲

دھوکہ اور فریب دینے سے روکتے ہیں۔اس سے دھوکہ دینے والے کو تو باطنی خباثت اور اخلاقی برائی سے پاک رکھنا منظور ہے۔اور جس کو دھوکے سے ایسا جانور دیا جائے اس کے مال کو نقصان سے اور اس کے دل کو صدمہ سے بچانا منظور ہے کیونکہ جب کسی جانور کا دودھ ایک وقت یا دو وقت اس کے تھنوں میں بند رکھا گیا۔اور معرض بیع میں پیش کیا گیا تو جانور کو ناحق تکلیف پہنچنے کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ خریدار تو یہی سمجھے گا کہ عادۃً اور معمولاً اس جانور کا دودھ اتنا ہی ہوا کرتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اتنا نہیں ہوتا تو یہ سراسر فریب ہے کیونکہ جو حقیقت و اظہار کے خلاف ہے وہ جھوٹ اور فریب ہوتا ہے۔پس حکیم حقانی۔ رسول ربانی ﷺ فرماتے ہیں کہ جو شخص ایسا جانور خرید لے اور بعد میں اسے معلوم ہو کہ مجھے دھوکہ دیا گیا تو وہ مختار ہے اگر وہ باوجود اس کیفیت کے اس جانور کو رکھ لینا چاہتا ہے تو رکھ لیوے اور اگر واپس کر دینا چاہتا ہے تو اسے واپسی کا اختیار ہے۔اصل مالک کو واپس پھیر دے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ اس دودھ کے عوض جو اس نے حاصل کیا ایک صاع تمر بھی ساتھ دیوے اور اس میں واپسی کے وقت اصل مالک کی تالیف بھی ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ اسی حدیث مصراۃ کے ذیل میں فرماتے ہیں۔

اقول. التصرية جمع اللبن فی الضرع لیتخیل المشتری غزارته فیغتر ولما کان اقرب شبهه بخیار المجلس او الشرط لان عقد البیع کان مشروطا بغزارة اللبن لم یجعل من باب الضمان بالخراج ثم لما کان قدر اللبن وقیمته بعد اهلاکه واتلافه متعذر المعرفة جدالا سیما عند تشاکش الشرکاء وفی مثل البدو وجب ان یضرب له حد معتدل بحسب المظنة الغالبیة یقطع به النزاع ولبن النوق فیه زهومة ویوجد رخیصا ولبن الغنم طیب ویوجد غالیا فجعل حکمهما واحدا فتعین ان یکون صاعا من ادنی جنس یقتاتون به کالتمر فی الحجاز والشعیر والذرة عندنا لامن الحنطة

والارزفانها اعلى الاقوات واغلاها واعتذر بعض من لم يوفق للعمل بهذا الحديث بضرب قاعد من عند نفسه فقال كل حديث لا يرويه الا غير الفقيه اذا نسد باب الراى فيه يترك العمل به وهذه القاعدة لا تنطبق على صورتنا هذه لانه اخرجه البخارى عن ابن مسعود ايضا وذ ميك به و لانه بمنزلة سائر المقادير الشرعية يدرك العقل حسن تقدير مافيه ولا يستقل بمعرفة حكم هذا القدر خاصة اللهم الاعقول الراسخين فى العلم

(میں کہتا ہوں) تصریہ تھنوں میں دودھ کے جمع کرنے کو کہتے ہیں- تاکہ خریدار دودھ کی زیادتی کا خیال کر کے دھوکے میں پڑ جائے- چونکہ اس کی شباہت خیار مجلس یا شرط کے بہت قریب تھی- کیونکہ سودے کا منعقد ہونا گویا کہ اسی بات پر ہے کہ وہ دودھ کی زیادتی سے مشروط ہے اس لئے خراج بالضمان کے باب سے نہیں بنایا گیا- پھر چونکہ دودھ کی مقدار اور اس کی قیمت اس کے تلف ہو جانے کے بعد بہت مشکل تھی کہ پہچانی جائے خصوصاً شرکاء کے جھگڑے کے وقت اور صحرا جیسے مقام میں تو واجب ہوا کہ اس کے لئے بموجب ظن غالب کے کوئی معتدل حد مقرر کی جائے جس سے نزاع قطع ہو جائے اور (چونکہ) اونٹنی کے دودھ میں بو ہوتی ہے اور ارزاں مل سکتا ہے- اور بکری کا دودھ عمدہ ہوتا ہے اور گراں ملتا ہے- اس لئے ان دونوں کا حکم ایک ہی رکھا گیا- پس متعین ہوا کہ وہ ایک صاع ہو- اس ادنیٰ جنس (غلہ) میں سے جو عام لوگوں کی خوراک ہو مثل کھجور کے حجاز میں اور جو اور جوار کے ہمارے ملک میں نہ گیہوں اور نہ چاول کی جنس سے کیونکہ یہ دونوں سب خوراکوں میں سے گراں اور اعلیٰ ہیں- اور جس شخص کو اس حدیث پر عمل کرنے کی توفیق نہیں ملی اس نے اپنے اپنے نفس سے ایک قاعدہ گھڑ کر یہ عذر بنایا اور کہا کہ ہر وہ حدیث جس کا راوی (صحابی) غیر

فقیہ ہو جب اس میں رائے (قیاس) کا دروازہ بند ہو جاتا ہو تو اس حدیث پر عمل ترک کر دیا جائے گا۔ اور یہ قاعدہ جیسا کچھ بھی (واہی) ہے۔ ہماری اس (پیش نظر) صورت پر منطبق بھی نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس مسئلہ (مصراۃ) کو امام بخاریؒ نے حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے بھی روایت کیا ہے اور وہ تمہارے لئے مجتہد ہونے میں کافی ہیں اور اس لئے بھی کہ اس (ایک صاع) کا تقرر شریعت کی مقرر کردہ مقداروں کی طرح ہے جس کے حسن و خوبی کو تو عقل پا سکتی ہے۔ لیکن خاص اس مقدار کی معرفت کو بالا ستقلال حاصل نہیں کر سکتی۔ مگر راسخین فی العلم کی عقل (جن کو منجانب اللہ بصیرت ہوتی ہے)

اسی طرح امام ابن تیمیہؒ الحرانی شیخ الاسلام "رسالہ فی معنی القیاس" میں لکھتے ہیں۔

وحقیقة الامر انه لم یشرع شئی علی خلاف القیاس الصحیح بل ما قیل انه علی خلاف القیاس فلا بدمن اتصافه بوصف امتیازیة عن الامور التی خالفها واقتضی مفارقته لها فی الحکم[1]

اور حقیقت امر یہ ہے کہ شریعت میں قیاس صحیح کی خلاف کوئی چیز مقرر نہیں کی گئی بلکہ جس امر کو خلاف قیاس کہا گیا ہے اس میں لازماً ایسا وصف ہے جس سے وہ ان امور سے ممتاز و الگ رکھا گیا۔ جس کے وہ خلاف ہے۔ اور اس سے مفارقت و جدائی کا متقاضی ہے۔

اس کے بعد شیخ الاسلام نے حدیث مصراۃ کا ذکر کر کے ان اعتراضوں کے جوابات ذکر کئے ہیں جو علمائے حنفیہ کی طرف سے اس حدیث کے متعلق کئے گئے ہیں۔ شیخ الاسلام کی تحریر کا حاصل مطلب یہ ہے کہ جن نصوص سے استنباط کر کے حنفیہ نے اس حدیث کو رد کیا ہے۔ یہ حدیث ان نصوص کی ہم قسم جزئی نہیں ہے بلکہ یہ مستقل ایک خاص صورت ہے جس کا حکم ان سے الگ ہونا چاہئے۔ پھر وجوہات

---

[1] مجموعہ رسائل شیخ الاسلام ص ۲۵۶ جلد ۲۔

[2] اعلام مصری ص ۱۲۶ ج ۲۔

مفارقت ذکر کیے ہیں جن کا بیان موجب طوالت ہے۔

اسی طرح حافظ ابن قیم نے بھی "اعلام الموقعین" میں اس حدیث پر مفصل لکھا ہے اور سب عذروں کو ایک ایک کر کے اڑا دیا ہے اور کہا ہے۔

کل ماذکرتموہ خطاء والحدیث موافق الاصول الشرعیۃ و قواعدھا ولو خالفھا لکان اصلابنفسہ کما ان غیرہ اصل بنفسہ واصول الشرع لا یضرب بعضھا ببعض کما نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یضرب کتاب اللہ بعضہ ببعض بل یجب اتباعھا کلھا ویقر کل منھا علی اصلہ وموضعہ فانھا کلھا عن عند اللہ الذی التقن شرعہ وخلقہ وما عدا ھذا فھو الخطاء الصریح

جو کچھ تم (حدیث مصراۃ کو رد کرنے والوں) نے ذکر کیا ہے۔ وہ بالکل خطا ہے اور یہ حدیث اصول شریعت اور اس کے قواعد کے (سراسر) موافق ہے۔ اور اگر (بالفرض) خلاف بھی ہو تو وہ بذات خود ایک اصل ہے جس طرح کہ دوسری احادیث اصل ہیں اور اصول شریعت کو ایک دوسرے سے ٹکرایا نہیں جاتا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا کہ کتاب اللہ کے بعض کو بعض سے ٹکرایا جائے۔ بلکہ سب (نصوص شرع) کی پیروی واجب ہے اور ہر ایک کو اس کے مقام و موضع پر مقرر کیا جائے کیونکہ وہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں جس نے اپنی شریعت کو بھی اور اپنی مخلوق کو بھی خوب پختہ بنایا (کہ ان میں کوئی کسر نہیں رکھی ہے) اور اس کے سوا جو کچھ بھی ہے سو وہ صریح خطا ہے۔

اب ہم بعض ایسے مسائل بیان کرتے ہیں۔ جن میں آنحضرت ﷺ حکیم حقانی رسول ربانی نے خریدار کے لئے سودا واپس کر دینے کا اختیار باقی رکھا ہے اور ان میں عامۃ الناس کی مالی اور اخلاقی بہبودی ملحوظ رکھی ہے۔

پہلی مثال صحیح مسلم وغیرہ میں ہے۔

عن ابی هريرة قال نهی رسول الله صلی الله عليه وسلم ان يتلقی الجرب فمن تلقی فاشتراه فاذاتی سيده السوق فهو بالخيار اخرجه الخمسة وهذا لفظ مسلم والترمذی وابی داؤد[1]

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے منع کیا کہ آگے جا کر بنجاروں سے ملا جائے پس اگر کوئی آگے جا کر ان سے مل کر مال خرید لے تو جب اس کا مالک بازار میں آوے تو وہ مختار ہے (چاہے بیع کو قائم رکھے چاہے توڑ دے)

دوسری مثال :

عن ابی هريرة ان رسول الله صلی الله عليه وسلم مرفی السوق علی صبرة طعام فادخل يده فيها فنالت اصابعه بللا فقال ما هذا يا صاحب الطعام فقال يا رسول الله اصابته السماء قال افلا جعلته فوق الطعام حتی يراه الناس من غشنا فليس منا

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ بازار میں غلہ کے ایک ڈھیر پر گذرے تو (وحی ربانی سے)[2] اس ڈھیر کے اندر ہاتھ ڈالا تو آپ کی انگلیوں کو کچھ تری محسوس ہوئی تو آپ نے فرمایا اے صاحب غلہ ! یہ کیا؟ اس نے عرض کیا یا رسول اللہ اس پر بارش پڑ گئی تھی آپ نے فرمایا تو پھر تو نے اسے اوپر کیوں نہ کر دیا کہ لوگ اس کو دیکھ لیتے (اور یہ بھی فرمایا) جو ہمیں دھوکا[3] دے گا وہ ہم میں سے نہیں ہوگا۔

اس حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ اپنے متاع کی کوئی ایسی بات چھپانی کہ اگر وہ ظاہر کی جائے گی تو خریدار نہ خریدے گا شریعت مطہرہ میں منع اور دیانت کے خلاف

---

[1] تیسیر الوصول جلد اول کتاب البیوع۔
[2] وحی کا ذکر ترمذی اور ابوداؤد کی روایت میں ہے۔
[3] صحیح مسلم کی دوسری روایت میں مطلقاً مَن غش بغیر ذکر مفعول کے ہے یعنی جس کسی کو بھی دھوکہ دے گا گنہگار ہوگا۔ عام اس سے کہ دوسرا شخص مسلمان ہو یا کون ہو۔

ہے-

اسلامیوں کا وطیرہ یہ ہونا چاہئے کہ جو کچھ بھی حقیقت ہے-وہ ظاہر کر دیں اس پر جو چاہے خریدے جو نہ چاہے نہ خریدے چنانچہ صحیح بخاری میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے عداء بن خالد (صحابی) کے پاس (غلام) بیچا تو آپ نے حضرت عداء کو یہ دستاویز لکھ دی-

هذا ما اشترى محمد رسول الله صلى الله عليه وسلم من العداء ابن خالد بيع المسلم المسلم لاداء ولا خبثة ولا غائلة[1]

یہ وہ ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ نے عداء بن خالد کے ہاتھ بیچا-ایسی بیع ہے جو ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے کیا کرتا ہے[2] کہ اس میں نہ کوئی بیماری ہے' اور نہ کوئی بری عادت ہے' اور نہ مکر و فریب یا زنا' چوری یا بے اجازت بھاگ جانے کا عیب-

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلامی طریق اور رسول اللہ (ﷺ) کی سنت یہ ہے کہ بائع اپنے مال کی حقیقت واقعی ظاہر کر دیوے-

اسی طرح ترمذی وغیرہ میں ہے-

عن عائشة ان رجلا ابتاع غلاما فاقام عنده ماشاء الله تعالى ثم وجدبه عيبا فخاصمه الى رسول الله صلى الله عليه وسلم فرده عليه فقال الرجل يا رسول الله قد استغل غلامى فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم الخراج بالضمان اخرجه اصحاب السنن-[3]

حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے ایک غلام خریدا- پس وہ

---

[1] صحیح بخاری کتاب البیوع فی ترجمہ باب اذا بین البیعان ولم یکتما-الخ

[2] سبحان اللہ! کیا پیارے الفاظ ہیں گویا سمجھا دیا کہ مسلمان کی شان یہ ہے کہ اس کا معاملہ ایسا ہو کہ اس میں کسی کا دھوکہ نہ ہو-

[3] تیسیر الوصول جلد ا ص ۷۵ مطبوعہ مطبع نولکشور کانپور-

غلام کچھ مدت اس کے پاس رہا پھر اس نے اس میں کوئی عیب پایا تو بائع اور مشتری دونوں وہ جھگڑا آنحضرت (ﷺ) کی جناب میں لائے تو آپ نے وہ غلام بائع کو واپس کر دیا۔ اس نے کہا یا رسول اللہ یہ مشتری میرے غلام سے نفع اٹھا تا رہا ہے۔ آپ نے فرمایا الخراج بالضمان[1] یعنی محاصل ضمان کی وجہ سے اسی کا حق ہے۔

یہ صورت جو اوپر مذکور ہوئی ہے اسے خیار عیب کہتے ہیں اور حنفیوں کے ہاں بھی مسلم ہے چنانچہ ہدایہ میں ہے۔

واذا طلع المشتری علی عیب فی المبیع فھو بالخیاران شاء اخذہ بجمیع الثمن وان شاء ردہ لان مطلق العقد یقتضی وصف السلامتہ فعند فواتہ یتخیر کیلا یتضرر بلزوم مالا یرضی بہ[2]

"اور جب خریدار مال بیع میں کسی عیب پر آگاہی پاوے تو وہ مختار ہے اگر چاہے تو اسے پوری قیمت کے عوض رکھ لے اور اگر چاہے تو اسے واپس پھر دے کیونکہ سودے کا پورا ہونا بالاطلاق عیب سے سلامت ہونے کو چاہتا ہے۔ پس سلامتی کے نہ ہونے کی صورت میں مشتری مختار ہے تاکہ وہ ایسی شے کے لازم ہو جانے سے ضرر نہ پاوے جس پر وہ راضی نہیں۔"

پھر عیب کی تعریف اس طرح کی ہے۔

---

[1] "الخراج بالضمان" کی تشریح میں مولانا وحید الزمان مرحوم وحید اللغات میں فرماتے ہیں۔ مثلاً ایک غلام خریدا اس کو کام میں لگایا کچھ منفعت کمائی اب اس میں ایسا عیب نکلا جو بائع نے مشتری کو نہیں بتلایا تھا۔ اور مشتری نے اس عیب کی وجہ سے وہ غلام بائع کو پھیر دیا۔ تو مشتری اپنی قیمت بائع سے واپس لے لے اور غلام کی کمائی جو مشتری کے پاس ہوئی وہ مشتری ہی کی ہو گی اس لئے کہ وہ اس غلام کا ضامن اور جواب دہ تھا اگر وہ ہلاک ہو جاتا تو اسی کا نقصان ہوتا۔ شریحؒ جو کوفہ کے قاضی تھے انہوں نے ایک مقدمہ میں ایسا ہی فیصلہ کیا کہا عیب دار غلام کو پھیر دے اور جو کچھ اس نے کمائی کی ہے وہ ضمان کی وجہ سے تیری ہی ہے (ص ۲۴ حرف الخاء) قلت کذافی النہایۃ للامام ابن الاثیر اور امام ترمذی نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔ میر سیالکوٹی

[2] ہدایہ کتاب البیوع باب خیار العیب۔

وکل ما او جب نقصان الثمن فی عادۃ التجار فھو عیب

"ہر وہ امر جس سے تاجروں کے نزدیک مال کی قیمت کم ہو جاتی ہو وہ عیب ہے۔" اب دیکھنا چاہئے کہ تصریہ کی صورت میں اگر مثلاً کسی گائے کا دودھ آٹھ سیر نکلا اور اس کی قیمت ایک سو روپیہ ہوئی اور خریدنے کے بعد گھر جاکر دوسرے وقت میں چھ سیر دودھ ہوا۔ اور اس نے اسے بیچنا چاہا تو اس جانور کی قیمت سو روپیہ مل جائے گی؟ اگر نہیں مل سکتی تو تصریہ کو عیب کے سلسلہ میں کیوں نہ لیا جائے۔ کیونکہ اس کی صورت یہ ہے کہ جانور کے تھنوں میں دودھ جمع رہنے دیا جاتا ہے تاکہ خریدار کو زیادہ معلوم ہو اور حقیقت میں عادۃً اس جانور کا ایک وقت کا دودھ اتنا نہیں ہوتا۔ تو خریدار دھوکہ کھا جاتا ہے پس شریعت مطہرہ نے (جو لوگوں کے مالوں کی بھی ویسی ہی محافظ ہے جیسی ان کی جانوں کی اور عزتوں کی ہے) ایسے سودے میں مشتری کو اختیار دیا کہ اگر اسے پسند نہیں ہے تو واپس کر دیوے اور یہ عین عدل ہے۔

ایک اور نکتہ کی بات ہے کہ "ہدایہ" میں خیار عیب کی علت یہ بیان کی ہے۔

کیلا یتضرر بلزوم مالا یرضی بہ

تاکہ مشتری اس بیع کے لازم ہونے سے نقصان نہ اٹھاوے جس پر وہ راضی نہیں ہے۔

اور حدیث زیر بحث میں بھی یہی ہے کہ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں۔

وان سخطھا ردّھا[1]

یعنی وہ اس پر راضی نہیں تو واپس کر دیوے۔

پس اب تو موافقت کی صورت نکل آئی کہ حنفی بزرگ بھی ناراضی کی صورت میں بیع کو لازم نہیں کرتے اور حدیث میں بھی یہی ہے تو اختلاف کس امر میں رہا اسی امر میں کہ ہم حنفی ہیں اور ہمارے بزرگوں نے اس حدیث پر عمل نہیں کیا۔ اور یہ خصلت درست نہیں کیونکہ حدیث رسول اللہ (ﷺ) کے آگے جب وہ صحت کو پہنچ جائے

---

[1] صحیح بخاری کتاب البیوع باب النھی للبائع ان لا یحفل الابل الخ

سر تسلیم خم کر دینا چاہئے۔ کیونکہ سب مسلمان اس دربار کے غلام ہیں۔ کسی کو یہ اختیار نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے حکم کے آگے سر اٹھا سکے۔ چنانچہ خداوند تعالیٰ نے فرمایا۔

وما كان لمومن ولا مومنة اذا قضى الله ورسوله امرا ان يكون لهم الخير من امر هم ومن يعص الله ورسوله فقد ضل ضلا لا مبينا (احزاب پ ۲۲)

اور کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ جائز نہیں کہ جب اللہ (تعالیٰ) اور اس کا رسول (ﷺ) کسی امر کا فیصلہ کر دیوے تو ان کو اپنے اس امر میں کچھ اختیار باقی رہے اور جو کوئی اللہ کی اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا وہ صریح گمراہی میں پڑے گا۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ "ہدایہ" میں جو "مطلق العقد" یعنی یہ سودے کا مقرر ہو جانا تقاضا کرتا ہے کہ مال عیب سے بری ہے۔ پس جب وصف سلامت نہ پایا گیا تو مشتری کو واپسی کا اختیار ہونا چاہئے۔ کیونکہ سودے کے وقت جو حالت جانور کی دکھائی گئی تھی۔ وہ اس کی واقعی و حقیقی نہ تھی۔ بلکہ بناوٹی تھی اور وہ اس کے بعد پائی نہیں گئی اور عادۃً یہ امر مثل اس معاملہ کے ہے جس میں ناپسندیدگی پر واپسی کی شرط کر لی گئی ہو پس مشتری کو واپس کرنے کا حق ہونا چاہیے چنانچہ حاشیہ "ہدایہ" میں وصف السلامتہ پر کہا ہے۔

اى سلامة المعقود عليه فكانت سلامته كالمشروط صريحا لكونها مطلوبة عادة فعند فوات وصف السلامة يتخير المشترى اذ لو لزم العقد للزم بدون رضاء ولا بد من رضاه[1]

وہ جس کا سودا کیا گیا (سلامت چاہئے) پس اس کی سلامتی مثل اس کے ہے جس میں صریحاً شرط کر لی گئی ہو کیونکہ عادۃً سلامتی (بے عیب ہونا) مطلوب ہوتا ہے پس وصف سلامتی کے نہ ہونے کی صورت میں مشتری کو اختیار ہے کیونکہ اگر وہ بیع لازم قرار دی جائے تو اس کی رضا کے بغیر منعقد ہو

۱۔ "ہدایہ" مُحشی مولوی عبدالحیٰ مطبوعہ مطبع فاروقی دہلی ص ۲۴ در حاشیہ نمبر ۱۵۔

گی اور اس میں اس کی رضا ضروری ہے۔

اس عبارت پر غور کیجئے کہ فطرت کی شہادت سے یہ بزرگ وہی کچھ کہہ رہے ہیں جو حدیث کا منشاء ہے۔ لیکن جب تصریہ کا بالخصوص نام آجائے تو مخالفت کریں گے۔ اس لئے کہ ان کے مذہب میں اسے تسلیم نہیں کیا گیا تو معلوم ہوا کہ انکار کی وجہ صرف مذہبی تقلید ہے ورنہ دلیل اور شہادت فطرت اس کے خلاف ہے۔

تیسرا نکتہ یہ کہ "متن ہدایہ" میں فصل فیما یکرہ میں چند ایسی باتیں مکروہ (قریب بحرام) لکھی ہیں مثلاً کہا ہے۔

ونهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن النجش وعن السوم على سوم اخيه وعن بيع الحاضر للبادى[1]

منع کیا رسول اللہ ﷺ نے نجش[2] سے اور اپنے (مسلمان) بھائی کے سودے پر سودا کرنے سے اور شہری آدمی کے بدوی کے لئے بیچنے سے۔

اور یہ وہی امر ہیں جو حدیث ابو ہریرہ میں مع حکم تصریہ کے بھی مذکور ہیں۔ چنانچہ صحیح بخاری میں ہے۔

عن ابى هريرة ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال لا تلقوا الركبان ولا يبيع بعضكم على بيع بعض ولا تناجشوا ولا يبيع حاضر لباد ولا تصروا لغنم ومن ابتاعها فهو بخير النظرين بعد ان يحلبها ان رضيها امسكها وان سخطها ردها وصاعا من تمر[3]

حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم بنجاروں کو ان کے بازار میں مال اتارنے سے پہلے آگے جا کر (راستے میں) نہ ملا کرو۔ اور کوئی شخص دوسرے کی بیع پر بیع نہ کرے۔ اور محض قیمت بڑھانے کے لئے

---

[1] ہدایہ کتاب البیوع

[2] نجش یہ ہے کہ قیمت بڑھانے کے لئے نمائشی خریدار بن بیٹھے اور خریدنے کا قصد نہ ہو چونکہ اس میں بھی دھوکہ ہے اس لئے آنحضرت ﷺ نے اس سے منع فرمادیا۔ سبحان اللہ!

[3] کتاب البیوع باب النہی للبائع الخ

(نمائشی) خریدار نہ بنا کرو- اور کوئی شہری کسی بدوی کے لئے بیع نہ کیا کرے اور تم بکری کے تھنوں میں دودھ نہ روکا کرو- اور جو کوئی ایسی بکری کو خریدے تو وہ دودھ دوہ لینے کے بعد دو امروں میں سے ایک کا مختار رہے- اگر اسے پسند ہے تو رکھ لے اور اگر پسند نہیں تو اسے واپس کر دے اور ایک صاع تمر بھی (ساتھ دیوے)-

دیکھئے اس حدیث میں وہ تین امر بھی مذکور ہیں جو "ہدایہ" میں مذکور ہیں اور ان کی بنا حدیث رسول اللہ ﷺ پر رکھی گئی ہے تو اگر یہ بزرگ (خدا ان پر رحمت کرے) رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہی کی خاطر تصریہ کا حکم بھی لکھ دیتے تو کیسا اچھا ہوتا سارے مسائل حدیث کے موافق ہو جاتے اور مخالفت دور ہو جاتی-

اب ایک بات رہ گئی کہ اگر کہا جائے کہ خیر واپسی کا اختیار تو مان لیا- لیکن ایک صاع تمر ساتھ دینے کا حکم کیوں کیا؟ حالانکہ حدیث ہی سے اوپر گذر چکا ہے "الخراج بالضمان"[1] یعنی محاصل کا حق ضمانت کی وجہ سے مشتری کو ہے تو مصراۃ کی واپسی میں تو مشتری کو لینے کے دینے پڑ گئے تو اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث "الخراج بالضمان" کے معنی یہ تھے کہ اگر وہ غلام اس مشتری کے پاس ہونے کی حالت میں مر جاتا تو نقصان اس مشتری ہی کا ہوتا پس اس کی اس عرصہ کی کمائی کا مشتری ہی مستحق ہونا چاہئے اور مشتری کو دودھ کا عوض دینے کا حکم کیا- تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تصریہ کی حالت میں دودھ جزو بیع تھا یعنی جانور کے ساتھ ہی تھا- نیا پیدا نہیں ہوا- پس جب جانور واپس کر دیا تو اس کا دودھ بھی واپس کرنا چاہئے اور دودھ اس دودھ سے مختلط ہو گیا جو بعد سودے کے پیدا ہوا اور ان میں تمیز مشکل تھی تو اس کے عوض جھگڑا چکانے کے لئے کچھ ادا کرنے کا حکم کیا- اور چونکہ عربوں کی عام اور آسان قوت کھجور تھی- اس لئے کھجور کا حکم کیا- چنانچہ اس کا ذکر "حجۃ اللہ" کی عبارت میں گذر چکا ہے اور حضرت شیخ الاسلام رسالہ "قیاس" میں "الخراج بالضمان" کے جواب میں فرماتے ہیں-

---

[1] اخرجہ الترمذی والحاکم وغیرہما-

واما قوله الخراج بالضمان فاولا حديث المصراة اصح منه باتفاق اهل العلم مع انه لا منافاة بينهما فان الخراج ما يحدث في ملك المشترى ولفظ الخراج اسم للغة مثل كسب العبد واما اللبن ونحوه فملحق بذلك وهنا كان اللبن موجودا في الضرع فصار جزاء من المبيع ولم يجعل الصاع عوضا عما حدث بعد العقد بل عوضا من اللبن الموجود في الضرع وقت العقد واما تضمين اللبن بغيره وتقديره بالشرع فلان اللبن المضمون اختلط باللبن الحادث بعد العقد فتعذرت معرفة قدره فلهذا قدر الشرع البدل قطعا للنزاع وقدر بغير الجنس لان التقدير بالجنس قد يكون اكثر من الاول او اقل فيفضى الى الربا بخلاف غير الجنس فانه كان اتباع لذلك اللبن الذى تعذرت معرفة قدره بالصاع من التمر والتمر كان طعام اهل المدينة ومكيل مطعوم يقتات به كما ان اللبن مكيل مقتات وهو ايضا يقتات به بلا بصنعة بخلاف الحنطة والشعير فانه لا يقتات به الابصنعة فهو اقرب اجناس التى يقتاتون بها الى اللبن ولهذا كان من موارد الاجتهاد ان جميع الامصار يضمنون ذلك لمن يقتاتا لتمر فهذا من موارد الاجتهاد كامره فى صدقة الفطر بصاع من شعير او تمر (رسالہ قیاس مشمولہ مجموعہ رسائل شیخ الاسلام جلد ثانی ص۲۵۷)

لیکن آپ کا یہ قول کہ محاصل ضمانت کے عوض میں ہے تو اس کا جواب اولاً تو یہ ہے کہ حدیث مصراۃ اس حدیث (الخراج بالضمان) کی نسبت باتفاق اہل علم زیادہ صحیح ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ ان دونوں میں کوئی منافات نہیں کیونکہ محاصل سے وہ چیز مراد ہے جو مشتری کی ملک میں ہوتے ہوئے پیدا ہو اور لفظ خراج اس محاصل کا نام ہے مثلاً غلام کی کمائی۔ اور دودھ اور مثل اس کی

اور چیزیں اس سے ملحق ہیں اور یہاں (مصراۃ کی صورت میں) دودھ تھنوں میں آگے ہی (بیع کے وقت) موجود تھا۔ پس وہ بیع کا جزو ہو گیا۔ اور ایک صاع تمر اس دودھ کا عوض نہیں کیا گیا جو بیع ہو چکنے کے بعد پیدا ہوا۔ بلکہ اسی دودھ کا عوض ہے جو بیع کے وقت تھنوں میں موجود تھا۔ اور شریعت نے دودھ کا عوض جو غیر دودھ کو مقرر کیا۔ یعنی کھجوروں کو تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ دودھ جس کا عوض دلایا گیا ہے اصل دودھ سے جو بیع منعقد ہو جانے کے بعد پیدا ہوا مل گیا تو اس کے مقدار کی شناخت نہایت مشکل ہو گئی۔ پس اس لئے شریعت (مطہرہ) نے جھگڑا قطع کرنے کے لئے اس کا بدل مقرر کیا اور غیر جنس سے اس لئے مقرر کیا کہ ہم جنس مقرر کرنے میں کبھی زیادتی ہو گی اور کبھی کمی تو یہ ربا (سود بیع) ہو جائے گا اور غیر جنس کے مقرر ہونے میں یہ بات نہیں ہو سکتی اس کی صورت تو یہ ہو جائے گی کہ گویا وہ دودھ جس کی مقدار کی شناخت مشکل ہو گئی ہے ایک صاع تمر کے عوض خریدا گیا ہے۔ اور تمر (کھجور) اہل مدینہ کی عام خوراک تھی اور یہ پیمانے سے لی دی جاتی ہے۔ اور بطور غذا کے کھائی جاتی ہے اور اسی طرح دودھ بھی ایسی چیز ہے جو پیمانہ سے لی دی جاتی ہے اور غذا کی چیز ہے نیز کھجور ایسی خوراک ہے جو بغیر انسانی کسب اور صنعت کے خوراک بنتی ہے اور گیہوں اور جو بھی خوراکی چیزیں تو ہیں لیکن بغیر انسانی کسب اور صنعت کے خوراک نہیں بنتیں۔

"پس کھجور دوسری جنسوں کی نسبت دودھ کے زیادہ قریب جنس ہے اور اسی لئے یہ بات اجتہادی امروں میں سے ہے کہ سب شہروں کے لوگ اس کا عوض ایک صاع تمر کر دیا کریں یا یہ امر صرف انہی کے لئے ہے کہ کھجور جن کی خوراک میں ہو پس یہ بات اجتہادی امروں میں سے ہے مثل اس حکم کے جو آنحضرت ﷺ نے صدقہ فطر کے متعلق ایک صاع جو یا کھجور کا کیا۔"

الحمد للہ کہ حدیث مصراۃ کے متعلق امور ثمانیہ کا بیان تفصیل سے بیان ہو چکا

جس سے ثابت ہو گیا ہے کہ حدیث صحیح و ثابت ہے اور اس سے انکار کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

اس سے ہماری اصل غرض صاف ثابت ہے کہ محدثین علیہم الرحمتہ رسول اللہ ﷺ کی صحیح حدیث کی پیروی میں قیل و قال اور حیل و حجت نہیں کرتے۔

سچی فقاہت جس کی نسبت آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے۔

من یرد اللہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین۔

"اللہ تعالیٰ کو جس کسی کی بھلائی منظور ہوتی ہے تو اسے دین کی سمجھ عطا کر دیتا ہے۔"

صرف محدثینؒ کے حصہ میں ہے۔ جن کی زندگی کا اعلیٰ مقصد حدیث رسول اللہ ﷺ کی خدمت اور اس کی پیروی ہے۔ ان کا یہ وطیرہ ہرگز نہیں کہ اگر کسی حدیث کی حکمت معلوم نہیں ہو سکی تو اپنی ناقص سمجھ کو کامل و بے قرار دے کر ٹال دیا جائے۔

واللہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم۔

<u>ایک بھاری وہم کا ازالہ</u> :- بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت امام صاحب رحمتہ اللہ علیہ کا طریق اجتہاد محدثین علیہم الرحمتہ کے طریق سے جدا ہے اور آپ قیاس کو حدیث پر مقدم رکھتے تھے۔ اس کا جواب تفصیل طلب ہے جس کا بیان مختصراً یہ ہے کہ اس عاجز زلہ ربائے علمائے متقدمین کی تحقیق جو دیانت و ادب ہر دو امروں کو ملحوظ رکھ کر ہے یہ ہے کہ حضرت امام صاحب اہلسنت اور اہل حدیث کے پیشوا تھے۔ جیسا کہ باب اول کے ضمیمہ فصل سوم میں آپ کے خصوصی حالات میں ائمہ اہل حدیث مثل امام ذہبیؒ اور حافظ ابن حجرؒ اور امام ابن تیمیہؒ رحمہم اللہ کے اقوال سے گذر چکا ہے اس کے علاوہ اس موقع پر آپ کے طریق اجتہاد کا بیان مختصراً یہ ہے کہ دلائل شرع کے اصول اجتہاد یا بنائی قیاس ہیں تین امر ہیں۔ قرآن اور حدیث صحیح اور اجماع امت اور چوتھی دلیل وہ قیاس ہے جو (قواعد مسلمہ و مقررہ کے رو سے) ان تینوں میں سے کسی ایک سے مستنبط ہو۔ اس تفصیل سے جو ہم نے بیان کی کسی امام حدیث یا امام فقہ کو انکار نہیں ہاں

شرائط تنقید و اعتبار میں جس طرح بعض مقامات میں دیگر محدثین میں اختلاف ہے۔ اسی طرح بعض شروط میں امام صاحبؒ کا بھی اختلاف ہو تو یہ قابل گرفت نہیں اصول حدیث اور اصول درایت پر نظر رکھنے والے علماء سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے چنانچہ نور الانوار کے متن منار میں ہے۔

اعلم ان اصول الشرع ثلثة الکتاب والسنة و اجماع الامة والا صل الرابع القیاس (نور الانوار ص۶' ۷)

"جان تو کہ دلائل شرع کے متن ہیں۔ قرآن شریف اور حدیث شریف اور اجماع امت اور چوتھی دلیل قیاس ہے۔"

اس کی شرح میں ملا احمدؒ صاحب (استاد شہنشاہ غازی عالمگیر رحمتہ اللہ علیہما) نور الانوار میں فرماتے ہیں۔

ھو القیاس المستنبط من ھذہ الاصول الثلثة (نور الانوار مطبوعہ لکھنو ص۷)

"وہ قیاس دلیل شرع ہو سکتا ہے جو ان تین اصول (مذکورہ) سے مستنبط ہو۔"

علاوہ اس کے ہم حافظ ابن حجرؒ کی تہذیب التہذیب سے ایک خاص حوالہ ذکر کرتے ہیں جس سے امام صاحب رحمتہ اللہ علیہ کا مذہب نہایت صفائی سے معلوم ہو جائے گا اور سب وہم دور ہو جائیں گے۔ وہ یہ کہ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں۔ یحییٰ بن ضریس کہتے ہیں کہ میں امام سفیانؒ کی مجلس میں حاضر تھا کہ آپ کے پاس ایک شخص آیا۔ اور پوچھنے لگا کہ آپ امام ابو حنیفہؒ میں کیا عیب پاتے ہیں امام سفیانؒ نے سوال کیا کیوں ان کو کیا ہے؟ اس شخص نے کہا میں نے امام ابو حنیفہؒ کو فرماتے سنا کہ میں پہلے اللہ تعالیٰ کی کتاب (قرآن) کو لیتا ہوں اگر وہ مسئلہ اس میں نہیں پاتا تو رسول خدا (ﷺ) کی سنت کو لیتا ہوں اگر اس میں بھی نہیں پاتا تو صحابہ سے جس کا قول پسند کرتا ہوں لے لیتا ہوں اور ان کے قول کو چھوڑ کر کسی اور طرف نہیں جاتا۔ لیکن جب ابراہیم (نخعیؒ) اور شعبی اور محمد بن سیرین اور عطاء (بن رباح) تک نوبت آجائے تو یہ ایسے لوگ ہیں

جنہوں نے اجتہاد کیا تھا۔ سو جس طرح انہوں نے اجتہاد کیا تھا میں بھی اجتہاد کرتا ہوں (تہذیب التہذیب جلد دہم ص ۴۵۱)۱۲۔ یہ عبارت امام صاحب کا مسلک بتانے میں بالکل صاف ہے۔ علاوہ اس کے یہ معلوم کل ہے کہ آپ مرسل روایت کو امام مالکؒ کی طرح مطلقاً حجت مانتے ہیں۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ آپ قیاس کے مقابلہ میں ضعیف حدیث کو مقدم جانتے تھے کہ ضعیف کا ضعف عارضی ہے اس میں احتمال صحت کا ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اس کے مقابلہ میں قیاس کی ضرورت نہیں۔ بھلا وہ شخص جو صحابی کے قول کے سامنے بھی قیاس نہ کرتا ہو۔ وہ صحیح حدیث کو عمداً کس طرح ترک کر سکتا ہے۔ فتنبہ۔

فرقہ اہل حدیث میں باہمی اختلاف

آپ فصول سابقہ میں پڑھ چکے ہیں کہ اہل حدیث کا مذہب ہے نصوص قران و حدیث کی اتباع کرنا۔ جسے اس شعر میں بتلایا گیا ہے ؎

اصل دین آمد کلام اللہ معظم داشتن
پس حدیث مصطفےٰ برجاں مسلم داشتن

الحمد للہ کہ ان کا باہمی اختلاف اس اصول سے ہٹ کر نہیں ہوا جیسا کہ دوسرے فرقوں میں ان کے متقدمین و متاخرین میں خاص ان امور میں بھی اختلاف ہوا جن سے وہ دوسروں سے متمیز ہوئے تھے۔

اہل حدیث میں جو کچھ باہمی اختلاف ہوا اس کی صورت یہ ہے کہ نصوص قرآن و حدیث کے سمجھنے میں اہل حدیث کے دو مسلک ہوئے۔

ایک یہ کہ نصوص شریعت کو ان کے ظاہری و عرفی یا شرعی معانی تک محدود سمجھا جائے اور کوئی ایسا امر جو ان کے مفہوم لغوی یا عرفی یا شرعی سے خارج ہو اس کو حکم میں داخل نہ کیا جائے۔ مثلاً حدیث میں گیہوں جو وغیرہ چھ چیزوں کی بیع میں ان کے ہم جنس ہونے کی صورت میں جو حکم ہے کہ وہ برابر برابر ہوں اہل حدیث کے ایک گروہ کے نزدیک یہ حکم خاص انہی چھ چیزوں تک محدود ہے جو حدیث میں مذکور ہیں باقی چیزیں اس حکم میں داخل نہیں ہیں۔

دوم یہ کہ کبھی (برعایت قواعد و قرائن) نصوص کے حقیقی معانی میں کوئی ☐ پیدا کر کے ان سے استنباط بھی جائز ہے۔ مثلاً اہل اجتہاد کے نزدیک انہی محولہ بالا چھ چیزوں کے حکم میں باقی چیزیں اس طرح داخل ہیں کہ گیہوں وغیرہ چیزوں کا لین دین ماپنے اور تولنے ہر دو طریق سے ہوتا ہے اور سونے چاندی کا لین دین صرف تولنے سے ہوتا ہے تو اب باقی چیزیں بھی جن کا لین دین ماپنے یا تولنے سے ہوتا ہے اس حکم میں

داخل ہیں۔

اہل حدیث میں یہ اختلاف مسلک کوئی نئی بات زمانہ مابعد میں نہیں ہوئی۔ بلکہ خود آنحضرت ﷺ کی موجودگی ہی میں فہم کتاب کے متعلق صحابہؓ دو طریق پر تھے۔ بعض اہل ظاہر جو خطاب شرع کو ظاہری معنوں پر مقصود رکھتے تھے اور بعض اہل استنباط جو ظاہری معنوں کو چھوڑ کر حالت خطاب کو نگاہ رکھ کر ان سے کوئی خاص مراد سمجھتے تھے۔ چنانچہ صحیح بخاری شریف میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یہود بنی قریظہ کے محاصرے کے لئے لشکر بھیجا تو اسے یہ حکم بھی دیا۔

لا یصلین احد العصر الا فی بنی قریظة فادرك بعضهم العصر فی الطریق فقال بعضهم لانصلی حتی ناتیها وقال بعضهم بل نصلی لم یرد منا ذلك النبی صلی الله علیه وسلم فلم یعنف واحدا منهم

(بخاری جلد دوم باب مرجع النبی من الاحزاب الخ)

”نہ پڑھے تم میں سے کوئی نماز عصر مگر بنی قریظہ کی بستی میں پس بعض کو عصر کا وقت رستے ہی میں ہو گیا تو ان میں سے بعض کہنے لگے کہ ہم نماز نہیں پڑھیں گے۔ حتی کہ ہم اس بستی میں پہنچ جائیں اور دوسروں نے کہا کہ آنحضرت ﷺ کی مراد اس حکم سے یہ نہیں ہے اس لئے ہم تو نماز یہیں پڑھ لیتے ہیں۔ پس یہ معاملہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ذکر کیا گیا تو آپ نے دونوں فریق سے کسی کو بھی زجر و توبیخ نہ کی۔“

اس حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ صحابہ کرامؓ میں سے بعض نے آنحضرت ﷺ کے خطاب کو ظاہر الفاظ پر حمل کیا۔ اور بعض نے ظاہر کے سوا ایک مخصوص مراد سمجھی۔ اور آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی تو آپ نے کسی فریق کو بھی زجر و توبیخ نہ کی۔

خاتمۃ الحفاظ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری شرح صحیح بخاری میں فرماتے ہیں۔

قال السهیلی وغیره فی هذا الحدیث من الفقه انه لا یعاب علی من اخذ بظاهر حدیث او اية وعلی من استنبط من النص معنی یخصصه

"امام سہیلی وغیرہ نے کہا کہ اس حدیث سے یہ بات مستنبط ہوتی ہے کہ جو شخص کسی حدیث یا آیت کے ظاہری معنی لے تو اسے برا نہ جانیں اور اسی طرح اسے بھی برا نہ کہیں جو کسی نص سے کوئی مخصوص معنی استنباط کرے۔"

اور اس کے بعد فرماتے ہیں۔

وحاصل ماوقع في القصة ان بعض الصحابة حملوا النهي على حقيقة قوله وبعض الاخر حملوا النهي على غير الحقيقة وانه كناية عن الحث والاستعجال والاسراع الى بني قريظة (فتح الباری پارہ ۱٦ ص٦٧ مطبوعہ دھلی)

حاصل قصہ یہ ہے کہ بعض اصحاب نے نہی کو حقیقت پر سمجھا اور بعض نے غیر حقیقت پر اور کہا کہ یہ کنایہ ہے۔ بنی قریظہ کی بستی میں بہت جلدی پہنچنے کی ترغیب کا۔

پہلے گروہ (اہل ظاہر) میں سے یہ بزرگ ہیں امام ابو داؤد بن علی اصبہانیؒ اور امام حافظ ابن حزمؒ قرطبیؒ وغیرہما۔ اور دوسرے گروہ میں سے یہ ہیں امام مالکؒ' امام شافعیؒ' امام احمد بن حنبلؒ' امام بخاریؒ اور امام ترمذی وغیرہم رحمتہ اللہ علیہم اجمعین۔

دفع دخل :- شاید کسی کے ذہن میں یہ کھٹکے کہ جس نوع کا اختلاف تم اہل حدیث میں بتا کر ان میں سے ایک گروہ کو اہل اجتہاد و استنباط کہتے ہو۔ اور ان کی روش یہ بتلاتے ہو کہ وہ کسی نص میں اس کے ظاہری معنی کے سوا برعایت قواعد و قرائن کوئی مخصوص معنی مراد لینا جائز جانتے ہیں۔ اور حضرات احناف کا مسلک بھی تو یہی ہے تو پھر تم ان کو اہل رائے کیوں کہتے ہو۔ اور اہل حدیث کیوں نہیں جانتے؟ تو اس کا مفصل جواب تو فصل سابق سے معلوم ہو چکا ہے کہ دونوں کے مسلک اجتہاد میں بہت فرق ہے اسی لئے اہل نظر برابر اہل حدیث اور اہل رائے کو دو جدا جدا گروہ قرار دیتے چلے آئے ہیں۔ چنانچہ علامہ شہرستانی (المتوفی ۵۴۸ھ) میں اپنی مشہور کتاب الملل والنحل میں مجتہدین فی الفروع کے ضمن میں فرماتے ہیں۔

ثم المجتهدون من ائمة الامة محصورون في صنفين لا يعدون الى ثالث اصحاب الحديث واصحاب الرأى. اصحاب الحديث وهم اهل الحجاز هم اصحاب مالك بن انس واصحاب محمد بن ادريس الشافعي واصحاب سفيان الثورى واصحاب احمد بن حنبل واصحاب داؤد بن على بن محمد الاصبهانى (انتهى بقدر الحاجة جلد ۲ ص ٤٦)

''امت کے مجتہد صرف دو قسم پر ہیں- تیسری کوئی نہیں-اصحاب حدیث اور اصحاب رائے اصحاب حدیث جو اہل حجاز و(مکہ مدینہ والے) ہیں اور وہ یہ ہیں امام مالکؒ کے شاگرد اور امام شافعیؒ کے شاگرد اور امام سفیانؒ کے شاگرد اور امام احمدؒ کے شاگرد اور امام داوٗدؒ کے شاگرد-

اور اس سے اوپر اصحاب ظاہر کا ذکر کر کے کہتے ہیں-

ومن اصحاب الظاهر مثل داؤد الاصبهاني وغيره (ج ۲ ص ٤٥)

اور اصحاب ظاہر سے مثلاً امام داوٗد اصبہانیؒ وغیرہ-

اسی طرح علامہ موصوف اہل الرائے کی نسبت فرماتے ہیں-

اصحاب الرأى وهم اهل العراق اصحاب ابى حنيفة النعمان بن الثابت (ج ۲ ص ٤٦)

اصحاب رائے اور وہ اہل عراق ہیں وہ امام ابو حنیفہ نعمان بن ثابتؒ کے شاگرد ہیں-

اسی طرح علامہ ابن خلدون اپنی تاریخ کے مقدمہ میں صحابہ کے بعد کے زمانے کی نسبت فرماتے ہیں-

طريقتين طريقة اهل الراى والقياس وهم اهل العراق وطريقة اهل الحديث وهم اهل الحجاز (جلد اول ص ۲۷۲ علم الفقه)

ان میں فقہ دو طریقوں پر منقسم ہوئی-اہل رائے وقیاس کے طریقے پر اور وہ

اہل عراق ہیں اور اہل حدیث کے طریقہ پر اور وہ اہل حجاز ہیں-"
پھر اس سے تھوڑا آگے اصحاب ظواہر اور ان کے امام داؤد بن علیؒ اصبہانی کا ذکر ہے- ان عبارتوں سے صاف ظاہر ہے کہ اہل حدیث اور اہل رائے کا مصداق ایک نہیں بلکہ دو مختلف گروہ ہیں- اہل رائے تو امام ابو حنیفہؒ اور ان کے اصحاب ہیں اور امام مالکؒ' امام شافعیؒ' امام احمدؒ' امام سفیانؒ ثوری اور امام داؤدؒ علیہم اجمعین سب کے سب اہلحدیث ہیں- الا موخر الذکر (امام داؤد) اہل ظاہر سے ہیں اور باقی سب اہل اجتہاد و استنباط-

فرقہ اہل حدیث کے باہمی اختلافات نمبر ٢ :

یہی اختلاف مسلک آیات صفات کے سمجھنے میں ہوا کہ بعض نے تو مثلاً ید' عین وغیرہ کی بابت کہا کہ یہ صفات الہیہ کے نام ہیں جو ان الفاظ سے تعبیر کی گئیں- گویا ان کو بمنزلہ "حقائق شرعیہ" کے جانا جن کی حقیقت و کیفیت کے علم کو تو کیا سپرد خدا اور تاویل سے کیا سکوت اور ان کے حقائق لغویہ یا عرفیہ کے رو سے جو تشبیہ لازم آتی تھی اس سے کیا انکار- لہذا ان کا نام ہوا اہل تفویض اس طریق میں یہ خوبی ہے کہ اس میں نہ تو معطلین کی طرح صفات سے انکار ہے اور نہ مشبہین و مجسمہ کی طرح ذات بر حق کو جسمانی جانتا ہے بلکہ حدیث "انت کما اثنیت علی نفسك" کا نقشہ نظر میں اور اسی کا اثر دل پر جما رہتا ہے-

اور دیگر بعض نے کہا کہ ان آیات میں جب حقیقی معنی مراد نہیں ہیں تو حسب قرائن ان سے مجازی معنی مراد ہیں ان کو اہل تاویل کیا گیا- چنانچہ امام شوکانی (ان پر ہو رحمت رحمانی) جو متاخرین اہل حدیث میں بڑے پائے کے امام ہیں اور اہل تفویض میں سے ہیں ارشاد الفحول میں آیات صفات میں تاویل کرنے کے متعلق فرماتے ہیں-

وقد اختلفوا فی ھذا القسم علی ثلثة مذاھب (الاول) انه لا مدخل للتاویل فیھا بل یجری علی ظاھرھا ولا یوول شئی منھا وھذا قول المشبه (والثانی) ان لھا تاویلا ولکنا نمسك عنه مع تنزیه اعتقادنا عن

التشبیه والتعطیل لقوله تعالی (وما یعلم تاویله الا الله) قال ابن برهان وهذا قول السلف (والمذهب الثالث) انها مؤولة قال ابن برهان والاول من هذا المذاهب باطل والاخران منقولان عن الصحابة ونقل هذا المذهب الثالث عن علی وابن مسعود و ابن عباس وام سلمة انتهی ملخصا (ارشاد الفحول مطبوعه مصر ص ۱۶۴)

اس قسم میں (آیات صفات کی تاویل میں) علماء امت کے تین مذہب ہیں (اول) یہ کہ ان میں تاویل کو دخل نہیں بلکہ ان کو ان کے ظاہر پر جاری کیا جاوے اور ان میں سے کسی کی بھی تاویل نہ کی جائے اور یہ قول مشبہین کا ہے (دوسرا) یہ کہ ان کی کوئی تاویل تو ضرور ہے لیکن ہم اس تاویل سے رکے رہتے ہیں اور اس کے ساتھ یہ بھی اعتقاد رکھتے ہیں کہ اللہ تعالی تشبیہ (کسی کی طرح ہونے) اور تعطیل (صفات سے معطل و خالی ہونے) سے پاک ہے۔ بدیں قول الہی "وما یعلم تاویله الا لله" ابن برہان نے کہا سلف کا یہی قول ہے۔ (اور تیسرا مذہب یہ ہے) کہ یہ آیات قابل تاویل ہیں' ابن برہان (مذکور) نے کہا ان مذاہب (مذکورہ بالا) میں سے پہلا مذہب یعنی تشبیہ تو باطل ہے اور دوسرے دنوں صحابہؓ سے منقول ہیں۔ اور یہ تیسرا مذہب یعنی تاویل والا حضرت علی اور ابن مسعود اور ابن عباس اور ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے منقول ہے۔

امام شوکانی کی اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ مفوضین اور مؤولین ہر دو فریق میں اس امر میں تو اتفاق ہے کہ آیات صفات میں ذات حق کے لئے جو الفاظ ید وغیرہ وارد ہیں ان سے ان کے لغوی معنی ہاتھ جو ایک عضو ہے اور اس کی حقیقت ہم کو معلوم ہے مراد نہیں۔ کیونکہ خدا تعالیٰ جسم اور جسمانیات سے پاک ہے اور اس میں بھی اتفاق ہے کہ ان الفاظ کی کوئی نہ کوئی تاویل ضرور ہے لیکن اختلاف اس امر میں ہے کہ وہ تاویل ذات حق کے سوائے کسی اور کو بھی معلوم ہے یا نہیں؟ مفوضین کہتے ہیں کہ ان

کی تاویل سوائے ذات باری عزاسمہ کے دیگر کوئی نہیں جانتا۔ اس لئے ہم ان کی کوئی کیفیت نہ ذہن میں فرض کرتے ہیں اور نہ زبان سے کہتے ہیں بلکہ اس کا علم خدائے تعالیٰ کے سپرد کرتے کہتے ہیں کہ یہ امور صفات باری میں کما تلیق بشانہ المقدس ہیں۔ چنانچہ وہ آیت آل عمران میں اسم جلالت یعنی "اللہ" پر وقف کرتے ہیں۔ اور مؤولین کہتے ہیں کہ ان کی تاویل راسخین فی العلم بھی جانتے ہیں چنانچہ وہ الراسخون فی العلم کو بھی بواسطہ حرف عطف استثناء میں داخل کرتے ہیں۔ برخلاف مشبہین کے کہ وہ ان الفاظ کے ظاہری معنیٰ بایں طور لیتے ہیں کہ مثلاً ید سے اسی قسم کا ہاتھ مراد ہے جسے ہم پہچانتے ہیں۔ جس کا نتیجہ معاذ اللہ یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ و تقدس ایک جسمانی چیز ہے پس وہ جمیع صفات و عوارض جسمانیہ کا محل ہو سکتا ہے۔

تنبیہ ضروری :۔ بعض لوگ جنہوں نے اس مسئلہ کے اختلاف کو اس طریق پر جو امام شوکانیؒ نے ذکر کیا ہے اور ہم نے اس کی توضیح کی ہے، نہیں سمجھا۔ وہ اہل تفویض کو بھی مجسمہ خیال کرتے ہیں۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ کا پایہ علوم شرعیہ وحکمیہ میں مسلم کل ہے اور ان کی نصرت حق اور حمایت سنت بھی معلوم ہے۔ زندگی بھر مؤولین، مشبہین اور معطلین کی تردید میں قلم اٹھائے رکھا اور طریق تفویض کی تائید میں اس قدر لکھا کہ باطل بدلائل عقلیہ وسمعیہ ثابت کر دیا کہ جہاں اہل تاویل کا آخری قدم ہے وہ اہل تفویض کا پہلا زینہ ہے اور مشبہین کی نسبت واضح کر دیا کہ یہ لوگ ایمان سے بے بہرہ ہونے کے علاوہ عقل سے بھی کورے ہیں کہ ذات قدیم ازلی وابدی کے لئے محدثات کی طرح جوڑ بند قرار دیتے ہیں۔ اور معطلین کی نسبت ظاہر کر دیا کہ وہ ذات حق کو ایک ایسی ذات مانتے ہیں جو کسی صفت کمال کی مالک نہیں تعالیٰ اللہ عما یقول الظلمون علوا کبیرا۔ لیکن باوجود اس کے بعض معقولیوں نے آپ کو مجسمہ سے سمجھا چنانچہ "سلم العلوم" کے حواشی میں لفظ لایحد پر مولوی عبد الحلیم سے نقل کیا ہے فی شرح الزلفی ای لا یکون محصور ابالحدود کالمکان والشکل وھذا اشار الی رد قول ابن تیمیہ من المجسمۃ حیث قال ان اللہ متمکن علی العرش

وهو مكانه انتهى (حاشیہ سلم نمبر ۳ صفحہ ۳ مطبوعہ مطبع محمدی واقع لاہور)

محشی مرحوم نے حضرت شیخ الاسلام کی طرف جو عبارت منسوب کی ہے اس کا حوالہ ذکر نہیں کیا کہ یہ عبارت ان کی کس کتاب میں ہے؟ کیونکہ امام ممدوح کثیر التصانیف ہیں اور ہم کو باوجود اس کے کہ ان کی بہت سی تصانیف زیر نظر رہتی ہیں یہ عبارت یا اس کے ہم معنی عبارت کہیں نہیں ملی- بلکہ اس کے خلاف آپ کی بہت سی تصریحات ہیں جو ہم انشاء اللہ ابھی ذکر کریں گے اور محشی رحمتہ اللہ علیہ نے امام ہمامؒ کو جو مجسمہ میں سے قرار دیا سو یہ بھی خطا ہے- اگر شیخ الاسلام ممدوح کی تصریحات کا علم نہ بھی ہو تاکہ ان کی زندگی کن مباحث میں گذری تو آپ کو مجسمہ میں شمار نہ کیا جاتا- والله يعفوا عن المحشي وعنا وعن سائر المسلمين ولنعم ماقيل لكل جواد كبوة ولكل عالم هفوة-

چنانچہ ہم شیخ الاسلام کا مسلک ان کے ایک خط سے جو انہوں نے امام شمس الدین رحمہ اللہ کو مدینہ طیبہ میں لکھا تھا- ذکر کرتے ہیں جس سے ظاہر ہو جائے گا کہ تاویل و تفویض اور تشبیہ و تعطیل الگ الگ مسلک ہیں- پہلے دونوں سلف امت سے منقول ہیں جیسا کہ امام شوکانیؒ کے حوالہ سے گذر چکا اور پچھلے دونوں مردود ہیں اور یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ شیخ الاسلام مرحوم اہل تفویض میں سے تھے نہ کہ اہل تجسیم میں سے حاشاشانه عن ذلك

پہلی عبارت یہ ہے:

فالقائل ان زعم انه ليس له يدمن جنس ايدى المخلوقين وان يده ليست جارحة فهذا حق (خط شيخ الاسلام مشموله رساله اجتماع الجيوش للشيخ ابن القيم رحمه الله ص ١٤٠)

پس قائل اگر یہ خیال کرے کہ خدا تعالیٰ کا ہاتھ مخلوق کے ہاتھ کی طرح نہیں اور نیز یہ کہ وہ ایک جسمانی عضو نہیں ہے تو یہ بات بالکل درست و بجا ہے-

دوسری عبارت یہ ہے:

من قال ان الظاهر غیر مراد بمعنی ان صفات المخلوقین غیر مرادۃ قلنا لہ اصبت فی المعنی (خط مذکور ۱۳۸)
جو شخص یہ کہے کہ ان الفاظ سے ظاہری معنی مراد نہیں ہیں یعنی یہ کہ ان سے مخلوقات کی صفات مراد نہیں ہیں تو ہم کہیں گے اے قائل تو نے درست کہا۔

(۴) اس کے بعد شیخ الاسلام کے اپنے مسلک کی بابت عبارت ذیل ملاحظہ ہو۔

ہذہ الاحادیث تمر کما جاء ت ویومن بہا ویصدق وتصان عن تاویل یفضی الی تعطیل وتکیف الی تمثیل (خط مذکور ص ۱۳۸)
یہ احادیث (جو صفات باری تعالیٰ میں وارد ہیں) ان کا اجراء اسی طرح ہونا چاہئے جس طرح کہ وہ وارد ہوئیں اور ان پر ایمان رکھنا چاہئے۔ اور ان کی تصدیق کرنی چاہئے اور ان کو ایسی تاویل سے جو تعطیل تک پہنچائے اور ایسی کیفیت بیان کرنے سے جو تشبیہ تک لے جائے بچانا چاہئے۔

اور اس سے بھی زیادہ صفائی سے آپ منہاج السنۃ میں رد شیعہ کے ضمن میں فرماتے ہیں۔

فان التشبیہ والتجسیم المخالف للعقل والنقل یعرف فی احد من طوائف الامۃ اکثر منہ فی طوائف الشیعۃ (جلد اول ص ۱۷۲)
کیونکہ تشبیہ و تجسیم جو عقل و نقل ہر دو کے مخالف ہے امت کے کسی طائفہ میں طوائف شیعہ سے زیادہ معلوم نہیں ہے۔

اسی طرح منہاج السنۃ میں کثرت سے ایسے حوالے مل سکتے ہیں جن میں بالتصریح تشبیہ و تجسیم کا ابطال ہے جن کے ذکر سے خوف طوالت مانع ہے۔

ان عبارتوں سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت شیخ الاسلام تجسیم و تشبیہ کے ہرگز قائل نہیں تھے ہاں وہ اہل تاویل کی باطل تاویل پر بھی کان نہیں دھرتے تھے پس جو شخص تجسیم کو ان کی طرف منسوب کرتا ہے وہ ان کے مسلک سے ناواقف ہے یا تجسیم و

تفویض میں فرق نہیں جانتا- حالانکہ ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے کہ تفویض تو ہے درجہ اقرار بعدم الادراک کا اور حق ہے-اور تشبیہ و تجسیم درجہ ہے قول بالعلم کا اور باطل ہے فافهم ولا تكن من القاصرين-

کشف حقیقت :اصل بات یوں معلوم ہوتی ہے کہ ان بزرگان نے جنھوں نے حضرت شیخ الاسلامؒ کو تجسیم و تمثیل کا قائل سمجھا ہے کسی معتزلی یا جہمی کی کسی تحریر میں دیکھ لیا ہو گا کہ وہ حضرت شیخ الاسلامؒ کو مجسم قرار دیتے ہیں کیونکہ حضرت شیخ مثبت صفات تھے جیسا کہ ان تصریحات سے ظاہر ہے اور معتزلہ و جہمیہ مثبتین صفات کو مجسمہ کہتے ہیں- تو ان بزرگوں نے بھی سمجھ لیا ہو گا کہ حضرت شیخ سچ مچ مجسم ہیں-اور پھر کہیں ان کی کوئی مجمل عبارت بھی مل گئی تو اس نے خیال سابق کو اور پختہ کر دیا- چنانچہ اس امر کی بابت حضرت شیخ خود فرماتے ہیں-

والجهمية والمعتزلة يقولون من اثبت لله الصفات وقال ان الله يرى في الاخرة والقران كلام الله ليس بمخلوق فانه مجسم مشبه (منہاج جلد اول ص۱۷۳)

جہمیہ اور معتزلہ (جو منکرین صفات ہیں) کہتے ہیں کہ جو کوئی اللہ تعالیٰ کی صفات کو مانتا ہے اور کہتا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کا دیدار ہو گا اور قران کلام اللہ مخلوق نہیں ہے پس وہ شخص مجسم اور مشبہ ہے-

رجوع بمطلب : غرض یہ کہ آیات صفات کے متعلق تین مذاہب ہیں اول یہ کہ جو نصوص وارد ہیں ان کے حقیقی اور لغوی معنی مراد ہیں اور ان میں سے کسی صورت میں بھی تاویل کی گنجائش نہیں اور یہ مذہب مشبہین کا ہے-جو خدا تعالیٰ کو بھی ایک جسم تصور کرتے ہیں اور اس کے ہاتھ پاؤں آنکھ انگلیاں وغیرہ اعضاء تجویز کرتے ہیں کیونکہ نصوص میں ان کے لئے الفاظ وارد ہیں اور یہ باطل ہے اور اہل حدیث اس سے بری ہیں جیسا کہ اوپر گذر چکا-

دوسرا مذہب تاویل ہے-اور اس کا بیان یوں ہے کہ جب ظاہر الفاظ کی رو سے

ذات بر حق کی مخلوق سے مشابہت لازم آتی ہے اور مشابہت باطل ہے تو ان الفاظ سے ان کے لغوی معنی نہیں بلکہ ان کے مناسب کوئی دیگر معانی مراد ہیں اور ان الفاظ کا استعمال ان معانی میں مجازی طور پر کیا گیا ہے اور مجاز کا استعمال فصیح زبان میں ضرور ہوتا ہے اور قرآن و حدیث میں علاوہ آیات صفات کے دیگر مواقع میں بھی بکثرت ہے جس سے اہل تفویض کو بھی انکار نہیں۔ جس کی تفصیل کا یہ مقام نہیں۔

تیسرا مذہب تفویض ہے۔ اس کی شرح یوں ہے کہ یہ تو درست ہے کہ جو الفاظ نعوت (صفات) باری تعالیٰ میں وارد ہوئے ہیں ان کے ان سے ظاہری و حقیقی معانی مراد نہیں ہیں یعنی وہ معانی جو لغت کی رو سے حقیقۃً ہمارے ذہن میں اور مشاہدے میں آتے ہیں مراد نہیں ہیں بلکہ وہ ذات بر حق کی صفات ہیں جن کی کیفیت و حقیقت ہمارے ذہن میں نہیں آسکتی جیسے کہ ہم اس کی ذات کا تصور حقیقی نہیں کر سکتے۔ ہاں ہم ہر جگہ ان الفاظ کی تاویلی مراد بھی مقرر نہیں کر سکتے۔ لہٰذا ہم ان کی حقیقت کا علم اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتے ہیں۔ اول اس وجہ سے کہ ہمارے پاس کوئی قطعی سند عقلی یا نقلی نہیں ہے جو ہم کو تاویل پر مضطر کرے۔ دوم اس وجہ سے کہ تفویض میں سلامتی ہے اور تاویل میں ذمہ داری۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ جو تاویل ہم کریں وہ خدا کی مراد کے خلاف ہو پس ترجیح تفویض کو ہے نہ کہ تاویل کو۔

سوم اس وجہ سے کہ اگر ہر جگہ لازمی طور پر تاویل کریں اور صفات ذات صفات فعل میں امتیاز نہ کریں تو ذات بر حق کا صفات سے معطل ہونا لازم آئے گا جیسا کہ جہمیہ کا مذہب ہے اور وہ باطل ہے۔

تنبیہ :۔ بعض لوگوں کا خیال اب بھی ہے اور پہلے بھی رہا ہے کہ اہل حدیث مطلقاً تاویل کے قائل نہیں ہیں۔ لیکن ان کی یہ رائے مسئلہ صفات کو تفصیلاً نہ سمجھنے اور ائمہ اہل حدیث کی تصریحات و تشریحات کو نہ جاننے کے سبب ہے۔ بلکہ صفات فعل میں جہاں کوئی قطعی دلیل عقلی یا نقلی تاویل پر مجبور کرے وہاں اہل حدیث بھی تاویل کرتے ہیں اور صفات ذات میں جہاں انکار صفات لازم آتا ہو اور کوئی دلیل قطعی صاف

بھی نہ ہو تاویل نہیں کرتے بلکہ ان کو صفات ذات جانتے ہیں جن کا وجود ذات برحق کے لئے ضروری ہے۔ اور ان کی حقیقت کا انکشاف سپرد الٰہی کرتے ہیں اور کہتے ہیں انت کما اثنیت علی نفسك

اے برادر بے نہایت در گہیست
ہر چہ بروے میرسی بروے مانیست

چنانچہ شیخ ابن تیمیہؒ سے پیشتر انہی کی روش کے ایک امام حدیث حافظ ابن حزم قرطبیؒ جو ۴۵۶ھ میں فوت ہوئے اپنی مشہور تصنیف کتاب الفصل میں معتزلہ کے اس قول کے جواب میں کہ اللہ تعالیٰ ہر مکان میں ہے فرماتے ہیں معتزلہ لوگ اس امر پر آیت مایکون من نجوی ثلاثة الاھو رابعھم (مجادلہ پ ۲۸) وغیرہ سے استدلال کرتے ہیں سو اس کا جواب یہ ہے کہ

(قال ابو محمد) قول اللہ تعالی...... یجب حملہ علی ظاھرہ مالم یمنع من حملہ نص اخراو اجماع او ضرورۃ حس (جلد ۲ ص ۱۲۲)

اللہ تعالیٰ کے قول کو ظاہر پر حمل کرنا واجب ہے جب تک کہ اس کو ظاہر پر حمل کرنے سے دوسری نص یا اجماع یا ضرورۃ حس منع نہ کرے۔

اس کے بعد ان سب آیات کا ایک ہی جواب دیا ہے کہ ان سے تدبیر واحاطہ مراد ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ تاویل ہے حالانکہ حافظ ابن حزمؒ خود ظاہری ہیں اور مفوضین کے امام ہیں لیکن یہاں "تاویل" کی ہے اور وجہ اس کی یہ بیان کی کہ عقلاً اور حساً معلوم ہے کہ جو شے کسی مکان میں ہوتی ہے وہ اس مکان کو پر کرنے والی ہوتی ہے اور اسی شکل کی ہوتی ہے اور یہ بات احکام اجسام میں سے ہے جس سے اللہ تعالیٰ پاک ہے۔ (لہٰذا اس کو ظاہر پر حمل کرنا درست نہیں) اس کے بعد استواء کی نسبت کہا ہے کہ نہ تو اس سے مراد استقرار ہے (جو اس کے حقیقی معنی کو لازم ہے) اور نہ استیلاء (جو تاویل ہے) بلکہ

یعنی انه فعل فعله فی العرش وھو انتھاء خلقه الیه فلیس بعد

العرش شئی

اس سے مراد انتہائے خلق ہے کہ عرش کے بعد کوئی شے نہیں ہے۔

اسی طرح یمین' وجہ' قدم' اصابع' نزول وغیرھا امور کے متعلق مفصل ذکر کیا ہے جو تاویل سے خالی نہیں (ص ۱۶۶ سے ص ۳۷ اتک جلد ثانی)

اسی طرح امام بیہقیؒ جو چوتھی اور پانچویں صدی ہجری کے ایک عالی پایہ امام حدیث ہیں انہوں نے صفات الہیہ کے متعلق ایک خاص کتاب "کتاب الاسماء والصفات" لکھی ہے۔اس میں مسلک تاویل کی ضرورت وصورت کی نسبت امام خطابیؒ سے جو چوتھی صدی ہجری میں ایک زبردست محدث گذرے ہیں نقل کرتے ہیں۔

--- قال ابو سلیمان ونحن احری بان لا نتقدم فیما تاخر منه من هو اکثر علما واقدم زمانا وسنا ولکن الزمان الذی نحن فیه قد جعل اهله حزبین منکر لما یری من نوع هذه الاحادیث رأسا ومکذب به اصلا و فی ذلك تکذیب العلماء الذین رووا هذه الاحادیث وهم ائمة الدین ونقلة السنن والواسطة بیننا وبین رسول الله صلی الله علیه وسلم والطائفة الاخری مسلمة للروایة فیها ذاهبة فی تحقیق الظاهر منها مذهبا یکاد یفضی بهم الی القول بالتشبیه ونحن فرغب عن الامرین معا ولا نرضی بواحد منهما مذهبا فیحق علینا ان نطلب لما یرد من هذا الاحادیث اذا صحت من طریق النقل والسند تاویلا یخرج عن معانی اصول الدین و مذهب العلماء ولا تبطل الروایة فیها اصلا اذا کانت طریقها مرضیه ونقلتها عدو لا ص ٢٥٤)

امام ابو سلیمان خطابی کہتے ہیں کہ جب وہ (بزرگ) جو ہم سے علم میں زیادہ اور زمانہ اور عمر میں پیشتر تھے اس امر میں پیچھے ہٹے رہے تو ہم کو بہت مناسب ہے کہ ہم بھی اس میں آگے نہ بڑھیں لیکن جس زمانے میں ہم ہیں اس کے

لوگ دو گروہ ہیں ایک تو وہ ہیں جو اس قسم کی احادیث سے بالکل منکر اور ان کے مکذب ہیں اور اس میں ان علماء کی تکذیب ہے جنہوں نے احادیث کو روایت کیا حالانکہ وہ اماماں دین اور ناقلین سنت ہیں اور آنحضرت ﷺ اور ہمارے درمیان واسطہ ہیں دوسرا گروہ وہ ہے جو ان روایات کو تسلیم تو کرتا ہے۔ لیکن ان کے ظاہر معانی کے اثبات میں ایسی روش چلتا ہے جو قول بالتشبیہ کے قریب پہنچادیتی ہے۔ اور ان ہر دو امور (انکار و تشبیہ) سے ایک ساتھ بیزار ہیں اور ان میں سے کسی سے بھی مذہب بنانے کی رو سے ہم راضی نہیں ہیں۔ پس ہم پر واجب ہے کہ ان احادیث میں جو نقل و سند کی رو سے صحیح ثابت ہو جائیں کوئی ایسی تاویل ڈھونڈیں جو اصول دین کے معانی کو اور مذاہب علماء (سلف) کو ملحوظ رکھ کر کی جائے اور جو روایت اس بارے میں وارد ہوئی ہو جب اس کا طریق (روایت) پسندیدہ (مقبول) ہو اور اس کے نقل کرنے والے (راوی) عادل (و متقی) ہوں تو اس (تاویل) سے وہ (روایت) باطل نہ ہو جاتی ہو۔

ان ہر دو ائمہ اہل حدیث کی تصریحات سے صاف ثابت ہو گیا کہ اہل حدیث کو تاویل سے بہر صورت انکار نہیں۔ بلکہ وہ صرف ان باطل تاویلوں سے انکار کرتے ہیں۔ جن میں اصول دین نصوص شرعیہ اور محاورات زبان عرب ملحوظ نہ ہوں اور ادھر ادھر کے زٹل قافئے ملا کر کر دی جائیں۔ جس طرح گمراہ فرقے پہلے بھی کرتے رہے ہیں۔ اور اب بھی کرتے ہیں فافہم۔

حضرت حجتہ الہند اس مسئلہ کو ایک خاص تفصیل سے لکھتے ہیں۔ جس کا خلاصہ و حاصل حسب ذیل ہے۔

مسائل شرعیہ جن کے سبب امت کے کئی فریق ہو گئے دو قسم پر ہیں۔ ایک وہ جو قرآن و حدیث منطوقاً و تصریحاً مذکور ہیں اور صحابہ و تابعین ان کو اسی طرح مانتے رہے۔ جب وہ زمانہ آیا جس میں ہر شخص کو اپنی اپنی رائے پسند

آنے لگی تو ایک گروہ نے ظاہر کتاب و سنت کو (اسی طرح) پکڑے رکھا اور اصول عقلیہ کی موافقت یا مخالفت کی پرواہ نہ کی اور کہیں معقولات میں بولے بھی تو صرف خصم کے الزام دینے اور زیادہ اطمینان کے لئے (بولے) نہ کہ استفادہ عقائد کے لئے۔ سو یہ لوگ تو اہل سنت ہیں اور دوسرے گروہ نے ان موقعوں میں جہاں ان کے خیال میں اصول عقلیہ کی مخالفت نظر آئی۔ (ان الفاظ قرآن و حدیث کو) ان کے ظاہر معانی سے ہٹا کر ان کی تاویل کر دی۔ پس انہوں نے (ان علوم عقلیہ کی رو سے) تحقیق امر اور بیان حقیقت کے لئے گفتگو کی۔ اور دوسری قسم مسائل کی وہ ہے جو نہ تو کتاب اللہ میں منطوق ہے اور نہ ان کے متعلق کوئی حدیث مشہور ہی ہے۔ اور نہ صحابہؓ نے ان میں (تفصیلی) کلام کیا۔ سو وہ اپنی اسی حالت پر پڑے رہے حتی کہ متاخرین اہل علم نے ان میں کلام کیا۔ اور کئی ایک وجوہ سے (جو اصل کتاب حجتہ اللہ میں مذکور ہیں) ان میں اختلاف ہوا۔ مثلاً آیات صفات کہ ان میں اجمالی طور پر اصولاً تو سب متفق ہیں لیکن ان کی تفصیل و تفسیر میں مختلف ہیں۔ ایک گروہ تو کہتا ہے کہ ان سے ان کے مناسب (تاویلی) معانی مراد ہیں اور دوسرے کہتے ہیں کہ ہم نہیں جانتے کہ ان سے مراد (الٰہی) کیا ہے؟ پس اس قسم (ثانی) میں ایک کو ترجیح دیتا اور یہ کہتا کہ ان میں سے فلاں سنت کے مطابق ہے (اور فلاں نہیں ہے) صحیح نہیں جانتا۔ کیونکہ اگر تو خالص سنت طلب کرے تو وہ تو ان مسائل میں بالکل خوض نہ کرتا ہے جیسا کہ سلف (صالحین) نے ان میں خوض نہیں کیا۔ انتہی مترجماً و مخلصاً (حجتہ اللہ مصری جلد اول ص ۹، ۱۰)

حضرت شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی عبارت کا محصول یہ ہے کہ مسائل اعتقادیہ دو قسم پر ہیں۔

اول: وہ جن کی کیفیت قرآن یا حدیث میں بالتصریح وارد ہے مثلاً عذاب قبر

وغیرہ-

دوم: جن کی کیفیت مصرح نہیں ہے- مثلاً استواء علی العرش-ان مسائل پر کلام کرنے والے علماء بھی دو طرح کے ہیں- ایک مفوضین- دوسرے مؤولین- مفوضین تو ہر قسم میں تفویض کرتے ہیں اور مؤولیں ہر قسم میں تاویل-حضرت شاہ رحمتہ اللہ علیہ پہلی قسم مسائل میں تاویل جائز نہیں جانتے اور دوسری قسم میں جرح نہیں جانتے- فافھم ولا تکن من القاصرین

وانا العبد المفتقر الی اللہ الکریم

محمد ابراہیم
میر السیالکوٹی

حصہ دوم

احادیث کی حفاظت خود آنحضرت ﷺ بلکہ خود اللہ تعالیٰ کو منظور تھی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لله العلي الاكرم الذى علم بالقلم علم الانسان مالم يعلم والصلوة والسلام على حبيبه المبعوث الى العرب و العجم و على اله و اصحابه و خلص احبابه سادة خير الامم. المبلغين عنه ما سمعوا من اقواله و شهدوا من احواله ببذل الجهد و صرف الهمم ط اما بعد.

اس عنوان کی تفصیل سے پیشتر چند امور بطور تمہید بیان کرنے ضروری ہیں۔

(۱) اللہ تعالیٰ نے اپنا پاک کلام قرآن شریف آسمان سے بارش کی طرح نہیں برسایا۔ اور نہ اسے بجلی کی مہیب آواز سے بندوں تک پہنچایا بلکہ اپنے رسول پاک (صلوات اللہ علیہ و سلامہ) کے مبارک منہ میں ڈالا۔ جو ان کا ہم جنس تھا جن کی طرف وہ پیغام آیا۔ اور آپ کی ذات گرامی میں علمی اور عملی ہر دو طرح کے کمالات بوجہ اتم پیدا کئے کہ آپ قولی تعلیم کے ساتھ ان کے لئے عملی نمونہ بھی قائم کریں۔ تاکہ جو لوگ آپ کے حلقہ صحبت میں داخل ہوں وہ آپ سے انس پکڑ کر اور قلبی ارادت و عقیدت پیدا کر

کے حسب استعداد آپ کے فیض صحبت سے اکتساب فضائل یعنی تزکیہ نفس اور تہذیب اخلاق کا بہرہ حاصل کریں۔ چنانچہ آپ اپنی بعثت کا ایک مقصد یہ فرماتے ہیں انما بعثت لاتمم صالح الاخلاق اور حق تعالیٰ نے آپ کی شان میں فرمایا و انك لعلی خلق عظیم (ن پ ۲۹) نیز فرمایا

لقد من الله علی المومنین اذ بعث فیهم رسولا من انفسهم یتلوا علیهم ایته و یزکیهم و یعلمهم الکتب والحکمة و ان کانوا من قبل لفی ضلال مبین (ال عمران پ ٤)

"اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر (بڑا ہی) فضل کیا کہ ان میں انہیں میں کا ایک رسول برپا کیا جو ان پر اس کی کتاب پڑھتا اور ان کو پاک کرتا اور ان کو کتاب (الٰہی) اور حکمت (طریق عمل) سکھاتا ہے اور بے شک یہ لوگ اس سے پیشتر صریح گمراہی میں (پڑے ہوئے) تھے۔"

یہ آنحضرتؐ کے عملی نمونہ ہی کا اثر تھا کہ عرب کے امّی اور علوم سے بے خبر بدویوں میں ایسی روح پھنک گئی کہ انہوں نے حیرت انگیز قلیل مدت میں کسریٰ و قیصر کے تخت الٹ دیے۔ اسی روح پرور سیرت کی حقیقت سمجھانے کے لئے اور اسے نمونہ عمل بنانے کے لئے آنحضرت ﷺ عام طور پر خطبات میں عام لوگوں کے مجمع میں با آواز بلند فرمایا کرتے تھے۔

ان خیر الحدیث کتاب الله و خیر الهدی هدی محمد (صحیح مسلم ابواب الجمعه)

"بہترین کلام خدا کی کتاب (قرآن مجید) ہے (جس میں لفظی تعلیم ہے) اور بہترین سیرت محمدؐ کی سیرت ہے (جو عملی تعلیم ہے)۔"

(۲) قرآن شریف میں علاوہ اتباع و اطاعت رسولؐ کی تائیدی آیات کے کئی جگہ آنحضرتؐ کا نمونہ عمل اختیار کرنے کی تاکید و ترغیب ہے۔ (ا) چنانچہ جب جنگ احد کی ہزیمت سے کھسیانے ہو کر تمام قبائل عرب نے متفقہ طاقت سے کئی ہزار جمعیت

سے مدینہ طیبہ پر آخری اور فیصلہ کن حملہ کیا اور مسلمان دہشت زدہ ہو گئے لیکن رسول اللہ ﷺ پر کچھ بھی اثر نہ تھا تو اس پر خداوند تعالیٰ نے فرمایا

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ (احزاب پ ۲۱)

"(مسلمانو!) تمہارے لئے رسول اللہؐ میں قابل اقتدا اچھا نمونہ عمل تھا۔"

(ب) اور اسی حقیقت کو ملحوظ رکھتے ہوئے آپ کے سفر تبوک کے ذکر میں جو شدت گرما میں دور دراز مسافت کا سفر تھا اور کئی ایک لوگوں کے دل اس موقع پر چھوٹ گئے تھے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا:

لکن الرسول والذین امنوا معہ جاھدو باموالھم وانفسھم (توبہ پ ۱۰)

"لیکن رسول اللہؐ اور آپ کے ساتھ کے مومن اپنے مالوں اور اپنی جانوں سمیت شریک جنگ ہوئے۔"

(ج) صراط مستقیم جس کی تحصیل کے لئے اعمال صالحہ اور اخلاق فاضلہ کی ساری تگ و دو ہے اور ہر نمازی ہر رکعت نماز میں اسے طلب کرتا ہے اس کی نسبت بھی تو یہی فرمایا کہ وہ صراط الذین انعمت علیھم یعنی وہ صراط مستقیم ان لوگوں کا طریق عمل ہے جن پر خدا کا انعام ہوا اور انعام والوں کے صدر نشین حضرات انبیاء علیہم السلام ہی ہیں۔ چنانچہ فرمایا فاولئک مع الذین انعم اللہ علیھم من النبیین و الصدیقین الایۃ (النساء پ ۵)

ان آیات سے صاف ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ لوگ میرے رسول کا نمونہ عمل اختیار کریں اور رسول اللہ ﷺ بھی علی الاعلان فرماتے ہیں کہ میرا طریق عمل بہترین طریق عمل ہے۔ تو کیا کوئی عقلمند کہہ سکتا ہے کہ جو امر ایسا خوب اور پسندیدہ اور موجب سعادت ہر دو جہان ہو اسے حکیم و دانا اور قدیر و توانا خدا اور اس کا حکمت آموز اور مصلحت اندیش رسول ضائع جانے دے گا؟ ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔

آمدم بر سر مطلب: پس آنحضرت ﷺ نے اپنی سنت و سیرت کی حفاظت دو طرح سے کی ہے۔

اول : یوں کہ آپ نے اپنے طریق عمل پر چلنے کی تاکیدیں کیں اور موکد تاکیدوں کے ہوتے ہوئے ہو نہیں سکتا کہ صحابہ جیسی فرمانبردار اور جاں نثار جماعت آپ کے حکمت آموز اقوال اور بانظام افعال کو ضائع جانے دے چنانچہ کتب حدیث میں "اعتصام بالسنتہ" کا باب خصوصیت سے باندھا گیا ہے۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف کے اسی باب سے بعض احادیث نقل کی جاتی ہیں۔

(۱) آنحضرت ﷺ کے خادم خاص حضرت انس سے روایت ہے کہ تین شخصوں کی جماعت آنحضرت کی عبادت کا حال پوچھنے کے لئے آپ کی ازواج مطہراتؓ کی خدمت میں آئی۔ جب ان کو بتایا گیا تو انہوں نے اس (مقدار) کو تھوڑا خیال کر کے آپس میں کہا کہ ہم آنحضرت سے کہاں مل سکتے ہیں؟ آپ کو تو خدا تعالیٰ نے ہر طرح کی تقدیم[1] و تاخیر کی لغزشوں سے معاف کر دیا ہے۔ پس ان میں سے ایک کہنے لگا کہ میں تو ہمیشہ ساری رات نماز ہی میں گذار دیا کروں گا۔ دوسرے نے کہا کہ میں ہمیشہ دن کو روزہ رکھا کروں گا اور کبھی نہیں توڑوں گا۔ تیسرے نے کہا میں عورتوں سے الگ رہوں گا۔ اور کبھی شادی نہیں کروں گا (اتنے میں) آنحضرت تشریف لے آئے اور آپ نے فرمایا تم وہی ہو جنہوں نے ایسا ایسا کہا۔ سنو خدا کی قسم میں تم سب سے زیادہ خدا (کے جلال) سے ڈرنے والا اور سب سے زیادہ (اس کی نافرمانی سے) پرہیز کرنے والا ہوں۔ لیکن میں

---

[1] اس تقدیم و تاخیر سے مراد یہ ہے کہ بعض وقت انسان پر دو یا زیادہ کام بیک وقت آپڑتے ہیں۔ ہر چند کہ وہ سب جائز ہوتے ہیں لیکن عملی صورت میں ایک کام کو پہلے کیا جاتا ہے اور دوسرے کو پیچھے یہ عملی ترتیب کبھی مناسب وقت و مصلحت پڑتی ہے اور کبھی نہیں پڑتی کیونکہ دماغی تدبیروں میں خطاب و صواب ہر دو امر ممکن ہوتے ہیں ہر چند کہ یہ اجتہادی امر ہے لیکن خطا سے انسان کی طبیعت پر بوجھ ضرور پڑتا ہے۔ انبیا علیہم السلام عمداً گناہ نہیں کرتے۔ وہ معصوم ہوتے ہیں سو اسی بوجھ کو ہلکا کرنے کے لئے خدا تعالیٰ نے فرمایا لیغفرلک اللہ ماتقدم من ذنبک وماتأخر (فتح پ ۲۶) اور اس کو ذنب بوجہ لغزش و خطا کے کہا ہے اور سیاسی کاموں اور نقل و حرکت میں تقدیم و تاخیر ہو جاتی ہے۔ اور سورہ فتح جس کی مذکورہ بالا آیت ہے سیاسی امور کے متعلق صلح حدیبیہ کے موقع پر نازل ہوئی اور اسی معنی میں آنحضرت دعا کیا کرتے تھے۔ اللھم اغفرلی ما قدمت و ما اخرت (حصن حصین)

روزہ رکھتا بھی ہوں اور توڑتا بھی ہوں اور (رات کو) نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں۔اور میری بیویاں بھی ہیں۔ پس جو کوئی میری سنت سے روگردانی کرے گا وہ مجھ سے نہیں ہے (اس حدیث کو امام بخاری اور امام مسلم نے روایت کیا۔ مشکوٰۃ صفحہ ۱۹)

(۲) اسی طرح حضرت عائشہؓ صدیقہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک کام کیا اور اس کے (کرنے یا نہ کرنے کے) بارے میں (لوگوں کو) اختیار دیا۔ بعض لوگوں نے (اس عمل کو ہلکا جان کر) اس سے پرہیز کرنا چاہا یہ بات آنحضرتؐ کو معلوم ہوئی تو آپ نے خطبہ دیا اور اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کی۔ پھر فرمایا وہ کیسے لوگ ہیں؟ جو اس امر سے پرہیز کرنا چاہتے ہیں جسے میں کرتا ہوں۔ اللہ کی قسم مجھے ان سب سے اللہ کی شناخت زیادہ ہے اور مجھے اس کا ڈر بھی ان سب سے زیادہ ہے (متفق علیہ مشکوٰۃ صفحہ ۱۹)

(۳) اسی طرح حضرت ابو سعید خدری سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے (جماعت صحابہؓ سے فرمایا کہ دیگر لوگ تمہارے تابع ہیں اور (میرے پیچھے) کئی لوگ زمین کے کناروں سے تمہارے پاس آکر دین کی سمجھ حاصل کریں گے۔ پس تم میری (تاکید) ان سے نیک سلوک کرنے کے متعلق قبول کرو (رواہ الترمذی مشکوٰۃ صفحہ ۲۶ کتاب العلم)

(۴) اسی طرح ابراہیم بن عبدالرحمٰن عذری نے مرسلاً روایت کیا ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا یحمل ھذا العلم من کل خلف عدولہ (الحدیث) (یعنی ہر زمانہ کے) پیچھے آنے والے عادل لوگ اس علم (دین) کو حاصل کرتے رہیں گے۔

ان احادیث سے صاف ثابت ہے کہ آنحضرتؐ کو اپنی سنت کی حفاظت خاص طور پر ملحوظ تھی۔ کیونکہ سنت پر عمل اور آئندہ آنے والے لوگوں کو اس کی تعلیم بغیر حفاظت کے نہیں ہو سکتی۔

دوسرا طریق: یہ کہ آنحضرتؐ جب کوئی مسئلہ فرماتے تو اسے تین دفعہ دہرا کر فرماتے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ جب کوئی (دینی) بات فرماتے تو اسے تین دفعہ دہراتے حتیٰ کہ اسے (اچھی طرح) سمجھ لیا

جاتا۔(کتاب العلم)

حکمت: حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی یہ عادت مبارک اس لئے تھی کہ حاضرین میں سے ہر طبقہ اور ہر استعداد کا شخص اسے اچھی طرح سمجھ کر یاد رکھ سکے چنانچہ بخاریؒ نے اس باب کا عنوان اس طرح باندھا ہے باب من اعاد الحدیث ثلثا لیفہم عنہ پھر اس کی تائید اور ثبوت میں وہ احادیث بیان کی ہیں جن میں کسی امر کو تین دفعہ پکار کر فرمانے کا ذکر ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اونٹنی پر سوار ہو کر کم و بیش ایک لاکھ پاک نفوس کے مجمع عام میں ایک بلیغ خطبہ فرمایا۔ اس میں آپ نے حاضرین سے اپنی تبلیغ دین کا اقرار لیا اور اس پر خدا تعالیٰ کو گواہ رکھا اور حاضرین سے فرمایا لیبلغ الشاھد الغائب منکم یعنی جو حاضر ہیں وہ (یہ علم دین) اپنے غیر حاضروں کو پہنچادیں (متفق علیہ)

یہ تاکید اپنے تعلیم کردہ علم کی حفاظت و اجراء کے لئے تھی۔ یا کس لئے؟

صحیح بخاری کی اسی روایت میں امام محمد بن سیرین تابعیؒ (جو اس حدیث کے راویوں میں سے ہیں) کا قول ہے کہ انہوں نے کہا رسول اللہ ﷺ نے سچ فرمایا ایسا واقع ہو بھی گیا۔ یعنی صحابہ نے آنحضرتؐ سے سیکھا ہوا علم دین تابعیوں کو پہنچا دیا۔ امام محمد بن سیرین جلیل القدر تابعی ہیں۔ حدیث کو لکھنے کی بجائے حفظاً یاد کرتے تھے۔ ۱۱۰ھ میں بصرہ میں فوت ہوئے۔ زہد و ورع اور علم حدیث و فقہ میں یکتائے زمانہ تھے۔

صحیح بخاری کے اسی باب یعنی لیبلغ الشاھد الغائب کے ذیل میں علامہ عینی نے ابوداؤد سے حدیث نقل کی ہے کہ آنحضرت نے فرمایا تسمعون و یسمع منکم و یسمع من یسمع منکم (جلد اول صفحہ ۵۳۶) یعنی تم مجھ سے سنتے ہو اور تم سے دوسرے لوگ سنیں گے اور جو تم سے سنیں گے ان سے دوسرے لوگ سنیں گے۔ یعنی احادیث نبویہؐ کی روایت کا سلسلہ زمانہ بزمانہ جاری رہے گا۔

سب کے بعد آنحضرت کی دو دعائیں بھی ہر وقت یاد رکھیں جو خاص ان لوگوں کے لئے ہیں جو آپ کی احادیث کو آپ کی زبان مبارک سے سن کر یاد رکھیں اور پھر جوں کی توں لوگوں کو پہنچائیں اور ان کو آپ کی سنت سکھائیں۔

(ل) بارونق رکھے اللہ تعالیٰ چہرہ اس بندے کا جس نے میری بات سنی پس اسے حفظ کر لیا اور یاد رکھا پھر اسے ادا کیا (الحدیث رواہ الترمذی و ابوداؤد و غیرھما مشکوۃ کتاب العلم صفحہ ۲۷) امام سفیانؒ کہتے ہیں کہ ہر محدث کے چہرہ پر (اس دعا کی برکت سے) رونق ہوتی ہے چاہے وہ بوڑھا ہو جائے۔

(ب) اے اللہ! میرے خلفاء پر جو پیچھے آئیں گے رحم کر جو روایت کریں گے۔ میری احادیث اور میری سنت اور تعلیم دیں گے ان کی لوگوں کو (جامع صبغہ للسیوطی)

احادیث کی حفاظت خود اللہ تعالیٰ کو منظور تھی

قرآن شریف سے پہلی آسمانی کتابوں میں تغیر و تبدل تصحیف و تحریف ہر طرح کے انسانی تصرفات ہوتے رہے اور وہ کتابیں محفوظ نہ رہ سکیں۔ حتیٰ کہ زمانہ مابعد میں ان کی بجائے دیگر کتابیں انہیں ناموں سے مشہور کی گئیں اور یہ امر ہر زمانہ کے ان علماء پر روشن ہے جو ان کتابوں اور ان قوموں کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے ہوئے ہیں۔

جن اقوام سے اپنی الہامی کتابیں بھی محفوظ نہ رہ سکیں وہ اپنے انبیاء علیہم السلام کی سنت اور طریق عمل کی کیا حفاظت کرتیں۔

(۴) لیکن اللہ کے فضل سے قرآن شریف کا ایسا حال نہیں ہوا۔ بلکہ وہ نہایت صحت و صفائی سے انہی الفاظ میں محفوظ ہے جن میں وہ نازل ہوا اور آنحضرت ﷺ نے صحابہؓ کے سامنے پڑھا اور ان کو سکھایا اور نمازوں اور خطبوں میں اس کی قرات کی اور ان سے وعظ و تذکیر کی۔ اس کے حافظ اس وقت بھی کثیر تعداد میں موجود تھے اور آپ کے بعد تو ہر زمانہ میں دنیا کے ہر قطر میں بیش از بیش ہوتے رہے۔ جن کی گنتی سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جان سکتا۔ پس اگر آنحضرت ﷺ کا طریق عمل اور خطبوں اور وعظوں میں آپ کی توضیحات و تذکیرات محفوظ نہ رہیں تو خالی الفاظ کی حفاظت سے وہ عملی کوائف کس طرح معلوم ہو سکیں گے جو آپ نے صحابہؓ کے سامنے ادا کیے۔ سو اس کے لئے اللہ تعالیٰ زمانہ مابعد میں ایسی بابرکت ہستیاں پیدا کرتا رہا جن کی زندگی کا مقصد رسول اللہ کی احادیث و سنت کا علم حاصل کرنے کے سوا دیگر کچھ نہ تھا۔ مولانا حالی

مرحوم نے اپنی مسدس میں ان مبارک ہستیوں کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے زیادہ کوئی کیا لکھے ؟ یہ سب کچھ خدائی انتظامات تھے۔

گروہ ایک جویا تھا علم نبی کا — لگایا پتہ جس نے ہر مفتری کا
نہ چھوڑا کوئی رخنہ کذب خفی کا — کیا قافیہ تنگ ہر مدعی کا
کئے جرح و تعدیل کے وضع قانون
نہ چلنے دیا کوئی باطل کا افسوں

اسی دھن میں آساں کیا ہر سفر کو — اسی شوق میں طے کیا بحر و بر کو
سنا خازن علم دیں جس بشر کو — لیا اس سے جا کر خبر اور اثر کو
پھر آپ اس کو پرکھا کسوٹی پہ رکھ کر
دیا اور کو خود مزا اس کو چکھ کر

کیا فاش راوی میں جو عیب پایا — مناقب کو چھانا مثالب کو تایا
مشائخ میں جو قبح نکلا جتایا — ائمہ میں جو داغ دیکھا بتایا
طلسم ورع ہر مقدس کا توڑا
نہ ملا کو چھوڑا نہ صوفی کو چھوڑا!

رجال اور اسانید کے ہیں جو دفتر — گواہ ان کی آزادگی کے ہیں یکسر
نہ تھا ان کا احساں یہ اک اہل دین پر — وہ تھے اس میں ہر قوم وملت کے رہبر
لبرٹی میں جو آج فائق ہیں سب سے
بتائیں کہ لبرل بنے ہیں وہ کب سے

زمانہ نبوت و عصر صحابہؓ میں حدیث کیوں نہ جمع کی گئی؟

(۱) آنحضرت ﷺ سے پیشتر اور آپ کے وقت میں بھی عرب کے لوگ بسبب بادیہ نشین ہونے کے عام طور پر قوت حافظہ سے کام لیتے تھے اور ان میں تحریر کا رواج نہایت کم تھا- چنانچہ آپ نے اسی معنے میں فرمایا-

انا امة امية لانكتب ولانحسب (الحديث متفق عليه مشكوة كتاب الصوم)

ہم امی لوگ ہیں- ہم نوشت (و خواند) اور حساب (و کتاب) نہیں جانتے-

بدوی قبائل: علامہ ابن خلدون مغربی نے اپنی مشہور عالم تاریخ کے مقدمہ میں صنائع و مکاسب کے متعلق مفصل بحث کی ہے اور ایک فصل بالخصوص صناعت کتابت کے ذکر میں لکھی ہے- خلاصہ اس کا یہ ہے کہ بادیہ نشین قومیں اپنے توحش صحرائیت کی وجہ سے صنائع سے دور رہتی ہیں اور جوں جوں کسی قوم کا اجتماع و تمدن ترقی کرتا جاتا ہے- اس میں صنائع و مکاسب کا رواج بھی ترقی پذیر ہوتا جاتا ہے- چنانچہ فرماتے ہیں-

وخروجها في الانسان من القوة الى الفعل انما يكون بالتعليم و على قدرالاجتماع والدان و التناعي في الكمالات و الطلب لذلك تكون جودة الخط في المدينة اذهومن جملة الصنائع وقد قدمنا ان هذا من شانها و انها تابعة للعمران و لهذا نجد اكثر البدو اميين لايكتبون ولا يقرؤن (مقدمه ابن خلدون صفحه ۳٤۹)

اور صنعت کی قابلیت جو انسان میں بالقوہ موجود ہے اس کا بالفعل حصول تعلیم سے ہوتا ہے- انسانوں کا اجتماع اور آبادی اور کمالات کی طلب اور سعی جس قدر ہو اسی قدر اس کا حصول بھی ہوتا ہے- اسی لئے خط کی عمدگی و خوبی شہر

میں (کامل) ہوتی ہے کیونکہ یہ (کتابت) بھی مجملہ صنائع کے ہے اور ہم سابقاً بیان کرچکے ہیں کہ اس کا بھی یہی حال ہے اسی لئے ہم اکثر بدیوں کو امی پاتے ہیں کہ وہ نہ تو لکھ سکتے ہیں اور نہ پڑھ سکتے ہیں۔

اسکے بعد خاص کر قبیلہ مضر[1] کی نسبت جس کی ایک شاخ قبیلہ قریش بھی ہے۔ لکھتے ہیں۔

واما مضر فکانوا فی البدو العبد عن الحضر من اھل الیمن واھل العراق وھل الشام و مصر فکان الخط العربی لاول الاسلام غیر بالغ الی الغایة من الاحکام والا تقان و الاجارة ولا الی التوسط یمکان العرب من البداوة والتوحش و بعد ھم عن الصنائع

(مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۳۵۰)

لیکن (قبیلہ) مضر سو بدویت میں دوسروں سے بہت بڑھ کر تھا اور اہل یمن و اہل عراق اور اہل شام اور اہل مصر کی نسبت مدنیت سے بہت دور تھا۔ پس خط عربی شروع اسلام میں پختگی اور عمدگی میں نہایت کو بلکہ توسط کو بھی نہیں پہنچا تھا کیونکہ عرب صحرا نشین تھے اور صنائع سے بہت دور (نا آشنا) تھے۔

الغرض واقعات کو محفوظ رکھنے کے لئے عرب کی عام عادت حفظ اور درائیت تھی نہ کہ تحریر و کتابت ان کو اس ملکہ میں نہایت درجہ کا کمال حاصل تھا۔ خطب و قصائد سب کچھ بر زبان محفوظ رکھتے تھے اور جب چاہتے صفحہ سینہ سے پڑھ سناتے۔ اور یہ قدرتی امر ہے کہ جس عضو و قوت سے اس کا مناسب کام لیا جائے اس کی قوت و ملکہ بڑھ جاتا ہے۔ اسی معنی میں انگریزی زبان میں کہتے ہیں پریکٹس میکس مین پرفیکٹ

---

[1] آنحضرت ﷺ بھی مضر کی اولاد سے ہیں۔ کیونکہ قبیلہ مضر اپنے جد اعلیٰ مضر بن نزار کی طرف منسوب ہے جو چار واسطوں سے نضر بن کنانہ کا جد اعلیٰ ہے اور نضر بن کنانہ کی اولاد کو قریش کہتے ہیں پس نضر سے مضر تک کرسی نامہ یوں ہے نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر۔ آنحضرت ﷺ کے نسب نامہ میں بھی نضر سے مضر تک یہی سلسلہ اجداد ہے پس آپ ﷺ مضر کی اولاد سے ہوئے۔ حدیث میں وارد ہے تم مضر اور ربیعہ کو برا مت کہو وہ دونوں مومن تھے (لسان العرب)

(Practice Makes a Man Perfect)یعنی مشق انسان کو کامل بنا دیتی ہے۔

پس اہل عرب کے حافظے ان میں تحریر کے عام طور پر رائج نہ ہونے اور تمدنی اسباب آسائش کم ہونے اور زیادہ تر قوت حافظہ سے کام لینے اور اس پر پورا اعتماد کرنے کے سبب نہایت قوی تھے اور وہ کسی تحریری بیاض کے محتاج نہ تھے۔

عربوں کی قوت حافظہ : (۱) عرب نسب کو نہایت عزیز اور بڑے فخر کی بات جانتے تھے۔ قبائل و اشخاص کے نسبی و خاندانی تعلقات باقاعدہ بطور فن سیکھتے تھے۔ لیکن یہ تعلیم و تعلم سب کچھ زبانی ہوتا تھا۔ کوئی تحریری کورس (نصاب) مقرر و مدون نہیں تھا۔ جن لوگوں کو اس فن میں کامل مہارت اور پوری لیاقت و قابلیت ہوتی تھی ان کو نسابہ کہتے تھے[1] یہ لوگ کئی کئی پشتوں تک مختلف قبائل کے آباواجداد کا سلسلہ مع ان کی مختلف شاخوں کے برزبان یاد رکھتے تھے۔ اور کسی شخص کا اصیل (آزاد و شریف) یا مولے (آزاد شدہ غلام) یا وضیع و کمینہ ہونا اور اس کا کسی خاص قوم و خاندان میں سے ہونا یا نہ ہونا انہی نسابہ (نسب دان) لوگوں کی شہادت پر موقوف تھا۔

(۲) عربوں کو اپنی زبان پر بہت ناز و فخر تھا وہ اپنے آپ کو عرب (فصیح خوشگو صاف زبان والے) جانتے تھے اور دوسرے ملک والوں کو عجم (گونگے بے زبان حیوان) سمجھتے تھے۔ ان کی اس مایہ ناز زبان دانی کے کمال کی صورت بھی یہی تسلیم کی جاتی تھی کہ شعراء عرب کے اشعار اور فصحاء کے خطبے (لیکچر) کثرت سے برزبان یاد ہوں چنانچہ زمانہ جاہلیت کے اشعار و قصائد انہی باکمال لوگوں کے حافظہ کے طفیل زمانہ تدوین علم تک برابر محفوظ چلے آئے اور آج وہ ہمیں کتابی صورت میں نظر آرہے ہیں۔

جس طرح آج کل وفور علم و وسعت معلومات کا مدار کثرت مطالعہ پر ہے اسی طرح ان ایام میں قوت حافظہ کی جودت پر تھا۔

(۳) اس دستور کا اثر بعد کے زمانوں تک بھی رہا اور جب عہد اسلامی میں حدود سلطنت

---

[1] حضرت صدیق اکبر کو بھی اس فن میں کامل مہارت تھی۔

بہت وسیع ہو گئیں اور تمدن اسلامی ترقی پا گیا اور تحریر کا رواج ضرورتوں کی بنا پر عام ہو تا گیا تو علمی کتابوں اور سرکاری کاغذوں کی تصحیح بھی حفظ و درائیت ہی سے کی جاتی رہی۔ چنانچہ علامہ ابن خلدون اپنی تاریخ کے مقدمہ میں فصل صناعتہ الوراقتہ میں لکھتے ہیں۔

كانت العناية قديما بالدواوين العلمية و السجلات في نسخها و تجليد ها و تصحيحها بالرواية والضبط (صفحه ٣٥٢)

قدیم زمانہ میں علمی کتابوں اور سرکاری دستاویزوں کے لکھنے اور جلد سازی اور تصحیح میں روایت اور ضبط (حافظہ) کی طرف التفات ورجوع ہو تا تھا۔

غرض عربوں کے کاروبار کا مدار بیشتر حافظہ پر تھا۔ چنانچہ شیخ محمود سکری بغدادی اپنی تاریخ "بلوغ الارب فی احوال العرب" میں فرماتے ہیں۔

واما كون العرب احفظ من غير هم فلان الغالب منهم اميون ولا يقرؤن ولا يكتبون بل ان جميع العرب البوادى كذلك و مع هذا حفظوا على سبيل التفصيل ايامهم و حروبهم ووقائعهم و ما قيل فيها من شعر و خطب و ما جرى من المفاخرات و المنافرات بين قبائلهم و ضبطوا انسابهم و اسماء فرسانهم الذين نزلوا ميادين حروبهم و انهم من اى قبيلة والى اى اب ينتهون من الاباء الاولين و اسلافهم السابقين و كان احدهم يقول الشعر بلغت ابياته مابلغت فما هم الاسمعوه فانتقش في صحائف خواطر هم و تمثل فى خيالهم و هذا مماتساوى فيه الخاصة والعامة منهم والصغير و الكبير و الذكر و الانثى من احيائهم و ذلك مما لا يستريب فيه احد ولا يشك ذونظر و كانوا اذا جرت بينهم حادثة غريبة او اتفقت لهم نكتة غريبة ضربوا بها الامثال وسارت بين القبائل تلك الاقوال فلا تغيب هاتيك الوقائع عن افكار هم۔

(صفحه ٤١، ٤٢ ج ١٠)

"عربوں کے دیگر قوموں کی نسبت حافظے میں بڑھ کر ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اکثر ان میں سے امی تھے کہ پڑھنا جانتے تھے نہ لکھنا۔ بلکہ سب بادیہ نشین عرب ایسے ہی تھے اور باوجود اس کے ان کو اپنے تاریخی ایام اور لڑائیاں اور قومی واقعات اور ان کے متعلق جو اشعار و خطبے کہے جاتے تھے۔ اور ان کے قبائل میں قومی مفاخرو نفرت اور ہجو کے متعلق جو جو کچھ ہو چکا تھا وہ سب کچھ ان کو بالتفصیل محفوظ تھا۔ نیز ان کو اپنے نسب نامے اور اپنے نامور شاہسواروں کے نام جو میدان جنگ میں (جنگ کے لئے) اترتے تھے۔ سب محفوظ تھے۔ اور یہ بھی کہ وہ کس قبیلہ سے ہیں اور پہلے بزرگوں اور پچھلے اجداد میں سے کس دادا تک ان کی نسب منتہی ہوتی ہے۔ اور اگر ان میں سے کوئی شاعر شعر کہتا جس کے بیت (تعداد میں) جہاں تک کہ پہنچ سکتے۔ تو وہ سب اشعار بس صرف ایک دفعہ کے سن لینے سے ان کے صفحہ دل پر نقش ہو جاتے۔ اور ان کے خیال میں صورت پکڑ جاتے اور اس وصف میں ان کے خاص و عام اور چھوٹے بڑے اور مرد و عورت سب برابر تھے۔ اور یہ ایسی بات ہے جس کے ماننے میں کسی کو بھی تردد نہیں اور نہ کوئی صاحب نظر اس میں شک کر سکتا ہے اور جب ان میں کوئی نادر حادثہ ہوتا یا کوئی عجیب بات پیش آجاتی تو اسے ضرب المثل بنا لیتے اور وہ باتیں مختلف قبائل میں شائع ہو جاتیں پس وہ واقعات ان کے فکروں سے دور نہ ہوتے۔"

پس صحابہ کرام کو ان امور کے محفوظ رکھنے میں جو انہوں نے آنحضرت ﷺ کی زبان وحی ترجمان سے اپنے کانوں سنے تھے یا آپ کے وہ اعمال صالحہ جو انہوں نے اپنی آنکھوں دیکھے تھے۔ اور ان کا نقشہ ان کی نظروں میں برابر پھرتا رہتا تھا یا وہ پیاری اور اخلاص آمیز گفتگوئیں جن سے ان کو حضور ﷺ سے شرف ہم کلامی حاصل ہوتا تھا۔ کسی تحریری یادداشت کی حاجت نہیں تھی۔ کیونکہ انہوں نے ان کے یاد رکھنے میں اسی مروجہ ملک فطری قوت حافظہ سے کام لیا۔ جس سے وہ پشتوں تک کے واقعات اور قومی

حالات اور دواوین عرب (قصائد و خطب) اور نسب نامے محفوظ رکھتے تھے[1]

خلاصۃ المرام و نتیجہ الکلام یہ کہ جن ضرورتوں کی بنا پر بعد کے زمانوں میں حدیث نبوی مدون کی گئی وہ ضرورتیں عہد نبوت اور عصر صحابہ میں لاحق نہیں ہوئی تھیں۔

دوسری وجہ اس زمانہ میں حدیث جمع نہ ہونے کی یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کا عہد نزول قرآن کا زمانہ تھا۔ اور آنحضرت جس طرح مبلغ قرآن تھے۔ اسی طرح مبین و شارح قرآن بھی تھے[2] اپنے وعظوں اور خطبوں میں قرآن مجید مع تشریح مطالب بیان کرتے تھے۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ہے۔

---

[1] اس امر کی صحت میں کچھ بھی کلام نہیں کہ جب جسمانی اعضاء کو حرکت میں نہ لائیں اور ان سے ان کے مناسب کام نہ لیں جن کے لئے خالق حکیم نے انہیں بنایا ہے تو وہ ضعیف و کمزور ہو جاتے ہیں اور محل عوارض بن جاتے ہیں۔ امراء و رؤسا باوجود مقوی غذاؤں میں پلنے کے کیوں کمزور و سست اور بے ہمت ہوتے ہیں اور غرباء و محنتی لوگ باوجود خشک روٹی کھانے کے اور وہ بھی کبھی پوری اور کبھی ادھوری کبھی بروقت اور کبھی بے وقت پانے کے کیوں قوی تندرست اور توانا و چست ہوتے ہیں؟ اسی وجہ سے نہ کہ وہ اپنے اعضاء کو محنت و حرکت سے بچا کر ان کے آرام کے لئے خارجی اسباب پر زندگی گزارتے ہیں اور یہ "بیچارے مصیبت کے مارے" اپنے اعضاء کو عمل میں لا کر محنت و مشقت سے زندگی بسر کرتے ہیں جس سے ان کے قوی نظام طبعی کے ماتحت کام کرتے ہیں۔

اسی طرح جو لوگ قوت حافظہ سے کام نہیں لیتے یا کم لیتے ہیں۔ اور بات بات میں تحریر کے (جو ایک خارجی ذریعہ یادداشت ہے) محتاج ہوتے ہیں۔ ان کے حافظے کمزور ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ ان کے معلومات کثرت مطالعہ سے وسیع ہو جاتے ہیں اور ان کا دماغ اس طرح کی مشق سے ہر قسم کی بات کو اخذ کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ لیکن یہاں تو صرف "قوت حافظہ" میں گفتگو ہے۔ نہ کہ دماغ کی دوسری قوتوں میں۔ کیونکہ تحریر پر بھروسا کرنے سے حافظہ سے کام کم لیا جاتا ہے۔ تو رفتہ رفتہ کمزور ہو جاتا ہے اور بغیر تحریر کے گزارہ نہیں آتا۔

ایسے لوگ جب کسی ایسی قوم کی قوت حافظہ کی نسبت جن میں تحریر کا رواج بہت کم ہو۔ اور وہ زیادہ تر فطری قوت حافظہ سے کام لیتے ہوں کچھ سنتے ہیں تو بہت تعجب کرتے ہیں اور اسے قریبا ناممکن اور افسانہ جان کر انکار کر دیتے ہیں اور مقولہ المرء یقیس علی نفسہ (ہر شخص دوسرے کو اپنے پر قیاس کرتا ہے) کے مطابق ان کو بھی اپنے جیسے جانتے ہیں۔ حالانکہ دونوں کے حالات زندگی اور طریق معاشرت اور وسائل علم اور دماغی قوتوں کی تربیت میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔

[2] چنانچہ فرمایا و انزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیهم (نحل پارہ ۱۴) اسی امر کا کسی قدر مفصل بیان حصہ اول میں ہو چکا ہے۔

عن جابر بن سمرۃ قال کانت للنبی صلی اللہ علیہ و سلم خطبتان یجلس بینھما یقرء القرآن ویذکر الناس (جلد اول صفحہ ۲۸۳)

یعنی نبی ﷺ دو خطبے کرتے۔ اور ان کے درمیان جلسہ کرتے (بیٹھتے) اور قرآن پڑھتے اور لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے تھے۔

چونکہ قرآن اور بیان قرآن ہر دو آپ ہی کی زبان وحی ترجمان سے نکلتے تھے۔ اور ہر دو عربی زبان میں تھے جو آپ کی زبان تھی۔ اس لئے سخت اندیشہ تھا کہ متن اور شرح مخلوط اور کلام خدا اور کلام رسول ممزوج نہ ہو جائے جیسا کہ کتب سابقہ میں ہو گیا[1]۔ اس لئے آپ نے کتابت حدیث سے یعنی قرآن کی تفسیر و تشریح جو آپ فرمایا کرتے تھے اس کے لکھنے سے منع فرمادیا تھا۔ چنانچہ حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے۔

عن ابی سعیدؓ الخدری ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم قال لا تکتبوا[2] عنی و من کتب عنی غیر القرآن فلیمحہ و حدثوا عنی ولا

---

[1] کتب سابقہ میں متن و شرح کے اختلاط و امتزاج کا اعتراف تاریخ دان پادریوں کو بھی کرنا پڑا ہے۔

[2] منکرین حدیث اس حدیث کو اس امر میں پیش کیا کرتے ہیں کہ جب خود آنحضرت ﷺ نے کتابت حدیث سے منع فرمادیا تھا۔ تو اس کی پیروی کہاں واجب رہی؟ یہ انکی سخت بے سمجھی اور بے علمی کی دلیل ہے۔ اول اس لئے کہ ممانعت تو کتابت سے ہے نہ متابعت سے۔ پس اس حدیث کو ممانعت متابعت میں پیش کرنے کے کیا معنی؟ پیروی و اطاعت کے لئے کتابت ضروری نہیں۔ جیسے کہ قران مجید جس طرح کہ کتابت میں آنے کے بعد واجب الاطاعت ہے۔ اسی طرح کتابت و تحریر میں آنے سے پہلے بھی واجب الاطاعت تھا۔ چونکہ حصول علم بغیر تحریری فرمان کے صرف زبانی تحدیث و نقل روایت سے بھی ہو سکتا ہے۔ اس لئے اسی حدیث میں ممانعت کتابت حدیث کے حکم کے ساتھ ہی فرمادیا و حدثوا عنی یعنی (قرآن کے سوا جو کچھ میں کہا کروں اسے) میری طرف سے زبانی بیان کیا کرو۔ ہاں زبانی روایت میں کمی بیشی کا اندیشہ تھا سو اس کی رکاوٹ کے لئے ساتھ ہی فرمادیا من کذب علی متعمدا فلیتبوا مقعدہ من النار یعنی "جو کوئی جان بوجھ کر کسی امر میں میری طرف جھوٹی نسبت کرے گا۔ اسے اپنا ٹھکانا جہنم میں بنانا چاہئے۔"

دیگر یہ کہ اس ممانعت کی وجہ سے اس علم کا اعتبار نہیں تو یہ سند بھی تو اسی علم کی کتب مدونہ سے

حرج و من كذب علي (قال همام احسبه قال) متعمدا فليتبوء مقعده من النار (صحيح مسلم جلد ثانی باب التثبيت في الحديث و حكم كتاب العلم صفحه ٤١٤)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجھ سے (جو کچھ سنو اسے) لکھا نہ کرو۔ اور جس نے مجھ سے سوائے قرآن کے کچھ لکھا ہو اسے مٹا دے۔ اور مجھ سے زبانی روایت کیا کرو۔ اور اس میں کوئی حرج نہیں اور جو کوئی مجھ پر عمداً جھوٹ باندھے اسے چاہئے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنائے۔

گذشتہ سے پیوستہ

پیش کی جاتی ہیں۔ جو اس ممانعت کی خلاف ورزی کا نتیجہ ہے۔ پس یہ سند کیوں معتبر ہونے لگی؟ اگر کہا جائے کہ یہ الزامی اعتراض ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ الزام ہم پر قائم نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ہماری اور منکرین حدیث کی نزاع تو علم حدیث کے اعتبار اور اتباع میں ہے اور اس حدیث پیش کردہ میں ممانعت کتابت سے ہے نہ کہ ممانعت اتباع جیسا کہ وجہ اول میں مذکور ہے۔ پس جب پیروی منع نہ ہوئی۔ اور تحدیث و حفظ احادیث اس حدیث کی رو سے بھی امر جائز بلکہ مندوب ہوا تو جو علم ہمارے حافظہ میں محفوظ ہے اور اس پر ہمارا عمل درآمد بھی ہے۔ اس کے کتابت میں لانے سے اس میں کیا خرابی پیدا ہو گئی؟ بلکہ اس کی حفاظت تو اب دوبالا ہو گئی۔ کہ سینے میں محفوظ ہونے کے علاوہ سفینے (نوشت) میں بھی محفوظ ہو گیا۔ پس ترقی کی صورت میں وہ اور بھی محفوظ ہو گیا۔ اور چونکہ عہد نبوت میں قرآن مجید سے مخلوط ہو جانے کا اندیشہ تھا اس لئے قرآن خود بھی لکھوایا۔ اور اس کے لکھنے کی ترغیب بھی دی اور حدیث کے لکھنے سے منع کیا۔ لیکن جب آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد التباس و اختلاط کا اندیشہ جاتا رہا۔ تو اس کی کتابت میں کوئی حرج نہ رہا کیونکہ اصل کتابت سے ممانعت نہ تھی۔ جیسا کہ متن کے مشرح و مفصل بیان سے معلوم ہو سکتا ہے۔ چنانچہ محدثین (شكر الله مساعيهم الجميلة) نے اسے مدون کرنا شروع کیا اور اس کے نتائج سے آج تک اسلامی دنیا متمتع ہوتی چلی آئی ہے۔ اس حدیث لا تكتبوا عني... الخ کا باقی بیان بالتفصیل انشاء اللہ آگے آئے گا فانتظروا۔

ارتباط بحصہ اول

جب حصہ اول میں اس بیان کے ضمن میں کہ عصر صحابہؓ اور عہد تابعینؒ اور زمانہ اتباع تابعین (رحمہم اللہ اجمعین) میں قرآن عظیم اور سنن نبی کریم ﷺ کی پیروی تقلید شخصی کے بغیر واجب جانی جاتی تھی ان ائمہ باکمال کا ذکر خیر بھی آگیا جنہوں نے تدوین علم کی طرح ڈالی۔ جس سے بعد کے زمانوں میں وہ ایک باقاعدہ اور مستقل فن کی طرح قرار پایا۔ تو اب مناسب ہے کہ اس علم کی تدوین و اشاعت اور زمانہ بزمانہ اس کی ترقی و اذاعت کی کیفیت بھی کسی قدر تفصیل سے بیان کر دی جائے۔ چنانچہ ہم سابقاً فصل زمانہ تابعین و اتباع تابعین میں اس امر کا وعدہ کر آئے ہیں۔

(۲) دیگر یہ کہ جب جماعت اہل حدیث (کثر اللہ سوادھم) کے متعلق کچھ تاریخی امور بیان ہو چکے۔ تو اب اس مقدس علم کی بھی تاریخ بیان ہونی چاہئے۔ جس کی اتباع و خدمت کی وجہ سے وہ ”اہلحدیث“ کہلائے تاکہ منسوب اور منسوب الیہ ہر دو کے ذکر سے مضمون مکمل ہو جائے۔

صحابہؓ میں احادیث نبویہؐ کی حفاظت

(۱) گو آنحضرت ﷺ کی ممانعت کو ملحوظ رکھتے ہوئے بعض صحابہؓ کرام کتابت احادیث سے محترز رہے- لیکن ان کی حفاظت ورعایت میں انہوں نے پوری سعی وہمت سے کام لیا- چنانچہ یہی حضرت ابو سعید خدریؓ جو حدیث ممانعت کے راوی ہیں- حدیث نبویؐ کو پوری طرح حفظ کرتے تھے- اور اپنے شاگردوں کو بھی بتاکید حفظ کرواتے تھے- چنانچہ سنن دارمی میں ہے-

عن ابی نضرة قال قلت لابی سعید الخدریؓ الاتکتبنا فانا لا نحفظ فقال لا انا لن نکتبکم و لن نجعله قرانا و لکن احفظوا عنا کما حفظنا نحن عن رسول الله صلی الله علیه و سلم (سنن دارمی صفحه ٦٦)

"(یعنی حضرت ابوسعید خدری کے شاگرد) ابونضرہ تابعی نے آپ سے کہا کہ آپ (جو روایت کرتے ہیں) ہمیں لکھوا دیا کریں- کیونکہ ہمیں یاد نہیں رہتا- تو آپ نے فرمایا' نہیں یہ ہرگز نہیں ہوگا کہ میں اسے قرآن بنادوں- ہاں تو بھی ہم سے اسی طرح حفظاً یاد کرو جس طرح ہم نے رسول اللہ ﷺ سے حفظاً یاد کیں-"

(۲) صحابہ کرام کی پاک جماعت حضور سرور عالم ﷺ کے اشاروں کی تعمیل اور آپ کے ارادوں کی تکمیل میں ایسی سرگرم تھی کہ اس کی نظیر صفحہ ہستی پر دیکھی نہ سنی گئی- پس ہو نہیں سکتا کہ یہ مقدس جماعت جس نے آنحضرت ﷺ کے سیاسی مقاصد کی تکمیل میں چند سال کے عرصہ میں اپنی دہشت انگیز اور حیرت خیز فتوحات سے دنیا میں ایک ایسا عظیم انقلاب پیدا کر دیا- جس سے دنیا کا ایک نیا نقشہ تیار کرنا پڑا- وہ آپ کے شرعی مقاصد کی تکمیل میں (معاذ اللہ) ایسے سست و بے ہمت نکلیں کہ رسالت کے اصل مقصود یعنی تصحیح عقائد' اصلاح عمل اور تہذیب اخلاق کو فوت کر دیں- یا ان امور

کے متعلق آپ کی پاکیزہ ہدایات کو فراموش کر دیں-

واقعات شاہد ہیں کہ ان کے مبارک قدم جہاں پہنچے-وہاں پر اسلامی حکومت کے ساتھ ساتھ شرعی علم و عمل کا سکہ بھی بیٹھتا گیا-وہاں کے قومی و ملکی رسم و رواج بلکہ ان کی زبان تک اٹھ گئی-اور ان کی جگہ نبی عربی (فداہ ابی و امی و روحی) ﷺ کی سنت اور زبان کا رواج ہو گیا-اور یہ باتیں انجام کو نہیں پہنچ سکتیں جب تک وہ لشکر کشی، کشور کشائی، طرز حکومت اور تبلیغ و اشاعت اسلام میں آپ کی ہدایات و معمولات کو ملحوظ نہ رکھیں- مثلاً خدا تعالیٰ نے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر مجملاً خبر دی ہے کہ تم (مسلم قوم) کو موجود الوقت دشمنوں کے علاوہ دیگر قوموں سے بھی-جن کو تم ابھی نہیں جانتے اور بعض ان میں سے سخت جنگجو قومیں ہیں-پالا پڑے گا (فتح پ ۲۶) اس کی تفصیل و بیان میں رسول اللہ ﷺ نے فتح مصر، فتح روم و شام فتح ایران کے متعلق جو جو احادیث فرمائی تھیں-وہ ان کو کس طرح بھول سکتی تھیں یا یوں کہئے کہ ان واقعات کے ہوتے ہوئے کس طرح فراموش ہو سکتی تھیں- نیز ارسال سریہ (لشکر بھیجنے) کے وقت جب آپ بنفس نفیس خود بھی شریک جنگ ہوتے تھے-اور فوج کی کمان آپ کے ہاتھ میں ہوتی تھی- تو صحابہ کرام ان احوال و احکام اور معمولات کو اپنی فتوحات و لشکر کشی کے وقت جو آپ کی وفات کے بعد ہوئیں، کیسے بھلا سکتے تھے-مثلاً آپ نے صحابہ کو خطاب کر کے فرمادیا تھا-

عن ابی ذر قال قال رسول الله صلى الله عليه و سلم انكم ستفتحون مصر وهي ارض يسمى فيها القيراط فاذا فتحتموها فاحسنوا اليها فان لهم ذمة ورحما و قال ذمة و صهرا. (الحديث)[1]

"یعنی حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم عنقریب ملک مصر فتح کرو گے وہ ایسا ملک ہے کہ اس میں (سکہ) قیراط چلتا ہے- پس جب تم اسے فتح کرو تو ان (لوگوں) سے احسان کرنا- کیونکہ

۱- صحیح مسلم جلد ۲-

تمہارے ذمہ ان کا (حق) عہد اور (حق) رشتہ ہے۔"

اسی طرح آپ نے فتح ایران کے متعلق بھی فرمایا تھا۔

عن جابر بن سمرة قال سمعت رسول الله صلى الله عليه و سلم يقول لتفتحن عصابة من المسلمين او المومنين كنز ال كسرىٰ الذى فى الابيض[1]

"یعنی حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ مسلمانوں کی ایک جماعت آل کسریٰ کا خزانہ جو (اس کے قصر) ابیض میں ہے فتح کرلے گی۔"

اسی طرح قیصر روم کے خزانے فتح ہونے کی بشارت بھی صحیح بخاری اور صحیح مسلم وغیرہما کتب حدیث میں مروی ہے تو کیا آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ صحابہ کرام کو ان ممالک کی فتح کے وقت آنحضرت ﷺ کے ارشادات نسیاً منسیاً ہوگئے تھے۔ حاشا و کلا۔ یا نماز کے احکام کو جس میں نجات و عاقبت کے علاوہ مسلمانوں کی تنظیم کا سبق اور اپنے امیر و سردار کی اطاعت کی عملی مشق بھی ہے۔ اور وہ دن میں پانچ بار آپؐ کے ساتھ با جماعت گزارتے تھے کس طرح فراموش کر سکتے تھے

چونکہ ہمارا دین زیادہ تر عمل کے متعلق ہے۔ اور آنحضرت (ﷺ) دین کی اکثر باتیں جو عمل کے متعلق ہوں وہ اپنے طریق عمل سے سمجھاتے تھے جو آج کل کی تصویری تعلیم (Pictorial Instruction) (پکٹوریل انسٹرکشن) کی نسبت نفس میں اثر کرنے اور حفظ و اتقان (پختگی) میں بدرجہا ارفع و اعلیٰ ہے۔ اس لئے ہو نہیں سکتا۔ کہ صحابہ کرام کی مقدس جماعت ان کو ائف و معمولات کو ضائع ہونے دے۔ پس جس طرح خدائے فیاض نے اپنے فضل و فیاضی سے ان کی ہمت و سعی میں برکت بخشی تھی کہ ان کے مبارک قدم فتوح بلدان کے لئے آگے ہی آگے بڑھائے جیسا کہ کہا گیا ہے:

---

[1] صحیح مسلم جلد ۲ ص ۳۹۶۔

تھمتا نہ تھا کسی سے سیل رواں ہمارا

اور اقوام عالم کو ان کے آگے دھر دیا[1] اور شاہان عالم کے تختوں کو ان کے پاؤں کی چوکی بنا دیا۔ اسی طرح اشاعت اسلام اور اجرائے شریعت کے مقصد کو پورا کرنے کے لئے ان کی ہمت میں برکت دینے کے ساتھ ان کے حافظہ میں پختگی اور ان کے ضبط میں اتقان پیدا کر دیا۔ کہ ان کو رسول اللہ ﷺ سے اپنے کانوں سے کلمات طیبات اور آنکھوں دیکھے واقعات و حالات اور آپ کے اعمال صالحات عموماً باوجود زمانہ دراز گذر جانے کے بالکل تازہ اور آنکھوں کے سامنے رہتے تھے۔ اور ان کے دل میں اپنا ڈر اس قدر بھر دیا تھا کہ اگر کہیں کسی مترادف لفظ یا کمی بیشی کا شبہ بھی پڑ گیا۔ تو اس تردد کو روایت میں برابر ظاہر کر دیا۔ چنانچہ صحیح مسلم کی حدیث جو خزائن ایران کی فتح کے متعلق اوپر مذکور ہوئی۔ اس میں من المسلمین او المومنین میں لفظ "او" سے سمجھا دیا۔ کہ رسول اللہ ﷺ نے مسلمین فرمایا تھا۔ یا مومنین حالانکہ دونوں کے مصداق و مفہوم شرعی میں کچھ بھی فرق نہیں۔ صرف روایت الفاظ میں احتیاط کے خیال سے ایسا ذکر کر دیا۔

الغرض حالات مذکورہ کے ہوتے ہوئے صحابہ کرام ان واقعات کے یاد رکھنے میں کسی کتابی بیاض و تحریری نسخہ کے محتاج نہ تھے۔ نہ تو اپنے علم کے لئے اور نہ دوسروں کو بتانے کے لئے۔ جب کبھی ان کے سامنے ان واقعات کے متعلق کوئی ذکر آیا۔ تو جھٹ ان کی نظروں میں عہد رسالت کا نقشہ مع اس واقعہ کی خصوصیات و کیفیات کے پھر گیا۔ گویا کہ وہ اسے اب بھی عیاناً دیکھ رہے ہیں۔ چنانچہ صحیح بخاری

---

[1] اس میں لیسعیاہ نبی کی بشارت کی طرف اشارہ ہے جو آنحضرتؐ کے حق میں ہے جو یہ ہے۔ (۲) کس نے اس راست باز (امین) کو پورب کی طرف سے برپا کیا اور اپنے پاؤں کے پاس بلایا (معراج) اور امتوں کو اس کے آگے دھر دیا اور اسے بادشاہوں پر مسلط کیا؟ کس نے انھیں خاک کی مانند اس کی تلوار کے اور اڑتی بھوس کے مانند اس کی کمان کے حوالے کیا؟ (۳) اس نے ان کا پیچھا کیا اور جس راہ پر کہ پیشتر قدم نمارا تھا سلامت گذر گیا۔ (لیسعیاہ نبی باب ۴۱ : ۳/۲) آنحضرت تو اولاً و بالذات مصداق ہیں اور صحابہ بالتبع۔ کیونکہ یہ سیاسی غلبے کی خبر ہے اور سیاسی غلبے اور جنگوں میں صحابہ بھی شامل ہیں۔ فافہم۔

شریف میں ہے کہ جب عمرو بن سعید[1] مکہ معظمہ پر چڑھائی کی تیار کر رہے تھے- تو حضرت ابو شریح[2] صحابیؓ نے اسے اس کام سے روکنے کے لئے ان الفاظ سے خطاب کر کے رسول اللہ ﷺ کی حدیث سنائی-

ائذن لی ایها الامیر احدثك قولاقام به صلی الله علیه و سلم الغدمن یوم الفتح سمعته اذنای ووعاه قلبی وابصرته عینای حین تکلم[3]

"(یعنی) امیر صاحب! مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ کو وہ حدیث سناؤں جو رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ سے دوسرے روز فرمائی تھی جسے میرے دونوں کانوں نے سنا- اور میرے دل نے اسے پوری طرح یاد کر لیا اور جب آپ فرما رہے تھے تو میری دونوں آنکھیں آپ کو دیکھ رہی تھیں-"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ کی اس تقریر کا تفصیلی نقشہ صحابی کی نظر میں زمانہ روایت تک برابر پھر رہا ہے- اور وہ ان کے خزانہ حافظہ میں کامل طور پر مخزون و محفوظ ہے- اور ان کو اس کی نسبت پورا وثوق و یقین ہے کیونکہ دل، کان اور آنکھ کا ذکر صرف سماع و حفظ و فہم کی پختگی اور رسائی ظاہر کرنے کے لئے ہے ہم ان تاکیدی

---

[1] حضرت عبداللہ بن زبیر نے جو آنحضرت ﷺ کی پھوپھی کے پوتے اور حضرت صدیق اکبرؓ کے نواسے تھے انہوں نے یزید سے بیعت نہ کی تھی اور مکہ معظمہ میں پناہ گزین ہو گئے تھے- عمرو بن سعید نے جو یزید کی طرف سے حاکم مدینہ تھا- عبداللہ بن زبیر کے مقابلہ کے لئے مکہ شریف کی طرف لشکر کشی کا سامان تیار کیا- حضرت ابو شریح صحابی نے عمرو بن سعید کو اس سے منع کیا- کہ آنحضرت ﷺ نے حرم مکہ میں لڑائی کرنی فتح مکہ کے دوسرے روز بالتصریح حرام فرمائی تھی- پس وہاں پر لشکر کشی جائز نہیں-

[2] حضرت ابو شریح خزاعی فتح مکہ سے پیشتر اسلام لائے- غزوہ فتح مکہ میں اپنے قبیلے خزاعہ کا جھنڈا لئے دس ہزار قدوسیوں میں شامل تھے- مدینہ طیبہ میں ۶۸ھ میں فوت ہوئے- قاضی شریح جو حضرت عمرؓ اور ان کے بعد کے عہدوں میں عادل و قابل قاضی تھے انہی حضرت ابو شریح کے بیٹے تھے (اصابہ جلد ہفتم مطبوعہ کلکتہ صفحہ ۱۸۵)

[3] صحیح بخاری کتاب العلم باب لیبلغ الشاہد الغائب-

زوردار الفاظ کو ذرا کھول کر بیان کرنا چاہتے ہیں۔

(۱) **قوله قام به رسول الله صلى الله عليه و سلم**: (بیان کے وقت رسول اللہ ﷺ کھڑے تھے) اس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ اول سامع کا آنحضرت ﷺ کی حالت تقریر (قیام) کو محفوظ رکھنا دوم اس بات کا اظہار کہ مضمون بیان کردہ آنحضرت ﷺ کی نظر میں خاص اہمیت رکھتا تھا کہ اس کو کھڑے ہو کر بیان فرمایا۔

(۲) **قوله الغدمن يوم الفتح**: (فتح مکہ کے دوسرے روز) اس میں یہ جتایا ہے کہ مجھے رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد کی تاریخ و زمانہ بھی محفوظ ہے۔

(۳) **قوله سمعته اذ ناى**: (آپ کے اس ارشاد کو میرے دونوں کانوں نے سنا) اس میں بذات خود بلاواسطہ سننے کی تصریح ہے۔ جس میں اس وہم کا ازالہ ہے کہ شائد کسی دوسرے سے سن کر کہا ہو۔ نیز دونوں کانوں سے سننے کے ذکر میں تحقیق و ثبوت سماع میں تاکید و مبالغہ حسن ہے۔ اور کمال توجہ کا اشارہ بھی ہے۔

(۴) **قوله وعاه قلبى**: (آپ کے ارشاد کو اس طرح دل میں بحفاظت تمام بٹھالیا۔ جس طرح مظروف کو ظرف اپنے اندر لے لیتا ہے) اس میں حفظ و فہم کلام اور اس پر پورے طور سے حاوی ہونے کو بوجہ ابلغ بیان کیا ہے۔

(۵) **قوله ابصرته عيناى**: (کلام کرتے وقت میری دونوں آنکھیں آپ کے دیدار سے مسرور تھیں) اس سے یہ ظاہر کیا ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا تھا۔ تو میں بالمشافہ آپ کے دیدار پر انوار سے بہرہ اندوز ہو رہا تھا۔ ایسا نہیں کہ کسی اوٹ اور حجاب کے پرے بیٹھا ہوا صرف آواز ہی سن رہا تھا۔ کیونکہ متکلم کو اپنی آنکھ سے دیکھنا کلام کے سمجھنے اور محفوظ رکھنے میں بہت مدد دیتا ہے۔ اور دونوں آنکھوں سے دیکھنے کا ذکر کرنے میں ثبوت روایت میں مبالغہ اور تحقق یقینی کا فائدہ ہے۔ نیز اس میں سننے والے کا کمال اشتیاق بھی پایا جاتا ہے۔ اور شوق و ذوق کی حالت میں سنی ہوئی بات بھولا نہیں کرتی۔ پس جب دل کان اور آنکھ ہر سہ ذرائع علم کا ذکر کیا اور کمال اشتیاق و توجہ کو ثابت کیا تو گویا جمیع وجوہ فہم و حفظ کامل کا دعوی کیا۔ بلاغت کلام کو جاننے والے اصحاب

سمجھ سکتے ہیں کہ یادداشت کی پختگی کو اس سے زیادہ کن الفاظ میں بیان کر سکتے ہیں؟

اس تبلیغ کا زمانہ: عمرو بن سعید سے حضرت ابو شریح صحابی کی یہ گفتگو مشہور و معروف تابعی یزید بن معاویہؓ کے عہد کی ہے کیونکہ یہ عمرو بن سعید یزید[1] کی طرف سے مدینہ طیبہ پر متعین تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ صحابی کی نظر میں یہ حدیث نبوی نصف صدی سے بھی زیادہ عرصہ تک ایسی ہی تازہ ہے جیسی کہ کل کی بات فافہم و لا تکن من القاصرین۔

(۳) صحابہؓ کو جو الفت و محبت، عقیدت و ارادت، شوق و شغف، عشق و دل بستگی آنحضرت ﷺ کی ذات اقدس سے تھی۔ وہ بھی ان کو آپ کے اقوال و افعال کے محفوظ رکھنے میں قوی مدد دیتی تھی۔ کیونکہ محبّ اپنے محبوب کی اداؤں اور باتوں کو ضائع جانے نہیں دیتا۔ خاص کر جب کہ وہ محبوب نہایت درجے کا حکیم و فہیم اور محبّ کی نظر میں عظیم القدر و کبیر الشان ہو۔ کہ اس کی ہر وقت و ہر سکون اور ہر قول و ہر خاموشی کسی خاص مصلحت پر مبنی ہو۔ اس کی مثال تو یوں سمجھنی چاہئے۔ کہ جس طرح بارش کی بوندیں پیاسی زمین میں جذب ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح محبوب کی ادائیں اور باتیں محبّ کے لوح خاطر پر نقش ہو جاتی ہیں۔ گویا محبّ کا دماغ محبوب کے اقوال و افعال کے لئے ایک عکسی آئینہ ہے جس میں ان کی صورت منطبع ہو جاتی ہے۔ اور محبّ کا سینہ محبوب کے اقوال کے لئے فونوگرام کی پلیٹ ہے۔ جس میں وہ سب جذب ہو جاتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ سے صحابہ کی الفت و محبت محتاج بیان نہیں۔ محبت ہی تو تھی۔ جس نے ان کی نظر میں سرور عالم ﷺ کی ذات گرامی کی تعظیم اور آپ کے احکام و ارشادات کی تعمیل اور آپ کی سیرت و سنت کی اتباع کے سامنے ان کے مال و جان، عزت و آبرو، وطن و مکان، زن و فرزند سب کچھ ہیچ و بے حقیقت کر دئے تھے۔ وہ حضور پر نور ﷺ کی مرضی کو اپنی مرضی و خواہش پر مقدم رکھتے تھے۔ اور آپ کی غلامی کو دو جہان کی سرداری سمجھتے تھے۔ اسی محبت و عقیدت کا اثر تھا جس نے عروہ بن مسعود ثقفی

---

[1] یزید کا زمانہ حکومت رجب ۶۰ھ سے ربیع الاول ۶۴ھ تک رہا (تاریخ الخلفاء للسیوطیؒ)

ایسے جہاں دیدہ و تجربہ کار کو مقام "حدیبیہ" پر حیران کر دیا تھا- جب کہ وہ کفار قریش کی طرف سے آنحضرت ﷺ کی خدمت اقدس میں سفیر ہو کر آیا تھا- اس نے آپ کے ان جانثاروں کی فداکاری اور جاں نثاری دیکھی تو واپس جا کر قوم کو ان الفاظ میں خطاب کر کے اسلامیوں کی سیاسی قوت کا اندازہ جتلایا-

فرجع عروة الی اصحابه فقال ای قوم واللہ لقد وفدت علی الملوك و وفدت علی قیصر و کسریٰ و نجاشی واللہ ان رأیت ملکا قط یعظم اصحابه مایعظم اصحاب محمد محمداً واللہ ماتنخم نخامة الاوقعت فی کف رجل منھم فدلك بھا وجهه و جلده واذا مرھم ابتدروا امره و اذا توضاء کادوایقتتلون علی وضوئه واذا تکلم خفضوا اصواتھم عنده ولا یحدون النظر الیه تعظیما له و انه قد عرض لکم خطة رشد فاقبلوھا (صحیح بخاری کتاب الشروط ج ۲ مطبوعه مصر ص ۷۹)

(یعنی) "پس وہ عروہ اپنے لوگوں کی طرف لوٹا اور کہنے لگا کہ اے میری قوم! اللہ تعالیٰ کی قسم میں (کئی ایک) بادشاہوں کے پاس گیا ہوں- اور قیصر (روم) اور کسریٰ (ایران) اور نجاشی (شاہ حبشہ) کے پاس بھی گیا ہوں- اللہ تعالیٰ کی قسم میں نے کسی بادشاہ کو نہیں دیکھا کہ اس کے اصحاب اس کی اتنی عزت کرتے ہوں جتنی عزت محمد (ﷺ) کی محمد (ﷺ) کے اصحاب کرتے ہیں- اللہ کی قسم! جب اس نے ناک صاف کی تو وہ پانی کسی آدمی ہی کی ہتھیلی پر پڑا- جسے اس نے اپنے چہرے اور بدن پر مل لیا- اور جب آپؐ نے کوئی حکم کیا تو اس کی تعمیل میں انہوں نے جلدی کی- اور جب آپؐ نے وضو کیا تو قریب تھا کہ وضو کا (گرا ہوا) پانی لینے کے لئے آپس میں لڑ پڑیں- اور جب آپؐ نے بات کی تو آپؐ کے سامنے سب نے آوازیں پست کر دیں اور آپؐ کی طرف آپ کی تعظیم کے خیال سے تیز نظر کر کے دیکھتے نہیں- اور آپؐ نے تمہارے

سامنے بھلائی کا ایک نرم راستہ پیش کر دیا ہے پس تم اسے قبول کر لو۔"

ایسی عقیدت و محبت والی قوم سے متصور نہیں ہو سکتا۔ کہ وہ اصل چیز کو جس کی وجہ سے ان میں اس ارادت و الفت کی روح پھونکی گئی۔ اور اس میں ان کی دنیوی بہبودی اور اخروی نجات بھی ہو ضائع جانے دیں۔ یعنی "احکام شریعت" خواہ وہ احکام آپ کے ارشادات قولیہ سے حاصل ہوں خواہ اشارات فعلیہ سے۔

وہ آپ کے ہر فعل کو نہایت محبت سے دیکھتے اور آپ کے ہر قول کو نہایت عقیدت مندی سے سنتے تھے۔ ان کے نزدیک (بلکہ واقعہ میں بھی) آپ کی حرکات و سکنات، نشست و برخاست، سکوت و تکلم، ضحک و بکاء، خواب و بیداری کی حالتیں با معنی اور حکمت پر مبنی ہونے کی وجہ سے سب سبق آموز اور قابل اقتداء تھیں۔ لہٰذا وہ آپ کے اقوال و افعال کو خاص دلچسپی و انس سے سنتے اور دیکھتے۔ اور پھر در شاہوار کی طرح نہایت قدر سے محفوظ رکھتے تھے۔ اللّٰهم صل علی سیدنا و مولنا محمد و علی اله و ازواجه و اصحابه و بارك و سلم۔

بعض نوشتیں آنحضرت ﷺ کے حکم سے لکھیں گئیں

اوپر جو کچھ بالتفصیل مذکور ہوا- وہ عام رسم و رواج کے متعلق تھا- ورنہ احادیث کے استقراء اور متتبع سے معلوم ہو سکتا ہے- کہ بعض تحریریں قرآن مجید کے علاوہ بھی خاص فرمان نبوی سے لکھی گئیں- ان کو ہم اصولی طور پر چند اقسام پر تقسیم کرتے ہیں- تاکہ معلوم ہو سکے کہ قرآن مجید کے املاء کے علاوہ کتنے اور صیغے ہیں- جن میں تحریر کی ضرورت پڑتی ہے- لیکن قربان جائیں اس نبی امیؐ پر کہ آپ نے ان سب پر توجہ کی- اور اپنی امت کو ہونے والی فتوحات میں اس "طریق مسنون" پر کام کرنے کی تعلیم کر دی-

اول :- وہ جو کسی کی درخواست پر آپ نے بعض مسائل لکھ دینے کا حکم کیا-

دوم :- وہ فرامین جو آپ نے اپنے عمال کے نام لکھوائے-

سوم :- وہ مکاتیب جو آپ نے دعوت اسلام کے متعلق اندرون و بیرون عرب کے بادشاہوں اور سرداروں کے نام لکھوائے-

چہارم :- مسلمانوں کی بعض سیاسی و تمدنی (بلدی) ضرورتوں کو ملحوظ رکھ کر کسی امر کے تحریر میں لانے کا حکم دیا-

پنجم :- وہ تحریریں جو آنحضرت ﷺ نے بعض لوگوں یا قوموں کو بطور سند اور دستاویز کے لکھوا کر دیں-

پہلی قسم :- کی مثال یہ ہے کہ مکہ معظمہ میں قبیلہ خزاعہ میں سے ایک شخص نے قبیلہ بنی لیث کا ایک آدمی مار ڈالا- رسول اللہ ﷺ کو خبر پہنچی- تو آپ نے مکہ مکرمہ کی عزت و حرمت اور اس میں قتل و قتال کی ممانعت و حرمت کے متعلق خطبہ فرمایا- حاضرین میں سے ایک یمنی شخص نے (جو ابو شاہ کے نام سے مشہور تھا) عرض کیا کہ

حضور والا مجھے یہ (خطبہ) لکھوا دیجئے۔ اس کی یہ درخواست شرف قبولیت کو پہنچی اور آپ نے زبان شفقت ورحمت ترجمان سے فرمایا۔ اکتبوا لابی فلان یعنی یہ (خطبہ) ابو شاہ کو لکھ دو (صحیح بخاری کتاب العلم) دیگر یہ کہ حضرت ابوہریرہؓ سے صحیح بخاری میں مروی ہے۔

قال (همام) سمعت ابا هريرة يقول ما من اصحاب النبی صلی الله علیه و سلم احد اکثر حدیثا عنه منی الا ما کان من عبدالله بن عمرو فانه کان یکتب ولا اکتب

ہمام (شاگرد حضرت ابوہریرہؓ) کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوہریرہؓ کو کہتے سنا کہ آنحضرت ﷺ کے اصحاب میں سے کوئی شخص بھی مجھ سے زیادہ آپ کی حدیث کا حافظ نہیں مگر جو روایت عبداللہ بن عمروؓ سے ہو کیونکہ وہ لکھ لیا کرتا تھا۔ اور میں لکھا نہ کرتا تھا۔ صحیح بخاری کتاب العلم باب کتابتہ العلم۔

اس روایت میں اگرچہ اس امر کی صراحت نہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرو کا احادیث نبویہ کو لکھنا کس زمانہ میں تھا۔ لیکن حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں اس روایت کے ذیل میں لکھا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ کی یہ روایت احمدؒ اور امام بیہقیؒ نے بھی روایت کی ہے جس میں صاف مذکور ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو نے آنحضرت ﷺ سے کتابت احادیث کی اجازت چاہی تھی تو آپ نے ان کو اجازت دے دی تھی اس کے بعد حافظ صاحب نے اس روایت (امام احمد و امام بیہقی کی روایت) کی اسناد کے متعلق کہا ہے کہ وہ حسن ہے[1]

حضرت عبداللہ بن عمرو کو کتابت احادیث کی اجازت ملنا جمیع محدثین کے نزدیک مسلم ہے۔ اور ان کے ترجمہ میں ان کے واقعات و حالات اور اس اجازت کا ذکر بھی برابر ملتا ہے۔ چنانچہ حافظ ابن عبدالبرؒ اندلسی "استیعاب" میں ان کے ترجمہ میں فرماتے ہیں۔

اسلم قبل ابیه و کان فاضلاً حافظا عالما قرء الکتاب و استاذن

[1] فتح الباری مطبوعہ دہلی۔ پارہ اول ص ۱۰۶۔

النبی صلی اللہ علیہ و سلم فی ان یکتب حدیثہ فاذن لہ قال یا رسول اللہ اکتب کلما اسمع منک فی الرضاء و الغضب قال نعم انی لا اقول الا حقا[1]

عبداللہ بن عمرو اپنے باپ (عمرو) سے پہلے اسلام لائے اور عالم و فاضل و حافظ تھے۔ کتاب پڑھنا جانتے تھے۔ آنحضرت ﷺ سے آپ نے حدیث لکھنے کی اجازت چاہی تو آپ نے ان کو اجازت دے دی۔ اس پر انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا میں جو کچھ آپ سے سنوں خواہ وہ آپ نے حالت رضا میں کہا ہو خواہ حالت غصہ میں کہا ہو سب لکھ لیا کروں تو آپ نے فرمایا ہاں کیونکہ میں سوائے حق کے کچھ نہیں کہتا۔

اس کے بعد حافظ ابن عبدالبرؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت مذکورہ بالا ذکر کی ہے جس کا اخیر اس طرح ہے۔

وکان یکتب ولا اکتب استاذن رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم فی ذلک فاذن لہ.

یعنی عبداللہ بن عمرو احادیث لکھا کرتے تھے اور میں لکھا نہیں کرتا تھا (بلکہ زبانی یاد رکھتا تھا) انہوں نے آنحضرت ﷺ سے اس امر کی اجازت طلب کی تھی تو آپ نے ان کو اجازت دے دی تھی۔

ان روایات سے معلوم ہو گیا کہ حضرت عبداللہ بن عمرو کی کتابت عہد رسالت میں تھی۔

اس کے بعد ایک نظر پھر صحیح بخاری پر ڈالئے کہ اس میں حضرت ابو ہریرہؓ کے الفاظ کان یکتب میں کان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ یہ امر عہد رسالت کے متعلق ذکر کر رہے ہیں۔ فافہم۔

دوسری قسم: کی مثال یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے (اپنی آخری بیماری میں)

---

[1] استیعاب مطبوعہ حیدر آباد دکن ج ۱ ص ۳۸۲۔

ایک فرمان اپنے عمال کی طرف بھیجنے کے لئے لکھوایا- جس میں فریضہ زکوٰۃ کے بعض مسائل تحریر کروائے- لیکن اس فرمان کے ارسال کرنے سے پیشتر آپؐ اس دار فانی سے عالم باقی کو رحلت فرما گئے[1] تو آپ کے بعد اس فرمان کا نفاذ خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے کیا- پھر خلیفہ ثانی حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے بھی اسی کے مطابق عمل کیا- یہ تحریر آل فاروق کے پاس محفوظ چلی آئی- امام زہری[2] کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر کے بیٹے حضرت سالم[3] نے وہ تحریر مجھے پڑھنے کو دی تو میں نے اسے جوں کا توں بالتمام حفظ کر لیا- اور وہ تحریر وہی ہے جسے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے حضرت عبداللہ بن عمر کے دونوں بیٹوں حضرت عبداللہ اور حضرت سالم سے (حاصل کر کے) نقل کروالیا تھا-

اس سے صاف ثابت ہے کہ یہ تحریر پہلی صدی کے اخیر تک برابر محفوظ چلی آئی- کیونکہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کا زمانہ ۹۹ھ سے ۱۰۱ھ تک ہے- اس کی تائید حضرت انس کی ایک روایت سے بھی ہوتی ہے کہ جب حضرت صدیق اکبرؓ نے ان کو بحرین میں عامل کر کے بھیجا تو ان کو ایک تحریر مشتمل بر مسائل زکوٰۃ بھیجی جو آنحضرت ﷺ کی مہر سے مزین تھی-[4]

(۲) اسی طرح آپ نے عمرو بن حزمؓ صحابی کی طرف بھی ایک فرمان لکھوایا جس میں قصاص و دیت (خون بہا) کے مسائل تھے- اس تحریر کا ذکر بہت سے اکابر محدثین نے اپنی اپنی تصانیف میں کیا ہے- مثلاً امام الائمہ امام مالکؒ نے مؤطا میں امام شافعیؒ نے رسالہ ملحقہ بکتاب الام[5] میں امام احمدؒ نے مسند میں امام بخاری نے تاریخ صغیر میں امام

---

[1] انا للہ و انا الیہ راجعون و فی ذلک قال حسانؓ- من شاء بعدک فلیمت فعلیک کنت احاذر

[2] امام زہریؒ امام مالکؒ کے استاد ہیں- ان کا ذکر آگے آئے گا- انشاء اللہ

[3] حضرت سالمؒ بڑے پایہ کے عالم تھے- فقہائے سبعہ مدینہ میں معدود تھے ان کا ذکر باب فصل کے حاشیے میں گذر چکا ہے-

[4] یہ سارا بیان سنن ابی داؤد کی کتاب الزکوٰۃ کی تین روایتوں کو جمع کر کے لکھا گیا ہے-

[5] رسالہ ملحقہ بکتاب الام صفحہ ۵۸ نیز جلد ۱ ص ۶۶' ۶۷-

دارمیؒ نے اپنی مسند میں، امام ابوداؤدؒ نے سنن میں اور نیز مراسیل میں، امام نسائیؒ نے مجتبیٰ میں، امام دارقطنی نے سنن میں، نیز امام شوکانیؒ نے نیل الاوطار میں لکھا ہے کہ اس کو امام ابن خزیمہؒ، امام ابن ہمامؒ، امام ابن جارودؒ، امام حاکمؒ اور امام بیہقیؒ نے بھی موصولاً روایت کیا اور ائمہ حدیث کی ایک جماعت نے اس کو صحیح کہا ہے۔[۱]

امام ابن قیم نے ھدی میں کہا کہ یہ ایک بڑی عظیم القدر نوشت ہے جو کئی قسم کے مسائل شرعیہ پر مشتمل ہے۔ مثلاً زکوٰۃ، دیات، احکام، کبائر، طلاق، عتاق، ایک ہی کپڑے میں نماز پڑھ سکنے کا حکم، نماز میں احتباء[۲] کرنے کا مسئلہ اور قرآن شریف کو ہاتھ لگانے کا مسئلہ وغیرہ وغیرہ (مسائل شریعہ اس میں مسطور ہیں) امام احمدؒ کہتے ہیں کہ اس میں ہرگز شک نہیں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یہ تحریر لکھوائی تھی۔ چنانچہ تمام فقہاء (مجتہدین) نے مقدار دیات میں اسی کو حجت گردانا ہے۔[۳]

غرض یہ تحریر قبولیت و شہرت کی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ مشابہ متواتر ہے۔

(۳) اسی طرح آپ نے ایک فرمان ضحاک بن سفیانؓ صحابیؓ[۴] کی طرف لکھوایا۔ جس میں مقتول کی دیت میں اس کی بیوہ کو حق وراثت ملنے کا حکم مذکور تھا۔ اس کا ذکر بھی امام دارالہجرۃ مالکؒ نے مؤطا میں اور امام شافعیؒ نے کتاب الام میں کیا ہے۔[۵]

تیسری قسم: یعنی اندرون و بیرون عرب کے سرداروں اور بادشاہوں کو "دعوت اسلام" کے خطوط لکھنے کی مثال یہ ہے کہ آپ نے مقوقس شاہ اسکندریہ کو جو ایک عیسائی بادشاہ تھا یہ خط لکھا۔

---

[۱] نیل الاوطار جلد ۶ صفحہ ۲۹۲، ۲۹۳۔

[۲] احتباء۔ اس طرح بیٹھنا کہ دونوں رانیں پیٹ کے ساتھ لگائی ہوں اور دونوں ہاتھ ان کے گرد لپیٹے ہوں۔ عون المعبود جلد ا صفحہ ۲۳۲۔

[۳] زاد المعاد ابن قیم جلد اول صفحہ ۱۳۰ مطبوعہ کانپور۔

[۴] ضحاک بن سفیان صحابی کے ترجمہ میں حافظ ابن حجرؒ نے اصابہ میں کہا وروی سعید بن المسیب عنہ ان النبی صلی اللہ علیہ و سلم کتب الیہ ان یورث امراۃ اشیم الضبابی من دیۃ زوجھا اصابہ جلد ۳ صفحہ ۷ ۵۳ قسم اول مطبوعہ کلکتہ

[۵] کتاب الام للامام الشافعی جلد ۶ ص ۷۷ مطبوعہ مصر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

من محمد بن عبداللہ ورسولہ الی المقوقس عظیم القبط سلام علی من اتبع الھدی. اما بعد فانی ادعوک بدعایۃ الاسلام اسلم تسلم. یوتک اللہ اجرک مرتین فان تولیت فان علیک اثم اھل القبط و یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم ان لا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیئا ولا یتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون اللہ فان تولوا فقولوا اشھدوا بانا مسلمون (زاد المعاد کانپوری ج ۱ صفحہ ۵۱۹)

خدائے رحمٰن ورحیم کے نام سے شروع

محمد خدا کے بندے اور اس کے رسول کی طرف سے مقوقس شاہ قبط کی طرف۔ اس شخص پر جو ہدایت (الٰہی) کی پیروی کرے سلام ہو۔ بعد اس کے (معلوم ہو) کہ میں تم کو اسلام کی دعوت سے (خدا کی طرف) بلاتا ہوں۔ اسلام لے آؤ تو بچ جاؤ گے اور خداتعالیٰ تم کو دوہرا اجر دے گا۔ اور اگر تم نے روگردانی کی تو قوم قبط کا گناہ تمہارے ذمہ ہو گا اور اے اہل کتاب ایسے کلمہ کی طرف آؤ جو ہم میں اور تم میں برابر ہے کہ ہم سوائے خدا کے کسی اور کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی چیز کو بھی شریک نہ بنائیں۔ پس اگر (یہ اہل کتاب اس بات سے) روگردانی کریں تو اے مسلمانو! تم کہو (کہ اے اہل کتاب) تم گواہ رہو کہ ہم تو مسلمان (خدا کے فرمانبردار) ہیں۔

ہم نے اس قسم کے سب خطوط کا ذکر اپنی کتاب تاریخ نبوی میں کسی قدر تفصیل سے کر دیا ہے۔ اس مقام پر خاص اس خط (شاہ اسکندریہ والے) کو اس لئے منتخب کیا ہے کہ زمانہ حال کے انکشافات میں سے ایک نہایت متبرک و قابل قدر انکشاف یہ ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا یہ "نامہ عنبر شامہ" باصلہ افریقہ کے عیسائیوں کے ایک گرجا سے دستیاب ہوا ہے۔ وہاں سے سابق خلیفۃ المسلمین سلطان عبدالحمید خاں غازی مرحوم

کے پاس بصد ادب و تکریم بطور تبرک استنبول (قسطنطنیہ) میں پہنچایا گیا- جنھوں نے اس کے فوٹو چھپوا کر دنیا کے ہر قطر میں اس کی اشاعت کر دی-الحمد للہ- ثم الحمد للہ کہ اس ذرہ بے مقدار گنہگار سیاہ کار کو بھی یہ تحفہ شاہوار و گوہر آبدار نصیب ہوا-

محدثین (رحمہم اللہ) نے اپنے حافظہ خداداد سے اس خط کے الفاظ کو جس طرح ضبط کیا ہے ہم نے اسے اوپر نقل کر دیا ہے-اس میں اور اس فوٹو کے الفاظ میں کوئی قابل لحاظ فرق نہیں ہے-کیونکہ دونوں کے الفاظ برابر ایک ہی ہیں- فرق صرف یہ ہے کہ اس مکتوب عکسی کا رسم الخط قدیم ہے-جو آنحضرت ﷺ کے عہد سعادت مہد میں عربوں میں مروج تھا-اور جس رسم الخط میں اب ہم لکھتے پڑھتے ہیں وہ بعد کے زمانوں میں بہت دفعہ کی اصلاح کے بعد قائم ہوا ہے-اسی لئے اس کو خط نسخ کہتے ہیں-

اس مکتوب عکسی کے الفاظ میں اور محدثین کے محفوظ الفاظ میں صرف یہ فرق ہے کہ محدثین کی روایت میں "ادعوك بدعاية الاسلام" ہے-اور ایک روایت میں "بداعية الاسلام" بھی ہے-اور اس مکتوب شریف میں "ادعوك بدعوة الاسلام" ہے-

عربی زبان کا تھوڑا سا علم صرف جاننے والے اصحاب بھی جانتے ہیں-کہ دعا یدعوا کا مصدر کئی طرح پر آتا ہے-دعاء' دعوی' دعوۃ اور داعیۃ سب مصدر ہیں چنانچہ "مجمع البحار" میں لفظ دعا کے ضمن میں اسی حدیث کے متعلق فرماتے ہیں- ادعوك بدعاية الاسلام ای بدعوته وهی كلمة الشهادة التی یدعی الیها اهل الملل الكافرة وروی بداعية مصدر كالعافية

اور اس سے پہلے فرماتے ہیں-

الدعوی الادعاء فما كان دعوهم والدعا و اخر دعوهم وله دعوة الحق

چوتھی قسم: کی تحریروں کی مثال یہ ہے کہ صحیح بخاری شریف میں حضرت حذیفہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا-اکتبو الی من تلفظ بالاسلام من الناس[1]

---

[1] صحیح بخاری کتاب الجہاد باب کتابۃ الامام الناس

یعنی "جو شخص اسلام کا اقرار کرتا ہو مجھے ان سب کے نام لکھ کر بتاؤ پس ہم نے (کوئی) ڈیڑھ ہزار مردوں کے نام لکھے۔"

اسی طرح احادیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ بعض جنگوں میں غازیان اسلام کے نام بھی لکھے گئے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آیا۔ کہ یا رسول اللہ ﷺ! میرا نام فلاں فلاں غزوہ میں لکھا گیا ہے اور میری بیوی حج کو جانے والی ہے۔ آپؐ نے فرمایا جا! تو اپنی بیوی کے ساتھ ہو کر حج کر۔[1]

اسی طرح صحیح بخاری شریف میں حضرت ابو جحیفہؓ (صحابی) سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت علیؓ سے سوال کیا۔ کہ آیا آپ کے پاس کچھ ایسے مسائل بھی ہیں؟ جو ہوں تو وحی باری تعالیٰ سے لیکن قرآن مجید میں (بالتصریح) موجود نہ ہوں؟ تو آپ نے (جواب میں) فرمایا خدا کی قسم جو گٹھلی کو پھاڑ کر اگانے والا ہے۔ اور سب مخلوق کا پیدا کرنے والا ہے۔ کہ ہمارے پاس (مکتوبی صورت میں تو) صرف قرآن (شریف) ہے۔ ہاں قرآن کا فہم (استنباط) بھی ہے جو اللہ تعالیٰ (اپنے) کسی مسلم (بندے) کو عطا کر دے اور نیز یہ جو اس صحیفہ میں ہے۔ پھر میں (ابو جحیفہ) نے عرض کیا کہ اس صحیفہ میں کیا (لکھا) ہے؟ آپ نے فرمایا قتل نفس اور قطع اعضاء وغیرہ جرائم میں مظلوم کو معاوضہ دلانے اور (مسلمان) قیدی کو (دشمن سے) چھڑانے کے احکام (لکھے ہیں) نیز یہ (لکھا ہے) کہ کوئی مسلمان کسی کافر کے بدلے قتل نہ کیا جائے۔[2]

---

[1] صحیح بخاری کتاب الجہاد باب کتابۃ الامام الناس۔

[2] حضرت علی نے جو یہ تین امور بیان کیے ان سے صرف اتنے ہی الفاظ مراد نہیں ہیں۔ بلکہ یہ مراد ہے کہ ان تینوں امروں کے متعلقہ مسائل مندرج ہیں ھکذا قال الحبر العلامۃ الشوکانی رحمہ اللہ فی نیل الاوطار اور ظاہر ہے کہ ان ہر سہ ابواب میں کثرت سے مسائل آسکتے ہیں۔ چنانچہ کتب حدیث میں ان کے متعلق بہت سی احادیث ہیں۔

حضرت علیؓ نے قرآن مجید کے بعد ان امور ثلاثہ کے سوا کسی دیگر تحریر کا جو انکار کیا۔ اس کی بنا اس بات پر ہے کہ خود انہوں نے ان امور کے سوا اور کچھ نہ لکھا تھا۔ اور بالخصوص ان تین ابواب کے

اس روایت میں اس امر کی تصریح نہیں ہے کہ یہ مسائل حضرت علی کو آنحضرت ﷺ نے لکھوائے تھے یا آپ نے خود اپنی یادداشت کے لئے لکھ رکھے تھے۔ لیکن حضرت جابرؓ کی مندرجہ ذیل حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسائل آپ کو آنحضرت ﷺ نے لکھوائے تھے۔

عن جابر بن عبدالله قال کتب النبی صلی الله علیه و سلم علی کل بطن عقوله ثم کتب انه لایحل لمسلم ان یتوالی مولے رجل مسلم بغیره اذنه ثم اخبرت انه لعن فی صحیفته من فعل ذلك.[1]

"یعنی حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے لکھوایا کہ ہر بطن کی دیت اس کے اپنے ذمہ ہے۔ پھر یہ بھی لکھوایا کہ کسی مسلمان کو حلال نہیں کہ دوسرے مسلمان کے آزاد کردہ غلام کا خود بخود مالک بن بیٹھے۔ پھر مجھے (حضرت جابرؓ کہتے ہیں) یہ بھی خبر دی گئی کہ آپ نے (اس) صحیفے میں ایسا کرنے والے پر لعنت بھی ذکر کی ہے۔"

گذشتہ سے پیوستہ
متعلق نوشت رکھنے کی یہ وجہ ہے کہ حضرت علیؓ صحابہ میں بڑے پائے کے قاضی تھے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو فصل مقدمات کی خاص قابلیت عطا فرمائی تھی۔ حضرت عمر فاروقؓ ایسے صاحب فہم و تدبیر صحابی آپ کی اس خداداد قابلیت کے خصوصیت سے معترف تھے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں آپ کی شان میں آپ کے یہ الفاظ ہیں اقضانا علی یعنی حضرت علی ہماری جماعت (صحابہ) میں سب سے بڑے قاضی ہیں۔ (صحیح بخاری کتاب التفسیر باب ما ننسخ من اٰیۃ) اس کی تائید ایک مرفوع حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ جب آپ کو آنحضرت ﷺ نے یمن کا قاضی مقرر کر کے بھیجا اور آپ نے اپنی کم عمری میں اور اس امر میں ناتجربہ کاری کا عذر کیا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا تھا ان الله سیهدی قلبك ویثبت لسانك (مشکوٰۃ باب العمل فی القضاء بروایۃ الترمذی و ابوداؤد و ابن ماجہ) یعنی ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ تیرے قلب کو (حق کی) ہدایت کرے گا۔ اور تیری زبان کو (حق بولنے پر) ثابت رکھے گا۔ اور یہ بات سب کو معلوم ہے کہ قاضیوں کو ان ابواب ثلاثہ یعنی قصاص دیات اور احکام اساری اور ان کے متعلقہ مسائل کی سخت ضرورت رہتی ہے۔ پس ان امور کی نسبت جو احادیث آنحضرت ﷺ سے ان کو ملیں وہ سب اس صحیفہ متبرکہ میں مکتوب تھیں۔

[1] صحیح مسلم کتاب العتق باب تحریم تولی العتیق غیر موالیہ جلد اول صفحہ ۴۹۵)

پانچویں قسم: کی ایک مثال تو صلح حدیبیہ کا عہد نامہ ہے جس سے حدیث کے قائل و منکرین بلکہ اسلام کے منکرین کو بھی انکار نہیں اور جو خاص فرمان نبویؐ سے حضرت علیؓ کے قلم سے لکھا گیا تھا- اس کا ذکر صحیح بخاری وغیرہ کتب حدیث میں مفصل موجود ہے-

اس کی دوسری مثال یہ ہے نہ صحیح بخاری وغیرہ کتب حدیث میں حضرت عداء صحابی سے مروی ہے-

ویذکر عن العداء بن خالد قال کتب لی النبی صلی اللہ علیہ و سلم ھذا ما اشتری محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم من العداء بن خالد بیع المسلم المسلم لا داء ولا خبثۃ ولا غائلۃ[1]

یعنی حضرت عداء بن خالد کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے مجھے یہ (دستاویز) لکھ دی تھی کہ یہ وہ سودا (فروخت) ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ نے عداء بن خالد بن ہودہ کے ہاتھ بیچا- ٹھیک (اسی طرح) جس طرح کہ ایک مسلمان کی دوسرے مسلمان سے بیع ہونی چاہئے- اس میں نہ تو کوئی بیماری ہے اور نہ بری خصلت اور نہ بد کرداری[2]

یہ تحریر حضرت عداء کے پاس بہت زمانہ تک محفوظ رہی- چنانچہ جامع ترمذی میں ہے-

عن عبدالمجید بن وھب قال قال لی العداء بن خالد الاقرائك کتابا کتبہ لی رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم قلت بلی فاخرج الی کتابا ھذا ما شتری الخ (تیسیر الوصول کتاب البیوع بروایت الترمذی)

---

[1] صحیح بخاری کتاب البیوع باب اذا بین البیعان ولم یکتما و نصحا-

[2] حضرت عداء نے نبی ﷺ سے ایک غلام یا لونڈی خریدی تھی جس پر آپ نے ان کو یہ دستاویز لکھ دی تھی- بیع المسلم المسلم سبحان اللہ! کیا پاک تعلیم اور کیا پیارے الفاظ ہیں- گویا سمجھا دیا کہ ایک مسلمان کی شان یہ ہے کہ اس کا سودا و معاملہ ایسا صاف ہو کہ اس میں کسی قسم کا دھوکہ یا فریب یا مال کی عیب پوشی نہ ہو اللھم صلی علی محمد الخ-

یعنی عبدالمجید بن وہب (تابعی) کہتے ہیں کہ مجھ سے عداءؓ بن خالد (صحابی) نے کہا کہ کیا میں تجھ کو رسول اللہ ﷺ کی وہ تحریر نہ دکھاؤں جو آپ نے میرے لئے لکھوادی تھی؟ میں نے کہا کیوں نہیں؟ (ضرور دکھایئے) پس وہ ایک نوشت نکال لائے جس میں یہ لکھا تھا کہ الخ[1]

تقریب میں حافظ صاحب نے حضرت عداء بن خالد کی نسبت لکھا ہے۔تاخرت وفاته الى بعد المائة یعنی ان کی وفات پہلی صدی کے اختتام کے بعد ہوئی۔ اور عبدالمجید تابعی مذکور کو طبقہ رابعہ میں شمار کیا ہے جو امام زہریؒ وغیرہ تابعین کا طبقہ ہے اور اس طبقہ کی بابت تصریح کی ہے کہ اس طبقہ کی وفاتیں پہلی صدی کے اختتام کے بعد ہوئی۔

اس تفصیل سے صاف صاف معلوم ہو گیا کہ آنحضرت ﷺ کا یہ پاک نوشتہ پہلی صدی کے بعد تک برابر محفوظ چلا آیا۔

حافظ ابن عبدالبر قرطبیؒ[2] نے "استیعاب" میں حضرت عداء صحابی کے ترجمہ میں اس نوشت کا ذکر کر کے کہا ہے۔

وهي عند اهل الحديث محفوظة

"یعنی یہ تحریر اہل حدیث کے نزدیک محفوظ ہے۔"

حافظ ابن عبدالبرؒ نے باسناد خود ابورجاء عطاردی تابعی سے روایت کیا کہ مجھے عداء بن خالد نے کہا کیا میں تجھ کو وہ تحریر نہ دکھاؤں؟ جو رسول اللہ ﷺ نے میرے لئے

---

[1] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ آنحضرت ﷺ کی تحریرات و نشانات کو نہایت محبت سے محفوظ رکھتے تھے۔ اور نہایت شوق سے دوسرے لوگوں کو بطور تبرکات دکھاتے تھے اللھم صلی علی محمد و علی ال محمد۔ اللھم اغفر ولکاتبه ولمن سعی فیه۔

[2] حافظ ابن عبدالبر ربیع الاخر ۳۶۸ھ میں پیدا ہوئے اور جمعہ کی رات کو اخیر تاریخ ربیع الاخر ۴۶۳ھ میں فوت ہوئے۔ پس آپ نے پورے پچانوے سال عمر پائی۔ آپ کا نام یوسف بن عبداللہ تھا اور کنیت ابوعمر تھی۔ لیکن حافظ ابن عبدالبر کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ ان کے وقت میں اندلس (ملک سپین) میں ان کے پایہ کا کوئی حافظ حدیث نہ تھا۔

لکھوادی تھی (جب دکھائی) تواس میں لکھا تھا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم ھذا ما اشتریٰ[1]....الخ

اس روایت کو ہم نے ایک تواس خیال سے لکھا کہ اس تحریر میں بسم اللہ بھی لکھی تھی۔ دوم اس لئے کہ حضرت عداء نے وہ تحریر عبدالمجید کی طرح ابو رجاء کو بھی دکھائی۔ پس یہ دوسری شہادت ہو گئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عداء نے اس پاک نوشتہ کو نہایت حفاظت سے سنبھال کر رکھا تھا اور نہایت شوق اور محبت سے لوگوں کو اس کی زیارت کراتے تھے۔

ابو رجاء کی نسبت حافظ صاحب نے تقریب میں لکھا ہے کہ ان کا نام عمران بن ملحان تھا اور محضرم ہیں۔ یعنی آنحضرت ﷺ کے عہد سعادت مہد میں موجود تھے لیکن ایمان بعد میں لائے اور انہوں نے بہت لمبی عمر پائی۔ چنانچہ ۱۰۵ھ میں (۱۲۰) سال کی عمر میں فوت ہوئے۔

ان دونوں روایتوں سے یقیناً ثابت ہو گیا کہ وہ تحریر دوسری صدی میں ضرور محفوظ تھی۔

---

[1] "استیعاب فی معرفۃ الاصحاب" مطبوعہ حیدر آباد' دکن۔ جلد دوم صفحہ ۵۲۴۔ نمبر صحابی نمبر ۲۱۶۳۔

عصر صحابہؓ میں کتابت احادیث

اوپر کے بیان میں جو یہ کہا گیا ہے۔ کہ صحابہ کسی تحریری بیاض کے محتاج نہیں تھے۔ اس سے یہ مراد ہے کہ کوئی کتابی نسخہ جس میں احادیث نبویہؐ جمع کی گئی ہوں اور وہ دوسروں کو بھی تعلیم کیا جائے آنحضرت ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام کے وقت میں ضروری نہیں تھا۔ ورنہ اپنے اپنے طور پر حفظ سینہ کے علاوہ مکتوبی صورت میں بھی احادیث کو نگاہ رکھنا کچھ نہ کچھ عصر صحابہ بلکہ عہد رسالت میں بھی تھا۔ عہد رسالت کا حال آپ حضرت علیؓ' حضرت عبداللہ بن عمروؓ' حضرت عداء بن خالدؓ وغیرہم کی تحریروں اور صلحنامہ حدیبیہ اور دعوت و تبلیغ کے خطوط سے معلوم کر چکے۔ اب عصر صحابہ کا حال ذیل کے بیان سے سمجھ لیجئے۔

صحابہؓ میں سب سے زیادہ روایت چھ شخصوں کی ہے۔ جن کو محدثین بکثرین صحابہ کہتے ہیں۔ ان کے اسماء گرامی یہ ہیں۔ عائشہ صدیقہؓ' عبداللہ بن عمرؓ' عبداللہ ابن عباسؓ' انس بن مالکؓ' جابر بن عبداللہؓ اور ابوہریرہ رضی اللہ عنھم اجمعین۔ ان سب نے آنحضرت ﷺ کے بعد لمبی زندگی پائی اور روایت کا زیادہ موقع پایا۔

پھر ان سب میں سے زیادہ روایت ابوہریرہؓ کی ہے کہ ان کو اس امر میں آنحضرت ﷺ سے خصوصیت سے فیض حاصل ہوا۔ جیسے کہ آپ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے لئے فقاہت کی دعا کی تھی[1] چنانچہ صحیح بخاری میں ہے۔

ان ابا هريرة قال انكم تقولون ان ابا هريرة يكثر الحديث عن رسول الله صلى الله عليه و سلم و تقولون مابال المهاجرين والانصار

[1] صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے اپنے (سینہ مبارک) سے لگا کر کہا۔ اللهم علمه الكتاب اے اللہ تعالیٰ! اس کو قرآن کا علم دے (صحیح بخاری کتاب العلم)۔ اللهم اغفر لكاتبه و لمن سعى فيه ولوالديهم اجمعين۔

لایحدثون عن رسول الله صلی الله علیه و سلم بمثل حدیث ابی هریرة و ان اخوتی من المهاجرین کان یشغلهم الصفق بالاسواق و کنت الزم رسول الله صلی الله علیه و سلم علی ملاء بطنی فاشهد اذا غابوا و احفظ اذا نسوا وکان یشغل اخوتی من الانصار عمل اموالهم و کنت امراء مسکینا من مساکین اعنی حین ینسون و قد قال رسول الله صلی الله علیه و سلم فی حدیث یحدثه انه لن یبسط احد ثوبه حتی اقضی مقالتی هذه ثم یجمع الیه ثوبه الا وعی ما اقول فبسطت نمرة علی حتی اذا قضی رسول الله صلی الله علیه و سلم مقالته جمعتها الی صدری فما نسیت من مقالة رسول الله تلك من شئی (صحیح بخاری شروع کتاب البیوع حدیث اول)

"یعنی حضرت ابوہریرہؓ نے کہا کہ تم لوگ کہتے ہو کہ ابوہریرہ رسول اللہ ﷺ سے بہت سی احادیث روایت کرتا ہے اور تم یہ بھی کہتے ہو کہ مہاجرین و انصار کا کیا حال ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے ابوہریرہ کی طرح (کثرت سے) احادیث روایت نہیں کرتے (سو اس کا جواب یہ ہے کہ) میرے مہاجرین بھائیوں کو بازاروں میں سودے سلف کا شغل تھا اور میں شکم سیری پر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر رہتا تھا- پس میں اس وقت بھی حاضر رہتا تھا جب وہ غیر حاضر ہوتے تھے اور سنا ہوا یاد رکھتا تھا جب وہ بھول جاتے تھے اور میرے انصاری بھائیوں کو اپنے مالوں کے کام کاج کا شغل تھا اور میں اصحاب صفہ کے مساکین میں سے ایک مسکین شخص تھا- پس (سنا ہوا) یاد رکھتا تھا- جب وہ بھول جاتے تھے اور ایک دن رسول اللہ ﷺ نے سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ ایسا کوئی نہ ہو گا کہ میرے بات کرنے تک اپنا کپڑا پھیلا دے- پھر اس کو اکٹھا کر کے اپنے ساتھ لگالیوے- مگر یاد رکھ لے گا جو کچھ میں کہوں گا- پس وہ چادر جو مجھ پر تھی بچھادی- حتی کہ جب رسول اللہ ﷺ نے

اپنی بات ختم کرلی- تو میں نے اسے اکٹھا کر کے اپنے سینے سے لگالیا- پس مجھے رسول اللہ ﷺ کی وہ بات کچھ بھی نہ بھولی-"

حضرت ابوہریرہؓ نے اپنے کثیر الحدیث اور احفظ ہونے کی یہ وجوہات بیان کی ہیں-

اول : یہ کہ دیگر اصحاب اہل و عیال اور کسب و تجارت والے تھے- وہ ہر وقت خدمت نبوی میں حاضر نہیں رہ سکتے تھے- اس کے برخلاف میں اصحاب صفہ کے مساکین میں سے تھا- جو اہل و عیال گھر گھاٹ نہ رکھنے کی وجہ سے آنحضرت ﷺ کی اجازت سے صحن مسجد ہی میں رہتے تھے- اور ان کو کسب و تجارت کی بھی ضرورت نہ تھی- بلکہ لوگوں کے گھروں سے کھانا آجاتا تھا پس میں اکثر اوقات آنحضرت ﷺ کی خدمت ہی میں رہتا تھا اور مجھے آپ سے احادیث سننے کا زیادہ موقع ملتا تھا-

دوم : یہ کہ دیگر لوگ کام کاج اور اہل و عیال کے مشاغل میں ہونے کی وجہ سے کوئی بات بھول جائیں تو بھول جائیں- میرا کام تو صرف علم سیکھنا اور اسے یاد کرنا تھا اور بس-

سوم : یہ کہ مجھے آنحضرت ﷺ سے حفظ احادیث میں ایسا فیض حاصل ہوا کہ جو کچھ سیکھا وہ سینہ پر نقش ہو گیا اور پھر بھولا نہیں-

صحیح بخاری سے یہ بھی ثابت ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ کو احادیث نبویہ کا جو شوق تھا اس کا آنحضرت ﷺ کو بھی علم تھا- چنانچہ انہی سے روایت ہے-

عن ابی هريرة انه قال يا رسول الله من اسعد الناس بشفاعتك يوم القيمة قال رسول الله صلى الله عليه و سلم لقد ظننت يا باهريرة ان لا يسئلنى عن هذا الحديث احد اول منك لما رايت من حرصك على الحديث (صحيح بخاری)

یعنی حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ (ﷺ) قیامت کے دن آپ کی شفاعت کی سعادت سب سے زیادہ کس کو حاصل ہو گی؟ تو آپ نے فرمایا- اے ابوہریرہؓ! مجھے ضرور خیال تھا کہ یہ

بات مجھے تجھ سے پیشتر کوئی شخص نہیں پوچھے گا۔ اس وجہ سے کہ میں نے تیرا شوق حدیث کی نسبت (بہت ہی) پایا۔

سابقاً حضرت عبداللہ بن عمروؓ کے ذکر میں گذر چکا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ احادیث نبویہ کو زبانی یادر کھا کرتے تھے اور لکھا نہ کرتے تھے یہ ان کی ابتدائی حالت اور عہد رسالت کی کیفیت ہے۔ ورنہ عہد رسالت کے بعد انہوں نے بھی اپنی روایات لکھ رکھی تھیں۔ چنانچہ "خاتمۃ الحفاظ" نے فتح الباری میں حسن بن عمرو بن امیہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ ان کو اپنے گھر لے گئے اور آنحضرت ﷺ کی احادیث کے نوشتے دکھائے اور کہنے لگے (دیکھو) یہ (سب کچھ) میرے پاس لکھا ہوا (موجود) ہے[1]

اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ بعض صحابہؓ نے اپنے زمانے میں احادیث نبویہ کو لکھ لیا تھا۔ اگرچہ کوئی تعلیمی نصاب تیار نہ ہو سکا تھا۔ لکل اجل کتاب۔

حدیث لا تکتبو اعنی غیر القرآن الخ اور ازالہ شبہ

منکرین حدیث صحیح مسلم کی اس حدیث کو پیش کر کے کہا کرتے ہیں کہ خود آنحضرت ﷺ نے حدیث کے لکھنے سے منع فرمادیا تھا۔

عن ابی سعیدن الخدری ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم قال لا تکتبوا عنی و من کتب عنی غیر القران فلیمحہ و حدثوا عنی ولا حرج و من کذب علی (قال ھمام احسبہ قال) متعمدا فلیتبوا ء مقعدہ من النار[2]

"حضرت ابو سعید خدری کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ کہ مجھ سے (جو کچھ سنو اسے) لکھا نہ کرو اور جس نے مجھ سے سوائے قرآن کے کچھ اور لکھا ہو وہ اسے مٹا دیوے اور مجھ سے زبانی روایت بیان کیا کرو اور اس میں کوئی

---

[1] فتح الباری جزو اول مطبوعہ دہلی کتاب العلم باب کتابۃ العلم زیر حدیث حضرت ابی ہریرہ صفحہ ۱۰۵۔

[2] صحیح مسلم جلد ۲ باب التثبت فی الحدیث و حکم کتابۃ العلم صفحہ ۴۱۴۔

حرج نہیں۔اور جو کوئی مجھ پر عمداً جھوٹ باندھے تو اسے چاہئے کہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنائے۔"

منکرین حدیث کے جواب میں اس کے متعلق سابقاً گذر چکا ہے کہ اس حدیث میں کتابت غیر از قرآن کی ممانعت ہے نہ اتباع حدیث کی۔اور ہمارا تمہارا جھگڑا اتباع حدیث میں ہے نہ کہ کتابت میں۔پس تم کو یہ حدیث کسی طرح بھی مفید نہیں۔

عبرت: مقام تعجب ہے کہ صحابہ کرامؓ جن سے آنحضرت ﷺ خطاب کر رہے ہیں اور وہ آپ کے کلام ہدایت نظام کے محل اور موقع کو دوسروں کی نسبت زیادہ اچھا سمجھ سکتے تھے اور آپ کے احکام سعادت التیام کی تعمیل میں دوسروں کی نسبت زیادہ چست اور نہایت پختہ و فرمانبردار تھے۔جیسا کہ آپ حدیبیہ کے واقعہ کے ذکر میں معلوم کر چکے ہیں وہ تو حدیث رسول اللہ ﷺ کو جان ومال اور ہر شے سے عزیز جانیں اور آپ کی سنت سے ایک قدم ہٹنا بھی گوارا نہ کریں اور اس حدیث سے تعمیل حدیث کی ممانعت نہ سمجھیں۔اور آج تیرہ سو برس سے زیادہ عرصہ کے بعد وہ لوگ کہ نہ تو عربی ان کی زبان ہو اور نہ اکتسابی طور پر ان کو اس زبان میں اتنی مہارت ہو کہ اس میں صحت سے تحریری یا تقریری طور پر اپنے خیالات کا اظہار کر سکیں[1] اور صرف اردو تراجم کو دیکھ دیکھ کر لوگوں کو شکوک و شبہات میں ڈالنا ان کا دستور ہو۔وہ بے پڑھے مجتہد[2] اس حدیث

---

[1] عرصہ ہوا ہم نے اپنے رسالہ الہادی میں کتاب تائید القرآن میں جو پادری اکبر مسیح باندوی کی کتاب تاویل القرآن کے جواب میں لکھی گئی تھی لکھا تھا کہ اگر مولوی عبداللہ چکڑالوی (بانی فرقہ اہل القرآن) مسٹر اکبر مسیح کے نزدیک علوم عربیہ میں کمال رکھتے ہیں تو مسٹر اکبر مسیح مولوی عبداللہ صاحب کو لکھیں کہ آپ کو اچھا خاصا مولوی لکھ رہا ہوں۔مہربانی کر کے آئندہ مہینے کا رسالہ اشاعت القرآن عربی زبان میں شائع کریں۔مولوی عبداللہ صاحب سے کیا ہو سکتا تھا۔جذام کے تعفن میں گل سڑ کر مر گئے اور جہان کو پاک کر گئے لیکن ہمارا مطالبہ پورا نہ کر سکے۔اب بھی ان کے معتقدوں میں سے کسی کو اپنے علم کا خیال ہے تو وہ خیالات کا اظہار تقریراً و تحریراً عربی زبان میں کریں ورنہ خاموش رہیں۔

[2] آنحضرت ﷺ نے جاہل مجتہد کو دین کی آفتوں میں شمار کیا ہے۔۱۲ (جامع صغیر جلد ا صفحہ ۳)

سے یہ سمجھیں کہ آنحضرت ﷺ اپنی حدیث کی تعمیل سے منع فرماتے ہیں اور ان کا یہ فہم صحابہؓ کے مقابلہ میں درست ہو۔ اللھم انا نعوذبك من وساوس الشیطان و الیك نشکوا جہالة الزمان و فتنة اھل الطغیان۔

تنبیہ: بھلا کوئی ان عقل کے پیچھے لٹھ لے کر پھرنے والے بے پڑھے۔ مجتہدوں سے پوچھے تو سہی! کہ بھائی یہ تو بتاؤ کیا تمہاری عقل (گو کیسی ہی ناقص ہے) میں یہ سما سکتا ہے کہ خدا کا کوئی رسول (علیہ السلام) اپنی اتباع سے خود منع کرے اور کہے کہ کلام خدا کی تشریح و توضیح جو میں تم کو بتاؤں اس کا تو اعتبار نہ کرنا اور جو کچھ تمہارے اپنے دماغ میں آئے اسی کو خدا کا منشا اور مراد سمجھنا (استغفر اللہ) دیکھئے! حضرت ہارون پیغمبر خدا (علیہ السلام) گوسالہ پرست یہودیوں کو یوں خطاب کرتے ہیں۔ و ان ربکم الرحمن فاتبعونی و اطیعوا امری[1] (طٰہٰ پ ۱۶) یعنی "تمہارا رب تو وہ ہے جو رحمٰن ہے۔ پس میری پیروی کرو اور میرے حکم پر چلو۔"

غرض یہ بالکل بے عقلی کی بات ہے کہ رسول اپنی اتباع اور اطاعت سے منع کرے۔

حضرت ابو سعید کی شخصیت و سیرت: حضرت ابو سعید خدریؓ جو اس حدیث زیر بحث کے راوی ہیں فضلائے صحابہ سے تھے۔ یہ بھی اصحاب صفہ سے تھے۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے بعد لمبی عمر پائی۔ ان سے بھی احادیث بکثرت مروی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت جابر بن عبداللہ جیسے کثیر الحدیث صحابہ نے بھی ان سے حدیث روایت کی ہے۔ چنانچہ "خلاصہ اسماء الرجال" میں ہے۔

كان من فضلاء الصحابة له الف و مائة حدیث و سبعون حدیثا

آپ علماء صحابہ میں سے تھے۔ آپ کی روایت کردہ احادیث کی تعداد ایک ہزار ایک سو اور ستر (۱۱۷۰) ہے۔

(۲) حافظ ذہبی تذکرہ میں فرماتے ہیں۔

---

[1] اتباع فعل میں پیروی کرنے کو کہتے ہیں اور اطاعت فرمان ماننے یعنی قول میں مطیع ہونے کو۔ اس آیت میں پیغمبر بر حق کی فعلی اور قولی ہر دو طرح کی احادیث کو ماننے اور ان کے مطابق عمل کرنے کا ثبوت ہے۔

روی حدیثا کثیرا و افتی مدة والدہ من شھداء احد عاش ابو سعید ستاوثما نین سنة و حدث عنه ابن عمرو جابر بن عبداللہ و غیر ھما من الصحابة الخ (پھر اس سے آگے فرماتے ہیں) یروی ان ابا سعید کان من اھل الصفة و حدیثه کثیر[1]

حضرت ابو سعید نے حدیث کثرت سے روایت کی اور بہت مدت تک فتویٰ دیتے رہے۔ ان کا والد (مالک بن سنانؓ) شہدائے احد میں سے ہے۔ حضرت ابو سعیدؓ نے چھیاسی سال کی عمر پائی تھی۔ اور آپ سے صحابہ میں سے عبداللہ بن عمر اور جابر بن عبداللہ وغیرہما نے بھی حدیث روایت کی (یہ بھی) مروی ہے کہ حضرت ابو سعیدؓ اصحاب صفہ میں سے تھے آپ کی روایت کردہ احادیث کثرت سے ہیں۔

(۳) حافظ ابن عبدالبر اندلسی "استعیاب" میں فرماتے ہیں۔

کان ابو سعید من الحفاظ المکثرین العلماء الفضلاء العقلاء و اخبارہ تشھد له تبصحیح ھذا الجملة[2]

"یعنی حضرت ابو سعید کثیر الروایت۔ حفاظ حدیث اور علماء و فضلاء اور عقلا میں سے تھے آپ کی روایات آپ کی ان سب اوصاف کی تصحیح کی شہادت دیتی ہیں۔"

یہ تو باب الکنیٰ میں ہے اور باب الاسماء میں ان کے ترجمہ میں فرماتے ہیں۔

ابو سعیدن الخدری ھو مشھور بکنیته اول مشاھدہ الخندق و غزا مع رسول اللہ صلی اللہ علیه و سلم اثنی عشرة غزوة کان ممن حفظ عن رسول اللہ صلی اللہ علیه و سلم سننا کثیرة وروی عنه علما جما و کان من نجباء الا نصار و علمائھم. توفی سنة اربع و سبعین روی عنه جماعة من الصحابة و جماعة من التابعین[3]

---

[1] تذکرہ جلد اول ص ۳۰۷۔ [2] استیعاب ص ۱۷۱ جلد دوم باب الکنیٰ۔
[3] ان کا نام سعد تھا باپ کا نام مالک تھا۔

یعنی حضرت ابو سعید خدریؓ اپنی کنیت سے مشہور ہیں[1] ان کی سب سے پہلے جنگی حاضری غزوہ خندق میں ہوئی اور آنحضرت ﷺ کی معیت میں بارہ جنگوں میں شریک ہوئے۔ آپ ان صحابہ میں سے تھے جن کو رسول اللہ ﷺ کی بہت سے احادیث و سنن یاد تھیں۔ آپ نے آنحضرتؐ سے بہت بڑا علم روایت کیا اور انصار اصحاب میں سے بڑے جلیل القدر صحابی تھے۔ آپ ۷۴ھ میں فوت ہوئے۔ آپ سے بہت سے صحابہ اور بہت سے تابعین نے احادیث روایت کیں۔

سنت رسولؐ اللہ کی رعایت و حمایت :۔حضرت ابو سعیدؓ سنت رسول اللہ (ﷺ) کے عاشق صادق اور ایک سرگرم حامی تھے۔ کوئی امر بھی سنت کے بر خلاف برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ جب مروان بن حکم نے اپنے عہد گورنری میں عید گاہ مدینہ طیبہ میں پختہ ممبر بنوایا اور خطبہ کے لئے نماز عید سے پیشتر ممبر پر چڑھنے لگا تو حضرت ابو سعید کی ان سے تکرار ہو گئی۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو سعید کے اپنے الفاظ اس طرح ہیں۔

فاذا مروان ینازعنی یده کانه یجرنی نحو المنبر و انا اجره نحو الصلوة۔[2]

"(میں نے مروان کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا) تو مروان مجھ سے اپنا ہاتھ چھڑا کر مجھے ممبر کی طرف کھینچنا چاہتا تھا اور میں اس کو نماز کی طرف کھینچتا تھا۔"

دیکھئے! یہ وہی حضرت ابو سعید ہیں ناں؟ جو قرآن کے سوا کچھ نہ لکھنے کی حدیث بیان کرتے ہیں۔ اور پھر سنت کی اس قدر رعایت و حمایت کرتے ہیں کہ حاکم شہر کو بھی نماز عدی سے پہلے خطبہ نہیں پڑھنے دیتے اور اسے ہاتھ سے پکڑ کر کھینچتے ہیں۔ ان کو اس امر سے نہ تو حکومت کا رعب مانع ہو سکتا ہے اور نہ لحاظ۔ رضی اللہ عنہ و ارضاہ۔

کشف حقیقت :۔اصل حقیقت یہ ہے کہ عہد نبوت نزول قرآن کا زمانہ تھا۔

---

1. استیعاب جلد دوم ص ۵۶۷ باب الاسماء۔
2. صحیح مسلم کتاب العیدین جلد اول صفحہ ۲۹۰۔

عرب عام طور پر لکھنے پڑھنے سے عاری تھے۔ جیسا کہ سابقاً مفصل گذر چکا۔ اور آنحضرت ﷺ کی عادت شریف تھی کہ تبلیغ آیات کے ساتھ احکام کی تشریح بھی فرماتے تھے اور لوگوں کے پاس کلام الٰہی اور کلام رسول میں امتیاز کرنے کے لئے سوائے رسول اللہ ﷺ کے اپنے بتانے کے کوئی اور ذریعہ تھا ہی نہیں۔

اس لئے خطرہ تھا کہ متن اور شرح کے الفاظ میں اختلاط اور التباس ہو کر الفاظ قرآن کی حفاظت میں خلل آجائے گا۔ لہٰذا آپ نے سوائے قرآن شریف کے کسی اور تحریر کی اجازت نہ دی۔ اور جس جگہ اختلاط کا خطرہ نہ تھا اس جگہ خود بھی لکھوایا اور لکھنے کی اجازت بھی دی۔ بلکہ جب خطرہ جاتا رہا تو اجازت عام کر دی۔ حدیث ممانعت اور واقعات نبویہؐ اور احادیث اجازت ان سب کو جمع کر کے جو کچھ حاصل ہو سکتا ہے یہ ہم نے اس کا خلاصہ و نتیجہ بیان کر دیا ہے۔

امام نوویؒ حدیث مذکور کی شرح میں فرماتے ہیں۔

تحمل الاحاديث الواردة بالاباحة على من لا يوثق بحفظه كحديث اكتبوا لابى شاه و حديث صحيفة على رضى الله عنه و حديث كتاب عمر و بن حزم الذى فيه الفرائض و السنن والديات و حديث كتاب الصدقة و نصب الزكوة الذى بعث به ابوبكر رضى الله عنه انسا رضى الله عنه حين وجهه الى البحرين و حديث ابى هريرة ان ابن عمر و بن العاص كان يكتب و غير ذلك[1] من الاحاديث و قيل ان حديث النهى منسوخ بهذه الاحاديث و كان انهى حين خيف اختلاطه بالقران فلما امن ذلك اذن فى الكتابة و قيل انما نهى عن كتابة الحديث مع القران فى صحيفة واحدة لئلا يختلط فيشتبه على القارى والله اعلم

(صحيح مسلم للامام النووى جلد دوم صفحه ٤١٥)

---

[1] ان سب کا بیان سابقاً مفصل ہو چکا ہے۔

"جن حدیثوں سے کتابت کی اباحت واجازت ثابت ہوتی ہے۔ان کو اس امر پر محمول کریں گے۔کہ یہ اجازت اس شخص کے حق میں ہے جس کو اپنے حافظہ پر اعتماد نہ ہو مثلاً حدیث اکتبوا لابی شاہ۔اور حضرت علی کے صحیفہ والی اور حضرت عمرو بن حزم والی نوشت جس میں فرائض اور سنن اور دیات (خون بہا) کے مسائل تھے۔اور صدقہ (زکوٰۃ) کی نوشت والی حدیث جو ابو بکرؓ نے حضرت انسؓ کو بھیجی تھی جب کہ آپ نے ان کو بحرین کی طرف بھیجا تھا اور حضرت ابو ہریرہ کی یہ روایت کہ عبداللہ بن عمرو بن العاص لکھا کرتے تھے وغیرہ وغیرہ اسی قسم کی دوسری احادیث[۱] اور بعض نے کہا ہے کہ ممانعت کی حدیث ان احادیث اجازت سے منسوخ ہے۔اور ممانعت صرف اس وقت تھی جب قرآن کے ساتھ حدیث کے مل جانے کا اندیشہ تھا۔پس جب یہ اندیشہ جاتا رہا تو آپ نے کتابت کی اجازت دے دی اور بعض نے کہا ہے کہ صرف ممانعت اس امر کی تھی۔کہ حدیث کو قرآن کے ساتھ ملا کر ایک ہی صحیفہ پر نہ لکھا جائے تاکہ دونوں مخلوط نہ ہو جائیں اور پڑھنے والے کو اشتباہ نہ پڑے واللہ اعلم۔"

غرضیکہ کہ حدیث لکھنے کی ممانعت کا حکم کوئی اصلی ودائمی نہیں تھا۔بلکہ عارضی و وقتی تھا۔کیونکہ اس وقت قرآن اور غیر قرآن کے اختلاط کا سخت اندیشہ تھا[۱] اور یہ بات لفظ عنی میں بامعان نظر غور کرنے سے صاحب ذوق سلیم کو صاف معلوم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ یہ فرما رہے ہیں کہ مجھ سے سوائے قرآن کو کچھ نہ لکھو۔ اور ظاہر ہے کہ آپ قرآن مجید بھی سناتے تھے اور اس کے مطالب بھی سمجھاتے تھے[۲] پس اگر

---

[۱] جس طرح کہ تیسرے دن کے بعد قربانی کا گوشت گھر میں رکھنے سے منع کیا۔لیکن اگلے سال آپ نے فرمادیا کہ گزشتہ سال لوگوں میں تنگی تھی اس لئے وہ حکم دیا تھا اب تم ذخیرہ کر سکتے ہو۔ مشکوٰۃ صفحہ ۲۲۴)

[۲] تنبیہ یہ بات بالکل بے عقلی کی ہے کہ آنحضرت ﷺ صرف الفاظ قرآن سنا دیتے تھے اور فہم مطالب امتیوں کے دماغ کے (جو ابھی زیر تربیت تھے) حوالے کر دیتے تھے۔جس شخص کے سر میں

آپ کی زبان فیض ترجمان سے قرآن اور اس کی تشریح و تفسیر سن کر ہر دو لکھے جاتے۔
گذشتہ سے پیوستہ

دماغ ہے اور دماغ میں قوت فکر ہے وہ اسے ایک لحہ کے لئے بھی اپنے دماغ میں جگہ نہیں دے سکتا۔

اگر یہ درست ہے کہ (معاذ اللہ) آنحضرت ﷺ قرآن کی تفسیر نہیں کر سکتے تھے۔ یعنی آپ مجاز نہیں تھے۔ تو مولوی عبداللہ صاحب چکڑالوی بانی فرقہ اہل قرآن کو کیا حق تھا؟ کہ محض الفاظ قرآن کی تبلیغ واشاعت سے تجاوز کر کے اس کی تفسیر و تشریح مطالب میں بار شتر کے برابر سفید اوراق کو سیاہ کر ڈالیں۔ عام اس سے کہ وہ بے قاعدہ اور بے فائدہ ہو یا کیا؟ اور ان کے بے پڑھے مرید اس پر بھی قناعت نہ کر کے قرآن کا نام لے کر اور اسے موم کی ناک بنا کر انٹ سنٹ واہی تباہی باتوں سے رائی کا پہاڑ اور تنکے کا تاڑ بنا ڈالیں۔ سبحان اللہ ۔

بت کریں آرزو خدائی کی شان تیری ہے کبریائی کی

ان کا تو حق ہو کہ قرآن کو جدھر چاہیں موڑ لیں۔ کوئی پانچ نمازیں پڑھتا ہے تو وہ بھی قرآن کے حکم سے اور کوئی تین پڑھتا ہے تو وہ بھی قرآن کے حکم سے تیس روزوں کا ثبوت مانگو تو وہ بھی قرآن سے اور اگر تین کا چاہو تو وہ بھی قرآن سے۔ اگر اوقات نماز کی پابندی ہے تو قرآنی حکم سے اور اگر اوقات کی پابندی اڑانا چاہو تو وہ بھی قرآن سے۔ بلکہ ہیات نماز کو تمام اڑانا چاہو تو وہ بھی قرآن سے۔ کوئی تحریمہ کے وقت قواعد نحویہ کے خلاف ان اللہ ھو العلی الکبیر پڑھ کر قول باندھتا ہے۔ تو کوئی اللہ الصمد پڑھ کر۔ اور کوئی کہتا کہ جس طریق پر عام مسلمان نماز پڑھتے ہیں اگرچہ یہ طریق قرآن نے نہیں سکھایا۔ لیکن جب قرآن نے کوئی اور طریق بھی مقرر نہیں کیا تو جس طرح ساری امت نماز پڑھتی ہے۔ اس طرح پڑھ لینے میں کیا حرج ہے؟ غرض جتنے آدمی اتنے طریقے۔ اور دعویٰ سب کا یہی کہ ہم اہل قرآن ہیں ہم روائتی اسلام کے قائل نہیں ہیں سبحان اللہ قرآن کیا ہوا موم کی ناک ہوا جدھر چاہا موڑ لیا۔

خدا کا شکر ہے کہ ابھی ان کے معلومات یہاں تک نہیں پہنچے۔ کہ نماز کی حالت میں کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم قرآن میں نہیں ہے اور جسے اہل روایت لوگ سمجھتے ہیں۔ اس میں نماز کا ذکر نہیں ہے بلکہ اس کے برخلاف قرآن میں یہ بھی ہے۔ وللہ المشرق و المغرب فاینما تولوا فثم وجہ اللہ (البقرہ پ ۱) یعنی مشرق و مغرب (سب طرفیں) خدا ہی کی ہیں۔ پس جدھر منہ کر لو خدا کا قبلہ ادھر ہی ہے۔

خدا گنجے کو ناخن نہ دے۔ اگر کبھی ان کا اجتہاد یہاں تک پہنچ گیا تو خدا خیر رکھے استقبال کعبہ کی قید بھی اڑ جائے گی۔ اور حفاظت کعبہ و جزیرۃ العرب بھی ایک بے جا شور و غوغا اور ایک بے سود سوداو ہذیان سمجھا جائے گا۔ (و معاذ اللہ من ذلک)

(۲) اور اگر کہیں یہ خیال آ گیا کہ نماز میں ترتیب ارکان کہ پہلے قیام ہو پھر رکوع پھر قومہ پھر سجدہ پھر جلسہ پھر دوسرا سجدہ یہ بھی حدیث ہی سے ثابت ہے۔ اسے ہم کیوں مانیں؟ کیونکہ قرآن میں

تو متن اور شرح ہر دو مخلوط ہو جاتے- جب ہم اس احتیاط و ممانعت پر بھی بعض روایت میں پاتے ہیں کہ بعض صحابہ نے بعض احادیث نبویہ کو قرآنی آیت خیال کر لیا تھا اور یہ ان کا اپنا خیال تھا- تو اگر قرآن کے ساتھ احادیث کی کتابت کی اجازت بھی دی جاتی تو قرآن کے الفاظ کی حفاظت میں بہت اختلاف و اختلاط پیدا ہو جاتا- قربان جائیں اسی نبی

گذشتہ سے پیوستہ

قومہ اور جلسہ اور دوسرے سجدہ کا تو ذکر ہی نہیں ہے- اور قیام اور رکوع کا کسی جگہ ذکر ہے اور کسی جگہ نہیں ہے- پس یہ بھی ضروری نہیں- اور علاوہ اس کے کہیں رکوع کو پہلے ذکر کیا ہے- اور کہیں سجدے کو پہلے- تو ان کی ترتیب کہ پہلے رکوع ہو پیچھے سجدہ ہو- یہ بھی ضروری نہیں جس طرح بن پڑے- انٹ سنٹ نماز گھسیٹ لینی کافی ہے- اگر یہ خیال آگیا تو نماز ایک مضحکہ ہو جائے گی-

(۳) اور اگر کبھی نزاکت اجتہاد یہاں تک پہنچ گئی کہ قرآن مجید سے رکوع کا جزو نماز ہونا ثابت نہیں ہو سکتا- کیونکہ صلوٰۃ خوف کی کیفیت میں اس کا ذکر نہیں تو ایک دن رکوع سے بھی چھٹی مل کر نماز نہایت مختصر سی رہ جائے گی-

(۴) اسی طرح اگر کسی وقت اسی مقام پر پہنچ گئے کہ قرآن میں دو سجدوں کا حکم نہیں ہے تو اور تخفیف ہو جائے گی-

(۵) اور تشہد و قعدہ اور سلام کے بعد نماز سے فارغ ہونے کا حکم تو قرآن میں ہے ہی نہیں- بس اور چھٹی ہو گی-

اب نماز کیا رہ جائے گی- کہ جدھر چاہا منہ کر لیا اور کھڑے ہو کے سجدے میں چلے گئے- اور پھر بھاگ کر گاڑی میں سوار ہو لئے- بس اللہ اللہ خیر صلا- اور بار بار رکعتوں کا دوہرانا تو روایتی ملاؤں نے بنا رکھا ہے- کہ اتنی دیر تک لوگوں کو نماز میں باندھ رکھتے ہیں- اس کی ضرورت ہی کیا؟ اعاذنا اللہ من ھذہ الخرافات والوساوس والخزعبیلات ربنا لاتزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا و ھب لنا من لدنک رحمتہ انک انت الوھاب-

غرض ان لوگوں نے قرآن کو موم کی ناک تو آگے ہی بنا رکھا ہے- اگر اس میں اور مشاق ہو گئے اور اس میدان میں کھل کھیلے- تو اسے ایک پانی کی نالی کی طرح بنا ڈالیں گے کہ جہاں سے چاہا کنارہ توڑ لیا اور جدھر چاہا پانی بہا لے گئے-

اچھا تو دین کی اس طرح قطع و برید کرنے والوں کا تو حق ہو کہ قرآن کی تفسیر کریں اور جس طرح چاہیں اس کا مطلب بگاڑ لیں- اور حق نہ ہو تو اس کا نہ ہو جس پر قرآن اترے- اور وہ خدا اور اس کے بندوں کے درمیان سفیر ہو- اور خدا کی شریعت کا امین ہو اور بیان قرآن اس کا منصب ہو- صلوات اللہ علیہ و سلامی - قاتلھم اللہ انی یوفکون-

امی پر جنہوں نے یہ حکیمانہ حکم دے کر قرآن کو اصلی صورت میں محفوظ رکھا- اللھم صلی علی محمدن النبی الامی و الہ و اصحابی و بارك و سلم-

خلاصۃ المرام: حاصل کلام یہ کہ آنحضرت ﷺ الفاظ قرآن بھی پڑھتے تھے اور ان کی تشریح مطالب بھی فرماتے تھے- کبھی تو لفظاً مراد الٰہی بتادیتے تھے اور کبھی عمل کر کے سمجھادیتے تھے کہ اس حکم کی کیفیت عمل یوں ہے-

آپ کے وعظ اور خطبہ کا یہی طریق تھا- کہ قرآن کی آیات پڑھتے اور ان کی تشریح فرماتے چنانچہ صحیح مسلم میں ہے-

عن جابر بن سمرة قال كانت للنبي صلى الله عليه و سلم خطبتان يجلس بينهما يقراء القران و يذكر الناس [1]

نبی ﷺ دو خطبے پڑھتے اور ان کے درمیان جلسہ کرتے (بیٹھتے) اور قرآن پڑھتے اور لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے تھے-

جب یہ معلوم ہو چکا کہ آنحضرت ﷺ وعظ و خطبہ میں قرآن شریف پڑھ کر سمجھاتے تھے تو اب بخوبی سمجھا جاسکتا ہے- کہ آپ نے محض کلام الٰہی کو اپنے کلام سے متن کو شرح سے ممتاز و جدا رکھنے کے لئے یہ حکم دیا تھا کہ مجھ سے قرآن کے سوا کچھ نہ لکھو اس کا مطلب ہرگز ہرگز یہ نہیں ہے کہ میری تفسیر و تشریح کا اعتبار نہ کرو-

ہم اس امر کو اس طرح بھی سمجھا سکتے ہیں کہ مسند دارمی میں ابو نضرہ تابعی [2] سے روایت ہے کہ-

قلت لابی سعیدن الخدری الاتکتبنا فانا لا نحفظ فقال لا لن

---

[1] صحیح مسلم جلد اول صفحہ ۲۸۳ باب یخطب الخطبة قائما الخ-

[2] ان کا نام منذر بن مالک ہے- اوساط تابعین سے ہیں- بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ سے روایت کی مثلاً حضرت علیؓ' ابو موسیٰ اشعریؓ' ابوذر غفاریؓ' ابوہریرہؓ' ابو سعید خدریؓ' ابن عباسؓ' ابن زبیرؓ' انسؓ' ابن عمرؓ' جابرؓ' عمران بن حصینؓ' سمرہ بن جندبؓ وغیرہم رضی اللہ عنہم اجمعین- بڑے فصیح اللسان تھے- ۱۰۸ھ میں فوت ہوئے ان کا جنازہ بموجب ان کی وصیت کے حضرت حسن بصری نے پڑھایا- تہذیب التہذیب جلد دہم صفحہ ۳۰۳)

نکتبکم و لن نجعله قرانا ولکن احفظو اعنا کما حفظنا نحن عن رسول الله صلی الله علیه و سلم[1]

میں نے حضرت ابو سعید خدری کی خدمت میں عرض کی کہ (جو حدیثیں آپ ہمیں سناتے ہیں وہ) ہم کو لکھوا دیا کریں کیونکہ ہمیں زبانی یاد نہیں رہتیں۔ اس پر آپ نے فرمایا نہیں ہم تمہیں لکھوائیں گے نہیں۔ اور ہم اسے (لکھ کر) قرآن نہیں بنا ڈالیں گے۔ لیکن تم بھی ہم سے (سن کر) حفظاً یاد کر لو جس طرح ہم نے رسول اللہ ﷺ سے (سن کر) حفظاً یاد کر لی تھیں۔

اس سے صاف ثابت ہے کہ حضرت ابو سعید حدیث روایت کیا کرتے تھے۔ لیکن بموجب اپنی مذکورہ بالا روایت کے نہ لکھتے تھے نہ لکھواتے تھے نہ لکھنے کے قائل تھے بلکہ خود بھی حافظ تھے اور اپنے شاگردوں کو بھی حفظاً یاد کرواتے تھے اور سنت پر عمل کرتے تھے بلکہ احادیث کو تحریر میں نہ لاتا بھی باتباع حدیث تھا۔ پس اس حدیث ممانعت کا مطلب صرف اتنا ہی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حفاظت قرآن کے لئے کتابت حدیث سے منع فرمادیا تھا نہ کہ اتباع حدیث سے۔ اسی لئے کتابت حدیث کے متعلق علماء حدیث کے دو گروہ ہو گئے۔ ایک گروہ تو حضرت ابو سعید خدریؓ کی طرح صرف حفظاً یاد کرنے کا قائل تھا۔ مثلاً صحابہ میں سے زید بن ثابت وغیرہ اور تابعین میں سے قتادہؒ' محمد بن سیرینؒ وغیرہما اور دوسرا گروہ حفظاً و کتاباً ہر دو طرح کا قائل ہے۔ مثلاً صحابہ میں سے عبد اللہ بن عمرو بن عاصؓ اور عبد اللہ بن عمرؓ اور تابعین میں سے حضرت حسن بصری و خلیفہ عمر بن عبد العزیزؒ وغیرہما۔ اور ائمہ میں سے امام مالک امام شافعیؒ' امام احمدؒ' امام بخاریؒ' امام نسائیؒ' امام ابو داؤدؒ اور امام ترمذیؒ وغیرہم مصنفین کتب حدیث رحمہم اللہ اجمعین۔

یہ اختلاف شروع میں رہا۔ پیچھے ساری امت اس پر متفق ہو گئی کہ حدیث کا لکھنا جائز ہے۔ بلکہ بذیل حدیث لا تکتبو اعنی.... الخ "اکمال اکمال المعلم" میں لکھا ہے۔

---

[1] مسند دارمی باب من لم یر کتابتہ الحدیث صفحہ ۶۶)

کرہ کثیر من السلف کتب العلم لھذا النھی و اجازہ الاکثر ثم وقع الاجماع علی جوازہ لاذنہ صلی اللہ علیہ و سلم لا بن عمرو و فی الکتاب (مہ) و لقولہ اکتبوا لابی شاہ ولحدیث شکا الیہ رجل سوء الحفظ فقال لہ استعن بیمینک و کتب صلی اللہ علیہ و سلم کتابا فی الصدقات والدیات و قد امر صلی اللہ علیہ و سلم بالتبلیغ عنہ و اذا لم یکتب ذھب العلم و الحدیث محمول عند بعضھم علی کتب الحدیث مع القران فی صحیفۃ واحدۃ خوف ان یختلط بہ و یشتبہ علی القاری و یحتمل ان النھی منسوخ و دخل زید بن ثابت علی معاویۃ فسالہ عن حدیث فامر بکتبہ فقال لہ زید ان النبی صلی اللہ علیہ و سلم امر ان لا یکتب شئی من احادیثہ[1]

یعنی اس ممانعت کی وجہ سے بہت سے سلف نے علم کے لکھنے کو مکروہ سمجھا اور اکثر نے اسے جائز جانا- پھر اس کے جواز پر اجماع ہو گیا- اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے عبداللہ بن عمرو بن عاص کو لکھنے کی اجازت دی تھی اور فرمایا تھا کہ ابو شاہ کو یہ مسائل لکھ دو اور اس حدیث کی وجہ سے کہ ایک شخص نے اپنے حافظے کی خرابی کی شکایت کی- تو آپ نے فرمایا- اپنے داہنے ہاتھ سے مدد لے- (یعنی لکھ لیا کر) نیز اس لئے کہ خود آنحضرت ﷺ نے صدقات و دیات کے متعلق نوشت لکھوائی تھی- نیز اس لئے کہ آنحضرت ﷺ نے تبلیغ دین کا امر کیا ہے- تو اگر علم لکھا نہ جائے تو گم ہو جائے اور یہ حدیث (ممانعت) بعض کے نزدیک اس امر پر محمول ہے کہ حدیث (نبوی) قرآن شریف کے ساتھ ایک ہی صحیفہ میں (نہ لکھی جائے- اس ڈر سے کہ اس

[1] اکمال اکمال العلم فی شرح صحیح مسلم للامام ابی عبداللہ محمد بن خلفۃ الوشتائی الابی المالکی المتوفی ۸۲۷ھ ۸۲۸ھ-

(قرآن) کے ساتھ مخلوط (نہ) ہو جائے اور قاری پر مشتبہ (نہ) ہو جائے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ممانعت منسوخ ہو۔ اور حضرت زید بن ثابتؓ (صحابی) حضرت معاویہؓ کے پاس گئے۔ تو حضرت معاویہؓ نے ان سے ایک حدیث کی بابت پوچھا (اور انہوں نے بتائی) تو حضرت معاویہؓ نے اسے لکھنے کا حکم کیا۔ حضرت زیدؓ نے ان سے کہا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا تھا کہ آپ کی کوئی حدیث نہ لکھی جائے۔ پس حضرت معاویہؓ نے اسے مٹا دیا۔

زید بن ثابتؓ کا ایسا کہنا بھی حضرت ابو سعید خدریؓ کی طرح ہے۔ ورنہ حضرت زیدؓ تو کاتب قرآن ہونے کے علاوہ آنحضرتؐ کے محرر (سکریٹری) بھی تھے۔ آنحضرتؐ کے خطوط بھی لکھا کرتے تھے۔ اور ان سب میں آیات قرآن کے علاوہ جو کچھ ہوتا تھا۔ وہ آنحضرت کے اپنے الفاظ ہوتے تھے۔ اور انہی کو حدیث کہتے ہیں۔ پس انہی کے فعل سے احادیث کا لکھنا ثابت ہوا۔

یہ امر کہ کتابت حدیث کے متعلق اختلاف صرف پہلی صدی میں رہا۔ پھر سب جواز پر متفق ہو گئے۔ اس سے بھی ثابت ہو سکتا ہے کہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے جمع و کتابت حدیث پر کسی امام نے انکار نہ کیا۔ حالانکہ اس وقت ائمہ حدیث کثرت سے تھے۔

اسی طرح "مکمل اکمال الاکمال" میں بھی[1] ہے۔ امام بخاری (علیہ رحمتہ اللہ الباری) نے اپنی صحیح کی کتاب العلم میں کتابتہ العلم کی سرخی سے باب باندھا ہے۔ خاتمۃ الحفاظ اس کی شرح میں فرماتے ہیں۔

السلف اختلفوا في ذلك عملا وتركا وان كان الامر استقروا الاجماع انعقد على جواز كتابة العلم بل على استحسانه بل لا يبعد

---

[1] هو ايضا تعليق على الشرح المذكور للامام ابى عبدالله محمد بن محمد بن يوسف السنوسى الحسنى المتوفى ۸۹۵ھ طبعا على نفقة السلطان عبدالحفيظ المغربى الطبعة الاولى بمصر ۱۳۲۸ھ۔

وجوبه على من خشي النسيان ممن يتعين عليه تبليغ العلم[1]

یعنی سلف صالحین (صحابہ و تابعین) نے علم (حدیث) کے لکھنے اور نہ لکھنے میں اختلاف کیا ہے۔ اگرچہ (بعد میں) علم کے لکھنے کے جواز پر بات ٹھہر گئی اور اجماع قائم ہو گیا۔ بلکہ اس کے استحسان پر یعنی لکھنے کے مستحسن ہونے پر۔ بلکہ اس شخص پر جو تبلیغ علم کے لئے متعین ہو اور اسے نسیان کا اندیشہ ہو اس کا لکھنا واجب ہونا بھی بعید نہیں۔

امام بخاریؒ قائلین جواز میں سے ہیں۔ ان کا کئی ایک کتب احادیث کا مصنف ہونا اس کی کافی شہادت ہے۔ آپ نے اس باب کے ضمن میں چار احادیث ذکر کی ہیں۔

اول: حضرت علیؓ کے صحیفہ والی جو سابقاً گذر چکی دوم۔ ابو شاہ والی۔ یہ بھی اوپر گذر چکی۔ سوم۔ حضرت ابو ہریرہؓ والی روایت کہ میں نہ لکھتا تھا اور عبداللہ بن عمرو بن عاص لکھ لیا کرتے تھے۔ یہ بھی گزر چکی۔ چہارم۔ یہ کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی مرض موت میں اپنی وفات شریف سے چار روز پہلے کچھ لکھوانا چاہا۔

اس حدیث کے ذکر سے بھی امام بخاریؒ کی یہ غرض ہے کہ یہ کتابت قرآن شریف کی آیت نہ تھی۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو آپ لکھوا کر نہ ہو سکا تو زبانی ہی تبلیغ فرما دیتے۔ لیکن یہ ہرگز ثابت نہیں ہے کہ آپ نے اس کے بعد کوئی آیت قرآنی ذکر کی ہو۔ لہذا لا محالہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ جو کچھ آپ لکھوانا چاہتے تھے غیر قرآن تھا۔ پس حدیث کا لکھنا جائز ہوا[2]

خاتمۃ الحفاظ ان احادیث کی شرح کے بعد بعنوان "تنبیہ" امام بخاری کی اس ترتیب احادیث اربعہ کی نسبت فرماتے ہیں۔

(تنبیه) قدم حديث على انه كتب عن النبى صلى الله عليه و سلم يطرقه احتمال ان يكون انما كتب ذلك بعد النبى صلى الله عليه

---

[1] فتح الباری مطبوعہ مصر جزء اول صفحہ ۱۸۲

[2] و هذا من فضل ربی۔

و سلم و لم یبلغه النهی و ثنی بحدیث ابی هریرة و فیه الامر بالکتابة وهو بعد النهی فیکون ناسخا و ثلث بحدیث عبدالله بن عمرو وقد بینت ان فی بعض طرقه اذن النبی صلی الله علیه و سلم له فی ذلك فهوا قوی للاستدلال للجواز من الامران یکتبوا لابی شاه لاحتمال اختصاص ذلك بمن یکون امیا او اعمی و ختم بحدیث ابن عباس الدال علی انه صلی الله علیه و سلم هم ان یکتب لامة کتابا یحصل معه الامن من الاختلاف وهو لایهم الابحق[1]

امام بخاری نے سب سے پہلے حضرت علیؓ والی حدیث بیان کی کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ سے (یہ باتیں) لکھیں اس میں یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ آپ نے وہ امور آنحضرت ﷺ کے بعد لکھے ہوں۔ اور آپ کو ممانعت (کتابت حدیث) کی خبر نہ پہنچی ہو۔ (اس کے بعد امام بخاریؒ نے) دوسرے مرتبہ پر حضرت ابو ہریرہؓ والی حدیث بیان کی اور اس میں (حدیث) لکھنے کا حکم موجود ہے۔ اور یہ ممانعت کے بعد کی ہے پس یہ حدیث ناسخ ہے (اور حدیث ممانعت منسوخ) (اس کے بعد امام بخاری نے) تیسرے مرتبہ پر حضرت عبداللہ بن عمرو والی حدیث بیان کی ہے۔ اور میں (حافظ ابن حجرؒ) بیان کر چکا ہوں کہ اس کے بعض طرق میں یہ بھی مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عمرو کو کتابت کا اذن دیا تھا۔ پس یہ حدیث جواز کتابت حدیث کے لئے ابو شاہ کے واسطے لکھنے کے امر والی حدیث کی نسبت زیادہ قوی ہے کیونکہ اس میں یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ یہ امر ان پڑھ یا اندھے سے مخصوص ہے۔ (اس کے بعد امام بخاریؒ نے) اخیر پر حضرت عبداللہ بن عباسؓ والی حدیث بیان کی ہے جو اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس بات کا قصد کیا کہ امت (مرحومہ) کے لئے ایک

---

[1] فتح الباری مصری جزء اول صفحہ ۱۸۷۔

ایسی نوشت لکھوا جائیں جس سے ان میں اختلاف کا اندیشہ نہ رہے[1] اور

---

[1] عبرت اس زمانہ کے نئے نئے انقلابات کو غائر نظر سے دیکھنے والے اصحاب جانتے ہیں کہ یہ زمانہ وساوس وفتن کا ہے- علم کا چرچا اور غوغا تو بہت ہے لیکن عمل واستعداد مفقود اور غضب تو یہ ہے کہ خود غرضی تحصیل مال اور حب شہرت کا بھوت سب پر سوار- الا ماشاء ربی-

قرآن چشمہ ہدایت ہے- لیکن زمانہ حال کے مطلب پرستوں نے اسے موم کی ناک بنا کر اپنے اپنے خیالات کے سانچے میں ڈھال رکھا ہے-

(۱) آنحضرت ﷺ کا خاتم النبیین ہونا قرآن میں منصوص- لیکن برخلاف اس کے قادیانی گروہ قرآن مجید ہی سے سلسلہ رسالت کے اجزاء کے دلائل بیان کرتے ہیں-

(۲) شریعت محمدیہ کا مکمل ہونا اور قرآن کا دائمی طور پر محفوظ رہنا اور تاقیام قیامت رہنا اور ہمیشہ کے لئے اسی شریعت کا رائج رہنا قرآن مجید میں مذکور- لیکن برخلاف اس کے بابی وبہائی ہیں کہ اسی قرآن مجید سے ایک ہزار سال کے بعد قرآن شریف کے منسوخ ہو جانے اور شریعت محمدی کے خاتمہ کے دلائل بیان کرتے ہیں-

(۳) اطاعت آنحضرت ﷺ کی تاکیدات بلیغہ اور آپ کی نافرمانی پر وعیدات شدیدہ قرآن کریم میں مصرح- لیکن چکڑالوی ہیں کہ اسی میں سے اطاعت رسول کو شرک کہتے ہیں اور آنحضرت ﷺ کا حق اتنا بھی نہیں جانتے کہ خاص اس وحی کو جو اللہ تعالیٰ نے خاص آپ پر نازل کی- لوگوں کو سمجھا سکیں کہ اس حکم سے اللہ تعالیٰ کی کیا مراد ہے-

(۴) توحید الٰہی کی آیات قرآن عظیم میں کثرت سے موجود- جن میں صاف صاف مذکور ہے کہ متصرف عالم' مشکل کشا' دستگیر' دعاؤں کا سننے اور قبول کرنے والا اور حاجات کا پورا کرنے والا' رزق کا کھولنے اور بند کرنے والا ضرر ونفع کا مالک' دور ونزدیک سے یکساں سننے والا' غائب وظاہر کو یکساں جاننے والا صرف وہی ایک اللہ تعالیٰ ہے- ان امور میں کوئی بھی اس کا ساجھی اور حصہ دار نہیں ہے لیکن پیرپرست' قبرپرست' تعزیہ پرست' اپنی ضلالتوں کی سندیں بھی اسی قرآن سے پیش کرتے ہیں-

(۵) صحابہؓ کی خدمات اسلام قرآن میں جابجا مذکور- ان کے ایثار جاں نثاریوں کی جگہ جگہ تعریف ان کو اللہ تعالیٰ کی رضا وقبولیت کا حصول اور جنت کی بشارت موجود- لیکن حضرات شیعہ ہیں کہ منہ پھاڑ پھاڑ کر اسی قرآن سے (معاذ اللہ) ان کی منافقت' غداری' اسلام دشمنی اور کیا کیا برائیاں بیان کرتے ہیں اس کا نتیجہ تو (معاذ اللہ) یہ ہوا کہ قرآن کریم کا کوئی ٹھیٹھ نہیں- ہر ایک کو اس کے مطلب کی دلیل سے خوش کر دیتا ہے اور اپنا کوئی مذہب قائم نہیں کرتا-

حلف عدو سے قسم ہم سے کھائی جاتی ہے
ہر ایک سے چاہت الگ جتائی جاتی ہے

(ظاہر ہے) کہ آپ سوائے حق بات کے کسی دیگر بات کا قصد نہیں کر

توبہ توبہ! قرآن کیا ہوا- موم کی ناک ہوا جدھر چاہا موڑ لیا اور جو چاہا بنا لیا- اگر کسی سادہ لوح کا دل ان اختلاف بیانیوں کی وجہ سے پریشان ہو جائے تو عجب نہیں کہ وہ قرآن مبارک سے بد ظن ہو کر خاصا گمراہ ہو جائے اور پھر تائب نہ ہو کیونکہ قرآن کا اپنا بیان ہے کہ اگر یہ قرآن غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو اس میں یہ مفتری لوگ بہت سا اختلاف پاتے- پس اس دعوے کے بعد اتنی اختلاف بیانیاں کسی کج اور سادہ لوح کے لئے موجب ضلالت ہو سکتی ہیں نہ کہ باعث ہدایت- اور کیا عجب کہ فتنہ انگیزوں کے دلوں میں بھی ایسے ہی فاسد خیالات راسخ ہو گئے ہوں- یہ سب بداعتقادیاں سنت رسول اللہ ﷺ کے چھوڑنے سے پیدا ہوئیں-

اس کی مثال یوں سمجھئے کہ دیکھنے کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے- اپنی آنکھوں میں قوت بصارت اور محاذ میں آفتاب عالم تاب یا اس کے قائم مقام (چراغ) کا نور بغیر اپنی بصارت کے آفتاب و چراغ سے روشنی حاصل نہیں ہو سکتی اور بغیر آفتاب یا چراغ کے اپنی بصارت درست نہیں ہو سکتی اور کسی کام نہیں آسکتی- آنحضرت ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے آسمان ہدایت کا آفتاب یا چراغ کہا ہے- چنانچہ فرمایا ہے- یا ایھا النبی انا ارسلنک (احزاب) ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا اللھم کما ھدیتنا الی السنۃ فلاتنزعھا منا حتی نلقاك-

اظہار خیانت: منکرین حدیث انکار حدیث میں گو متفق ہیں مگر درجات انکار میں مختلف ہیں جس کی وجہ سے ان میں کسی قاعدہ اور اصول کی پابندی نہ رہی- تو ان کی شاخیں الگ الگ ہو گئیں- چنانچہ حال میں ایک بے استعداد با کمال محب الحق نام ہوئے ہیں- جنہوں نے انکار حدیث میں ایک کتاب "دعوت الحق" لکھی ہے- اس میں علم حدیث کی بے اعتباری کے ثبوت میں بحوالہ تذکرۃ الحفاظ بیان کرتے ہیں کہ "حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے احادیث نبویہ کو لکھ کر ایک مجموعہ تیار کیا تھا- جسے آپ نے اپنی وفات کے وقت جلوا دیا-"

تعجب ہے کہ ان دروغ باف فتنہ انگیزوں میں جھوٹ بولنے اور دھوکہ دینے کی اتنی جرات ہو جاتی ہے کہ مطبوعہ کتابوں کا حوالہ دیتے ہیں اور خیانت کرتے ہیں- اگر یہ لوگ زمانہ تصنیف سے پیشتر ہوتے تو اللہ تعالیٰ جانے کیا کیا غضب ڈھاتے؟ حضرت ابوبکر ؓ کا فعل اور امام ذہبی ؒ کی نقل بھلا کسی کو اس کی تسلیم میں کیا شک؟ سید سلیمان ندوی صاحب ایسے ناقد و بصیر معارف میں اس کتاب پر ریویو کرتے ہیں اور اس کے حوالوں پر اعتبار کر کے اس کی تعریف کرتے ہیں اور اس کی خیانت پر واقف نہیں ہوتے- دوسرے لوگوں کی ایسی چھوٹی چھوٹی غلطیاں پکڑتے ہیں کہ اگر نہ پکڑتے تو حرج نہیں تھا- لیکن اس کی خیانت ظاہر نہ کرنے سے تو ایک جہان کے گمراہ ہو جانے کا اندیشہ ہے- اب سنئے کہ جس

سکتے لے

تنبیہ : خاتمۃ الحفاظ کا منشاء یہ ہے کہ امام بخاریؒ نے یہ ہر چہار احادیث ایک خاص ترتیب میں بیان کی ہیں کہ اگرچہ صحت اسناد میں سب سے برابر ہیں۔ لیکن مقصود پر دلالت کرنے میں ہر دوسری اپنی پہلی سے قوی تر ہے..... گویا اس ترتیب میں تفاوت مدارج قوت کو ملحوظ رکھا ہے اور یہ بات امام بخاریؒ کی دقت نظر کی دلیل ہے۔ فافہم

زمانہ تابعین میں تدوین علم حدیث

جب صحابہؓ یکے بعد دیگرے اس دار فانی سے کوچ کرتے گئے اور کبار تابعینؒ میں سے بہت سے بزرگ فوت ہو گئے اور امت مرحومہ میں اختلافات کا دروازہ کھل گیا تو اوساط تابعین کو اپنے مسموعات کے محفوظ رکھنے اور پچھلی نسلوں تک پہنچا جانے کے لئے تحریر کی حاجت پڑی۔ پس انہوں نے (ان پر اللہ تعالیٰ کی بے شمار رحمتیں ہوں) اس کیلئے کمر ہمت باندھی اور ہر طرح کی ممکن تحقیق و تدقیق سے حدیث نبوی ﷺ کو صفحہ سینہ

گذشتہ سے پیوستہ

صفحہ میں حافظ ذہبیؒ نے اس روایت کو تذکرہ میں ذکر کیا ہے اسی میں ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا ہے "فھذا لا یصح" (یعنی یہ روایت صحیح نہیں ہے) (دیکھو تذکرہ جلد اول صفحہ ۳ احوال حضرت ابو بکر صدیق اکبرؓ) دیکھئے کس قدر جرات ہے کہ روایت تو حافظ ذہبیؒ کے حوالہ سے نقل کر دی لیکن حافظ ذہبی نے اس پر جو حکم لگایا تھا اسے چھپا دیا۔ ایسے مصنفوں کا کیا اعتبار ؟

لے نبی برحق کا قلبی تعلق اللہ تعالیٰ سے ایسا ہوتا ہے کہ اس میں خلاف حکم الٰہی کا قصد و ارادہ پیدا نہیں ہوتا چنانچہ حضرت شعیب علیہ السلام کا قول و ما ارید ان اخالفکم الی ما انھکم عنہ اور آیت و ما ینطق عن الھوی اس پر دال ہیں۔ اور ترک اولیٰ یا خطا اجتہادی یا کسی امر میں تقدیم یا کسی میں تاخیر یا خلاف مصلحت وقتی ایسے امور جو انبیاء علیہم السلام سے سرزد ہوئے ہیں۔ وہ اس باب سے نہیں ہیں کیونکہ ان میں خلاف حکم الٰہی کا قصد و ارادہ نہیں ہوتا فافہم فانہ دقیق جدا و لا تکن من القاصرین۔

۲ مسلمان جمع قرآن کے بعد سب سے پہلے جس علم کو قید تحریر میں لائے وہ علم حدیث ہے۔ اس سے دو باتیں ثابت ہیں اول یہ کہ اس زمانہ کے لوگوں کو آنحضرت ﷺ کی ذات اقدس اور آپ کے اقوال طیبہ اور اعمال صالحہ اور اخلاق فاضلہ کی کس قدر قدر تھی۔ آپ کے ہر کلمہ اور ہر حرکت و سکون کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں اور ان کا ضائع ہونا گوارا نہیں کر سکتے اور یہی آنحضرت ﷺ کی وصیت تھی۔ ترکت فیکم امرین لن تضلوا ما تمسکتم بھما کتاب اللہ و سنتی۔ (مؤطا)

سے صفحہ سفینہ (صحیفہ) پر نقل کرنا شروع کیا۔ چنانچہ خاتمۃ الحفاظؒ جن کا پایہ علوم حدیث میں محتاج بیان نہیں۔ "مقدمہ فتح الباری" میں فرماتے ہیں۔

اعلم علمني الله و اياك ان اثارالنبي صلى الله عليه و سلم لم تكن في عصر النبي صلى الله عليه و سلم و في عصر اصحابه و كبار تبعهم مدونة في الجوامع ولا مرتبة لامرين. احدهما انهم كانوا في ابتداء الحال قد نهوا عن ذلك كما ثبت في صحيح مسلم خشية ان يختلط بعض ذالك بالقران العظيم وثانيهما لسعة حفظهم و سيلان اذهانهم ولان اكثرهم لا يعرفون الكتابة ثم حدث في اواخر عصر التابعين تدوين الاثار و تبويب الاخبار لما انتشر العلماء في الامصار و كثر الابتداع من الخوارج و الروافض و منكر الاقدار(مقدمه فصل اول مطبوعه دهلی صفحه ٥)

نبی کریم ﷺ کے آثار (اقوال وافعال) آپ کے عہد میں اور عصر صحابہؓ میں اور کبار تابعینؒ کے زمانہ میں دو وجہ سے باترتیب لکھے ہوئے جمع نہ تھے۔ اول اس وجہ سے کہ شروع شروع میں صحابہ کو آنحضرت ﷺ نے اس سے منع کر دیا تھا جیسا کہ صحیح مسلم میں ثابت ہے۔ کیونکہ اندیشہ تھا کہ بعض احادیث قرآن کریم سے مل نہ جائیں دوسرے اس وجہ سے کہ ان کے حافظے بہت مضبوط اور وسیع تھے اور ان کے ذہن بہت رواں تھے۔ نیز اس لئے کہ اکثر ان میں سے کتابت جانتے بھی نہ تھے۔ پھر تابعین کے پچھلے زمانہ میں آثار کی باترتیب کتابت اور اخبار (احادیث) کی باقاعدہ تبویب شروع ہو گئی۔ جب کہ (دور نزدیک کے) شہروں میں علماء کثرت سے پھیل گئے اور خارجیوں اور رافضیوں اور تقدیر کے منکروں کی بدعتیں کثرت سے شائع ہونے لگیں۔

خاتمۃ الحفاظؒ کی ان چند سطروں میں ہمارے مذکورہ بالا طویل مضمون کے اہم

مطالب کا خلاصہ نہایت صفائی سے آگیا ہے اس میں تواریخ امم اور علوم و فنون اور صنائع کی ہدایت اور ان کی عہد بعہد کی ترقیات پر فلسفیانہ نظر رکھنے والے اصحاب کے لئے کافی بصیرت ہے۔

(۱) علم حدیث کا پہلا مدون : حافظ ابن حجرؒ کی تصریح کے مطابق علم حدیث کا سب سے پہلا مدون امام ابن شہاب زہریؒ ہے۔ چنانچہ آپ کہتے ہیں۔

اول من دون الحديث ابن شهاب الزهرى على راس المائة بامر عمر بن عبدالعزيز ثم كثر التدوين و حصل بذلك خير كثير[۱]

"سب سے پہلا شخص جس نے علم حدیث کی تدوین کی وہ امام ابن شہاب زہریؒ ہے۔ (جس نے) خلیفہ عمرؒ بن عبدالعزیز کے امر سے پہلی صدی کے اخیر پر حدیث کو مدون کیا۔ پھر اس کے بعد (باقاعدہ) تصنیف و تالیف کی کثرت ہوئی گئی۔ جس سے بہت ہی خیر (و برکت) حاصل ہوئی۔"

امام ابن شہاب زہریؒ کی شخصیت محتاج بیان نہیں۔ ۵۰ھ میں مدینہ طیبہ میں پیدا ہوئے۔ آپ بڑے بڑے عالی قدر ائمہ محدثین کے استاد ہیں۔ مثلاً امام مالکؒ امام سفیان بن عینیہؒ امام لیث بن سعدؒ امام عطاء بن ابی رباحؒ خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ امام یحییٰ بن سعید انصاریؒ امام اوزاعیؒ امام ابن جریجؒ امام اسحٰقؒ امام باقرؒ اور موسیٰ بن عقبہؒ صاحب مغازی وغیرہم رحمہم اللہ اجمعین۔

آپ کو بہت سے صحابیوں سے روایت ہے مثلاً حضرت عبداللہ بن عمرؓ حضرت انسؓ حضرت جابر بن عبداللہؓ حضرت ابو طفیلؓ وغیرہم رضی اللہ عنہم اجمعین۔

اسی طرح بڑے بڑے تابعین اور فقہاء مدینہ طیبہ اور اولاد صحابہ سے بھی روایت ہے۔ مثلاً سعید بن مسیبؒ عبداللہؒ و سالم ہر دو پسران حضرت عبداللہ بن عمرؓ خارجہ بن زید بن ثابتؒ عبداللہ بن ابی بکر بن حزمؒ عطاء بن ابی رباحؒ عروہؒ بن زبیرؒ امام قاسمؒ بن محمدؒ بن ابی بکر الصدیقؓ وغیرہم رحمہم اللہ اجمعین۔ آپ کا حافظہ نہایت قوی تھا۔ چنانچہ

[۱] فتح الباری مطبوعہ دہلی جزء اول ص ۱۰۶۔

اسی راتوں میں قرآن شریف حفظ کر لیا۔[1]

امام لیث[2] (آپ کے شاگرد) کہتے ہیں کہ امام زہریؒ فرماتے تھے کہ میں نے علم کی ایسی کوئی بات اپنے دل میں ودیعت نہیں کی جسے میں پھر بھول گیا ہوں۔ امام مالکؒ کہتے ہیں کہ امام ابن شہابؒ باقی رہ گئے اور دنیا میں ان کا کوئی نظیر نہیں تھا۔[3]

خلیفہ ہشام بن عبدالملک[4] نے آپ سے کہا کہ اپنی بعض مرویات میرے بیٹے کو املا کرا دیں۔ آپ نے چار سو حدیثیں اپنے حافظہ سے املا کرائیں قریباً ایک ماہ کے بعد خلیفہ نے آپ سے کہا کہ وہ تحریر کہیں گم ہو گئی ہے تو آپ نے دوبارہ لکھوا دیں۔ جب پہلی تحریر سے مقابلہ کیا گیا تو ایک حرف کا بھی فرق نہ نکلا۔[5]

امام ابن شہابؒ کے دونوں نسخے یعنی خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانے والا۔ اور ہشام بن عبدالملک کے عہد والا آج ناپید ہیں۔

خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ:۔ خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے زمانہ پر نظر کی اور آنے والے زمانہ کے خطروں کو سمجھا تو تدوین حدیث کے اہم کام کو عام طور پر شاہی فرمان سے انجام دینا چاہا۔ چنانچہ صحیح بخاری میں ہے۔

كتب عمر بن عبدالعزيز الى ابى بكر بن حزم انظر ما كان من حديث رسول الله صلى الله عليه و سلم فاكتبه فانى خفت من دروس العلم و ذهاب العلماء و لا يقبل الاحديث النبى صلى الله عليه و سلم وليفشوا العلم وليجلسوا حتى يعلم من لا يعلم فان العلم لا يهلك حتى يكون سرا. (صحیح بخاری جلد اول کتاب العلم)

یعنی خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے ابوبکر بن حزم (عامل مدینہ طیبہ) کو لکھا کہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث کو دیکھ بھال کر لکھ لو۔ کیونکہ مجھے علم کے مٹ

---

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد اول صفحہ ۹۷۔
[2] امام لیث کا مقبرہ مصر میں ہے۔ خاکسار سفر مصر میں وہاں ان کی دعا کے لئے گیا تھا۔ رحمۃ اللہ علیہ
[4] خلیفہ ہشام کا زمانہ ۱۰۵ھ سے ۱۲۵ھ تک رہا۔
[5] تذکرۃ الحفاظ جلد اول ۹۷۔

جانے اور علماء کے فوت ہو جانے کا اندیشہ ہو رہا ہے اور (دیکھو) سوائے رسول اللہ ﷺ کی حدیث کے (اور کچھ) قبول نہ کیا جائے- اور (علماء کو) چاہئے کہ علم (حدیث) کی اشاعت کریں اور (اس کی) مجالس (منعقد) کریں- تاکہ جو علم نہیں رکھتا وہ تعلیم پائے کیونکہ علم جب تک کہ پوشیدہ نہ ہو جائے ضائع نہیں ہوتا-

ہم خلیفہ راشد کے اس فرمان پر چند امور تفصیل سے لکھنا چاہتے ہیں-

(۱) آپ کا زمانہ خلافت ۹۹ھ سے ۱۰۲ھ تک ہے- اس وقت تک صحابہ تو چند متبرک نفوس کے سوا سب فوت ہو چکے تھے اور کبار تابعین ؒ میں سے بھی اکثر کا انتقال ہو چکا تھا- اس سے آپ کو اندیشہ ہوا کہ علماء صحابہ اور کبار تابعین کے وفیات پر اگر کچھ اور زمانہ گزر گیا تو علم حدیث گم ہو جائے گا- لہٰذا اس کو ضبط صدر سے ضبط تحریر میں لے آنا چاہئے-

آپ کا یہ اندیشہ بالکل اسی طرح کا ہے جس طرح خلافت صدیقی میں مسیلمہ کذاب کی جنگ میں بہت سے حفاظ قرآن شریف شہید ہو گئے- تو حضرت فاروق اعظم ؓ نے حضرت صدیق اکبر ؓ سے کہا کہ اگر آئندہ اسی طرح جنگوں میں حفاظ قرآن شہید ہوتے گئے تو قرآن مجید اکثر گم ہو جائے گا- پس قرآن شریف کو مکتوبی صورت میں یکجا کر دینا چاہئے[1]

نیز یہ اسی طرح کا ہے- جس طرح خلافت عثمانی آنحضرت ﷺ کے صاحب سر صحابی حضرت حذیفہ بن یمان نے سفر عراق سے واپس آکر حضرت ذوالنورین سے کہا کہ ان لوگوں کے املائے قرآن میں کئی ایک غلطیاں ہیں- آپ اس کا تدارک کیجئے تاکہ امت محمدیہ (علی صاحبها الصلوۃ والتحیه) میں کتاب اللہ کے متعلق اہل کتاب کا سا اختلاف نہ ہو جائے-

اس پر خلیفہ ثالث حضرت عثمان ذوالنورین ؓ نے صحیفہ ابی بکر کی نقلیں ایک مقررہ

---

[1] صحیح بخاری مصری جلد ۳ ص ۱۴۵ باب جمع القرآن-

رسم الخط میں کرواکر بلاد اسلامیہ میں چاروں طرف بھیج دیں۔

اسی طرح خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے بھی حالت زمانہ اور صحابہ کی وفیات پر نظر کر کے ضروری سمجھا کہ علم حدیث کو کتابی صورت میں جمع کر لیا جائے۔ پس ابو بکر بن حزم تابعیؒ (عامل مدینہ) کو حکم کیا کہ تم اس کام کو اپنے اہتمام سے انجام دو۔

(۲) خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے فرمان میں صاف لکھ دیا کہ صرف آنحضرت ﷺ کی حدیث لکھی جائے اور اس کے سوائے اور کچھ نہ لکھا جائے۔

(۳) اس فرمان میں یہ بھی بتصریح لکھا کہ کتابی جمع کے علاوہ اشاعت علم (حدیث) کے لئے علمی مجالس بھی منعقد کی جائیں اور ان میں اس علم (حدیث) کا درس دیا جائے۔ کیونکہ علم کی اشاعت دو ہی طریق سے ہوتی ہے۔ تدریس سے اور اشاعت کتب سے۔ پس ہر دو طریق سے علم حدیث کی خدمت کرنے کا حکم صادر فرمایا اور یہ بھی صاف الفاظ میں فرمادیا کہ علم کا فنا اور زوال صرف اس کے مخفی و پوشیدہ رہنے سے ہوتا ہے اور بس۔

(۴) خلیفہ راشد نے ابو بکر بن حزم کو خصوصیت سے جو اس خدمت کے لئے منتخب کیا تو اس کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم ابو بکر مذکور کی شخصیت کے متعلق بھی کچھ لکھیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ مردم شناس خلیفہ نے یہ بھاری خدمت کیسے قابل و موزوں ہاتھوں میں دی تھی۔

ابو بکر بن حزمؒ: ابو بکر بن حزم کا نسب نامہ یوں ہے۔ ابو بکر بن محمد بن عمرو بن حزم بن زید بن لوذان خزرجی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ابو بکر اپنے جد اعلیٰ حضرت حزمؓ کی طرف منسوب ہیں۔ جو آنحضرتؐ کے انصاری یعنی مدنی جانثاروں سے تھے۔ آپؐ کے ساتھ غزوہ خندق میں موجود تھے اور آپؐ کی طرف سے اہل نجران پر عامل مقرر تھے۔

حضرت حزمؓ کا بیٹا عمرو جو ابو بکر کا دادا ہے وہ بھی صحابی ہے۔ ابو بکر کی دادی عمرہ حضرت عائشہؓ کی شاگرد تھیں۔ محمد جو ابو بکر کا دادا ہے۔ ان کو آنحضرت ﷺ کے عہد سعادت مہد میں پیدا ہونے کا شرف حاصل ہے۔ چنانچہ نجران میں ۱۰ھ میں پیدا

ہوئے[1]

خود ابو بکر تابعی ہیں خلیفہ عمر بن عبد العزیز اور پھر خلیفہ سلیمان بن عبد الملک کی طرف سے مدینہ منورہ پر امیر و قاضی' امام مالکؒ کہتے ہیں کہ مدینہ طیبہ مین علم قضا میں ابو بکر بن محمد کے برابر کوئی نہیں تھا- اور یہ بھی کہا کہ میں نے ابو بکر کی مثل صاحب مروت و صاحب حال کسی کو نہیں دیکھا[2]

خود ابو بکر اور ان کے دونوں بیٹے محمد اور عبد اللہ مدینہ منورہ کے صاحب فتویٰ علماء میں سے تھے- [3] ۱۲۰ھ میں چوراسی سال کی عمر میں فوت ہوئے رحمہ اللہ-

ابو بکر بن حزم کے ان کوائف کے ذکر سے ہمارا مقصود یہ ہے کہ وہ آنحضرت ﷺ سے قریب العہد تھے مہبط وحی مرکز اسلام مہد خلافت اور مرجع علم یعنی مدینہ منورہ کے رہنے والے- اور پھر اسی میں حاکم تھے- وہاں علماء صحابہ و کبار تابعین کے صحبت یافتہ تھے- علم والے گھرانے سے تھے- صاحب لیاقت و صاحب صلاحیت اور باہمت و مروت تھے- فقہائے مدینہ میں مسلم صاحب فتویٰ عالم تھے- خصوصاً خلیفہ عمر بن عبد العزیز ایسے علم دوست اور مردم شناس خلیفہ کا ان کو اس خدمت پر متعین کرنا- ان کی لیاقت و قابلیت کے سونے پر سہاگے کا کام دیتا ہے-

پس انہوں نے اس خدمت کو باثر عہدہ گورنری و قضا باحسن وجوہ انجام دیا- فجزاہ اللہ عنا و عن سائر اھل الحدیث جزاء حسنا-

مدینہ منورہ اور فقہائے سبعہ :- مدینہ منورہ ان دنوں علم اسلامی (قرآن و حدیث) کا مرکز و مجمع تھا- آنحضرت ﷺ سے خلفائے ثلاثہ تک اسلامی سلطنت کا دار السلطنت یہی پاک زمین تھی- اس میں ان کے جو سیاسی فرامین اور شرعی احکام و قضایا نافذ ہوتے تھے- وہ علمائے مدینہ کو ہمیشہ از بر اور پیش نظر تھے- بڑے بڑے قابل اور

---

[1] تہذیب التہذیب-

[2] اعلام الموقعین مطبوعہ دہلی جلد اول-

[3] یعنی زمانہ نبوت اور خلفائے ثلاثہ کے عہد میں مدینہ ہی دار الخلافہ تھا- حضرت علی نے مصلحت سمجھ کر کوفہ میں تبدیل کر لیا-

صاحب فتویٰ علماء اس وقت تک اس مقدس خطہ میں ہو چکے تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان چاروں[1] ٹھیک عہدوں میں مرکز اسلام ہونے کی وجہ سے یہاں تعامل اور تحمل روایت سب سے بڑھ کر قابل اعتبار ہو سکتا تھا۔ فقہائے سبعہ مدینہ اسی مبارک زمانہ کی قابل فخر یادگار ہیں۔ چنانچہ ان کے اسماء گرامی اس رباعی میں مذکور ہیں۔

اذا قیل من فی العلم سبعة ابحر

روایتهم لیست من العلم خارجة

فقل هم عبید الله عروة قاسم

سعید ابوبکر سلیمان خارجه

یعنی جب پوچھا جائے کہ علم (اسلامی) کے سات کون سے ہیں۔ جن کی روایت علم سے باہر یعنی خلاف نہیں ہے۔ تو جواب میں کہو کہ وہ یہ ہیں عبید اللہ، عروہ، قاسم، سعید، ابوبکر، سلیمان، خارجہ۔ (رحمہم اللہ اجمعین)

ان سب کی وفیات ۹۴ھ سے ۱۰۷ھ تک ہوئیں۔ اکثر ان میں سے ۹۴ھ میں فوت ہوئے تو اس سال کا نام "عام الفقہاء" پڑ گیا۔

رجوع بمطلب: صحیح بخاری شریف کی روایت مذکورہ بالا میں صرف ابوبکر بن حزم امیر مدینہ کو فرمان لکھنے کا ذکر ہے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ روایت بطریق عبداللہ بن دینار ہے اور وہ مدینہ طیبہ کے رہنے والے تھے۔ سو ان کو اسی فرمان پر اطلاع ہوئی جو ان کے شہر میں پہنچا۔ ورنہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے یہ حکم تمام اسلامی ممالک میں لکھا تھا۔ چنانچہ حافظ ابن حجرؒ فتح الباری میں لکھتے ہیں۔

وقد روی ابو نعیم فی تاریخ اصبهان هذه القصة بلفظ کتب عمر بن عبدالعزیز الی الافاق انظر واحدیث رسول الله صلی الله علیه و سلم فاجمعوه (فتح الباری مطبوعه دهلی جز اول صفحه ۹۹)

---

[1] یعنی زمانہ نبوت اور خلفائے ثلاثہ کے عہد میں مدینہ ہی دارالخلافہ تھا۔ حضرت علی نے مصلحت سمجھ کر کوفہ میں تبدیل کر لیا۔

"ابو نعیم نے تاریخ اصفہان میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کے اس فرمان کی روایت ان الفاظ میں بیان کی ہے کہ آپ نے تمام آفاق (اسلامی) میں یہ حکم نامہ لکھا تھا کہ آنحضرت ﷺ کی حدیث کو دیکھ بھال کر جمع کر لو۔"

اسی طرح حافظ ابن عبدالبر اندلسی اپنی کتاب جامع بیان العلم میں سعد بن ابراہیم سے نقل کر کے لکھتے ہیں۔

قال امرنا عمر بن عبدالعزیز بجمع السنن فکتبنا ھاد فترا دفترا فبعث الی کل ارض علیھا سلطان دفترا[1]

"کہ ہمیں عمر بن عبدالعزیز نے حدیث جمع کرنے کا حکم دیا تو ہم نے الگ الگ دفتروں میں ان کو لکھا تو (خلیفہ نے) ہر علاقے میں کہ جس میں آپ کا نائب تھا ایک ایک دفتر بھیج دیا۔"

سعد بن ابراہیم[2] مذکور بھی مدینہ طیبہ کے رہنے والے ہیں لیکن مکہ شریف اور واسط کا سفر بھی کیا تھا۔ چنانچہ امام سفیان بن عیینہؒ نے ان سے مکہ معظّمہ میں اور امام شعبہ اور امام ثوریؒ نے واسط میں روایت کی۔

بیدار مغز اور دوراندیش خلیفہ کے اس حکم پر ائمہ محدثین کی ہمتیں حدیث نبوی کے جمع کرنے میں مصروف ہو گئیں۔ کیونکہ شاہی توجہ تحریک قومی میں نہایت موثر ہوتی ہے۔ چنانچہ اس حکم کا اثر صرف اسی عہد تک نہ رہا۔ بلکہ اس نے اپنے بعد کے زمانوں کے لئے بھی اس قابل فخر مذاق[3] کا دروازہ کھول دیا۔

احادیث نبویہ کے جو دفتر اس زمانہ میں تیار ہوئے وہ انقلابات کے سبب بعینہ

---

[1] سیرۃ النبی مولفہ مولانا شبلی مرحوم حصہ اول مجلد اول طبع اول تقطیع کلاں صفحہ ۱۴۔

[2] سعد بن ابراہیم ۱۲۵ یا ۱۲۶ یا ۱۲۷ھ میں فوت ہوئے (تاریخ صغیر صفحہ ۱۴۵ نیز تذکرۃ الحفاظ جلد سوم صفحہ ۴۶۴)

[3] جمع احادیث کے مذاق کو قابل فخر اس لئے کہا ہے کہ مسلمانوں سے پیشتر کسی قوم نے اپنے ہادی و پیغمبر کے حالات کو اس چھان بین اور تفصیل سے نہیں لکھا۔ چنانچہ مصنفین یورپ اس کے برابر قائل ہیں۔

مکتوبی صورت میں تو محفوظ نہ رہے[1] لیکن ان کی دیکھا دیکھی جو مذاق تصنیف پیدا ہو گیا تھا۔ اس سے مختلف مقامات پر کئی ایک ائمہ نے اس روش کو جاری رکھا اور وہی علم حدیث کے پہلے مصنف کہلائے۔

(۲) امام زہریؒ کے بعد اس علم کے دوسرے مدون آپ کے لائق شاگرد امام ابن جریج رومی مکی ہیں[2] آپ بڑے پائے کے امام حدیث ہوئے ہیں۔ ان کے آباواجداد روم کے تھے اس لئے ان کو رومی کہتے ہیں۔ ۸۰ھ میں مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے۔ اٹھارہ سال تک حضرت عطاء بن ابی رباحؒ تابعی مکی کی خدمت میں رہ کر کثرت سے حدیث روایت کی۔ استاد اپنے شاگرد کا بغائت مداح تھا۔ چنانچہ حضرت عطاء سے کسی نے دریافت کیا کہ آپ کے بعد کس شخص سے کچھ دریافت کیا جایا کرے؟ تو حضرت عطاء نے امام ابن جریج کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ اگر یہ جوان زندہ رہا تو اس سے (پوچھ لیا کرنا)[3]

امام احمد کا قول ہے کہ ابن جریجؒ علم کا خزانہ ہے۔ یہ اور سعید بن عروہ حدیث کے

---

[1] تہذیب التہذیب میں ہے کہ عبداللہ بن ابی بکر سے کسی نے اس مجموعہ کی بابت دریافت کیا تو اس نے کہا وہ ضائع ہو گیا۔

[2] امام ابن جریج کو حافظ ابن حجرؒ نے تقریب میں چھٹے طبقہ میں رکھا ہے۔ جن کی ملاقات کسی صحابی سے ثابت نہیں ہوئی اور اس کی مثال میں انہیں امام ابن جریج کو ذکر کیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ پیدا تو ہوئے عصر صحابہ میں لیکن علم تابعین سے حاصل کیا اسی نظر سے ہم نے ان کو زمان تابعین کے مصنفین میں گنا ہے۔ کیونکہ صحابہ کا زمانہ ۱۱۰ھ تک ہے اور تابعین کا ۱۸۰ھ تک۔

[3] حضرت عطاء بن ابی رباحؒ بڑی شخصیت کے تابعی ہیں۔ بڑے بڑے جلیل القدر اور کثیر الحدیث حفاظ صحابہ سے روایت کی۔ مثلاً حضرت عائشہ' حضرت ابوہریرہ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم اجمعین۔

حضرت عطاء سے بھی بڑے بڑے ائمہ نے حدیث روایت کی۔ مثلاً امام ابو حنیفہؒ (امام اہل العراق نے) اور امام اوزاعیؒ (امام اہل الشام) نے۔ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ میں نے عطاء سے زیادہ افضل کسی کو نہیں پایا (میزان الاعتدال) آپ حضرت عمرؓ کی خلافت میں پیدا ہوئے اور ۱۱۴ھ میں فوت ہوئے۔

[4] تذکرۃ الحفاظ جلد اول صفحہ ۱۵۳۔

اول مصنف ہیں- حافظ ذہبیؒ نے ابن جریجؒ کو صاحب التصانیف کے نام سے نامزد کیا ہے-

نیز لکھتے ہیں کہ خالد بن نزار ایلی نے کہا کہ میں ۱۵۰ھ میں ابن جریج کی کتابیں لے کر (بیت اللہ شریف کے) سفر پر نکلا کہ ابن جریج سے ملاقات کروں- لیکن وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ آپ فوت ہو چکے ہیں (انا للہ)-اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی کئی تصانیف ہیں لیکن آج وہ سب ناپید ہیں- حاجی خلیفہؒ نے کشف الظنون میں عنوان السنن الموجودة قبل الصحیحین میں یوں لکھا ہے-

منها سنن لابن جريج و سنن لابن اسحق غير السير التى تقدمت (صفحه ۳۷ جلد دوم)

امام ابن جریج یکم ذی الحجہ ۱۵۰ھ کو مکہ شریف میں فوت ہوئے- رحمه الله و ایانا-

(۳) امام محمد بن اسحاقؒ: آپ فن مغازی کے بلانزاع امام ہیں- مدینہ منورہ کے رہنے والے تھے- پھر کوفہ رے اور جزیرہ میں اقامت کرنے کے بعد بغداد میں جا بسے اور وہیں ۱۵۱ھ میں فوت ہوئے-

آپ کو حضرت انسؓ صحابی کی زیارت کا شرف حاصل تھا- امام زہریؒ کے ہاں ان کی بہت قدر و منزلت تھی دربان کو حکم تھا کہ محمد بن اسحاق آویں تو ان کو روکا نہ جائے- انہوں نے فن حدیث میں بھی ایک کتاب السنن لکھی- جس کا ذکر اوپر امام ابن جریج کے حال میں ہو چکا ہے اور فن مغازی میں بھی بہت مفید کتاب لکھی- ان سے پیشتر خلفاء کی توجہ مغازی کی طرف بالکل نہ تھی- ان کی تصنیف نے ایسی قدر پائی کہ خلفاء کا مذاق طبع ہی بدل گیا اور وہ مغازی کے بہت ہی شائق ہو گئے- چنانچہ خاتمۃ الحفاظ تہذیب التہذیب میں ابن عدی محدث کے قول سے نقل کرتے ہیں کہ اگر امام محمد بن اسحاق کی سوائے اس کے کہ اس نے خلفاء کو ایسی کتابوں کے مطالعہ سے ہٹا کر جن سے کچھ بھی فائدہ نہ تھا رسول اللہ ﷺ کے مغازی اور آپ کی بعثت کی طرف مشغول کر دیا

دیگر کوئی بھی فضیلت نہ ہو تو یہ (اکیلی) ایسی فضیلت ہے جس میں امام محمد بن اسحاق سبقت لے گئے ہیں۔
ان کے بعد بہت لوگوں نے مغازی پر کتابیں لکھیں لیکن وہ ان کی رسائی تک نہ پہنچ سکے۔[1]

امام محمد بن اسحاقؒ کی یہ کتاب اب ناپید ہے۔ ہاں اس کا نشان سیرۃ ابن ہشام کی صورت میں باقی ہے۔ جو مصر میں مطبوع ہو کر عام طور پر دستیاب ہو سکتی ہے۔

تنبیہ: یہ امام محمد بن اسحاقؒ وہی ہیں جو قرات خلف الامام کی حدیث کے راوی ہیں۔ اس حدیث کو ساقط الاعتبار قرار دینے کے لئے حضرات احناف ایک یہ عذر کیا کرتے ہیں کہ امام مالک محمد بن اسحاقؒ کی نسبت سخت رائے رکھتے تھے۔ سو اس کا جواب دو طرح پر ہے۔

اول: یہ کہ حافظ ابن حجر تہذیب التہذیب میں فرماتے ہیں۔

والذی یذکر عن مالك فی ابن اسحق لا یکاد یتبین[2]

"یعنی جو کچھ امام مالکؒ سے محمد بن اسحاق کی بابت ذکر کیا جاتا ہے وہ مبین نہیں ہے۔"

نیز فرماتے ہیں۔

قال ابو زرعة الدمشقی و ابن اسحق رجل قد اجمع الکبراء من اهل العلم علی الاخذ عنه و قد اختبره اهل الحدیث فروا صدقا و عدلا مع مدحه ابن شهاب له و قد ذاکرت رحیما قول مالك فیه فرای ان لك لیس للحدیث انما هو لانه اتهمه بالقدر[3]

"یعنی امام ابو زرعہ دمشقی کہتے ہیں کہ (امام) ابن اسحاق ایسے شخص ہیں جن

---

[1] تہذیب التہذیب جلد نہم صفحہ ۴۵۔
[2] تہذیب التہذیب جلد نہم صفحہ ۴۱۔
[3] تہذیب التہذیب جلد نہم ص ۴۱، ۴۲۔

سے روایت کرنے کی نسبت بڑے بڑے بزرگ اہل علم کا اتفاق ہے اور حدیث والے لوگ اسے (خوب طرح) آزما کر سچائی اور بھلائی دیکھ چکے ہیں۔ خصوصاً جب کہ امام ابن شہاب زہری اس کی تعریف کرتے ہیں اور امام مالک کے قول کی نسبت رحیم (محدث) سے تذکرہ کیا تو اس نے کہا یہ بات اس کی (روایت) حدیث کی وجہ سے نہیں بلکہ صرف اس لئے تھی کہ آپ (امام مالک) نے اسے (ابن اسحاق کو) متہم بالقدر جانا۔"

پھر اس سے تھوڑا آگے لکھتے ہیں۔

وقال موسی بن هارون سمعت محمد بن عبدالله بن نمير يقول كان محمد بن اسحق يرمي بالقدر و كان ابعد الناس منه[1]

موسیٰ بن ہارون کہتے ہیں کہ میں نے امام محمد بن عبداللہ بن نمیر کو کہتے سنا کہ محمد بن اسحاق پر قدریہ ہونے کی تہمت تھی اور وہ اس سے سب لوگوں سے زیادہ دور تھے (یعنی ہرگز ہرگز قدریہ نہیں تھے)

یہ الزام اسی طرح کا ہے جس طرح امام ابو حنیفہ کو مرجیہ میں سے کہا جاتا ہے حالانکہ آپ ارجاء سے (جس سے اعمال بیکار سمجھے جائیں) بمراحل بعید ہیں۔ چنانچہ ابن حجر ہیثمی مکیؒ "الخیرات الحسان" میں فرماتے ہیں۔

اولانه لما قال الايمان لا يزيد ولا ينقص ظن به الارجاء بتاخير العمل عن الايمان وليس كذلك اذ عرف منه المبالغة في العمل والاجتهاد فيه واما ثالثا قال ابن عبدالبر كان ابو حنيفة يحسد و ينسب اليه ماليس فيه و يختلق عليه مالا يليق به[2]

چونکہ امام صاحب کا قول ہے کہ ایمان نہ زیادہ ہوتا ہے نہ کم ہوتا ہے۔ اس پر کسی کو ارجاء بمعنی عمل کے ایمان سے موخر ہونے کا ظن ہو گیا اور یہ بات اس طرح نہیں کیونکہ آپ کا عمل میں مبالغہ اور کوشش مشہور و معروف ہے

[1] تہذیب التہذیب جلد نہم ص ۴۱، ۴۲۔

[2] الخیرات الحسان ص ۶۷۔

اور تیسری وجہ یہ کہ حافظ ابن عبدالبر نے کہا کہ امام ابو حنیفہؒ کا حسد کیا جاتا تھا-اور آپ کی طرف وہ وہ باتیں نسبت کی جاتی تھیں جو آپ میں تھیں اور آپ کو وہ وہ بہتان لگائے جاتے تھے جو آپ (کی شان) کے لائق نہ تھے-

نیز حافظ صاحب فرماتے ہیں-

قال یعقوب وسالت ابن المدینی حدیث محمد بن اسحق عندك فقال صحیح قلت له فكلام مالك فیه قال مالك لم یجالسه ولم یعرفه (تهذیب التهذیب جلد نهم صفحه ٤٢)

"یعقوب (محدث) کہتے ہیں کہ میں نے امام علی بن مدینی (استاد امام بخاری) سے پوچھا کہ آپ کے نزدیک محمد بن اسحٰق کی حدیث کیسی ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ صحیح ہوتی ہے میں نے کہا کہ امام مالکؒ کا جو قول ان کے متعلق ہے؟ جواب دیا کہ امام مالکؒ نے ان کی مجالست نہیں کی اس لئے ان کو نہیں پہچانا-"

دوم یہ کہ رئیس الحنفیہ شیخ ابن ہمامؒ جو متاخرین حنفیہ میں سے مرتبہ اجتہاد تک پہنچے ہیں فتح القدیر شرح ہدایہ میں محمد بن اسحاق کی بغائب تعریف و توثیق کرتے ہیں-پس حضرات حنفیہ کو ان کی نسبت کوئی کلام نہیں کرنا چاہئے-چنانچہ لکھتے ہیں-

هذا ان صح الحدیث بتوثیق ابن اسحق وهو الحق الابلج و ما نقل من كلام مالك فیه لا یثبت ولو صح لم یقبله اهل العلم كیف و قال شعبة فیه هو امیر المومنین فی الحدیث و روی عنه مثل الثوری و ابن ادریس و حماد بن زید و یزید بن زریع و ابن علیة و عبدالوارث و ابن المبارك و احتمله احمد و ابن معین و عامة اهل الحدیث غفرالله لهم وقد اطال البخاری فی توثیقه فی كتاب القراة خلف الامام و ذكره ابن حبان فی الثقات و ان مالكا رجع عن الكلام فی ابن اسحق و اصطلح معه و بعث الیه هدیة (فتح القدیر جلد اول مطبوعه نولكشور صفحه ٩٠)

یہ بات تو ہے۔اگر یہ حدیث محمد ابن اسحاق کی توثیق سے صحیح طور پر ثابت ہو جائے اور یہی چمکتا ہوا حق ہے۔اور جو کچھ اس کے متعلق امام مالکؒ سے منقول ہے وہ ثابت نہیں اور اگر صحیح بھی تو اہل علم نے اسے قبول نہیں کیا اور کیونکر قبول کریں۔جب امام شعبہ نے ان کے متعلق کہا ہے کہ وہ حدیث میں امیر المومنین ہیں اور ان سے (بڑے بڑے ائمہ نے) مثل سفیان ثوری و ابن ادریس (امام شافعیؒ) اور حماد بن یزید اور یزید بن زریع اور اسماعیل بن علیہ اور عبد الحارث اور عبداللہ بن مبارک نے روایت کیا اور امام احمد بن حنبل اور امام یحیی بن معین اور عام اہل حدیث نے ان کو معتبر جانا۔اور امام بخاری نے ان کی توثیق میں کتاب القراۃ خلف الامام میں بہت لمبا بیان لکھا ہے۔اور امام ابن حبان نے ان کو ثقات میں گنا ہے۔اور یہ بھی کہ امام مالکؒ نے اس سے رجوع کیا۔اور ان سے صلح کرلی اور ان کو ہدیہ بھی بھیجا۔

(۴) معمر بن راشد یمنیؒ: یمن میں سب سے پہلے مصنف حدیث امام معمر بن راشد ہیں۔یہ بھی امام زہریؒ کے شاگرد ہیں۔امام یحیٰی بن معین[1] فرماتے ہیں کہ معمر ان لوگوں سے ہیں جو امام زہریؒ سے روایت کرنے میں تمام لوگوں سے پختہ اور ضابط ہیں۔اور امام احمدؒ کا قول ہے کہ معمر کو جس کسی کے ساتھ ملایا جائے معمر اس سے برتر ہوں گے۔ان کا حافظہ نہایت قوی تھا۔چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ جب میں حضرت قتادہؒ (تابعی) سے حدیث سنا کرتا تھا۔اس وقت میری عمر چودہ برس کی تھی۔جو کچھ میں نے اس وقت سنا تھا وہ سب میرے سینے پر لکھا ہوا ہے۔ابن جریجؒ (جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے) ان کا قول

---

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد اول صفحہ ۱۷۱، ۱۷۲ امام ذہبیؒ تذکرہ میں عبد الرزاق بن زیاد سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے حضرت معمرؒ سے پوچھا آپ نے امام زہریؒ سے (حدیث شریف) کس طرح سماعت کی یعنی آپ یمنی ہیں اور وہ مدنی ہیں کیسے اتفاق ہوا کہ آپ مدینہ شریف میں پہنچے آپ نے فرمایا میں قوم طاحیہ کا غلام تھا۔انہوں نے مجھے بزازی بیچنے کے لئے بھیجا تو میں مدینہ شریف میں آیا۔وہاں میں نے دیکھا کہ بہت لوگ ایک بزرگ کے سامنے اپنے اپنے معلومات پیش کر رہے ہیں میں بھی ان میں شامل ہو کر اپنے معلومات پیش کرنے لگا۔۱۲ الحضا (تذکرہ جلد اول صفحہ ۱۷۲)

تھا کہ معمر (کی مجلس) کو لازم پکڑو کیونکہ اس کے زمانے میں اس سے زیادہ علم والا کوئی نہیں رہا۔ امام معمر ۱۵۳ھ میں فوت ہوئے۔[1]

(۵) امام اوزاعیؒ: شام میں سب سے پہلے امام اوزاعیؒ[2] نے تدوین حدیث کی طرح ڈالی۔ ان کا نام عبدالرحمٰن تھا۔ ۸۸ھ میں پیدا ہوئے۔ امام عطاء بن ابی رباحؒ اور امام زہریؒ وغیرہما سے حدیث روایت کی اور ان سے بڑے بڑے ائمہ حدیث نے علم حدیث حاصل کیا۔ مثلاً امام شعبہؒ اور امام عبداللہ بن مبارک وغیرہما۔

آپ کا آبائی وطن ہندوستان ہے۔ پیدائش بعلبک (شام) میں ہوئی۔ اخیر عمر میں بیروت میں جابسے اور وہیں ۱۵۷ھ میں فوت ہوئے رحمہ اللہ۔

آپ بلانزاع اپنے وقت کے خصوصاً علاقہ شام کے امام تھے۔ حالت یتیمی میں ماں کی گود میں پرورش پائی باوجود اس بے مائگی کے متانت اور تادب میں ایسا کمال حاصل کیا کہ ولید بن مرثد کہتے ہیں۔ اگر بادشاہ بھی اپنی اولاد کو ایسے آداب سکھلانا چاہیں تو نہ سکھلا سکیں۔ سچ ہے ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

آپ کا بیان نہایت فصیح و موثر تھا۔ بہت ہی عقیل و وجیہ و صاحب وقار تھے۔ حافظ ذہبیؒ کہتے ہیں "لائق خلافت" تھے۔

اتباع سنت کے بڑے پابند تھے۔ عامر بن یساف کہتے ہیں میں نے آپ کو فرماتے سنا کہ جب تم کو رسول اللہ ﷺ کی حدیث مل جائے تو پھر کسی دوسرے کے قول کو نہ لو کیونکہ آپ (ﷺ) اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبلغ ہیں۔[3]

---

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد اول صفحہ ۱۷۱، ۱۷۲۔

[2] یہ وہی امام اوزاعیؒ ہیں جن کی نسبت ابن ہمامؒ وغیرہ حنفی علماء نے ذکر کیا کہ ان کی امام ابو حنیفہؒ سے مسئلہ رفعیدین میں گفتگو ہوئی۔ خاکسار کو اس واقعہ کی تصحیح میں تامل ہے۔

[3] مولانا خرم علی صاحب مرحوم نے اسی کو نظم میں ادا کیا ہے ؎

ہوتے ہوئے مصطفیٰ کی گفتار   مت دیکھ کسی کا قول و کردار

حافظ ذہبیؒ کہتے ہیں کہ اہل شام اور اہل اندلس (سپین) بہت مدت تک امام اوزاعیؒ کے مذہب پر رہے۔ پھر ان کے مذہب جاننے والے نہ رہے اور آج ان کے مذہب (اجتہادات) میں سے صرف اتنا ہی کچھ باقی ہے جو کتب خلافیات میں پایا جاتا ہے۔

(۶) سعید بن ابی عروبہ بصریؒ: بصرہ میں سب سے پہلے سعید بن ابی عروبہ نے تدوین حدیث کی۔ حضرت خواجہ حسن بصریؒ اور امام محمدؒ بن سیرین وغیرہما جیسے بزرگ تابعیوں سے حدیث روایت کی۔ اسمٰعیل بن علیہ اور محمد بن جعفر غندر اور بشر بن مفضل وغیرہم جیسے بزرگ راویان حدیث جن کی روایات سے صحیح بخاری اور صحیح مسلم بھری پڑی ہیں۔ سعید بن ابی عروبہ ہی کے شاگرد تھے۔

حافظ ذہبیؒ کہتے ہیں هو اول من صنف الابواب بالبصرة[1] یعنی یہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے بصرہ میں تدوین حدیث کی طرح ڈالی۔ حافظ ابن حجرؒ نے ان کو چھٹے طبقہ میں رکھا ہے اور ان کی وفات ۱۵۷ھ میں ذکر کی ہے۔

(۷) حماد بن سلمہؒ: اسی زمانہ میں بصرہ ہی میں حماد بن سلمہؒ بھی تھے۔ حافظ ذہبیؒ ان کے ترجمہ میں فرماتے ہیں۔

> هو اول من صنف التصانيف مع ابن ابی عروبة و كان بارعا فی العربية فقيها فصيحا مفوها صاحب سنة[2]
>
> "یہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے سعید بن ابی عروبہ کے ساتھ تصانیف لکھیں۔ عربیت میں بہت لائق و فائق تھے۔ فقیہ، خوشگو اور صاحب تقریر تھے (اور سب سے بڑھ کر یہ کہ) سنت کے (بہت) پابند تھے۔"

آپ کا قول ہے من طلب الحديث لغير الله مكر به[3] یعنی جس نے اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے سوا (کسی اور غرض کیلئے) علم حدیث کی تحصیل (میں کوشش) کی

---

[1] تذکرہ جلد اول ص ۱۹۰

[2، 3] تذکرہ جلد اول ص ۱۹۰ طبع ثانی

اس کو دھوکا لگا۔

امام احمدؒ کا قول ہے اذا رایت الرجل ینال من حماد بن ابی سلمة فاتهمه علی الاسلام[1] یعنی جب تو کسی شخص کو دیکھے کہ وہ حماد بن سلمہ کی برائی بیان کرتا ہے تو اس کے مسلمان ہونے میں شک کر۔

امام حمادؒ نے اپنے ماموں حمید طویل اور ابن ابی ملیکہ اور قتادہ وغیرہم تابعین سے حدیث روایت کی۔ اور پھر ان سے امام عبداللہ بن مبارکؒ اور یحییٰ بن سعید قطان اور محمد بن مسلمہ قعنبی جیسے بزرگ ائمہ حدیث نے یہ مبارک علم سیکھا۔

آپ قریبا اسی سال کی عمر میں عیدالاضحیٰ کے بعد ۱۶۷ھ میں نماز کی حالت میں فوت ہوئے۔ رحمه الله وایانا۔؎

نکل جائے دم تیرے قدموں (یعنی سجدے میں) کے نیچے
یہی دل کی حسرت یہی آرزو ہے

(۸) موسیٰ بن عقبہ :۔ مدینہ طیبہ میں موسیٰ بن عقبہ اسدی تھے۔ آپ بلا مدافعت فن مغازی کے امام تھے۔ سب سے پہلے آپ ہی نے مغازی میں کتاب لکھی۔ مغازی فن حدیث کی ایک شاخ ہے۔

حضرت سالم بن عبداللہ بن عمرؓ اور عروہ بن زبیرؓ جیسے بزرگ تابعین سے روایت کرتے ہیں۔

اور پھر ان سے ابن جریج مکیؒ، امام مالکؒ، امام سفیان بن عیینہؒ اور امام عبداللہ بن مبارکؒ جیسے عالی قدر ائمہ حدیث نے روایت کی۔

امام احمدؒ کہا کرتے تھے علیکم بمغازی موسیٰ بن عقبة[2] یعنی تم موسیٰ بن عقبہ کی کتاب "المغازی" کو لازم پکڑو۔

حافظ ابن حجرؒ ان کی کتاب "المغازی" کو اصح الکتاب فی المغازی قرار دیتے ہیں[3]

[1،2] تذکرہ جلد اول صفحہ ۱۴۰ طبع ثانی

[3] فتح الباری کتاب المغازی غزوہ موتہ۔

اور اس کے حوالجات کثرت سے نقل کرتے ہیں- اسی طرح کشف الظنون میں حاجی خلیفہؒ نے کہا ومغازیہ اصح المغازی کذافی المقفی[1] یعنی ان کی کتاب المغازی سب مغازی سے زیادہ صحیح ہے-" امام موسیٰ بن عقبہ ۱۴۱ھ میں فوت ہوئے- حافظ ابن حجرؒ نے ان کو پانچویں طبقے میں رکھا ہے- جنہوں نے ایک یا دو صحابہؓ کو دیکھا لیکن ان سے ان کی سماعت حدیث ثابت نہیں ہوئی-

(۹) ربیع بن صبیحؒ :- بصرہ کے عابدوں میں سے تھے- باوجود اس کے غازی و مجاہد تھے- امام شافعیؒ کہتے ہیں کان الربیع ابن صبیح غزاء یعنی ربیع بن صبیح بڑے غازی تھے- چنانچہ ۱۶۰ھ میں غزوہ سندھ میں[2] علاقہ سندھ میں فوت ہوئے- ابن سعد نے (طبقات میں) کہا کہ علاقہ سندھ میں غزا کے لئے نکلے تو سفر سمندر ہی میں فوت ہو گئے اور جزیرہ میں دفن کئے گئے[3] رحمہ اللہ و ایانا-

آپ کو حضرت حسن بصریؒ اور حمید طویل اور ثابت بنانی و غیرہم تابعین سے روایت ہے- اور آپ سے حضرت سفیان ثوریؒ اور حضرت عبداللہ بن مبارکؒ اور عبدالرحمٰن بن مہدیؒ اور وکیع اور ابوداؤد طیالسیؒ وغیرہم محدثین نے روایت کی-

حضرت ربیع فن حدیث کے حافظ نہ تھے- بلکہ محدثین کے نزدیک ان کی روایت قابل احتجاج بھی نہیں- لیکن ہم نے ان کو اول تو اوپر کی خصوصیت کے لحاظ سے یہاں درج کیا ہے- دیگر اس لئے کہ اہل بصرہ میں سے یہ پہلے ہیں جنہوں نے تدوین حدیث کی طرح ڈالی- چنانچہ حافظ صاحب تہذیب التہذیب میں فرماتے ہیں-

وقال ابن حبان کان من عباد اهل البصرة و زهاد هم و کان یشبه بیة باللیل ببیت النحل من کثرة التهجد الا ان الحدیث لم یکن

---

[1] کشف الظنون باب المیم عنوان المغازی والسیر جلد دوم ص ۴۷۱-

[2] سنن نسائی میں حضرت ابوہریرہؓ سے روائت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میری امت کے دو گروہوں کو اللہ تعالیٰ نے دوزخ سے آزادی دے دی ہے- ایک وہ گروہ جو (ملک) ہند میں غزا کرے گا اور دوسرا وہ جو (آخری زمانہ میں) عیسیٰ بن مریم کے ساتھ ہوگا-

[3] تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۲۴۸-

من صناعته فکان یهم فیما یروی کثیرا حتی وقع فی حدیثه المناکیر من حیث لا یشعر لا یعجبنی الاحتجاج به اذا افرد و ذکرا الرامهرمزی فی الفاصل انه اول من صنف بالبصرة (جلد ۳ صفحہ ۲۴۸)

ابن حبان کہتے ہیں۔ ربیع بصرہ کے عابدوں اور زاہدوں میں سے تھے اور رات کے وقت آپ کا گھر کثرت تہجد کی وجہ سے شہد کی مکھی کے گھر کی طرح ہوتا تھا۔ ہاں علم حدیث آپ کی صناعت میں سے نہ تھا۔ اسی لئے ان کو روایات میں کثرت سے وہم پڑ جایا کرتا تھا۔ حتی کہ ان کی روایات میں منکر احادیث بھی داخل ہو جاتی تھیں۔ اور ان کو معلوم بھی نہ ہوتا تھا۔ جب یہ منفرد ہوں تو مجھے ان سے احتجاج کرنا پسند نہیں اور رامہر مزیؒ (مصنف) نے اپنی کتاب فاصل میں ذکر کیا کہ یہ بصرہ میں پہلے شخص ہیں جنہوں نے تصنیف (حدیث) شروع کی[1]

(۱۰) امام مالکؒ بن انس (امام دار الہجرۃ): ۔ اب ہم اپنی تاریخ میں اس ممتاز ہستی کے بیان پر آپہنچے ہیں جن کی تصنیف آج تک زندہ اور علماء و طلباء حدیث کے ہاتھوں میں متداول ہے۔ اور اپنے بعد کی تصانیف کے لئے بمنزلہ ماں کے سمجھی جاتی ہے۔

وہ اپنے زمانہ تصنیف سے آج تک یعنی بارہ سو سال تک اسلامی دنیا کے ہر قطر میں برابر شہرت و قبولیت اور اعتبار و فضیلت کے ساتھ چلی آئی ہے اس سے ہماری مراد موطا امام مالک ہے[2]

---

[1] گویا بصرہ کے "پہلے مصنف" تین بزرگ ہیں سعید' حماد اور ربیع رحمہم اللہ۔

[2] امام مالکؒ کی جلالت قدر اور عظمت شان جو خاکسار ہیچمدان کے دل میں ہے اس کے لحاظ سے اور جس صفائی اور ثقاہت کے ساتھ آپ کی زندگی کے حالات اور آپ کے علمی کمالات و خدمات معلوم ہو چکے ہیں۔ اس کے رو سے بحر طبیعت میں موجیں اٹھتی تھیں کہ آپ کے حالات خوب سیر دل ہو کر لکھوں۔ لیکن موضوع باب کو ملحوظ رکھ کر طوالت سے بچنا چاہتا تھا۔ مگر انتخاب میں دقت واقع ہوتی تھی کہ کیا لکھوں اور کیا نہ لکھوں کیونکہ ہر امر جزوی کی نسبت خیال آتا تھا کہ اس کی یہ ضرورت ہے اور اس کا یہ فائدہ ہے۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ میں شدت اشتیاق اور کثرت

امام مالک کا پایہ اس قدر بلند ہے کہ مجھ ایسے نا قابل کا آپ کی تعریف میں قلم اٹھانا ایک قسم کی جرات اور ترک ادب ہے- مولانا عبدالحیٰ صاحب مرحوم لکھنوی تعلیق ممجد میں فرماتے ہیں-

الفائدة الثانيه في ترجمة الامام مالك و ما ادراك ما مالك امام الائمه ومالك الازمة راس اجلة دارالهجرة قدوة علماء المدينة الطيبة يعجز اللسان عن ذكر اوصافه الجليلة و يقصر الانسان عن ذكر محاسنه الحميدة وقد اطنب المور خون في توار يخهم والمحد ثون في تواليفهم في ذكر ترجمته و ثنائه و صنف جمع منهم رسائل مستقلة في ذكر حالاته الخ (صفحه ۱۳)

امام مالکؒ کی بابت تجھے کیا معلوم (کہ وہ کیا ہیں؟ اور ان کا کیا پایہ ہے؟) وہ اماموں کے امام ہیں اور (علم کی) باگ کے مالک- بزرگان دارالہجرۃ کے سر (تاج) ہیں اور علماء مدینہ طیبہ کے پیشوا- آپ کے اوصاف جمیلہ کے ذکر سے زبان عاجز ہے اور آپ کے محاسن حمیدہ کے بیان سے انسان قاصر- مورخین نے اپنی تواریخ میں اور محدثین نے اپنی تصانیف میں آپ کا ذکر اور ثنا بہت لمبا بیان کیا ہے اور ان میں سے ایک جماعت نے آپ کے حالات

گذشتہ سے پیوستہ

معلومات- اور عظمت شان سے محو حیرت ہو گیا اور کئی روز تک اسی حالت میں پڑا رہا- طبیعت نہ تو کوئی فیصلہ کر سکی اور نہ کوئی راہ پا سکی- آخر کئی روز کے بعد یہ خیال جما کہ اس امام ہمام عالی مقام کے حالات کی تفصیل سے اتر کر اختصار میں پڑنے کی نسبت یہ بہتر ہے کہ آپ کی تعریف و توصیف سے اپنا عجز ظاہر کر دوں-

اس خیال کو رکھ کر پھر دوبارہ کتابوں کا مطالعہ شروع کیا کہ اگر مجھ سے پیشتر کسی بزرگ نے اس طریق پر آپ کی تعریف کی ہو- تو اس کا نقل کر دینا اپنے الفاظ عجز کی نسبت زیادہ موثر ہو گا- الحمدللہ میری پڑتال و ورق گردانی کی محنت ٹھکانے لگی' اور گوہر مقصود ہاتھ آ گیا- مولانا ابوالحسنات محمد عبدالحیٰ صاحب لکھنوی رحمتہ اللہ علیہ کی عبارت جو متن میں نقل کی گئی احب الصالحين ولست منهم لعل الله يرزقني صلاحا- اے اللہ تعالیٰ! امام مالکؒ کو ہماری طرف سے اور تمام محدثین کی طرف سے اتنی جزائیں عطا کر کہ میزان میں زیادتی کی گنجائش باقی نہ رہے-

میں مستقل کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔"

(۲) اسی طرح امام عبدالرحمٰن بن علی الشیبانی المتوفی ۹۴۴ھ تیسیر الوصول میں فرماتے ہیں۔

هو امام الحجاز بل امام الناس في الفقه و الحديث و كفاه فخرا ان الشافعي رحمه الله من اصحابه (صفحہ ۷)

آپ فقہ اور حدیث میں حجاز کے بلکہ تمام (جہان کے) لوگوں کے امام ہیں۔ اور آپ کے فخر کے لئے یہ کافی ہے۔ کہ امام شافعیؒ آپ کے (ارشد) شاگردوں میں سے ہیں۔

(۳) امام شافعیؒ کی شخصیت امامت حدیث و فقہ میں محتاج بیان نہیں۔ آپ اپنے استاد بزرگ امام مالکؒ کی شان میں فرماتے ہیں۔

اذا ذكر العلماء فمالك النجم و ما احد امن علي في علم الله من مالك رحمة الله عليه[1]

جب علماء کا ذکر ہو تو امام مالک (ان میں) روشن ستارہ ہیں اور مجھ پر علم الٰہی میں امام مالکؒ سے بڑھ کر کسی کا احسان نہیں ہے۔

(۴) اسی طرح امام یحییٰ بن معینؒ جو جرح و تعدیل رجال کے مسلم امام اور مشہور نقاد ہیں اور امام احمدؒ اور امام بخاریؒ و امام مسلمؒ وغیرہم اجلہ محدثین کے استاد ہیں کہتے ہیں۔

كان مالك من حجج الله على خلقه[2]

یعنی امام مالکؒ خدا کی خلقت پر خدا کی ایک حجت تھے۔

(۵) اسی طرح حضرت شاہ ولی اللہ صاحب "مصفی" میں فرماتے ہیں۔

اہل نقل اتفاق دارند بر آنکہ چوں حدیث براویت او ثابت شد بدرجہ اعلیٰ صحت رسید (صفحہ ۷)

علماء حدیث کا اس امر پر اتفاق ہے کہ جب کوئی حدیث آپ (امام مالک) کی

[1،2] مصفی۔ ص ۳

روایت سے ثابت ہو گئی- تو بس صحت کے نہایت بلند کنگرے پر پہنچ گئی-

(۲) قاضی ابن خلکان نے آپ کے حالات میں آپ کا قول نقل کیا ہے-

وقال مالك قل رجل كنت اتعلم منه مامات حتي يجيئني و يستفدني (جلد اول صفحه ٤٣٩)

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ کم ہو گا جس کسی سے میں نے کچھ سیکھا ہو اور وہ فوت ہو گیا ہو- حتی کہ میرے پاس آوے اور مجھ سے کچھ دریافت کرے-

ولادت :-

آپ بعہد بنی امیہ خلیفہ ولید بن عبدالملک کے زمانہ میں ۹۳ھ میں مدینتہ الرسول ﷺ میں پیدا ہوئے- اس سے پہلے سنہ میں مسلمانوں نے سپین فتح کیا تھا[1]

نسب :-

آپ عرب کے معزز قبیلہ ذی اصبح میں سے ابو عامر کی اولاد سے ہیں- سلسلہ نسب یوں ہے- مالک بن انس بن مالک بن ابی عامرؓ-

(۱) ابو عامر کی نسبت حضرت شاہ صاحب نے مصفی میں لکھا ہے کہ وہ صحابی ہیں- اور سوائے غزوہ بدر کے سب غزوات میں آنحضرت ﷺ کے فدائیوں میں شامل ہو کر آپ کے ساتھ رہے[2]

---

[1] فتوح البلدان بلاذری-

[2] شاہ صاحب نے تو ابو عامر کو صحابہ میں شمار کیا ہے- لیکن حافظ ذہبیؒ تجرید اسماء الصحابہ میں لکھتے ہیں کان في زمن النبي صلى الله عليه و سلم و لم ار احد اذكره في الصحابة یعنی ابو عامر (مذکور) نبی ﷺ کے زمانہ میں تھا- (اس کے بعد لکھتے ہیں) اور میں نے کسی (مصنف) کو نہیں دیکھا کہ اس نے ان کو صحابہ میں ذکر کیا ہو- (جلد دوم صفحہ ۱۹۳ نمبر شمار ۲۱۱۱) حافظ ابن حجرؒ نے بھی اصابہ میں حافظ ذہبی کا حوالہ بتقدیم و تاخیر عبارت ذکر کر کے یونہی بغیر تردید یا تائید کے چھوڑ دیا ہے (باب الکنی- قسم ثالث- حرف عین- نمبر شمار ۸۲۸ جلد ہفتم مطبوعہ کلکتہ صفحہ ۲۶۹)

حضرت شاہ صاحب نے تو اپنا ماخذ ذکر نہیں کیا- لیکن زرقانی شرح موطا نے لکھا ہے- کہ قاضی عیاض نے قاضی بکر بن العلاء القیشری سے اسی طرح نقل کیا ہے (کہ وہ صحابی ہے) غالباً حضرت شاہ صاحب کا ماخذ قاضی عیاض کی تحریر ہو گی- حافظ ابن عبدالبر نے بھی استیعاب میں اس ابو عامر کا مطلقاً ذکر نہیں کیا- حالانکہ تین اور شخصوں کا ذکر کیا ہے- جن کا نام ابو عامر تھا- واللہ اعلم

(۲) امام صاحب کے جد امجد کہ انؒ کا نام بھی مالک ہے۔ کبار تابعین اور ان کے علماء سے ہیں۔ آپ کو حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ حضرت طلحہؓ حضرت عائشہؓ حضرت ابو ہریرہؓ حضرت حسانؓ وغیر ھم صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے روایت ہے اور پھر آپ سے آپ کے تینوں بیٹوں انس (والد امام مالکؒ) ابو سہیل نافع اور ربیع نے اور دیگر بہت لوگوں نے روایت کی۔ امام نسائیؒ وغیرہ نے آپ کو ثقہ کہا۔ ۷۴ھ میں فوت ہوئے۔

امام بخاریؒ نے بھی تاریخ صغیر میں آپ کو ان لوگوں میں شمار کیا ہے جو ۷۰ھ اور ۸۰ھ کے درمیان فوت ہوئے۔

آپ ان چار جانباز وفاداروں میں سے ہیں جو حضرت عثمانؓ کا جنازہ اٹھا کر قبرستان میں لے گئے تھے[۱] حالانکہ وہ وقت نہایت خوف اور بھاری فتنہ کا تھا اور باغیوں کے ڈر سے کسی کو اٹھانے کی جرات نہ پڑتی تھی۔

(۳) امام صاحب کا چچا ابو سہیل بھی ثقات تابعین سے ہے۔ امام صاحبؒ نے ان سے بھی بہت سے احادیث روایت کی ہیں۔

ان حالات سے معلوم ہو گیا کہ امام مالکؒ بزرگوں کی اولاد اور خاندان اہل علم سے ہیں۔

حلیہ :۔

آپ دراز قامت۔ بزرگ سر۔ اصلع[۲] (جس کے تالو پر بال نہ ہوں) نہایت سفید رنگ مائل بسرخی یعنی خوب گوری رنگت کے (حسین ماہ جبین) تھے۔ نہایت صاحب وجاہت و باوقار تھے۔ مجلس میں حاضرین آپ کے رعب کی وجہ سے زیادہ گفتگو نہیں کر سکتے تھے۔

---

[۱] تاریخ طبری۔ ذکر حضرت عثمانؓ۔

[۲] حضرت عمر کا سر مبارک بھی ایسا ہی تھا اور الحمد للہ کہ ہمارے سردار اہل حدیث حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب مدظلہ کا سر مبارک بھی ایسا ہی ہے اور بزرگ بھی ہے۔ علم قیافہ میں ایسا سر بزرگی اور عقلمندی کی دلیل و علامت ہوتا ہے۔

تحصیل علم :-

آپ کو تحصیل علم کے لئے مدینہ طیبہ سے باہر جانے کی ضرورت نہیں پڑی- کیونکہ مدینہ شریف اس وقت علم کا گہوارہ تھا- دس سال تک مہبط و منزل وحی کا مسکن رہنے کے بعد چوتھائی صدی تک خلافت راشدہ کا گھر ہونے کی وجہ سے ممالک اسلامیہ کا مرکز اور عالم اسلامی کا مرجع رہ چکا تھا- امام مالکؒ کی صغر سنی میں خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے علم حدیث کی تدریس کی مجالس اس میں قائم ہو چکی تھیں اور طریقہ تعلیم کا باقاعدہ ڈھنگ پڑ چکا تھا- "فقہاء سبعہ مدینہ" کے فیوض کی نہریں ابھی تک جاری تھیں- بڑے بڑے نامی ائمہ حدیث و فقہ موجود تھے- جن کے علوم کے وارث اکیلے امام مالکؒ ہوئے- حضرت شاہ صاحبؒ مصفی میں فرماتے ہیں-

وبود مالک درزا قامت- بزرگ سر- موئے سرنداشت بغایت سفید مائل بسرخی بود- سفید شده سر وریش او - واکثر اخذ حدیث اواز اہل مدینه است و علم رادست بدست ازیشان گرفت نخست علم فقه و فتاوی دواران میکرد بر حضرت عمرؓ ووے واسطه عقد بود دریں باب و بعد ازاں برفقہا صحابه مثل ابن عمرؓ و عائشهؓ و ابن عباسؓ و ابوہریره و انسؓ و جابرؓ دوران مے کرد و ایشاں مرکز دائره آمد ند و بعد ازیشاں این کاروبار برفقہا سبعة افتاد- مانند سعید بن مسیبؒ و عروه و سالم و قاسم- و بعد ازیشاں بر زہری و یحیی بن سعید وزید بن اسلم و ربیعه و ابن الزناد و نافع و بعد ازیشاں وارث ایشاں امام مالکؒ شدو حدیث و آثار ایشاں تدوین فرمود و آنچه از سینه بسینه منتقل مے شد دربطون قراطیس و دیعت نمود- و اہل آفاق از جمیع امصار بسوئے او متوجه شدند- چه درنقل حدیث- وچه درفتاوی و سرآمدبمه

شد دروقت خود- وشہرت عظیم یافت کہ ہیچ کس دراں شہرت و قبول نزدیک بادو مشابہ نبود- (صفحہ ۵'۶)

"امام مالکؒ دراز قد بزرگ سر تھے- تالو پر بال بھی نہ تھے- نہایت سفید رنگ مائل بسرخی تھے- سر اور داڑھی (کے بال) سفید تھے- علم حدیث زیادہ تر اہل مدینہ سے حاصل کیا- اور علم کو ان کے ہاتھوں ہاتھ لیا پہلے تو علم فقہ و فتاوی کا مدار حضرت عمرؓ پر تھا اور وہی اس تسبیح کے امام[1] تھے- اور آپ کے بعد اس کا دورہ دیگر فقہاء صحابہ مثلاً حضرت ابن عمرؓ حضرت عائشہؓ حضرت ابن عباسؓ حضرت ابوہریرہؓ حضرت انسؓ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہم پر ہونے لگا اور وہی اس دائرہ کے مرکز ٹھہرے- اور ان کے بعد یہ کاروبار فقہا سبعہ پر پڑا مانند سعید بن مسیبؒ اور عروہ بن زبیرؒ اور سالم بن عبداللہ بن عمر- اور قاسم بن محمد بن ابی بکر صدیقؓ کے- اور ان کے بعد امام زہری اور یحیٰی بن سعید انصاری اور زید بن اسلم اور ربیعۃ الرائی اور ابن الزناد اور نافع پر (پڑا) اور ان سب کے بعد ان سب کے وارث امام مالکؒ ہوئے جنہوں نے ان کی احادیث و آثار کو مدون کیا اور جو کچھ (استادوں کے) سینے سے (شاگردوں کے) سینے میں منتقل ہوتا چلا آیا تھا اسے کاغذوں کے پیٹ کے سپرد کیا یعنی لکھا اور سب شہروں کی ساری اسلامی دنیا آپ کی طرف متوجہ ہو گئی- کیا روایت حدیث میں اور کیا فتاوی میں اور آپ اپنے زمانہ میں سب کے سر تاج ہو گئے اور ایسی شہرت پائی کہ دوسرے شخص نے ویسی شہرت اور قبولیت یا اس کے کچھ قریب بھی نہ پائی-"

قوت حافظہ :- امام مالکؒ کا حافظہ نہایت قوی تھا- چنانچہ آپ کے شاگرد رشید امام معن بن عیسی جن کو آپ کی اخیر عمر تک خدمت و حضوری کا شرف حاصل رہا کہتے ہیں-

---

[1] واسطۃ العقد ہار کے اس دانے کو کہتے ہیں جس میں سے لڑی کے دونوں سرے ملا کر نکالے اور جوڑے جاتے ہیں- جیسے تسبیح کے سرے پر امام اسی لحاظ سے اس کا ترجمہ تسبیح کا امام کیا گیا-

كان مالك يتحفظ من الياء و التاء في حديث رسول الله صلى الله عليه و سلم (تذکرہ جلد اول صفحہ ۱۹۱)

امام مالکؒ رسول اللہ ﷺ کی حدیث کی ی اور ت (کے فرق) تک خوب یاد رکھتے تھے۔

آپ کے استاد، امام زہریؒ نے ایک مجلس میں چالیس سے کچھ اوپر حدیثیں بیان کیں۔ امام ربیعہ نے دوسرے دن آپ سے ذکر کیا کہ یہاں (مدینہ میں) ایک ہے جو وہ (تمام حدیثیں جو آپ نے کل بیان کی تھیں (پوری) سنادے۔ امام زہری نے دریافت کیا کہ وہ کون ہے؟ امام ربیعہ نے کہا ابن ابی عامر (یعنی امام مالکؒ) امام زہری نے کہا اسے لے آؤ۔ امام مالکؒ نے وہ چالیس حدیثیں سنادیں۔ تو امام زہری کہنے لگے کہ میں نہیں سمجھتا تھا کہ کوئی شخص میرے سوا ایسا یاد رکھنے والا باقی ہوگا[1]

انتخاب مشائخ میں احتیاط :۔ اصول حدیث میں دو اصطلاحی لفظ ہیں تحمل اور ادا "تحمل" شیخ سے حدیث کے سیکھنے کو اور ادا اپنے شاگردوں میں بیان کرنے کو کہتے ہیں۔ عام طور پر محدثین ضعیف و قوی ہر دو طرح کے راویوں سے روایت کرتے رہے ہیں (اور ایسے راوی تھوڑے ہیں کہ ان سے تحمل ترک کیا گیا ہو) پھر روایت یا تصنیف میں کسی نے تو صحاح روایات کو چھانٹ کر لکھا مثلاً حضرات شیخینؒ اور کسی نے ضعیف کا ضعف ذکر کر دیا مثلاً امام ترمذیؒ اور کسی نے قوی و ضعیف کو ملا کر لکھا اور تنقید کسی اور کے لئے چھوڑ دی مثلاً امام ابن ماجہؒ۔

لیکن امام مالکؒ کی شان ان سب سے نرالی ہے۔ آپ کو اداء یا روایت کے وقت چھانٹنے اور ضعیف کا ضعف ذکر کرنے کی ضرورت نہ پڑتی تھی۔ کیونکہ آپ تحمل کے وقت ہی اس بات کی رعایت و احتیاط رکھ لیتے تھے کہ صرف ان مشائخ سے اخذ حدیث کریں جن کی ثقاہت و عدالت اور اتقان و فقاہت میں کلام نہ ہو چنانچہ محدث ابن حبانؒ "اپنی کتاب الثقات" میں لکھتے ہیں۔

---

[1] تہذیب التہذیب ترجمہ امام مالکؒ۔

(۱) امام مالکؒ فقہاء (ائمہ مجتہدین) میں سے پہلے شخص ہیں، جنہوں نے مدینہ (طیبہ) میں رجال (راویان حدیث) کی تنقید کی، آپ صرف وہی روایت کرتے تھے جو صحیح ہو اور سوائے ثقہ روای کے کسی دیگر سے حدیث نہ لیتے تھے اور (پھر یہ کہ) وہ (ثقہ راوی) فقہ اور دین اور (علم) و فضل اور عبادت والا بھی ہو[۱] (انتہی مترجماً)

(۲) اور امام نسائی کا قول ہے کہ:

"میرے نزدیک تابعین کے بعد امام مالکؒ سے بڑھ کر صاحب (شرافت و نجابت اور صاحب (عظمت و) جلالت کوئی بھی نہیں۔ اور نہ کوئی ان سے بڑھ کر صاحب ثقاہت ہے اور نہ کوئی ان سے زیادہ (رسول اللہ ﷺ کی) حدیث پر صاحب (اعتبار و) امانت ہے اور نہ ضعیف راویوں سے روایت نہ کرنے میں ان سے کم روایت کرنے والا ہے۔ ہمیں (امام نسائی کو) معلوم نہیں ہوا کہ آپ نے بسوائے عبدالکریم بصری کے کسی متروک راوی سے حدیث حاصل کی ہو[۲]

(ب) تحمل روایت تو کیا آپ نااہل (جو روایت حدیث کے قابل نہ ہوں) کی مجالست بھی نہ کرتے تھے۔ چنانچہ آپ کے شاگرد قراد بن نوح کہتے ہیں۔

(۳) آپ نے کوئی امر ذکر کیا۔ اس پر کسی نے پوچھا۔ یہ بات آپ سے کس نے بیان کی آپ نے فرمایا ما کنا نجالس السفهاء یعنی "ہم نادانوں اور نااہلوں کی مجلس میں نہیں بیٹھا کرتے تھے۔" (اسعاف المبطا برجال المؤطا للسیوطی)

(۴) امام احمد بن حنبلؒ کے بیٹے عبداللہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد (بزرگوار) کو یہ بات کہتے سنا کہ دنیا میں علماء کے فضائل میں کوئی بات اس سے بڑھ کر نہیں کہ امام مالکؒ کہتے ہیں۔ انه ما جالس سفیها قط و لم یسلم من هذا احد غیر مالك یعنی میں نے کبھی کسی نادان (نااہل و غیر فقیہ) کی مجلس نہیں کی۔ اور اس سے سوائے امام مالکؒ کے کوئی نہیں بچا[۳]

---

[۱] تہذیب التہذیب جلد ۱۰ صفحہ ۹۔
[۲] تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص ۹۔
[۳] اسعاف المبطا برجال المؤطا للسیوطی۔

(۵) امام یحیٰ بن سعید القطان کہتے ہیں۔

امام مالکؒ کی روایت اس لئے مقبول ہے کہ آپ (قوی و ضعیف میں) تمیز کرتے تھے اور کثرت سے (کریدو) پڑتال کرتے اور جس میں کچھ لغزش پائی جائے اسے ترک کر دیتے تھے۔

(۶) امام شعبہ بن حجاج کہتے ہیں۔

امام مالکؒ ممیزین میں سے تھے۔ میں نے آپ کو کہتے سنا کہ ہر شخص اس لائق نہیں کہ اس کی روایت لکھی جائے اگرچہ ان میں ذاتی فضیلت کتنی ہی کیوں نہ ہو کیونکہ یہ رسول اللہ ﷺ کی اخبار (واحادیث) ہیں۔ پس صرف ان لوگوں سے لینی چاہئیں جو ان کے اہل ہوں۔

(۷) ابن واہب (آپ کے ایک شاگرد) کہتے ہیں کہ

امام مالکؒ سے کہا گیا کہ آپ نے اہل عراق سے کیوں روایت نہیں لی؟ آپ نے فرمایا میں ان کو دیکھا کہ یہاں (مدینہ میں) آتے ہیں تو وہ غیر ثقہ لوگوں سے (بھی) روایات اخذ کر لیتے ہیں۔ اس پر میں نے کہا اسی طرح وہ (عراقی) اپنے شہروں میں بھی غیر ثقہ راویوں سے روایات لے لیتے ہیں۔

اس قسم کی روایات بکثرت ہیں لیکن ہم بنظر اختصار اسی شمار پر بس کرتے ہیں۔ ان سب سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ امام مالکؒ ادائے حدیث تو کیا تحمل حدیث میں بھی نہایت احتیاط کرتے تھے۔ اسی لئے حضرت شاہ صاحب مصفیٰ میں فرماتے ہیں۔

> بالجملہ این چہار اما مانند کہ عالم را علم ایشان احاطہ کردہ است امام ابو حنیفہؒ و امام مالکؒ و امام شافعیؒ و امام احمدؒ این دو امام متاخر شاگرد امام مالک بودند و مستمندان از علم او۔ ودر عصر تا بعین نبودند مگر ابو حنیفہ۔ آں یک شخصے ست کہ رؤس محدثین مثل احمدؒ و بخاریؒ و مسلمؒ و ترمذیؒ و ابو داؤدؒ و نسائیؒ و ابن ماجہؒ و دارمیؒ یک حدیث

ازوے درکتا بہائے خود روایت نہ کردہ اند- و رسم روایت حدیث ازوے بطریق ثقات جاری نشدو آن دیگر شخصے است کہ اہل نقل اتفاق دارند کہ برآنکہ چون حدیث بروایت او ثابت شد بذر وہ اعلیٰ صحت رسید (صفحہ ۷۰٦)

"حاصل کلام یہ کہ یہ چار امام ہیں- جن کے علم نے دنیائے اسلام) کا احاطہ کیا ہے- امام ابو حنیفہؒ وامام مالکؒ اور امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ یہ دو پچھلے امام (یعنی امام شافعیؒ اور امام احمدؒ) امام مالکؒ کے شاگرد تھے[1] اور آپ کے علم سے حاجت پوری کرنے والے اور (ان میں سے) زمانہ تابعین میں سوائے امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کے کوئی نہ تھا- ان میں سے ایک (امام ابو حنیفہؒ) تو وہ شخص ہیں کہ ان سے سرداران محدثین مثل امام احمدؒ اور امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ اور امام ترمذیؒ اور امام ابو داؤدؒ اور امام نسائیؒ اور امام ابن ماجہؒ اور امام دارمیؒ نے ایک حدیث بھی اپنی کتابوں میں روایت نہیں کی اور ان (امام ابو حنیفہؒ) سے حدیث کی روایت کی رسم جاری نہ ہوئی- اور دوسرے (امام مالکؒ) وہ شخص ہیں کہ محدثین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جب کوئی حدیث ان کی روایت سے ثابت ہو گئی تو صحت کے سب سے بلند کنگرے پر پہنچ گئی-"

تصنیفات امام مالک (موطا) :- امام مالکؒ کی تصنیفات کئی ایک ہیں لیکن سب سے زیادہ مشہور ان کا "موطا" ہے- کسی تصنیف میں جس قدر وجوہ فضیلت ہو سکتے ہیں وہ سب مجموعی طور پر اس کتاب کو حاصل ہیں-

کسی کتاب کی فضیلت یا تو اس کے مصنف کی فضیلت کے لحاظ سے ہوتی ہے- یا التزام صحت کی جہت سے یا اولیت و تقدم کی نظر سے یا زمانہ تصنیف میں اس کی شہرت کی

---

[1] امام شافعیؒ تو امام مالکؒ کے بلاواسطہ کے شاگرد تھے- اور امام احمدؒ بالواسطہ کیونکہ امام احمدؒ، امام شافعیؒ سے فیض حاصل کرنے والے تھے- پس ہر دو امام مالکؒ کے شاگرد اور آپ سے فیض اٹھانے والے ہوئے-

وجہ سے' یا اس فن کے علماء کی قبولیت کے روسے۔ اور یہ سب جہتیں "موطا" کو حاصل ہیں۔

وجہ اول :۔ یعنی مصنف کی فضیلت اوپر گذر چکی۔ جس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

امر دوم :۔ یعنی التزام صحت اس کے لئے اوپر کا بیان جو "انتخاب مشائخ" کے متعلق لکھا گیا۔ وہ اسی نقطہ خیال سے لکھا گیا کہ امام مالکؒ نے اپنی کتاب "موطا" کو اوپر کی احتیاط سے حاصل کی ہوئی احادیث سے مرتب کیا۔ جن کی قبولیت میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ امام شافعیؒ فرماتے ہیں۔

ما علی ظهر الارض کتاب بعد کتاب الله اصح من کتاب مالك[1]

روئے زمین پر قرآن شریف کے بعد کوئی کتاب موطا امام مالکؒ سے زیادہ صحیح نہیں ہے۔

ف :۔ شاہ ولی اللہ صاحب (رحمتہ اللہ علیہ) نے مصفی میں التزام صحت موطا کے ذیل میں ان امور کا بھی ذکر کیا ہے۔ جن میں بعض دیگر مجتہدین کو امام مالکؒ سے قدرے اختلاف ہے۔ اس جگہ اس کی نقل کی ضرورت نہیں۔

ف :۔ امام مالکؒ نے اجلہ صحابہ مثلاً حضرت عبداللہ بن عمرؓ' حضرت عائشہؓ' حضرت ابو ہریرہؓ' حضرت انسؓ' حضرت جابرؓ' حضرت ابو سعید خدریؓ اور حضرت سہلؓ کی احادیث جن اسنادوں کے ساتھ "موطا" میں روایت کی ہیں۔ حضرت شاہ صاحب نے ان اسانید کا ذکر کر کے کہا ہے۔

"امام مالک باین اسانید قریب پانصد حدیث روایت کردہ است وآن احادیث اصح واقوی حدیث آنحضرت اند صلی اللہ علیہ وسلم در مشارق و مغارب زمین" (صفحہ ۱۵' ۱۶)

ان احادیث میں بوجہ قرب زمانہ و سکونت مدینہ طیبہ وسائط تھوڑے ہیں۔ کسی

---

[1] مصفی ص ۷ امام شافعی کی یہ رائے صحیح بخاری کی تصنیف سے پیشتر کی ہے۔

میں صحابی تک صرف ایک واسطہ ہے کسی میں دو۔ مثلاً حضرت ابن عمرؓ کی وہ روایات جن میں نافع یا عبداللہ بن دینار کا صرف ایک ایک واسطہ ہے۔ اسی طرح حضرت جابرؓ تک وہب بن کیسان کا ایک واسطہ ہے۔ اور حضرت عائشہؓ کی احادیث جن میں امام زہری اور امام قاسم[1] کے صرف دو دو واسطے ہیں۔ یہ قلت وسائط یا علو اسناد کسی دیگر امام کو جس کی تصنیف آج ہمارے ہاتھوں میں ہے حاصل نہیں ہوئی۔ امام ابوحنیفہؒ ہر چند کہ امام مالکؒ سے عمر میں تیرہ سال بڑے ہیں۔ لیکن ان کی اسناد میں صحابی تک زیادہ واسطے ہیں مثلاً حضرت عبداللہ بن عمر تک عن حماد عن موسیٰ بن مسلم عن مجاہد عن عبداللہ بن عمرؓ (کتاب الاثار۔ الصلوۃ فی السفر) تین واسطے ہیں۔

امام مالک کی "قلت وسائط" کے ساتھ "انتخاب مشائخ" میں احتیاط کو بھی ضم کیا جائے تو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی رائے کی صحت صاف طور پر معلوم ہو سکتی ہے کہ امام مالکؒ کی روایات اصح اور اقوی ہیں۔

امر سوم :۔ یعنی اولیت و تقدم اس میں بھی مؤطا اول نمبر پر ہے حافظ مغلطائی کا قول ہے۔

اول من صنف الصحیح مالك (مصفی صفحہ ۷)

یعنی سب سے اول جس نے حدیث کی تصنیف کی، وہ امام مالکؒ ہیں۔

خاکسار کہتا ہے کہ ہر چند کہ امام مالکؒ سے پیشتر بھی اور آپ کے زمانہ میں بھی کئی بزرگوں نے احادیث کتابی صورت میں جمع کیں، لیکن امام مالکؒ کے "مؤطا" میں خاص خصوصیتیں ہیں جن کی وجہ سے وہ اولیت کے رتبہ پر ہے۔ وہ یہ کہ امام مالکؒ نے اپنی کتاب کو فقہی ابواب کی ترتیب پر لکھا۔ جس سے وہ نصاب تعلیمی کے لائق ہوئی اور اس میں مسند احادیث میں سے صرف صحیح احادیث درج کیں جن میں کسی کو کاوش کرنے کی ضرورت نہ رہی۔

---

[1] یہ امام قاسم حضرت ابوبکر صدیق کے بیٹے محمد کے بیٹے تھے۔ مدینہ کے اجل علماء و فقہا سبعہ میں سے تھے۔

آپ سے پیشتر جو تصانیف ہوئیں - وہ اس طرز پر نہ تھیں - اور خالص صحاح کا مجموعہ تھیں اور نہ وہ درس تدریس کے لائق سمجھی گئیں - بلکہ صرف مصنف کی یادداشت سمجھی گئیں اور داخل تدریس نہ ہونے کی وجہ سے ان کا سلسلہ آگے کو نہ چلا - لیکن "مؤطا" کو اول تو خود امام مالکؒ نے اپنے درس حدیث میں رکھا - اور اس نظر سے یہ پہلی کتاب ہے جس کا قرآن کے بعد درس دیا گیا - اور امام مالکؒ کے شائق شاگردوں نے (جو وہ بھی امام فن ہوئے) امام مالک سے روایت کر کے دور دست بلاد میں اس کی اشاعت کی - جس سے اس کی شہرت تمام بلاد اسلامیہ میں ہو گئی اور لوگوں نے اسے نہایت شوق و محبت سے ہاتھوں ہاتھ لے لیا - امام مالکؒ کی دیکھا دیکھی آپ کے وقت میں جن لوگوں نے تصانیف لکھیں - وہ بھی آگے کو نہ چلیں چنانچہ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں -

وجماعت دیگر نیز بتصانیف پرداختند پس گفتہ شد بامام مالکؒ تو نفس خودرا در محنت انداختہ بودی بتصنیف ایں کتاب - وحالا مردماں امثال آں ساختند فرمود خواہید دانست کہ مقبول نہ خواہد شداز یں تصانیف مگر آنچہ باں وجہ اللہ را ارادہ کردہ باشند - پس بعد زمانے نام و نشان آں کتب شنیدہ نشد گویا درچاہ انداختہ شد آنہارا (مصفیٰ صفحہ ۱۰)

"دوسرے لوگوں نے بھی تصنیفات شروع کیں تو امام مالکؒ سے کہا گیا کہ آپ نے اپنے آپ کو اس کتاب (مؤطا) کی تصنیف سے (بہت) محنت میں ڈال رکھا تھا - مگر اب تو دوسرے لوگوں نے بھی اس کی مثل بنا ڈالی ہیں - (اس پر) آپ نے فرمایا' تم کو معلوم ہو جائے گا کہ ان تصانیف میں سے کوئی قبول نہ ہو گی مگر وہی جس سے اللہ تعالیٰ کی رضامندی چاہی گئی ہے - پس کچھ زمانہ کے بعد ان کتابوں کا نام و نشان بھی سنائی نہ دیا - گویا کہ ان سب کو کنوئیں میں ڈال دیا گیا -"

اس کے بعد حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں -

و مالک روزے از مطرف بن عبداللہ پر سید کہ مرد ماں چہ میگویند درمؤطا؟ گفت الناس رجلان محب مطری و حاسد مفتری مرد ماں دو قسم اند بعض دوست مبالغہ کنندہ است درثنا و بعض حسد کنندہ افتراء نمائندہ پس گفت مالک ان مدبک عمر فتری مایرید اللہ بہ اگر دراز کردہ شود در حق تو عمر را خواہی دید آنچہ ارادہ کردہ است خدا تعالی با او (صفحہ ۱۰)

"امام مالکؒ نے ایک روز (اپنے شاگرد) مطرف بن عبداللہ سے پوچھا کہ لوگ مؤطا کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ انہوں نے کہا لوگ دو قسم کے ہیں- بعض دوست ہیں جو صفت و ثنا میں مبالغہ کرتے ہیں- اور بعض حاسد ہیں جو افتراء باندھتے ہیں- اس پر آپ نے فرمایا (اے مطرف!) اگر تیری عمر (کچھ) دراز ہوئی تو تو دیکھ لے گا کہ اللہ تعالیٰ اس (کتاب) سے کیا ارادہ کرتا ہے-"

خاکسار کہتا ہے کہ اگرچہ امام مالکؒ نے اس پیشگوئی کی نسبت الہام کا دعویٰ نہیں کیا- لیکن صورت واقعہ نے بتادیا کہ یہ بات خود ستائی کے خیال اور ہوائے نفسانی سے نہیں نکلی بلکہ یہ ایک القائے ربانی تھا اور امام مالکؒ جیسے "صادق الاحوال" بزرگوں پر اللہ تعالیٰ کا ایسا فیض کچھ تعجب نہیں چنانچہ حدیث میں ہے- رب مدفوع بالابواب لو اقسم علی اللہ لابرہ (مشکوٰۃ صفحہ ۴۳۸)

غرض مؤطا کی اولیت ایک تو زمانہ کے لحاظ سے ہے- دیگر رتبہ کے لحاظ سے بھی ہے کہ ترتیب فقہی و انتخاب صحاح میں یہ کتاب اپنے بعد کے مصنفین کے لئے رہنما و پیشوا ٹھیری مابعد کی کتابوں میں سب سے افضل و اصح صحیحین ہیں- ان کا علو مرتبہ سب میں مسلم ہے- ان تینوں کتابوں کو مجتہدانہ و محدثانہ نظر سے مطالعہ کرنے والے کو یہ دونوں ترتیب و انتخاب میں مؤطا کے نقش قدم پر پائی جائیں گی- چنانچہ حضرت شاہ صاحب مصفی میں فرماتے ہیں-

و اما تلقی اصحاب کتب ستہ آنرا بقبول پس اظہر ازان ست کہ

گفتہ شود بخاری تا وقتیکہ از مالک متصل مرفوع یا بدعدول نمی کنداز وے بروایت غیروے- مگر آنکہ بشرط خود نیا بدپس شواہد می آرد برائے او- دربسیارے از مواضع آثار موطا را استشہادمی کند باشارات حدیث و ایما آت آں (صفحہ۹)

امر چہارم :- یعنی شہرت و قبولیت کے متعلق تو مؤطا کو ایک ایسی خصوصیت حاصل ہے- جو کسی دیگر کتاب کو نہیں ہو سکی- جس قدر حیثیات سے لوگوں کے طبقات کی تقسیم ہو سکتی ہے ان سب کے رو سے ہر طبقہ کی ایک خاصی جماعت نے مؤطا کو روایت کیا- اور اس کے لئے دور دست بلاد اسلامیہ سے سفر کر کے مدینہ طیبہ کی خاک پاک کو سرمہ چشم بنایا- حضرت شاہ صاحب مصفی میں فرماتے ہیں-

اما شہرت مؤطا پس از امام مالکؒ مؤطا راجم غفیر ازہر فریق کردہ انداز پادشاہاں رشید و امین و مامون بلکہ گفتہ اندکہ مہدی و ہادی نیز روایت کردہ اند- و از مجتہدین شافعیؒ و محمد بن الحسن بلا واسطہ واحمد عن عبدالرحمن بن مہدی و جماعات عنہ و ابو یوسف عن رجل عنہ- و از محدثاں جماعاتے کہ حصر آنہا میسر نیست- واز اصحاب مالک یحیی بن یحیی مصمودی و ابن قاسم و رضیع- واز صوفیاء ذوالنون مصری وغیرآں- واز اہل مصر و شام و عراق و یمن و خراسان ہمہ روایت کردہ اند (صفحہ۸)

"مؤطا کی شہرت کی تفصیل یہ ہے کہ اسے امام مالکؒ (کی زبان) سے ہر طبقہ کی جماعت کثیر نے روایت کیا ہے (چنانچہ) بادشاہوں میں سے ہارون رشید اور (اس کے دونوں بیٹوں) امین اور مامون رشید نے- بلکہ کہتے ہیں کہ خلیفہ مہدی اور ہادی نے بھی روایت کیا ہے- اور ائمہ مجتہدین میں سے امام شافعیؒ اور امام محمد بن حسن نے تو بے واسطہ (بالمشافہ) اور امام احمدؒ نے عبدالرحمٰن بن

مہدی کے واسطہ سے اور پھر ان سے ایک جماعت کثیرہ نے روایت کیا۔ اور امام ابو یوسف نے بھی ایک شخص کے واسطہ سے روایت کیا۔ اور محدثین میں سے اتنی بھاری جماعت نے روایت کیا کہ اس کا حصر آسان نہیں ہے۔ اور امام مالک کے اصحاب میں سے یحییٰ بن یحییٰ مصمودی مغربی اور ابن قاسم مصری اور رضیع نے روایت کیا۔ اور صوفیاء میں سے حضرت ذولنون مصری وغیرہ نے اور اہل مصر و اہل شام و اہل یمن اور اہل خراسان (دور دراز علاقوں سے) سب نے روایت کیا ہے۔

اسی طرح حضرت شاہ صاحب حجۃ اللہ میں فرماتے ہیں۔

وقد رواه عن مالك بغير واسطة اكثر من الف رجل۔ وقد ضرب الناس فيه اكباد الابل الى مالك من اقاصى البلاد كما كان النبى صلى الله عليه و سلم ذكره فى حديثه فمنهم المبر زون من الفقهاء كالشافعیؒ و محمد بن الحسن و ابن وهب و ابن القاسم و منهم نحار ير المحدثين كيحيى بن سعيد القطان و عبدالرحمن بن مهدى و عبدالرزاق و منهم الملوك و الامراء كالرشيد و ابنيه و قد اشتهر فى عصره حتى بلغ على جميع ديار الاسلام ثم لم يات زمان الا وهو اكثر له شهرة و اقوى به عناية و عليه بنى فقهاء الامصار مذاهبهم حتى اهل العراق فى بعض امرهم و لم يزل العلماء يخرجون احاديثه و يذكرون متابعة و شواهده ويشرحون غريبه و يضبطون مشكله و يبحثون عن فقهه و يفتشون عن رجاله الى غاية ليس بعدها غاية و ان شئت الحق الصراح فقس كتاب المؤطا بكتاب الاثار لمحمد والا مالى لابى يوسف تجد بينه و بينهما بعد المشرقين فهل سمعت احدا من المحدثين و الفقهاء تعرض لهما واعتنى بهما (جلد اول مصری ص ۱۳۲، ۱۳۳)

اور بے واسطہ (براہ راست) امام مالکؒ سے ایک ہزار سے زیادہ لوگوں نے اسے روایت کیا اور لوگوں نے اس کی تحصیل میں دور دراز شہروں سے امام مالک کی طرف (سفر کر کے) اونٹوں کی چھاتیوں کو پیٹ مارا (یعنی اونٹوں پر سوار ہو ہو کر پہنچے) جس طرح کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی حدیث (مبارک) میں اس بات کا ذکر کیا تھا[1] پس ان (سفر کرنے والوں) میں سے بعض تو بہت زبردست فقہا ماہرین فن ہیں مثلاً امام شافعی اور امام محمد بن حسن اور ابن وہب اور ابن قاسم اور بعض ان میں سے چوٹی کے محدث ہیں۔ مثلاً یحییٰ بن سعید قطان اور عبدالرحمٰن بن مہدی اور عبدالرزاق اور بعض ان میں سے بادشاہ و سلاطین ہیں مثلاً ہارون رشید اور اس کے دونوں بیٹے (امین و مامون) اور آپ کے زمانہ ہی میں اس کتاب مؤطا کی شہرت تمام اسلامی دیار میں پہنچ گئی۔ پھر جو زمانہ آتا گیا اس میں اس کی شہرت زیادہ ہی زیادہ ہوتی گئی اور اس طرف لوگوں کی توجہ بھی زیادہ ہی ہوتی گئی۔ (چنانچہ) اس پر فقہائے (امت) نے (اپنے اپنے) شہروں اور (علاقوں) میں اپنے مذاہب کی بنا رکھی حتیٰ کہ بعض امور میں اہل عراق (حنفیوں) نے بھی اور علما ہمیشہ اس کی احادیث کی تخریج کرتے رہے اور اس کے متابعات و شواہد ذکر کرتے رہے ہیں۔ اور غریب الفاظ کی شرح اور اس کے مشکلات کا ضبط اور اس کی فقہ سے

---

[1] اس عبارت میں حضرت شاہ صاحب نے اس حدیث کی طرف اشارہ کیا جو جامع ترمذی میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے یوشك ان یضرب الناس اکباد الابل یطلبون العلم فلا یجدون احدا اعلم من عالم المدینة۔ هذا حدیث حسن (فی نسخة صحیح) یعنی وہ زمانہ قریب آرہا ہے کہ لوگ علم کی طلب میں اونٹوں کی چھاتیاں پیٹیں گے اور (اس وقت) مدینہ (طیبہ) کے ایک عالم سے بڑھ کر علم والا کسی کو نہ پائیں گے۔ ترمذی نے کہا کہ یہ حدیث حسن ہے اور ایک نسخہ میں ہے کہ صحیح ہے۔ اس کے بعد امام ترمذی کہتے ہیں کہ امام سفیان بن عیینہ جو اس حدیث کے راویوں میں سے ہیں ان کا ایک قول یہ ہے کہ اس عالم سے مراد امام مالکؒ بن انس ہیں اور امام عبدالرحمٰن کا بھی قول ہے کہ مراد امام مالکؒ بن انس ہیں رحمہ اللہ وارضاہ۔ اللّٰھم اغفر لکاتبه و لمن سعی فیه برحمتك یا ارحم الراحمین۔

بحث اور اس کے رجال (راویوں کے حال) کی تفتیش (دیڑتال) اس حد تک کرتے رہے کہ اس کے بعد کوئی حد نہیں ہے۔ اور اگر تم خالص حق معلوم کرنا چاہتے ہو۔ تو (امام مالکؒ کی) کتاب مؤطا کا مقابلہ امام محمد کی کتاب الاثار اور امام ابو یوسف کی کتاب الامالی سے کرو تو اس میں اور ان دونوں میں بعد المشرقین (مشرق و مغرب کا فاصلہ) پاؤ گے۔ کیا تم نے کہیں سنا کہ کسی محدث نے ان دونوں (کتاب الاثار اور کتاب الامالی) کی (کچھ بھی) پرواہ کی اور ان کو خیال میں رکھا۔"

شاہ صاحب نے ان چند جملوں میں کوزہ میں دریا بند کر دیا ہے۔ اس کی توضیح یوں ہے کہ دنیوی ترقی و عروج کا کمال بادشاہت تک ہے۔ اور عموماً شاہی اشغال و مذاق تحصیل و خدمت علم کے رستہ میں مزاحمتیں ڈالتے ہیں۔ لیکن مؤطا کی شہرت کا آوازہ حجرہ مسجد سے نکل کر کوکب شاہی تک جا پہنچا اور اس نے ہارون رشید و امین و مامون رشید اور ہادی و مہدی جیسے خلفاء کو بھی تحصیل و روایت حدیث کے لئے بے تاب کر دیا۔ چنانچہ ان سب نے مدینہ طیبہ کا سفر کیا اور امام مالکؒ کے سامنے زانوئے ادب تہ کر کے شاگردانہ طور پر امام مالکؒ سے مؤطا کی سند حاصل کی۔

طبقہ ثانیہ یعنی مجتہدین و محدثین میں مؤطا کی شہرت و قبولیت گو ظاہر میں تعجب خیز نہیں ہے کیونکہ کسی علمی کتاب کی قدر اگر علماء نہ کریں تو اور کون کرے؟ لیکن مجتہدین و اکابر محدثین کے علو مرتبت کے لحاظ سے جب تک مؤطا ان کے نزدیک قابل تحصیل نہ سمجھی جاتی وہ اس کے لئے لمبے سفر ہرگز گوارا نہ کرتے اور جنہوں نے اسے قبل از درجہ اجتہاد حاصل کیا ہو بعد ازاں اس کی مسند احادیث کے ویسے ہی قائل نہ رہتے جیسے پہلے تھے۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحب مصفی میں فرماتے ہیں۔

واصل مذہب شافعیؒ و سر مشق اجتہاد او مؤطا مالکؒ ست در بعض جاہا تعقب کردہ است و در ترجیح روایات اختلاف نمودہ است و محمد را در مبسوط و غیر آں سرمایہ

فقاہت مؤطا است و اثار یکه از امام ابوحنیفہؒ روایت کر ده
است جمیع مسائل فقه را کفائت نمی کند و در مؤطا بسیار
جاہے گوئد و به اقول و به کان یقول ابو حنیفة (صفحه ۷)

"امام شافعیؒ کے مذہب کا اصل اور ان کے اجتہاد کی سر مشق امام مالکؒ کا مؤطا ہے اور بعض جگہ (امام شافعیؒ نے) تعاقب بھی کیا ہے۔ اور ترجیح روایات میں اختلاف بھی کیا ہے۔ اور مبسوط وغیرہ میں امام محمد کی فقاہت کا سرمایہ بھی مؤطا ہی ہے ورنہ وہ آثار جو انہوں نے امام ابو حنیفہؒ سے روایت کئے ہیں فقہ کے جمیع مسائل میں کفائت نہیں کرتے اور امام محمد اپنے مؤطا میں امام مالکؒ کی روایت ذکر کرنے کے بعد بہت جگہ کہتے ہیں کہ میں بھی یہی کہتا ہوں اور امام ابو حنیفہؒ بھی یہی کہا کرتے تھے۔

شاہ صاحب اس سے پہلے امام مالکؒ کی فضیلت کے ضمن میں لکھتے ہیں۔

و مذہب شافعی فی الحقیقت تفصیل کتاب اوست و امام
محمد را سرمایه فقاہت در مبسوط علم اوست (صفحه ۶)

امام شافعی کا مذہب در حقیقت آپ کی کتاب (مؤطا) کی تفصیل ہے اور امام محمد کی فقاہت کا سرمایہ اپنی کتاب مبسوط میں آپ ہی کا علم ہے۔

طبقہ ثالثہ صوفیا کا ہے۔ اس طبقہ کی زیادہ تر کوشش عمل اور خاص کر کیفیات قلب کی اصلاح میں ہوتی ہے لیکن عمل کے لئے صحیح علم کی ویسی ہی ضرورت ہے، جیسی کہ محکم و درست دیوار کو استوار و درست بنیاد کی۔ اس لئے بڑے بڑے مشائخ صوفیہ اس مشکوۃ نبوت کے لئے دود نور کے اقباس کے لئے دور دور سے کڑی اور دشوار منزلیں طے کر کے بصد شوق و نیاز کشاں کشاں مہبط وحی و مرکز نبوت مدینہ طیبہ میں پہنچے۔

"وہ آئے بام پہ سب طالب دیدار جا پہنچے"

شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے مصر و خراسان وغیرہ مقامات کا ذکر کر کے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ علاوہ اس کے ہر طبقہ کے شائقین علم نے مؤطا کی تحصیل کے

لئے مدینہ طیبہ کا سفر کیا۔ یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ مقامات کے قرب و بعد کے لحاظ سے بھی موطا کی شہرت خود حضرت مصنف رحمتہ اللہ علیہ کے وقت ہی میں مشارق و مغارب بلاد اسلامیہ میں جا پہنچی۔ چنانچہ مشرق کی طرف خراسان تک اور شمال کی طرف شام تک اور جنوب کی طرف یمن تک اور مغرب کی طرف اندلس (سپین) تک یہ کتاب جا پہنچی۔ اور اس وقت اسلامی سلطنت کی حدود یہی تھیں۔ یحیی بن یحیی مصمودی جس کی روایت کا نسخہ آجکل زیادہ متداول ہے وہ اندلسی (سپینی) تھا اور اسی وجہ سے امام مالکؒ کا مذہب زیادہ تر بلاد مغرب میں پھیلا۔

تفصیل بالا سے معلوم ہو سکتا ہے کہ امام مالکؒ کی کتاب "موطا" اسلامی کتب خانہ میں قرآن شریف کے بعد ایک خاص خصوصیت کی کتاب ہے اور جائز ہے کہ ہم اس کے مصنف کی فضیلت اور فیض علمی کے لحاظ سے یہ مثال بیان کریں کہ جس طرح نوح علیہ السلام کے بعد جملہ بنی آدم کی پیدائشی نسب کا رجوع حضرت نوحؑ کی طرف ہے اسی طرح امام مالکؒ کے بعد جملہ محدثین کی علمی نسبت کا رجوع امام مالکؒ کی طرف ہے۔ عرب و عجم، مشرق و مغرب میں جہاں جہاں تخت اسلامی متمکن ہوتا رہا وہاں وہاں امام مالکؒ کے فیض درس کی بساط بچھتی اور مسند لگتی رہی۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحب حجتہ اللہ میں فرماتے ہیں۔

وكان مالك من اثبتهم في حديث المدنيين عن رسول الله صلى الله عليه و سلم و اوثقهم اسنادا و اعلمهم بقضايا عمر و اقاويل عبدالله بن عمر و عائشة و اصحابهم من الفقهاء السبعة و به بامثاله قام علم الرواية والفتوى فلما وسداليه الامر حدث و افتى وافاد واجاد و عليه انطبق قول النبي صلى الله عليه و سلم يوشك ان يضرب الناس اكباد الابل يطلبون العلم فلا يجدون احدا اعلم من عالم المدينة على ماقاله ابن عيينه و عبدالرزاق و ناهيك بهما فجمع اصحابه رواياته و مختاراته و لخصوها و حرروها و

شرحوها و خرجوا عليها و تكلموا في اصولها و دلائلها و تفرقوا الى المغرب و نواحي الارض فنفع الله بهم كثيرا من خلقه و ان شئت ان تعرف حقيقة ما قلناه من اصل مذهبه فانظر في كتاب المؤطا تجده كما ذكرنا- (حجة الله مصری جلد اول ۱۴۴، ۱۴۵)

امام مالک ان لوگوں میں سے تھے جو رسول اللہ ﷺ کی حدیث میں جو اہل مدینہ کی روایت سے ہو- سب سے پختہ و ضابطہ تھے- اور اسناد میں سب سے زیادہ ثقہ تھے- اور حضرت عمرؓ کے فیصل جات کے اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عائشہؓ اور ان کے شاگردوں یعنی فقہائے سبعہ کے اقوال کے سب سے زیادہ عالم تھے- اور آپ (امام مالکؒ) اور آپ کے نمونہ کے لوگوں سے ہی روایت و فتویٰ کا علم قائم ہوا- پس جس وقت یہ امر (تحدیث و افتا) آپ کے سپرد ہوا تو آپ نے حدیث بھی پڑھائی اور فتوٰی بھی جاری کیے اور (مخلوق کو) فائدہ پہنچایا- اور (اس کام کو) اچھی طرح نبھایا- اور آپ ہی پر رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث منطبق ہوئی کہ وہ زمانہ قریب ہے کہ لوگ علم کی تلاش میں اونٹوں کی چھاتیاں پیٹیں گے- پس (اس وقت) مدینہ طیبہ کے ایک عالم سے (جو اس وقت ہو گا) کسی کو بڑھ کر علم والا نہ پاویں گے- بموجب اس روایت کے جو امام سفیان بن عیینہ اور امام عبدالرزاق نے بیان کی اور تجھے (اے قاری) یہ دونوں امام کافی ہیں- پس آپ (امام مالک) کے شاگردوں نے آپ کی روایت و مختارات کو جمع کیا اور ان کو ملخص کیا- اور تحریر کیا- اور ان کی تشریحات کیں اور ان پر تخریجیں کیں اور ان کے اصول و دلائل میں (عالمانہ) کلام کیا (غرض سب نے امام مالک کی مرویات کی مختلف طور پر خدمت کی) اور (آپ کے شاگرد) مغرب اور (اسلامی) دنیا کے دیگر نواح میں پھیل گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعے اپنی بہت سے مخلوق کو علمی نفع پہنچایا- اور اگر تو اس کی امر کی حقیقت معلوم کرنی چاہئے جو ہم نے

آپ (امام مالک) کے مذہب کے اصل کی بابت ذکر کیا ہے۔ تو تو (ان کی) کتاب مؤطا کو دیکھ کہ تو اسے ویسا ہی پائے گا جیسا کہ ہم نے ذکر کیا۔

رجوع بمطلب: امام مالکؒ نے جس احتیاط اور تنقید سے احادیث نبویہ کو جمع کیا وہ روش صرف امام مالکؒ تک ہی محدود نہ رہی بلکہ وہ زمانہ مابعد کے محدثین کے لئے ایک نہایت ہموار و پختہ شاہراہ ثابت ہوئی۔ چنانچہ یہ بات امام شافعیؒ، امام احمدؒ اور آپ کے شاگردوں امام بخاریؒ و امام ابو داؤدؒ نیز امام مسلمؒ، امام ترمذیؒ وغیرہم کی تصانیف پڑھنے سے صاف نظر آجاتی ہے۔

اس لئے امام مالکؒ کے زمانہ سے بعد کے زمانہ پر کوئی سوال نہیں آسکتا۔ اور نہ کوئی خدشہ باقی رہتا ہے۔ کیونکہ اس زمانہ سے برابر محدثین علیہم الرحمتہ تصنیف و تنقید میں مشغول رہے اور وہ کتابیں ہم تک بطریق تواتر و توارث برابر چلی آئی ہیں جن میں ہرگز کسی طرح کا احتمال نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحب حجتہ اللہ مصری جلد ا صفحہ ۱۴۷ میں فرماتے ہیں۔

فوقع شیوع تدوین الحدیث والاثر فی بلدان الاسلام و کتابة الصحف والنسخ حتی قل من یکون اھل الروایة الاکان له تدوین کفة او نسخة.

"پس بلاد اسلامیہ میں حدیث و آثار اور صحیفوں اور نسخوں کا لکھنا اور مدون کرنا (عام طور پر) شائع ہو گیا۔ حتیٰ کہ اہل روایت میں سے کوئی کم ہو گا کہ اس نے کوئی کتاب یا صحیفہ یا نسخہ مدون نہ کیا ہو۔"

ہاں امام مالکؒ کے زمانہ سے پیشتر کی نسبت یہ سوال ہو سکتا تھا کہ اس میں حدیث کتابی صورت میں جمع نہیں کی گئی تھی۔ لیکن اوپر کے بیان سے ثابت ہو گیا ہے۔ کہ جزوی طور پر احادیث کی نوشت زمانہ نبوت میں بھی ہوئی اور زمانہ صحابہ میں بھی اور زمانہ تابعین میں تو دربار خلافت یعنی پہلی صدی کے مجدد خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ کی توجہ سے تو باقاعدہ تصنیف کی بنیاد پڑ گئی۔ جس کی سب سے پہلی یادگار مؤطا امام مالکؒ ہے۔ آپ

نے یہ کتاب ۱۴۳ھ میں خلیفہ منصور عباسی کے عہد میں لکھی اور آپ کی وفات ۱۷۹ھ میں مدینہ طیبہ ہی میں ہوئی اور آپ فصول سابقہ میں پڑھ آئے ہیں کہ تابعین کا زمانہ ۱۸۰ھ تک ختم ہوا۔ اگرچہ امام مالک اتباع تابعین سے ہیں لیکن ان کی تصنیف زمانہ تابعین میں ہوئی۔ و ھذا ھو المقصود و الحمد اللہ المعبود۔

خاکسار محمد ابراہیم میر سیالکوٹی

حصہ سوم

تاریخ اہل حدیث
ہندوستان میں علم و عمل بالحدیث

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ الذی علم بالقلم ط علم الانسان مالم یعلم ط والصلوۃ والسلام علی المبعوث الی العرب و العجم ط بالحکمۃ البابصۃ و الحجۃ البالغۃ و جوامع الکلم ط و علی الہ و اصحابہ سادۃ من نصر الدین و احکم ط وائمۃ من بلغ وعلم ط اما بعد.

اس حصہ کتاب کو ہم ان ارباب فضیلت کے ذکر سے زیب دیتے ہیں۔ جن کی علمی یا عملی مساعی کی برکت سے ملک ہندو پنجاب میں علم و عمل بالحدیث کی بنیاد پڑی اور اشاعت ہوئی۔

(۱) جس زمانہ میں اس ملک میں اسلامی حکومت کا سکہ بیٹھا اور اس میں سلطنت اسلامیہ باقاعدہ قائم ہوئی افسوس ہمارا علم حدیث اس کے ساتھ ہی مروج نہ ہو سکا بلکہ اس کی اشاعت بہت زمانہ بعد ہوئی۔ جس کے اسباب ذکر کرنے کے لئے ہر عہد کی صورت فتح اور طرز حکومت اور امور سیاست اور مذہبی امور میں شاہان وقت کا نقطہ خیال اور ان کے علمی و عملی مشاغل کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔ اور ان امور کی تفصیل اس وقت ہمارے مقصود سے خارج ہے۔

(۲) اس عالم نشوونما اور کرہ انحطاط اور ارتقاء میں ہر چیز کی ابتدا ضعف سے ہوتی ہے اور اوج کمال تک ترقی پانے تک کئی ایک ناگزیر آفتیں بھی آتی رہتی ہیں جو رفتار ترقی کو سست و کمزور بلکہ بعض اوقات صفحہ ہستی سے نابود کر دیتی ہیں۔ لیکن حق ایک ایسا امر ہے

جس کا اثر کیسا ہی دھیما اور کتنا ہی تھوڑا کیوں نہ ہو اور آفت زمانہ سے دب دب کر مایوس کن صورتیں کیوں نہ دکھائی دیں۔ لیکن آخر کار سب مزاحمتیں دور ہو کر غلبہ اسی کو ملتا ہے والعاقبة للتقوے۔

(۴) ملک ہند و پنجاب میں علم سنت مطہرہ بحکم حدیث پاک بدء الاسلام غریباً الحدیث (مشکوۃ) بالکل اجنبیت کی حالت میں آیا اور صدیوں تک اس کے خواہاں خال خال نظر آتے رہے۔ نہ تو دربار شاہی میں اس کو بار ملا کہ سلطنت اس کی کفالت کرتی اور نہ مجالس امراء و رؤسا میں رسائی ہوئی کہ اس کے تذکرہ سے مجالس گرم ہوتیں اور نہ نصاب مدارس میں دخل ملا کہ علماء اس کی خدمت سے بہرہ اندوز ہوتے۔

ممالک بعیدہ سے انواع و اقسام کے حیوانات و طیور جمع کرنے کا خاص اہتمام تھا۔ بادشاہ سلامت خود تشریف لا کر خاص دلچسپی سے ان کو ملاحظہ فرماتے لیکن حدیث نبوی ؐ کا کوئی کتب خانہ جمع نہ کیا گیا۔ مشاعرہ اور گپ بازی سے مجالس کو رونق دی جاتی۔ ظریفوں' نقالوں اور بھانڈوں کی تنخواہیں بھی مقرر تھیں اور علاوہ بریں ان پر عطیات و انعامات بارش کی طرح برسائے جاتے تھے۔ لیکن قال (الصحابی) قال رسول اللہ (ﷺ) کی صدا سے کان غیر مانوس تھے۔ درسیات میں ارسطو کے فرسودہ خیالات اور اقوال الرجال کو منتہائے علم قرار دیا گیا لیکن وحی ربانی اور سنت رسول حقانیؐ جو شریعت حقہ کا مدار اور عقلیات کی محک صادق ہے۔ اسے حلقہ درس میں دخل ہی نہ تھا۔

آہ! مسلمانوں کا کتنا روپیہ تحریش بہائم (مینڈھا بازی وغیرہ) اور کنکوا بازی میں صرف ہوتا۔ لیکن خرچ شاہی سے کسی جماعت کو عربستان میں تحصیل و تکمیل فن حدیث کے لئے بھیجا نہ جاتا جیسا کہ انگریزی حکومت کے وقت بعض کمالات کی تکمیل کے لئے بعض اشخاص کو شاہی وظائف سے امریکہ وغیرہ ممالک میں بھیجا جاتا ہے فیا اسفی۔

غرض شاہی کفالت سے تو اس فن کی طرف مطلقاً توجہ نہیں کی گئی لیکن ہاں ذاتی طور پر بعض ارباب ہمت نے صعوبت سفر برداشت کی اور وہ "حرمین شریفین" (حرسهما الله) کی زیارت سے مشرف ہونے کے ساتھ اس فن کے جواہرات سے

بھی دامن بھر لاتے رہے۔

خدائے ذوالجلال کے علم میں اس کے لئے ایک ایسا وقت بھی مقرر تھا کہ ہندو پنجاب کا کوئی بھی گوشہ اس کے فیض سے خالی نہ رہے۔سو ٹھوائے واللہ متم نورہ ہو کر رہا۔وللہ الحمد

اس ملک میں اس پاک علم کا رواج گو دوسرے ممالک سے صدیوں بعد ہوا۔ لیکن خدا کے فضل سے اشاعت میں دوسروں سے کم نہ رہا اور بالخصوص اس آخری دور میں کہ قیامت سر پر آرہی ہے اور مسلمانوں میں عملی ضعف نہایت تک پہنچ چکا ہے۔ عمل بالحدیث میں تو دوسرے ممالک سے بدرجہا فائق ہے فلہ الکبریاء فی السموات والارض وھو العزیز الحکیم۔ التماس۔ اس خوشہ چین علمائے متقدمین نے اس حصہ کتاب میں زیادہ تر حاجی خلیفہ قسطنطینی (المتوفی ۱۰۶۷ھ کی کتاب کشف الظنون اور حسان الہند میر غلام علی آزاد بلگرامی المتوفی ۱۲۰۰ھ کی کتاب مآثر الکرام اور شیخ شیخنا حضور پر نور نواب سید صدیق حسن صاحب کی کتب ابجد العلوم اور اتحاف النبلاء سے مدد لی ہے اور بعض جگہ مولانا عبدالحئی صاحب مرحوم لکھنوی المتوفی ۱۳۰۴ھ کی کتاب فوائد بہیہ اور اس کے حواشی سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔(جزا ھم اللہ اجمعین) اور جس کتاب سے کچھ لیا ہے حسب عادت اس کا حوالہ دے دیا ہے۔

قارئین کرام سے التماس ہے کہ اگر اس میں کوئی غلط فہمی پائیں تو سوء ظن سے اجتناب کرتے ہوئے میرے سہو و قصور علم کا نتیجہ سمجھیں اور اسے دامن اغماض سے ڈھانپ کر اس کی اصلاح کر دیں۔ اور اس عاجز کو دعائے خیر سے یاد کریں کہ میں نے عربی اور فارسی زبان کی کمیاب کتابوں سے انتخاب کر کے اردو خواں اخوان کے لئے ان کی زبان میں ایک نادر تحفہ پیش کر دیا ہے۔واللہ الموفق الخیر اللھم تقبل منی انك انت السمیع العلیم وانفعنی ولا بائی و اخوانی بھذا التحفۃ السنیۃ الھدیۃ البھیہ فی الدنیا والاخرہ۔

مسود اوراق سیاہ کار میر سیالکوٹی ۱۵ شوال

شیخ رضی الدین حسن صغانی لاہوری رحمتہ اللہ علیہ

ولادت ۵۷۷ھ وفات ۶۵۰ھ

آپ کے والد ماجد صغان علاقہ ماوراء النہر سے آکر پنجاب کے دارالخلافہ شہر لاہور میں آباد ہوئے جہاں آپ ۵۷۷ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ فاروق اعظم حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے ہیں۔ ابتداء حال میں آپ نے اپنے والد ماجد سے تعلیم پائی۔ اور کافی مہارت حاصل کی۔ افسوس ہے کہ شیخ موصوف نے والد ماجد کے علاوہ جن ہندی شیوخ سے علم پڑھا۔ ان کے اسماء گرامی معلوم نہیں ہو سکے۔ آپ کے جو حالات یہاں لکھے جاتے ہیں۔ وہ ابجد العلوم و اتحاف النبلاء ہر دو مصنفہ نواب صاحب مرحوم ماثر الکرام مصنفہ حسان الہند سید غلام علی صاحب آزاد بلگرامی اور کشف الظنون مصنفہ حاجی مصطفیٰ چلپی استنبولی سے ماخوذ ہیں۔

آپ ۶۱۵ھ میں بغداد چلے گئے اور کئی سال تدریس و تصنیف میں گذارے۔ پھر مکہ شریف میں جا کر کچھ مدت وہاں کی ظاہری و باطنی برکات سے بہرہ اٹھاتے رہے۔ بعد ازاں عراق میں واپس آ گئے۔ ۶۱۷ھ میں خلیفہ معتصم عباسی نے آپ کو بطور سفیر ہندوستان بھیجا۔ ۶۲۴ھ میں ہند سے عراق لوٹے۔ اس کے بعد دوسری بار بطور سفیر ہندوستان آئے اور ۶۳۷ھ میں بغداد تشریف لے گئے۔

آپ نے اپنے والد ماجد کے علاوہ بعض دیگر علمائے عراق عرب و مکہ معظمہ سے بھی علم حاصل کیا اور حدیث کی سماعت کی۔ پھر بغداد کی طرف رحلت کی اور مدت تک وہاں اقامت پذیر رہے اور تدریس و تصنیف میں مشغول رہے۔ آپ مختلف فنون مثلاً حدیث لغت اور فقہ کے مسلم صاحب مہارت امام تھے۔ آپ نے مختلف علوم میں متعدد کتابیں لکھیں مثلاً علم حدیث میں مشارق الانوار جو تمام دنیا میں مشہور و متداول ہے۔ اس میں صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں سے احادیث کو انوکھی ترتیب پر منتخب کیا ہے۔ علمائے حدیث نے اس کی متعدد مختصر اور مبسوط شرحیں لکھی ہیں۔ مثلاً صاحب قاموس نے "شوارق الاسرار" العلیہ چار جلدوں میں اور عزالدین ابن ملک نے مبارق

الازہار (مطبوعہ انقرہ ۱۳۲۸ھ) دو جلدوں میں۔ اس فقیر کے پاس یہ کتاب موجود ہے۔ الحمد للہ میں نے اس سے نادر علمی فوائد حاصل کئے ہیں۔

مشارق الانوار کا ترجمہ مولانا خرم علی صاحب پھلواری نے اردو میں کیا تھا جو ہندوستان میں چھپ چکا ہے۔ اس کے علاوہ حدیث میں شرح بخاری و مصباح الدجی و الشمس المنیرہ و در السحابہ اور اس کی شرح۔

علم لغت میں کتاب شوارد و عباب و شرح القلادۃ السمطیہ فی توشیح الدرالدریہ۔ نیز کتاب الفرائض اور کتاب العروض آپ کی تصنیفات میں سے ہیں۔

آپ بغداد میں ۶۵۰ھ میں معتصم عباسی کے زمانہ میں فوت ہوئے۔ آپ نے اپنی اولاد کو وصیت کی کہ آپ کی نعش کو مکہ معظمہ لے جایا جائے۔ اس لئے آپ کو پہلے بغداد میں امانتاً دفن کیا گیا۔ آپ نے اپنی کتاب مشارق الانوار میں اپنی قبر کے مکہ شریف میں ہونے کی دعا کی تھی جس کی تاریخ یہ ہے اماته بها حميد افاقبره ثم اذا شاء انشره۔ رحمه الله

شیخ علی متقی جونپوری رحمۃ اللہ علیہ

المتولد ۸۸۵ھ — المتوفی ۹۷۵ھ

ان کے حالات حسان الہند میر غلام علی صاحب آزاد بلگرامی نے ماثر الکرام (دفتر اول) میں اور شیخ شیخنا حضرت نواب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ابجد العلوم اور اتحاف النبلاء میں حضرت شیخ عبدالحق صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتب سے نقل کئے ہیں۔

نوٹ:۔ شیخ عبدالحق صاحب مرحوم مرید تھے شیخ عبدالوہاب صاحبؒ کے اور وہ خلیفہ تھے حضرت شیخ علی متقی رحمۃ اللہ علیہ کے۔

شیخ علی متقیؒ اصل میں جونپوری ہیں۔ آپ کی پیدائش ۸۸۵ھ میں[1] میں شہر برہان

---

[1] سنہ ولادت کی تعیین مذکورہ بالا کتب میں سے کسی کتاب میں نظر ناقص میں نہیں آئی مگر ہر سہ کتب میں مکتوب ہے کہ آپ مکہ شریف میں نوے سال کی عمر میں ۹۷۵ھ میں فوت ہوئے ۹۷۵ میں سے نوے تفریق کریں تو تاریخ ولادت ۸۸۵ھ ہجری بنتی ہے۔ واللہ اعلم۔

پور (علاقہ دکن) میں ہوئی۔ان کے والد ماجد صوفی مشرب تھے۔انہوں نے ان کو ان کی طفولیت ہی میں اپنے پیر شیخ باجن رحمتہ اللہ علیہ کی بیعت میں منسلک کر دیا۔ سن تمیز کو پہنچے تو والد ماجد مرحوم کی موافقت میں شیخ باجن صاحب موصوف ہی کے حلقہ ارادت میں رہے۔ لیکن جب بالغ ہو گئے' اور والد جسمانی اور پیر روحانی ہر دو اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سائے میں چلے گئے تو بزرگوں کے مشہور قول کے مطابق کہ وہ بچہ جو بچپن میں کسی شیخ کی مریدی میں داخل ہوا جب بلوغت کو پہنچے تو اسے اختیار ہے کہ خواہ اسی کی بیعت میں رہے۔خواہ کسی دیگر شیخ وقت کے سلسلہ میں منسلک ہو جائے۔انہوں نے اس کے مطابق باختیار خود باقاعدہ شیخ باجن مرحوم کے فرزند شیخ عبدالحکیم صاحب رحمتہ اللہ علیہ سے خرقہ پوشی کی سعادت حاصل کی۔ چونکہ تصوف کی چاٹ بچپن میں لگ چکی تھی۔اور تخم کی تاثیر بھی تھی اور نشو نما بھی اسی چشمہ صافی کی سیرابی سے ہوا تھا اور معصوم طبع اسی رنگ کی گلکاری سے مزین ہو چکی تھی۔اس لئے طبیعت میں یہ پیاس ہمیشہ رہی کہ کوئی مرد الٰہی ملے جو مجھے راہ حق دکھائے اور منزل مقصود پر پہنچائے۔اسی تڑپ میں ملتان (علاقہ پنجاب) کی راہ پکڑی اور علوم ظاہر و باطن میں حسام الدین متقی رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں پہنچے اور مدت تک ان سے ظاہری و باطنی فیوض حاصل کرتے رہے۔ بعد ازاں ۹۵۳ھ میں عازم حرمین شریفین ہوئے اور مکہ معظمہ میں طرح اقامت ڈالی شیخ ابوالحسن بکری رحمتہ اللہ علیہ اور شیخ ابن حجر مکی رحمتہ اللہ علیہ[1] کی صحبت اختیار کر کے خرقہ قادری و شاذلی و مزنی زیب تن فرمایا۔ نیز یہ تینوں خرقے شیخ محمد بن محمد سخاویؒ سے پہنے۔

نشر علوم اور فیض صحبت :۔زمانہ اقامت مکہ میں آپ کے تقوی و طہارت اور نشر علوم ظاہری اور فیض باطنی کی شہرت دور و نزدیک کے بلاد میں پھیل گئی اور عوام و

---

[1] شیخ ابن حجر مکیؒ مکہ شریف میں مفتی حجاز تھے۔ جامع علوم ظاہری و باطنی تھے۔ان کی عمدہ تصانیف سے الصواعق المحرقہ ہے جو خلافت راشدہ کے ثبوت اور رد شیعہ میں مقبول خاص و عام ہے۔ آپ مکہ شریف میں ۹۷۳ھ میں فوت ہوئے رحمہ اللہ علیہ۔

خواص آپ کے فضائل و کمالات کا اعتراف کرنے لگے- حتیٰ کہ آپ کے استاد شریعت اور شیخ طریقت شیخ ابن حجر مکیؒ مصنف صواعق محرقہ نے بھی آپ کی شاگردی اختیار کی اور آپ کے حلقہ ارادت میں منسلک ہو گئے اور آپ سے خرقہ تصوف زیب تن فرمایا-

تصانیف : آپ کی تصانیف ایک سو سے زائد ہیں اور سب نافع و مفید ہیں- ان میں سے علم حدیث میں قابل قدر خدمت یہ ہے کہ امام سیوطی کی کتاب جمع الجوامع[1] کو فقہی ابواب کی ترتیب پر مرتب کیا- آپ کے استاد ابوالحسن بکری مکی اس کتاب کی نسبت فرماتے ہیں کہ امام سیوطیؒ کا احسان تمام لوگوں پر ہے اور شیخ علی متقی کا احسان امام سیوطی پر ہے[2] نیز حضور نواب صاحب مرحوم ابجد العلوم[3] میں فرماتے ہیں-

قد وقفت علی بعض تو الیفه فوجدتها نافعة مفيدة ممتعة تامة

(صفحہ ۸۹۵)

میں آپ کی بعض تصانیف سے واقف ہوا تو ان کو نفع مند مفید اور کامل کار آمد پایا-

قبولیت و اشارہ غیبی : آپ کے شاگرد و خلیفہ شیخ عبدالوہاب فرماتے ہیں کہ میں نے خواب میں ایک عالیشان مکان دیکھا- جو بہشت بریں کے طور پر انوار و انہار سے آراستہ و پیراستہ ہے اور شیخ علی متقی اس میں بیٹھے ہیں- اس مکان کے صحن میں بعض چھوٹی اور بعض بڑی نہریں اور نالیاں (لبا لب) بہ رہی ہیں- حضرت شیخ صاحب مرحوم نے مجھے ایک نہر کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ یہ جامع صغیر ہے- اور ایک نالی کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ یہ فلاں رسالہ ہے- پھر دوسری نالی کی طرف کہ یہ فلاں

---

[1] جمع الجوامع اور جامع الصغیر الکبیر کو شیخ مرحوم نے کتاب کنز العمال میں مع زواید جمع کر دیا ہے- جو حیدر آباد دکن میں بڑی تقطیع کی چار جلدوں میں طبع ہو چکی ہے- الحمد للہ اس عاجز کے پاس یہ چاروں جلدیں اور جامع صغیر مطبوعہ مصر جس کے حاشیہ پر عبدالرؤف مناوی المتوفی ۱۰۳۱ھ کی کتاب کنوز الحقائق جو اس طرز حروف تہجی کی ترتیب سے ہے طبع شدہ ہے کنوز الحقائق میں دس ہزار حدیثیں جمع ہیں-

[2] [3] اتحاف النبلا مقصد اول صفحہ ۱۲۹ نیز ابجد العلوم صفحہ ۸۹۵-

رسالہ ہے۔اسی طرح اپنی کتابوں اور رسالوں کے نام لے کر ہر ایک کو نہر اور نالی سے معین کرتے تھے۔(اتحاف النبلاء صفحہ ۴۲۶)

اھل علم و فضل کی قدر دانی : شیخ شیخنا حضرت نواب صاحب مرحوم ملا علی قاری کے حال میں فرماتے ہیں کہ زاد المتقین میں شیخ علی متقیؒ کے ذکر میں لکھا ہے کہ اہل عجم سے ایک آدمی تھا۔ نہایت خوشخط۔اس کو ملا علی قاری کہتے ہیں۔اس کی فضیلت اور اہلیت اور افلاس کو دیکھ کر میں نے اس سے تفسیر جلالین دس جدید پر خریدی۔اس پر بھی فرماتے تھے کہ (ملا علی قاریؒ) نے عجب محنت اٹھائی ہے۔اس سے زیادہ (قیمت) پر بھی خرید سکتے ہیں۔ حالانکہ تفسیر مذکور اہل مکہ کے خط سے ایک جدید کو دستیاب ہو جاتی تھی (اتحاف النبلاء صفحہ ۴۲۶)

وفات : آپ نوے سال کی عمر میں ۹۷۵ھ میں مکہ شریف میں فوت ہوئے۔ تاریخ وفات شیخ مکہ ہے شیخ عبدالوہاب شعرانی مصریؒ[1] (رحمتہ اللہ علیہ) طبقات کبریٰ میں فرماتے ہیں۔

---

[1] شیخ عبدالوہاب شعرانی مذکور الفوق عبدالوہاب (پیرو مرشد شیخ عبدالحق صاحب محدث دہلویؒ) کے سوا دوسرے بزرگ ہیں۔ آپ دسویں صدی کے مصری مشائخ طریقت میں سے ہیں۔شافعی المذہب تھے۔ شریعت و طریقت ہر دو کے جامع تھے۔صاحب کرامت تھے۔ائمہ دین اور بزرگوں کا ادب ملحوظ رکھتے تھے۔بالخصوص امام اعظم امام ابو حنیفہؒ کا بہت ادب کرتے تھے۔ان کے حق میں بے ادبی کرنے والے کو بہت برا جانتے تھے۔بلکہ اگر ایسے گستاخوں پر کوئی بلا نازل ہو تو ان کی عیادت بھی نہیں کرتے تھے۔اختلافات ائمہ میں ان کی روش معتدل ہے۔جہاں تک ہو سکے ان کے اقوال کی توجیہ بیان کر کے ان کے اختلافات کو جمع کرتے ہیں۔اس امر میں ان کی کتاب میزان کبریٰ مشہور ہے۔الحمد للہ اس فقیر کے پاس موجود ہے۔صاحب تصانیف تھے۔ان کی سب تصانیف مفید اور مقبول علماء ہیں۔مجھ زلہ ربائے کو ان سے کمال عقیدت ہے۔۱۳۲۰ھ کے سفر حج کے ضمن میں (دیگر بلاد اسلامیہ کا سفر بھی کیا تھا۔مصر' حیفا' یافا' نذمرین' بیت المقدس اور دمشق) مصر میں نماز جمعہ جامع امام شافعی میں پڑھ کر امام شافعیؒ کی قبر پر فاتحہ پڑھی۔پھر مغرب کی نماز شیخ صاحب ممدوح کی جامع مسجد میں پڑھی اور آپ کی قبر کی زیارت کی اور فاتحہ پڑھی۔ آپ ۹۷۳ھ میں فوت ہوئے۔

اللهم ارحمه برحمتك الواسعة

شیخ علی ہندی نزیل مکہ مشرفہ ہیں۔ان سے ۹۴۲ھ میں مکہ شریف میں ملا۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تھااور آپ میرے ہاں تشریف لاتے تھے۔ آپ صاحب' علم صاحب ورع' زاہد(بے نفس) تھے۔ نحیف البدن تھے۔فاقوں کی کثرت سے آپ کے بدن پر ایک اوقیہ گوشت نہیں ہوگا۔ آپ نہایت خاموش اور تنہائی پسند تھے۔گھر سے سوائے حرم کعبہ میں نماز جمعہ ادا کرنے کے نہیں نکلتے تھے۔اور صفوں کے کناروں پر کھڑے ہو کر نماز پڑھتے تھے اور جلدی ہی واپس چلے جاتے تھے۔ آپ نے مجھ کو اپنے مکان میں داخل ہونے کا شرف بخشا تو میں نے آپ کے پاس فقرائے صادقین کی ایک جماعت دیکھی ہر فقیر ایک خاص حالت میں اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ تھا۔ بعض تو (قرآن شریف کی) تلاوت کر رہے تھے اور بعض ذکر (الٰہی) میں (مشغول تھے)اور بعض مراقبے میں(مستغرق) تھے اور بعض کتابوں کے مطالعہ میں (مصروف) تھے۔مجھ کو مکہ شریف میں (لوگوں کی ملاقات واشغال کے متعلق)اس سے زیادہ کسی شے نے خوش نہیں کیا۔ آپ کی تصانیف متعدد ہیں۔مثلاً حافظ سیوطیؒ کی جامع صغیر کی (فقہی) ترتیب اور مختصر النہایہ وغیرہما۔

آپ نے مجھ کو ایک نسخہ قرآن شریف اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا دکھایا جو صرف ایک ورق پر (لکھا ہوا) تھا۔اس کی ایک سطر میں ایک حزب کی چوتھائی تھی۔

شیخ محمد طاہر صاحب گجراتی رحمتہ اللہ علیہ

ولادت ۹۱۲ھ وفات ۹۸۶ھ

شیخ رضی الدین مرحوم کے بعد معلوم نہیں اس ملک میں کون سا محدث گذرا۔ہاں جہاں تک معلوم ہوا ہندیوں میں سے جس شخص نے ہندوستان میں علم حدیث کی طرح ڈالی اور احیائے سنت مطہرہ ورد بدعات کا بیڑا اٹھایا وہ شیخ محمد طاہر صاحبؒ پٹن گجراتی ہیں۔

شیخ صاحب ممدوح قوم بوہرہ سے باشندگان پٹن گجرات سے تھے۔ آپ ۹۱۲ھ ۹۱۴ھ میں پیدا ہوئے۔اور اس ملک کے باکمال بزرگوں سے تحصیل علم کرنے

کے بعد سفر حرمین شریفین (حرسهما الله و عظم شانهما) سے مشرف ہوئے۔ وہاں کے مشائخ حدیث سے فن حدیث کی تکمیل کی۔ خصوصاً شیخ علی متقی جونپوری مذکور الفوق سے۔ میر علی آزاد بلگرامی ماثر الکرام میں فرماتے ہیں "علوم متداولہ کی تحصیل کے بعد حرمین شریفین کی راہ لی اور وہاں کے علماء اور مشائخ سے ملاقات کی خصوصاً شیخ علی متقیؒ سے کہ آپ کی محفل اشرف سے بہت سے فیوض حاصل کیے اور آپ کی مریدی کی سعادت سے بھی فائز ہوئے۔" (مترجماً و ملخصاً صفحہ ۱۹۴) بعدہ اپنے وطن کی طرف واپس ہوئے اور اجرائے سنت مطہرہ اور رد بدعات میں نہایت سرگرمی سے سعی کرنے لگے حتیٰ کہ اپنے دل میں عہد کر لیا کہ جب تک اپنی قوم کی پیشانی سے بدعت کا داغ نہ دھولوں گا دستار سر پر نہ رکھوں گا۔ (سبحان اللہ)

۹۸۰ھ میں جب اکبر بادشاہ ہند نے گجرات کو مسخر کر لیا اور پٹن میں جو شیخ صاحب ممدوح کا وطن تھا شیخ صاحب سے ملاقات کی۔ اور حالات معلوم کیے تو شاہ قدر شناس نے اپنے دست خاص سے حضرت شیخ صاحب کے سر پر دستار رکھی اور کہا کہ آپ کے دستار (مبارک) کو ترک کر دینے کا باعث ہمارے گوش گذار ہوا ہے۔ دین اسلام کی نصرت آپ کے ارادے کے موافق ہماری عدالت کا فرض ہے۔

اسی سال میں گجرات کی حکومت خان اعظم مسند میرزا عزیز کوکلتاش کے سپرد کی گئی چنانچہ اس کی اعانت و توجہ خصوصی سے بہت سی رسوم و بدعات کی بیخ کنی ہو گئی۔ لیکن ان کے تھوڑی دیر بعد حکومت عبدالرحیم خاں خانخاناں کو دی گئی جس کی حمایت میں فرقہ مہدویہ یعنی سید محمد جونپوری مدعی مہدویت کے پیرو پھر جاگ اٹھے۔ شیخ صاحب ممدوح نے پھر دستار اتار دی اور دارالخلافہ اکبر آباد یعنی آگرہ کا قصد کیا۔ تاکہ سارا ماجرا خود بادشاہ کے کانوں تک پہنچائیں۔ مخالفین کی بھی ایک جماعت پیچھے ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے رستہ ہی میں آپ کو اوجین اور سارنگپور کے درمیان گرا کر شہید کر دیا۔ یہ واقعہ جاں گزا ۹۸۶ھ میں ہوا۔

تصانیف: شیخ مرحوم نے علم حدیث کی نہایت قابل قدر خدمت کی۔ راویان

علم حدیث کے اسماء کی حرکات کا ضبط نہایت ضروری ہے۔اس کے متعلق ایک کتاب بنام مغنی لکھی جو دہلی میں تقریب التہذیب کے ساتھ مکرر چھپ چکی ہے[1] اسی طرح علم حدیث کی حل لغات میں مجمع بحار الانوار جو نہایت مشہور کتاب ہے۔ مفید و قابل قدر یادگار چھوڑی۔ جو تین جلدوں میں ہندوستان میں مکرر چھپ چکی ہے۔ یہ کتاب فائق زمخشری اور نہایہ ابن اثیر کی جامع ہے۔

الحمد للہ کہ خاکسار کے پاس یہ سب کتابیں موجود ہیں (نفعنی اللہ بہا فی الدنیا و الآخرہ)

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ

ولادت ۹۵۸ھ وفات ۱۰۵۲ھ

شیخ محمد طاہر صاحب پٹنی کے بعد اسی زمانے میں علم حدیث کی خدمت کا تمغہ شیخ عبدالحق صاحب دہلوی کے بازو پر ہے۔ آپ قوم ترک سے ہیں۔ آپ کے والد کا نام سیف الدین ہے جو شاہ عالی جاہ شاہجہاں مرحوم کے وقت دہلی میں متوطن ہوئے اور یہیں ہمارے شیخ صاحب ۹۵۸ھ میں پیدا ہوئے۔

اپنے وطن دہلی سے بائیس سال کی عمر میں تحصیل علوم کے بعد زیارت حرمین سے مشرف ہوئے اور کئی سال تک فن حدیث کی تکمیل[2] کے بعد وطن کو مراجعت کی اور اس فن کی خدمت کرنے لگے۔ چنانچہ لمعات شرح عربی مشکوٰۃ اور اشعۃ اللمعات شرح فارسی

---

[1] اس کے بعد خاتمہ پر ایک فصل تواریخ میں مقرر ہے۔ جس میں عموماً حضور اکرم ﷺ اور خلفائے اربعہ اور ائمہ اربعہ اور بعض دیگر اجلہ محدثین رحمہم اللہ اجمعین کے سنہ ولادت اور وفات لکھنے پر اکتفا کیا ہے۔ اس فقیر نے اس پر کچھ زیادہ کر کے اس کا نام اثمار اشمار یخ فی تفصیل التواریخ نام کتاب شروع کر رکھی ہے خدا اپنے فضل سے اختتام کو پہنچائے۔ یہ کتاب ایسے حال میں لکھ رہا ہوں کہ بینائی نہایت کمزور ہو گئی ہے۔ اللھم متعنی بسمعی و بصری و اجعلھما الوارث منی۔ خاکسار گنہگار میر سیالکوٹی جنوری ۱۹۵۲ء مطابق ۱۶ ربیع الثانی ۱۳۷۱ھ۔

[2] حضرت نواب صاحب مرحوم ابجد العلوم میں فرماتے ہیں رحل الی الحرمین و صحب الشیخ عبدالوھاب المتقی خلیفۃ الشیخ علی المتقی و اکتسب علم الحدیث و عادالی الوطن و استقربہ اثنتین و خمسین سنۃ بجمعیۃ الظاھر و الباطن و نشر العلوم (صفحہ ۹۰۱) یعنی بائیس سال کی عمر میں حرمین شریفین کا سفر کیا اور شیخ علی متقی کے خلیفہ شیخ عبدالوہاب کی صحبت میں رہے اور ان سے علم حدیث حاصل کیا اور اپنے وطن کی طرف لوٹے۔ اور باون سال

مشکوٰۃ اور شرح سفر السعادت وغیرہ نہایت عمدہ خدمتیں ہیں۔ اگرچہ ان تصانیف میں عموماً اپنے مذہب حنفی کی تائید کی ہے اور شان محدثیت کے لائق فتح الباری وغیرہ کتب کی تحقیقات سے اپنی کتب کو مزین نہیں کیا۔ لیکن پھر بھی بہت سے مسائل میں فقہائے حنفیہ کے مقابلے میں اہل حدیث کی جانب کو ترجیح دی ہے جو غنیمت ہے۔ آپ کی تحقیقات حدیثیہ کا ماخذ زیادہ تر ابن ہمام کی فتح القدیر اور علامہ عینی کی شرح بخاری ہے۔ جو خود مذہب حنفی کی تقلید کے ملتزم تھے اور شرح مشکوٰۃ میں زیادہ تر طیبی اور مرقاۃ مصنفہ ملا علی قاریؒ وغیرہما سے لیا ہے۔ آپ پر صوفیانہ مذاق غالب تھا۔ قادری طریق پر تھے۔ سید موسیٰ کے مرید تھے جو شاہ جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد سے تھے۔ اس فن کی خدمت میں بھی کتابیں لکھیں۔ چنانچہ حضرت سید عبدالقادر جیلانیؒ کی کتاب فتوح الغیب کی شرح فارسی ایک مفید یادگار ہے۔

شروح کتب کی خدمت کے علاوہ آپ نے بعض مستقل کتابیں بھی لکھیں مثلاً مدارج النبوۃ جو آنحضرت ﷺ کی ایک مبسوط سوانح عمری ہے۔ اس میں صحت روایات کا التزام نہیں کیا۔ بلکہ ہر قسم کی ضعیف و صحیح روایات کو بغیر تنقید کے جمع کر دیا ہے۔ جو بوجہ شیخ صاحب کی قبولیت عامہ کے عام واعظین کا خزانہ وعظ اور عیسائی وغیرہ معترضین اسلام کے لئے مایہ اعتراضات ہے۔

اسی زمانہ میں امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کا آفتاب مجددیت بھی نور افگن تھا اور بدعات کے بادل ہوا ہو رہے تھے۔

چونکہ حضرت مجدد صاحب احیائے سنت ورد بدعت میں نہایت سرگرم تھے اس لئے حضرت شیخ صاحب کو آپ سے بعض امور کی وجہ سے جو ان کی نظر میں بوجہ تقلید و اختیار تصوف مروجہ کے معیوب نہ تھے کچھ نقار تھا۔ لیکن اخیر عمر میں جب خدا تعالیٰ

تک ظاہر و باطن کی جمعیت کے ساتھ یہیں ٹھیرے رہے اور علوم کی اشاعت کرتے رہے۔ اس سے آگے فرماتے ہیں آپ کی تصانیف سو تک پہنچتی ہیں۔ نیز فرماتے ہیں کہ جب میں دہلی میں وارد ہوا تو آپ کی قبر کی زیارت کو گیا اور موضع قبر کو انس و ٹھنڈک کا موجب پایا (رحمہ اللہ) (صفحہ ۹۰۱)

نے طبیعت سے پردہ اٹھادیا اور حضرت مجدد صاحب کے طریق عمل کی راستی مشہود ہو گئی تو سب غبار و نقار جاتا رہا۔ اور ایسی صفائی حاصل ہوئی کہ باید و شاید۔ چنانچہ آپ خود حضرت خواجہ حسان الدین خلیفہ حضرت شاہ باقی باللہ صاحب (قدس اللہ اسرارہم) کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

ان ایام میں شیخ احمد (رحمہ اللہ) کی نسبت فقیر کی صفائی حد سے بڑھ گئی ہے۔ ہرگز بشریت کا پردہ اور طبیعت کا حجاب باقی نہیں رہا۔ عقل و انصاف و طریقت سے قطع نظر کر کے (یوں بھی) ایسے بزرگواروں اور عزیزوں کی برائی کوئی مناسب نہیں۔ اور (میرے) باطن میں بطریق ذوق و وجدان و غلبہ (حال) ایسا کچھ آگیا ہے کہ زبان اس کے ذکر سے گونگی ہے۔ پاک ہے وہ خدا جو دلوں کا پھیرنے والا اور احوال کا بدلنے والا ہے۔ شاید ظاہر بین لوگ اس بات کو بعید جانیں۔ میں نہیں جانتا کہ (میرا) کیا حال ہے اور کس طور پر ہے۔ (عالم بے خودی و حیرت طاری ہے) (انتہی مترجما از اتحاف صفحہ ۳۰۵)

سبحان اللہ! ہمارے بزرگان دین کے دلوں میں کیسی صفائی تھی اور وہ کس قدر صادق الاحوال تھے کہ جب اپنی غلطی یا دوسرے بھائی کی بے گناہی معلوم ہوئی تو فوراً اس سے رجوع کر کے اس کا اعلان کر دیا اور اس پر اصرار و ضد ہرگز نہیں کی۔ خداوندا! ہم کو بھی ایسے پاک باطن نصیب کر آمین۔

مجھ عاجز کو آپ کے علم و فضل اور خدمت علم حدیث اور صاحب کمالات ظاہری و باطنی ہونے کی وجہ سے حسن عقیدت ہے۔ آپ کی کئی ایک تصانیف میرے پاس موجود ہیں۔ جن سے میں بہت سے علمی فوائد حاصل کرتا رہتا ہوں۔

امام ربانی مجدد الف ثانی
شیخ احمد سرہندی رحمتہ اللہ علیہ

ولادت شوال ۹۷۱ھ وفات ۱۰۳۴ھ

شیخ عبدالحق کے بیان سے معلوم ہو چکا ہے کہ آپ ان کے معاصر ہیں۔ آپ کی

ولادت باسعادت ۱۴ شوال ۹۷۱ھ میں قصبہ سرہند ضلع انبالہ میں ہوئی- آپ کا نسب نامہ کئی پشتوں کے بعد حضرت فاروق اعظمؓ سے جا ملتا ہے-

ابتدا میں قرآن حفظ کیا- ابتدائی تعلیم کئی دیگر علوم اور فیوض باطنیہ اپنے والد ماجد مخدوم عبدالاحد صاحبؒ سے حاصل کئے- جو اپنے وقت کے مسلم باکمال بزرگ تھے- اس کے بعد مختلف بلاد کا سفر کر کے زمانہ کے متعدد فضلا سے تحصیل کی- چنانچہ سیالکوٹ پہنچ کر بڑی تحقیق سے بعض علوم عقلیہ استاذ زمانہ مولانا المحقق ملا کمال کشمیری سیالکوٹی سے اور فن حدیث ملا یعقوب کشمیری سے حاصل کیا-

آپ نے حرمین شریفین میں اکابر محدثین کی صحبت سے فیض اٹھایا اور ان سے حدیث شریف کی سند حاصل کی اور حدیث رحمت یعنی الراحمون یرحمھم الرحمن (رواہ الترمذی فی نوادرہ) کو مسلسلا ابن فہد سے جو اکابر محدثین کی صحبت سے فیض اٹھایا اور ان سے حدیث اور صحاح ستہ اور دوسری کتابوں کی اجازت حاصل کی (ابجد العلوم جلد چہارم صفحہ ۸۹۸)

علمی خدمات :- ۱۷ سال کی عمر میں تمام علوم درسیہ سے فارغ ہو کر تدریس میں مشغول ہو گئے- آپ نے عربی و فارسی میں بہت لطیف رسائل لکھے ہیں- آپ کے مکتوبات تین جلدوں میں ہیں- جو آپ کے تبحر علمی پر قطعی حجت ہیں- سنا گیا ہے کہ ان کا ترجمہ عربی میں بھی ہو چکا ہے- مگر دیکھنے میں نہیں آیا- آپ کی کئی ایک اور تصانیف بھی ہیں-

آپ کے والد ماجد نے ۱۰۰۷ھ میں وفات پائی تو آپ ۱۰۰۸ھ میں دہلی پہنچے- جہاں پر اپنے مخلص دوست خواجہ حسن کشمیری کی وساطت سے حضرت خواجہ باقی باللہؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے- دونوں بزرگوں کے دلوں میں بوجہ صفائی قلب ایسا جذب پیدا ہوا کہ حضرت خواجہ صاحب نے ان کے آنے کو غنیمت جانا اور انہوں نے ان کی صحبت کو اکسیر سمجھا-

آپ نے حضرت خواجہ باقی باللہؒ صاحب سے نقشبندی طریقہ کا فیض پایا اور اسی

طرح دیگر مشائخ طریقت سے تصوف کے دوسرے طریقوں کا فیض حاصل کیا- آپ کا سلسلہ یعنی طریقہ مجددیہ ہند سے ماوراء النہر' روم' شام' عرب اور مغرب اقصی تک پہنچ گیا-

آپ بلا اختلاف عالم باعمل' عارف کامل' جامع کمالات ظاہری و باطنی اور گیارہویں صدی کے مسلم مجدد ہیں- مجددیت کا لقب سب سے پہلے آپ کو مولانا عبدالحکیم صاحب سیالکوٹی نے دیا کہ وہ بھی ملا کمال کشمیری ممدوح کے شاگرد تھے-

عام قبولیت اور ابتلا: عام قبولیت کے سبب آصف خاں وزیر اعظم نے جو شیعی المذہب تھا- جہانگیر بادشاہ کے گوش گذار کیا کہ ان کا شہرہ اور لوگوں کی ان سے ارادت و عقیدت خطرہ سے خالی نہیں- اکثر امرائے دربار مثل خانخاناں و سید صدر جہاں و خانجہاں و خان اعظم و مہابت خاں و نزہت خاں و اسلام خاں و سکندر خاں و دریا خاں و مرتضی خاں وغیرہم ان کے معتقد و مرید ہو گئے ہیں- بادشاہ نے اول تو آپ کے معتقد سرداروں کو دور دور کے علاقوں میں تبدیل کر دیا اور پھر حاکم سربلند کے نام فرمان بھیجا کہ آپ کو شاہی ملاقات کے لئے نہایت عزت واحتشام سے دربار میں بھیج دے- دربار میں جانے پر آپ نے نہ تو سجدہ سلام ادا کیا جو جہانگیر کے دربار میں مروج تھا اور نہ آپ دیگر لوازمات آداب و کورنشات شاہی بجا لائے- ندیموں نے طریق معتادہ پر سجدہ کرنے کا اشارہ کیا تو آپ نے فرمایا یہ پیشانی غیر اللہ کے لئے نہ کبھی پہلے جھکی ہے اور نہ جھکے گی- اس جرات کا نتیجہ یہ ہوا کہ جہانگیر نے آپ کو خطرناک سمجھ کر بمشورہ وزیر مع آپ کے ساتھیوں کے قلعہ گوالیار میں نظر بند کر کے بھیج دیا- آپ نے وہاں پہنچ کر اپنے کل خلفاء کو خطوط لکھے کہ میری یہ کیفیت میری رضامندی سے ہے- آپ لوگ شاہ وقت کے برخلاف کوئی ایجی ٹیشن (بغاوت) نہ کریں- آپ تین سال قید میں رہے- اس اثناء میں جہانگیر بیمار پڑا اور اسے خواب میں تنبیہ کی گئی- جس پر اس نے رہائی کا حکم دیا- نہایت عزت واحترام سے اکبر آباد (آگرہ) میں بلایا- اور دعا کی درخواست کی- آپ نے گیارہ خلاف شرع رسوم کی جو سلطنت میں رائج ہو چکی تھیں اصلاح کے

لئے فرمایا- سب سے ضروری اصلاح سجدہ تعظیمی کی موقوفی تھی- جہانگیر نے بصدق دل سب کچھ قبول کیا- آپ نے دعا فرمائی جسے اللہ تعالی نے شرف قبولیت بخشا اور جہانگیر شفایاب ہو گیا- یہی آپ کی مجددیت کی شہرت کا زینہ ہے- اس کے بعد یوماً فیوماً آپ رد بدعات و اصلاح رسوم شرکیہ میں مصروف رہے- آپ کا نام عام طور پر مجدد صاحب مشہور ہو گیا اور آپ مجدد الف ثانی یعنی گیارہویں صدی کے مجدد کے لقب سے پکارے جانے لگے- اس کے بعد پھر آپ سرہند تشریف لائے- آپ نے ۶۳ سال کی عمر میں ۱۰۳۴ھ میں وفات پائی اور سرہند میں مدفون ہو کر اس سرزمین کو شرف بخشا-

شیخ نور الحق رحمۃ اللہ علیہ

ولادت ۹۸۳ھ وفات ۱۰۷۳ھ

شیخ عبدالحقؒ کے کمالات ظاہری و باطنی کی وراثت اور علم حدیث کی خدمت آپ کے بیٹے شیخ نور الحق صاحب کو ملی چنانچہ انہوں نے بھی اپنے والد ماجد سے کمالات صوری و معنوی کے ساتھ علم حدیث کو بھی مکمل کیا اور صحیح بخاری کی شرح فارسی تیسیر القاری لکھنی شروع کی- خاکسار نے اس کا ایک قلمی نسخہ مکہ مکرمہ کے کتب خانہ میں جو ۱۳۲۱ھ تک باب الصفا کے پاس ایک کمرہ میں تھا- دیکھا- اور اس سے فائدہ اٹھایا- طریق بیان شستہ و دلچسپ ہے- شیخ مرحوم نے نوے سال کی عمر میں ۱۰۷۳ھ میں اس دار فانی سے عالم جاودانی کی طرف رحلت کی-

مدت العمر آپ تدریس علم حدیث کی خدمت بجالاتے رہے- آپ کے فیوض و برکات کا کچھ ذکر آئندہ سید مبارک بلگرامی کے ذکر میں دیکھئے- رحمهما الله و ايانا و افاض علينا من بركاتهما-

سید مبارک محدث بلگرامی رحمہ اللہ

ولادت ۱۰۳۳ھ وفات ۱۱۱۵ھ

اس مبارک ہستی کا ترجمہ کسی قدر تفصیل سے میر غلام علی صاحب آزاد بلگرامیؒ نے لکھا ہے جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے-

صحیح الاصول والفروع تھے اور احیائے سنت اور ازالہ بدعت کا نقارہ بجاتے تھے۔ علوم ظاہری و باطنی میں یگانہ اور تقوی و طہارت میں ممتاز زمانہ تھے۔ چھ ماہ شعبان مکرم ۱۰۳۳ھ میں پیدا ہوئے۔ شروع جوانی میں تحصیل علوم میں لگ گئے اور ابتدا سے انتہا تک علوم نہایت پختگی سے حاصل کیے۔ ابتدائی تعلیم میر سید طیب بن میر عبدالواحد قدس اسرارہما اور دیگر فضلائے بلگرام اور اس کے اطراف کے علما سے حاصل کی اور ۱۰۶۱ھ میں تکمیل علوم کے لئے دہلی میں تشریف لے گئے اور خواجہ باقی باللہ صاحب[1] (رحمتہ اللہ علیہ) کے فرزند خرد خواجہ عبداللہ صاحب المشہور بخواجہ خرد (رحمتہ اللہ علیہ) کی خدمت میں پہنچ کر کتاب مطلوب پڑھی اور زمانہ اقامت دہلی میں شیخ نورالحق صاحب بن شیخ عبدالحق صاحب (رحمتہ اللہ علیہما) کے مکان پر سکونت پذیر رہے۔ اور ان سے علم حدیث حاصل کر کے اس فن اشرف میں مہارت عالی حاصل کی اور اپنی تمام عمر اسی فن مبارک کی خدمت میں ختم کر دی۔ حتی کہ آپ لقب محدث سے مشہور ہو گئے۔ حسان الہند حضرت میر علی صاحب آزاد بلگرامی ماثر الکرام میں ان کے ترجمہ میں فرماتے ہیں لہٰذا ہم نے ان کو اس کتاب میں قطب المحدثین سے یاد کیا ہے[2] آپ نے شیخ نورالحق صاحبؒ سے ۱۰۶۴ھ میں تحصیل علوم سے فراغت پائی اور ۱۰۷۲ھ میں دہلی میں میر سید عبدالفتاح عسکری احمد آبادی قدس سرہ کے دست حق پرست پر سلسلہ علیہ قادریہ کی بیعت کی۔ ان سب فیوض ظاہری و باطنی سے دامن بھر کر اپنے وطن بلگرام کی طرف لوٹے اور مسند توکل و قناعت کو زینت دی اور باقی عمر یاد الٰہی اور ریاضت اور تدریس علوم خصوصاً علم حدیث شریف میں گزار کر ۱۱۱۵ھ میں رحلت فرمائی۔

---

[1] حضرت خواجہ باقی باللہ صاحب قدس سرہ دہلی کے مشہور اولیاء اللہ سے ہوئے ہیں۔ آپ مرشد تھے حضرت مجدد صاحب رحمتہ اللہ علیہما کے۔ حضرت خواجہ مرحوم کی وفات کے وقت دو حرموں سے آپ کے دو شیر خوار فرزند تھے جن کے لئے آپ نے حضرت مجدد صاحبؒ کو تعلیم و تربیت کی وصیت کی تھی۔ فرزند اکبر کو خواجہ کلاں اور فرزند اصغر کو خواجہ خرد کہتے تھے ماثر الکلم صفحہ ۱۰۰۔

[2] ماثر الکرام صفحہ ۹۵۔

جذبہ اتباع شریعت :- اتباع شریعت اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا جذبہ آپ کے خمیر میں تھا- کسی کی کیا مجال کہ آپ کے حضور میں جادہ شرع سے باہر قدم رکھے - آپ کے کئی فرزند آپ کی زندگی ہی میں قضا کر گئے- کسی کے ماتم پر بھی خلاف شرع رسوم کا ارتکاب نہ ہو سکا- میر صاحب ممدوح نہایت لطیف طبع اور نکتہ سنج اور لطیفہ گو تھے- باجود اس کے اتنی ہیبت اور رعب تھا کہ آپ کے سامنے لوگوں کے پتے[1] پانی ہو ہو جاتے تھے-

(۱) ایک روز غیرت خاں حاکم لکھنؤ حضور کی زیارت کے لئے حاضر خدمت ہوا- خاں صاحب موصوف کا پاجامہ چوڑی دار تھا- جو حد شرع سے متجاوز تھا ٹخنوں سے نیچے تھا- میر صاحب نے اعتراض کیا- غیرت خاں صاحب کی مجال نہ تھی کہ کچھ عذر کر سکیں فوراً اپنے ہاتھ سے حد شرع سے زائد پائنچہ کاٹ ڈالا-

عادات : آپ نہایت سادگی- بے نفسی اور توکل سے زندگی بسر کرتے تھے- اپنی حاجت کسی دوسرے پر ظاہر نہ کرتے تھے- استاد المحققین میر طفیل محمد بلگرامی (آپ کے شاگرد) فرماتے تھے- میں ایک روز میر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا- آپ وضو کی تیاری کے لئے اٹھے ہی تھے کہ ناگاہ زمین پر گر پڑے- میں جلدی سے دوڑ کر پاس گیا- ایک ساعت کے بعد افاقہ ہو گیا- میں نے اس کا سبب دریافت کرنے کی جرات کی- بہت اصرار کرنے کے بعد فرمایا "تین روز ہو گئے ہیں کہ غذا کی جنس سے کوئی چیز میسر نہیں آیا اور ان تین روز میں نہ تو یہ بات کسی پر ظاہر کی اور نہ کسی سے قرض مانگا-" میرے دل میں رقت آگئی اور میں فوراً اپنے مکان کی طرف دوڑا اور شیریں طعام جو حضرت کو مرغوب تھا- تیار کرا کے حاضر خدمت کیا- اول تو آپ بہت خوش ہوئے اور مجھے دعائیں دینے لگے- لیکن بعد ازاں فرمانے لگے ایک بات کہتا ہوں بشرطیکہ تم کو گراں نہ گزرے- میں نے عرض کیا فرمایئے-! فرمانے لگے فقراء کی اصطلاح میں اس

---

[1] ہر جانور کے پیٹ میں جگر کے ساتھ ایک تھیلی ہوتی ہے جس میں سبز رنگ کا پانی جو مزا میں سخت کڑوا اور تاثیر میں زہرناک ہوتا ہے اسے پتہ کہتے ہیں-

کو طعام اشراف[1] کہتے ہیں- ہر چند کہ فقہاء کے نزدیک اس کا کھانا جائز ہے اور شریعت میں بعد تین روز (کے فاقہ) کے مردار بھی حلال ہے لیکن فقراء کے طریقہ میں طعام اشراف جائز نہیں ہے- میں نے جب یہ بات سنی تو بلا چون وچرا اٹھ کھڑا ہوا اور طعام اٹھا کر لے کر دروازہ کے باہر آگیا- کچھ دیر توقف کر کے وہ طعام لئے ہوئے پھر حاضر خدمت ہوا اور عرض کی کہ جب بندہ طعام اٹھا کر لے گیا تھا- تو کیا حضرت کو توقع تھی کہ میں یہ طعام پھر واپس لاؤں گا؟ آپ نے فرمایا نہیں- میں نے عرض کیا کہ اب جب کہ یہ طعام بندہ حضرت کی توقع کے بغیر لایا ہے تو یہ طعام اشراف نہ رہا- حضرت میر صاحب میری اس توجیہ پر بہت محظوظ ہوئے- اور فرمانے لگے تو نے عجب فراست کی ہے پھر آپ نے وہ طعام برغبت تمام تناول فرمالیا-

(۲) نیز استاد المحققین فرماتے تھے کہ سلطان اورنگ زیب عالمگیر (انار اللہ برہانہ) کی پیش گاہ سے علامہ مرحوم میر عبدالجلیل بلگرامی[2] کی تعیناتی بخشی گیری اور وقائع نگاری کی خدمت پر گجرات شاہ دولہ[3] (پنجاب) میں ہوئی- تو آپ دکن سے بلگرام میں تشریف

---

[1] اشراف- نفس کے جھکاؤ کو کہتے ہیں- اہل طریقت بزرگ دنیا کے لذائذ کو نفس کے جھکاوے استعمال نہیں کرتے بلکہ بغیر اس کے جو کچھ میسر آوے اس کو نعمت الٰہی سمجھ کر استعمال کر لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاتے ہیں- نفس کے جھکاؤ کے سوا حاصل شدہ کو قبول کرنا اہل طریقت نے اس حدیث سے لیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمرؓ کو کچھ عطا کیا تو حضرت عمرؓ نے عرض کیا اعطه افقرمني حضور یہ مال کسی زیادہ حاجتمند کو عطا کیجئے- اس پر آنحضرت نے فرمایا ما اعطيت من غير اشراف نفس الخ یعنی جو کچھ تجھ کو نفس کے جھکاؤ کے سوا دیا جائے اس کو لے لے- پھر اسے خود صرف کر یا صدقہ کر دے تیرا اختیار ہے (صحیح بخاری ملخصا) حضرت میر صاحب نے جب اپنا فاقہ اپنے شاگرد استاد المحققین کے پاس ذکر کر دیا اور وہ فورا طعام لذیذ تیار کرا کے لے آئے تو اس میں آپ کے خیال میں اشراف نفس پایا گیا- اس لئے اس کے کھانے سے پرہیز کی- استاد المحققین صاحب علم و معرفت تھے سمجھ گئے اور باہر جا کر کچھ دیر توقف کر کے وہی کھانا واپس لائے تو اس میں حضرت میر صاحب کا اشراف نفس نہ تھا اس لئے تناول فرمالیا- سبحان اللہ-

[2] میر عبدالجلیل مرحوم حسان الہند میر غلام علی آزاد مصنف ماثر الکرام کے نانا تھے- آپ بھی استاد المحققین کی طرح میر مبارک صاحب کے شاگرد تھے (ان کا ذکر انشاء اللہ آگے آئے گا)

[3] حضرت شاہ دولہ ایک فقیر ہوئے ہیں- ان کا مقبرہ شہر گجرات پنجاب کے مشرقی دروازہ کے باہر زیارت گاہ ہے- شہر سیالکوٹ میں ندی پر جو پل ہے وہ بھی اور عید گاہ کلاں بھی انہی فقیر صاحب کی یادگار ہے-

لائے اور بلگرام سے گجرات کا قصد کیا- علامہ مرحوم نے مجھے ساتھ چلنے کے لئے فرمایا- میں نے قبول کر لیا تو میں نے میر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا ارادہ سفر عرض کیا- میر صاحب موصوف نے فرمایا میری عمر اخیر کو پہنچ چکی ہے- میں چاہتا ہوں تم اس وقت مجھ سے جدا نہ ہو اور میرے جنازے میں حاضر ہو- میں سوچ میں پڑ گیا کہ میر عبدالجلیل صاحب کی رفاقت بھی ضروری ہے- اتنے میں حضرت صاحب نے مراقبہ کیا- دیر کے بعد سر اٹھا کر فرمایا "جاؤ" امید ہے کہ ایک دفعہ پھر بھی ملاقات ہو گی- چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جس سال حضرت میر صاحب کی وفات ہونی والی تھی- میر عبدالجلیل صاحب کو ایک ضروری کام آ پڑا- جس کے لئے انہوں نے مجھے (استاد المحققین) کو بلگرام میں بھیجا- میرے یہاں آنے کے تھوڑی مدت بعد حضرت میر صاحب کا انتقال ہو گیا اور آپ نے نماز جنازہ کی امامت کے لئے میرے حق میں وصیت کی-

سنہ وفات : آپ کا انتقال مبارک بروز دو شنبہ بتاریخ بیس ماہ ربیع الاول ۱۱۱۵ھ ہوا- میر عبدالجلیل مرحوم بلگرامی نے تاریخ وفات یوں لکھی-

مقدس گہر میر سید مبارک
چو فرمود در بحر رحلت شناہ
پے رحلت آں مطہر سرشت
خرد گفت تاریخ رضواں پناہ

شیخ نورالدین احمد آبادی رحمتہ اللہ علیہ

ولادت ۱۰۶۴ھ — وفات ۱۱۵۵ھ

باپ کا نام محمد صالح ہے- احمد آباد (گجرات) میں ۱۰۶۴ھ میں پیدا ہوئے- ملا احمد سلیمانی اور ملا فرید الدین احمد آبادی سے تحصیل علوم کی اور سر آمد روزگار ہو گئے ۱۱۴۳ھ میں مشرف زیارت حرمین شریفین (حرسہا اللہ) حاصل کیا۔[1]

مختلف فنون میں مفید کتابیں لکھیں جن کی تعداد کوئی ڈیڑھ سو سے زیادہ ہے- تفسیر قرآن مجید اور شرح صحیح بخاری بھی لکھی جس کا نام نورالقاری ہے- آپ صوفیانہ

مذاق رکھتے تھے- چنانچہ حضرت محبوب عالم صاحب احمد آبادی سے بیعت و خلافت خانوادہا حاصل کی- ابتدائے عمر سے آخر تک تدریس و تصنیف میں وقت بسر کیا اور ۱۱۵۵ھ میں اکانوے (۹۱) برس کی عمر میں رحلت کی عامله الله برحمة الواسعة

صاحب کمالات صوری و معنوی ماہر علوم ظاہر و باطنی علامہ نبیل فاضل نامی و گرامی میر عبدالجلیل بلگرامی رحمہ اللہ

ولادت ۱۰۷۱ھ　　　　وفات ۱۱۳۸ھ

سید مبارک محدثؒ کے ذکر میں گذر چکا ہے کہ میر عبدالجلیل صاحب بلگرامیؒ میر غلام علی آزاد بلگرامیؒ کے نانا اور سید مبارک کے شاگرد رشید اور استاذ المحققین میر طفیل محمد صاحب بلگرامی کے ہم درس ہیں- اور یہ بھی گذر چکا ہے کہ آپ خلد مکان حضرت محی الدین اورنگ زیبؒ کے وقت میں مختلف ممتاز عہدوں پر مامور رہ چکے ہیں- بالخصوص گجرات پنجاب میں چار سال تک عہدہ وقائع نویسی و بخشیگری پر گذار چکے ہیں- باقی حالات علمی و عملی سطور ذیل میں ملاحظہ فرمائیں- وباللہ التوفیق-

۲- ان کے کمالات کی وجہ سے کئی مہینوں تک اس عاجز کا قلم رکا رہا کیونکہ آپ کے کمالات ظاہری و باطنی اور مختلف علوم عربیہ میں آپ کے تبحر کی وجہ سے دل و دماغ پر حیرت افزا اثر تھا- آخر اس خیال سے کہ قلم فرسائی سکون سے اور لب کشائی سکوت سے بہتر ہے اپنے عجز و ناتوانی کا اقرار کرتے ہوئے سطور ذیل سے آں برگزیدہ انفس و آفاق کا تعارف اپنے ناظرین کو کراتا ہوں- واللہ ولی التوفیق-

نسب و ولادت : آپ خاندان سادات بلگرام کے روشن چراغ ہیں- جن کی ذات گرامی صفات سے بلگرام کو چار چاند لگ گئے- آپ کے والد ماجد کا نام سید امیر احمد ہے جو جامع کمالات صوری و معنوی تھے-

ولادت : آپ نے بتاریخ ۱۳ شوال ۱۰۷۱ھ اپنے نور ولادت سے خطہ بلگرام کو منور کیا- درسیات کی ابتدائی کتابیں استاذ المحققین کے ہمراہ سید سعد اللہ بلگرامیؒ کی خدمت

میں پڑھیں- پھر بلاد پورب کا قصد کیا اور درمیانی کتابیں متفرق مقامات کے ماہرین فن استادوں سے پڑھیں- آخر لکھنؤ میں شیخ غلام نقشبند صاحب کی خدمت میں پہنچے اور انتہائی کتابیں ان سے حاصل کر کے تکمیل تحصیل کی-

پھر وطن مالوف کو لوٹے اور فن حدیث کی سند قطب المحدثین سید مبارک محدث بلگرامی سے حاصل کی- ہر فن عقلی و نقلی میں صاحب کمال تھے- خصوصاً علم حدیث و تفسیر و لغت و فنون' عربیت و تاریخ و موسیقی میں مہارت تامہ رکھتے تھے- حافظہ بہت قوی تھا- چنانچہ کتاب قاموس اللغتہ اول سے آخر تک برزبان یاد تھی- اور احادیث نبویہ اور اسماء الرجال اور اسفار و امثال عرب اور واقعات تاریخیہ اس قدر مستحضر تھے کہ بقول حسان الہند" فکر کا محاسب ان کے شمار سے عاجز ہے- اور جامعیت علوم کا یہ عالم تھا کہ زمانہ کہن سال کی آنکھ نے ایسا صاحب کمال کم دیکھا ہو گا-

جب آپ کی ملاقات سید علی معصوم مدنی مصنف "سلافتہ العصر" سے اورنگ آباد (دکن) میں ہوئی اور صاحب موصوف نے آپ کے کمالات علمیہ معلوم کئے تو کہا کہ میں نے ساری عمر میں سید عبدالجلیل جیسا جامع العلوم شخص نہیں دیکھا-

شیخ غلام نقشبند آپ کے استاد ہمیشہ آپ کی تعریف و توصیف کرتے تھے- آپ عربی' فارسی' ترکی اور ہندی چار زبانوں کے بے مثل شاعر تھے- کسی زبان میں بھی ایسی کمی نہیں تھی کہ اس کے مقابلہ میں دوسری زبان کی مہارت کو فوقیت دی جا سکے-

خوش خطی : آپ کے نواسہ حسان الہند میر غلام علی آزاد بلگرامی ماثر الکرام دفتر اول میں آپ کے حالات میں آپ کے رسم الخط کے متعلق تحریر فرماتے ہیں-

"آپ کی پسندیدہ مبارک عادت تھی کہ جب آپ کتابت کا ارادہ کرتے تو پہلے بسم اللہ' الحمد للہ اور درود شریف کاغذ پر لکھ لیتے اور اس کے بعد مطلوبہ کتابت کرتے اور اخیر عمر تک اس عمل پر قائم رہے آپ نے ایک بہت بڑا کتب خانہ منجملہ اپنے باقیات صالحات کے چھوڑا ہے- اس میں اکثر کتابوں کا اپنے دست خاص سے مقابلہ اور اصلاح کی ہے- اور بہت سی کتابیں اپنے ہاتھ سے لکھی ہیں- شروع میں آپ نہایت عمدہ

شیریں خط ◻ لکھا کرتے تھے۔اس کے بعد آپ نے اپنی ایک نئی طرز ایجاد کی جو نہایت شیریں و دلنشیں و نظر افروز تھی۔ آپ کو کتابت کا اس قدر شوق تھا کہ بھکر میں اقامت کے آخری ایام میں صحیح بخاری کی کتابت کر رہے تھے اور اس کی تصحیح و مقابلہ کر رہے تھے۔جب آپ کی ملازمت سے علیحدگی کی اطلاع آئی تو واپسی پر بھکر کے قریب موضع نوشہرہ میں مقام کیا اور وہاں صحیح بخاری کی کتابت اور تصحیح و مقابلہ کے لئے چھ ماہ تک قیام کرنا پڑا اور چونکہ آپ کے ساتھ اور بہت سے اشخاص ہمرکاب تھے اس لئے ہزاروں روپیہ خرچ کرنا پڑا۔ صحیح بخاری کا وہ نسخہ متبرکہ اب آپ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔"

وصال :اس کے بعد آپ دہلی پہنچے اور وہیں شنبہ کی شب ۲۳ ربیع الاول ۱۱۳۸ھ میں آپ کا وصال ہوا۔ نعش مبارک کو حسب وصیت خود دار السلام بلگرام میں لایا گیا۔ جہاں آپ کو ٦ جمادی الاولی کو بوقت عصر اپنے والد بزرگوار جناب امیر احمد مرحوم کے قدموں میں سپرد خاک کیا گیا۔

آپ کی ایک کرامت یہ بھی تھی کہ باوجود اس کے کہ تابوت کو دہلی سے بلگرام لے جانے میں چودہ دن لگے اور گرمی کا موسم تھا مگر آپ کا جسم مبارک بالکل صحیح و سالم تھا۔کسی عضو میں کوئی بھی تغیر نہیں ہوا تھا۔جسد مطہر تازہ میت کی طرح تابوت سے چارپائی پر رکھا گیا اور آپ کے ہم درس استاد المحققین میر طفیل محمد صاحب بلگرامی نے اپنے ہاتھوں آپ کو قبر میں اتارا۔

راقم الحروف (غلام علی آزاد بلگرامی) نے آپ کی تاریخ وفات نکالی ہے۔

"اولئك لهم عقبى الدار – جنت عدن"

اور نیز آیہ کریمہ

"للذين احسنوا لحسنى و زيادة" (۱۱۳۸ھ) رحمه الله ملخصاً و مترجماً.

از ماثر الکرام دفتر اول صفحہ ۲٦۵ و صفحہ ۲٦٦

حاجی محمد افضلؒ صاحب سیالکوٹی

افسوس ہم کو اس پاک و مبارک وجود کے حالات مفصل نہیں ملے - جن کے نام نامی سے ہم (سیالکوٹی) فخر کر سکتے ہیں - جو کچھ ملتا ہے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اور جناب مرزا مظہر جانجاناں (علیہما رحمتہ) کے حالات میں تبعاً ملتا ہے کہ ان ہر دو بزرگواروں نے آپ سے علم حدیث حاصل کیا[1] اور آپ نے شیخ عبداللہ بن سالم بصری مکیؒ سے اور اسی نسبت سے ہم نے آپ کے ذکر خیر سے اپنی اس کتاب کو زیب دینا چاہا ہے - حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور جناب مرزا مظہر جانجاناں شہیدؒ ایسے لوگوں کا آپ کے سلسلہ تلمذ میں ہونا آپ کی افضلیت اور اسم با مسمیٰ ہونے کی بین دلیل ہے -

حضرت شاہ غلام علی صاحب رحمتہ اللہ علیہ آپ کی بغائت تعریف کرتے ہیں چنانچہ مقامات مظہریہ میں فرماتے ہیں -

ایشان از علمائے متبحر و فضلائے دانشور نداز اسرار معارف علوم باطن خطے و افرد ارند طریقه از حجته الله نقشبند فرزند و خلیفه حضرت ایشان محمد معصوم رحمة الله علیهما گرفته تاده سال استفاده فیوض باطن نمودند و تاد وازده سال از حضرت شیخ عبدالاحد فرزند و خلیفه خازن الرحمة شیخ محمد سعید فرزند سجاده نشین حضرت مجدد رحمة الله علیهم مشرف گردیده بمقامات عالیه رسیده اندوتحصیل علوم معقول و منقول

---

[1] چنانچہ حضرت شاہ صاحب اپنی کتاب القول الجمیل کے اخیر پر اپنی سند علم حدیث کے ذکر میں فرماتے ہیں - واجازنی مشکوٰۃ المصابیح و صحیح البخاری وغیرہ من الصحاح الست الثقة الثبت حاجی محمد افضل عن الشیخ عبدالاحد عن ابیه الشیخ محمد سعید عن جده شیخ الطریقة الشیخ احمد السهرندی بسنده الطویل المذکور فی مقاماتہ ترجمہ: اور مجھ کو اجازت دی مشکوٰۃ المصابیح اور صحیح بخاری وغیرہ صحاح ستہ کی معتمد ثابت القول حاجی محمد افضل نے شیخ عبدالاحد سے انہوں نے اپنے والد شیخ محمد سعید سے انہوں نے اپنے دادا شیخ طریقت شیخ احمد سرھندی سے ان کی سند طویل مذکور ہے - ان کے مقامات اور تصانیف میں -

و اسناد علم حدیث از ایشان نمودہ از شیخ سالم بصری ثم المکی علم حدیث نیز سند دارند (مقامات مظہریہ صفحہ ۹)

اور اسی کتاب میں دوسری جگہ حضرت جناب مرزا صاحب کی زبانی نقل فرماتے ہیں۔

پس بخدمت حضرت حاجی محمد افضل التماس توجہات نمودیم۔ فرمودند شما علی البصیرت سلوک کردہ ایدو کشف مقامات دارید و مارا چنداں کشف و علم مقامات نیست استفادہ باحسن وجوہ نتو اند شد۔ حضرت ایشاں (مرزا صاحب) میفرمودند۔ اگرچہ از آنحضرت (حاجی صاحب ممدوح) درظاہر استفادہ کردہ نشد۔ لیکن درضمن سبق حدیث فیوض از باطن شریف ایشاں رادر ذکر حدیث در نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم استغراق دست می داد و انوار و برکات بسیار ظاہر مے شد گویا در معنی صحبت پیغبر خدا صلی اللہ علیہ و سلم حاصل می شد و دریں اثنا توجہ و التفات نبوی صلی اللہ علیہ و سلم مشہود می گشت و نسبت کمالات نبوت درغائب وسعت و کثرت انوار جلوہ گری شودو معنی حدیث شریف العلماء ورثۃ الانبیاء علیہم السلام واضح می شد۔ ایشاں شیخ الحدیث واز روئے صحبت پیر فقیر اند فوائد بسیار در ظاہر و باطن تا بست سال از خدمت ایشاں حاصل نمودہ ایم۔

(مقامات مظہریہ صفحہ ۲۲ وصفحہ ۲۳)

حضرت مرزا مظہر جانجاناں شہید

ولادت رمضان شریف ۱۱۱۰ھ — وفات ۱۱۹۵ھ

آپ کا سلسلہ نسب ۲۸ واسطوں سے حضرت علی کے بیٹے امام محمد بن حنفیہ سے جا ملتا ہے۔ آپ کا نام شمس الدین حبیب اللہ ہے اور آپ کے والد ماجد کا نام میرزا جان تھا۔

اسی وجہ سے مرزا آپ کے نام کا جزو بن گیا ہوا ہے۔

حسان ہند میر غلام علی صاحب آزاد بلگرامی نے اپنی کتاب ''سرو آزاد'' میں درج کرنے کے لئے مرزا صاحب موصوف سے آپ کے حالات دریافت کئے۔اس پر آپ نے اپنے جو حالات خود تحریر فرمائے۔ان کا اردو ترجمہ بہ طور اختصار حسب ذیل ہے۔

''جان جاناں نام۔ مظہر تخلص۔ پسر میرزا جان۔ جانی تخلص۔ علوی نسب ہندی مولد۔ حنفی مذہب اور نقشبندی مشرب۔ پیدائش ۱۱۱۱ھ ظاہری نشو و نما اکبر آباد (آگرہ) میں ہوئی اور باطنی تربیت شاہجہان آباد (دہلی) میں حضرت سید محمد بدایونی نقشبندی سے حاصل کی۔ میرا نسب ۲۸ واسطوں سے حضرت محمد بن حنفیہؒ کے ذریعہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جا ملتا ہے۔

میرے جد اعلیٰ امیر کمال الدین نویں صدی ہجری کے شروع میں طائف کے علاقہ سے آکر ترکستان میں مقیم ہوئے اور عرصہ دراز تک ان علاقوں میں فرمانروائی کی۔ان کی اولاد بہت سی تھی جن میں سے امیر مجنون اور امیر بابا ہیں جو ہمایوں بادشاہ کے ہندوستان کے فتح کرنے کے موقع پر اس ملک (ہند) میں وارد ہوئے۔اس کے بعد سلاطین گورگانیہ کی خدمت اور رفاقت اس خاندان کا شعار رہا۔

میرزا جان مذکور نے جو امیر بابا سے چھٹے مرتبہ پر اور امیر کمال الدین مذکور سے بارہویں مرتبہ پر تھے عالمگیر بادشاہ کے زمانہ میں ایک عالی منصب سے ترک دنیا کی۔

بچپن سے ہی اس خاکسار کو مال و جاہ کی خواہش نہیں تھی۔ ضروریات کو حاصل کرنے کے بعد یہ فقیر از خود رفتگان کے دامن سے وابستہ ہوا۔اس امید پر کہ دوسرے جہان کے حالات سے واقفیت حاصل کرے۔جب سے ان کے دروازے پر قدم رکھا ہے دماغ ضعیف ہو گیا ہے اور تدبیر کے اسباب کی طاقت نہیں رہی۔خلوت نشینی اختیار کر لی ہے۔اور کبھی کمینوں

کے دستر خوان سے روٹی نہیں کھائی۔[1]

اتباع سنت کا شوق آپ کی طبیعت میں مرکوز تھا۔ چنانچہ حضرت شاہ غلام علی صاحب اپنی کتاب مقامات مظہری کے صفحہ ۱۶ پر آپ سے نقل کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے میری طبیعت نہایت اعتدال والی بنائی ہے اور میری طینت میں سنت نبوی ﷺ کی پیروی کی رغبت ودیعت کی ہوئی ہے (انتہی مترجماً)

چنانچہ شیخ شیخنا نواب صاحب مرحوم اپنی کتاب ابجد العلوم میں بہ ضمن ذکر حضرت مجدد صاحب مرحوم فرماتے ہیں۔

آپ کے متاخرین بزرگ فیض یابوں میں سے شیخ شمس الدین علوی المعروف مرزا مظہر جانجاناں ہیں۔ جو امام محمد بن حنفیہ کی اولاد سے تھے۔ آپ بہت سے فضائل کے مالک تھے۔ فن حدیث آپ نے حاجی (محمد افضل) صاحب سیالکوٹی سے حاصل کیا۔ اور مجددی طریقہ اپنے وقت کے اکابر طریقہ مجددیہ سے۔ اتباع سنت اور قوت کشفیہ میں آپ کا پایہ بہت بلند تھا۔ آپ کے شعر بہت انوکھے اور آپ کے مکتوبات[2] بہت مفید ہیں۔ آپ تشہد میں مسجد سے اشارہ کے قائل تھے[3] اور (نماز میں) اپنا دایاں ہاتھ بائیں پر سینے کے نیچے باندھتے تھے اور قرات فاتحہ خلف الامام کی تقویت کے قائل تھے۔

آپ کا سن وفات ہے عاش حمید امات شہیدا (۱۱۹۵)

---

[1] دفتر ثانی ماثر الکرام موسوم بہ سرو آزاد صفحہ ۲۳۲

[2] آپ کے مکتوبات کتاب کلمات طیبات میں ہمراہ مکتوبات حضرت غوث الثقلینؒ و مکاتیب قاضی ثناء اللہ پانی پتی و مکاتیب شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ مطبع مجتبائی دہلی میں طبع ہو کر شائع ہو چکے ہیں۔

[3] مکتوبات حضرت مرزا مظہر جانجاناں در کلمات طیبات۔ مکتوبات پانزدہم صفحہ ۲۷و۲۸

امام الہند حکیم الامتہ بقیتہ السلف حجتہ الخلف

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ

ولادت ۱۱۱۴ھ وفات ۱۱۷۶ھ

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے

مجھ ایسے نابکار کا آپ کی تعریف و توصیف میں کچھ لکھنا آپ کی شان میں گستاخی ہے کیونکہ ہندوستان بھر میں شہر بشہر اور کوچہ بکوچہ اور خانہ بخانہ جس قدر علم و عمل بالحدیث کا غلغلہ ہے۔اور اتباع سنت کا جتنا جوش طبائع میں موجزن ہے وہ سب کچھ آپ ہی کی برکت و فیض کا ثمرہ ہے۔

بلبل کو شوق گل تھا نہ قمری کو عشق سرو
یہ سارے گل کھلائے ہوئے باغباں کے ہیں

لہٰذا میرے لکھنے میں اس سے زیادہ نہیں ہو گا۔جو آپ کی نسبت لوگوں کے سینوں میں ساری اور ان کی زبانوں پر جاری ہے۔

آپؒ ۱۱۱۴ھ میں طلوع آفتاب کے ساتھ ہی دارالخلافہ دہلی میں پیدا ہوئے گویا خلق برحق نے عالم جسمانی و عالم روحانی ہر دو کے آفتابوں کو اکٹھا ظاہر کیا۔اور ظلمت ظاہری و باطنی کا پردہ چاک کر دیا۔آپ کا سلسلہ نسب تیس واسطوں سے حضرت فاروق اعظمؓ تک پہنچتا ہے۔تاریخی نام عظیم الدین ہے۔جو آپ کو ہر طرح پھبتا ہے۔

آپ کے حالات میں مستقل تصانیف ہیں۔سب کی جامع حیات ولی ہے میرے خیال میں ہندوستان میں اس قدر تفصیل و جامعیت کے ساتھ کسی دیگر عالم کے حالات نہیں لکھے گئے اور نہ اتنی کثرت سے کسی اور کی نسبت تصانیف لکھی گئیں۔

آپ نے اپنے حالات میں خود بھی ایک رسالہ لکھا ہے۔اس میں فرماتے ہیں کہ جب میری عمر چار سال چار مہینے اور کئی دن کی ہوئی' تو خاندانی رواج کے مطابق مکتب میں نشست ہوئی۔ساتویں سال کے اخیر میں قرآن شریف حفظ کر لیا۔اور فارسی کی

پڑھائی شروع کی۔ دسویں سال شرح ملا تک پڑھے۔ پندرہویں سال اس ملک کے رواج کے مطابق علوم متعارفہ سے فراغت پائی۔ البتہ فن حدیث جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو پیدا کیا تھا۔ ابھی نامکمل تھا۔ آپ کی کتاب ازالۃ الخفاء کی لوح کے اندر کے صفحے پر لکھا ہے۔

"باز اجازت عامہ روایت حدیث از مولانا محمد افضل معروف بجا جی سیالکوٹی گرفتند۔ و بریں ہم قانع نگر دیدہ در مدینہ منورہ علی صاحبہا الصلوٰۃ و السلام تشریف بردند و تجدید اجازت از عمدہ شیوخ خود ابو طاہر بن ابراہیم الکردی المدنی نمودند۔"

لیکن ہمیں معلوم نہیں ہوا کہ جناب حاجی صاحب موصوف سے اجازت روایت حدیث لینے کا زمانہ کون سا ہے۔ القول الجمیل میں آپ خود فرماتے ہیں۔

"جب آپ کی عمر سترہ سال کی ہوئی تو آپ کے والد ماجد شیخ عبدالرحیمؒ بیمار ہوئے۔ شیخ صاحب اپنے زمانہ میں فضیلت علمی کے ساتھ ایک مقدس بزرگ مانے جاتے تھے۔ یعنی عالم شریعت بھی تھے۔ اور پیر طریقت بھی[1]

ایام بیماری میں آپ کو بیعت وارشاد کی بھی اجازت دی اور کلمہ یدہ کیدی بتکرار کہا۔ اس کے بعد بارہ برس یا زیادہ تک کتب دینیہ و عقلیہ کی تدریس میں لگے رہے اور مذاہب اربعہ کی کتب اور ان کی فقاہت کے اصول اور ان احادیث کو جو ان کی دستاویز ہیں ملاحظہ کرنے کے بعد نور غیبی کی مدد سے آپ کے دل کا قرار فقہائے محدثین کی روش پر ہوا۔ چنانچہ خود جناب شاہ صاحب اپنے ایک رسالہ الجزء اللطیف نام میں ارقام فرماتے ہیں۔

---

[1] اسی لئے آپ کے خاندان کو شاہ صاحب کے لقب سے پکارتے ہیں۔ کیونکہ ہندوستان میں پیروں اور بزرگان طریقت کو شاہ صاحب کہتے ہیں۔ ورنہ آپ سید نہیں تھے بلکہ شیخ فاروقی تھے۔ پنجاب میں شاہ صاحب سیدوں کو کہتے ہیں پس ہر دو ملک کے اختلاف عرف کا لحاظ چاہئے۔

بعد ملاحظہ کتب مذاہب اربعہ و اصول فقہ ایشاں و احادیثے
کہ متمسک ایشاں ست قرار داد خاطر بمدد نور غیبی روش
فقہائے محدثین افتاد (الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف ملحقہ برسالہ
انفاس العارفین۔ مطبوعہ مطبع احمدی دہلی صفحہ ۱۹۵)

اور اپنے تعلیم کی بابت انفاس العارفین میں فرماتے ہیں۔

حضرت[1] ایشا درخلوت و جلوت بسیارسی بود کہ باین فقیر ملتفت
می شدند و تلطف من نمود ندو در ابتہاج و اہتراز می شدندومی
فرمودندکہ در دل من بے اختیار خطور میکند کہ بیک دفعہ ہمہ
علوم درسینہ تو اندازم و باز بعد چندے جوشے می زدند و بہمیں
کلمہ متکلم می شد ند و ہلم جزا اثر انفاس مبارک ایشاں ظاہر
گشت والا ایں فقیر چنداں محنت تحصیل نکشیدہ (صفحہ ۶۳)

تذییل: حضرت شاہ صاحب کے والد حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب علوم شریعت میں کامل ہونے کے علاوہ طریقت و باطن میں بھی صاحب کمالات تھے۔ اور صاحب کرامت اولیاءاللہ میں تھے اور حضرت شاہ صاحب نے ان کی قلبی کیفیت و توجہ کا جو ذکر اوپر کی عبارت میں کیا ہے فیوض رحمانیہ کے نزول کے وقت ایسے حضرات کے قلوب صافیہ پر ایسے کوائف گزرا کرتے ہیں اور ان کا انعکاس قابل و مستعد طبیعتوں پر پڑ کر ان کو منور کر دیتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کو عطاء نبوت کے وقت غار حرا میں جو حضرت جبریل علیہ السلام نے تین دفعہ سینے سے لگا کر زور سے بھینچا تھا وہ یہی کیفیت تھی۔ الحمد للہ کہ اس سیاہ کار پر بھی حضرات اساتذہ جناب مولانا عبدالمنان صاحب مرحوم محدث وزیر آبادی اور جناب مولانا عبیداللہ غلام حسن صاحب سیالکوٹی کی توجہ اور جذب نے یہی کیفیت طاری کر دی تھی ورنہ اس عاجز کو بھی تحصیل علم میں دماغ سوزی اور محنت کشی کی زحمت نہیں اٹھانی پڑی۔ اللھم لک الحمد حمدا کثیرا طیبا

---

[1] شاہ صاحب کے والد حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ۔ ۱۲

مبارکا فیہ- اللھم زینني بالعمل کما کرمتني بالعلم و جملني بالتقوی کما احسنت علی بنور الفھم-

رجوع بمطلب: اس کے بعد حضرت شاہ صاحب اپنے والد ماجد کے طریق عمل کی نسبت فرماتے ہیں مخفی نماند کہ حضرت ایشاں در اکثر امور موافق مذہب حنفی عمل میکر دند الا بعض چیز ہا کہ حسب حدیث یا وجدان بمذہب دیگر ترجیح می یافتند از انجملہ آنست کہ در اقتداء سورہ فاتحہ می خواندند و در جنازہ نیز (صفحہ ۶۹)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ شاہ عبدالرحیم صاحب بھی اہل حدیث تھے اور حدیث نبوی پر عمل کرنے میں ان کے رستے میں کسی معین مذہب کی رکاوٹ ہرگز نہ تھی اور اسی کا نام ترک تقلید ہے جس پر اہل حدیث سے نزاع کی جاتی ہے-

۲- حضرت شاہ ولی اللہ صاحب سے پیشتر اس ملک میں علم حدیث کی بنیاد تو پڑ چکی تھی لیکن تقلید کے عام رواج کی وجہ سے عمل بالحدیث کی بحثیں لکھیں- حجۃ اللہ میں کئی ایک ابواب اور الانصاف و عقد الجید خاص کتابیں اسی امر کے لئے تحریر کیں- نیز مؤطا امام مالکؒ کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا جو کتب حدیث کی ماں کہلانے کی مستحق ہے جس سے لوگوں میں علم و عمل ہر دو کا شوق پیدا ہو گیا- اس میں جا بجا محدثین کی تعریف ہے اور ان کے مذہب کو ترجیح دی ہے- چنانچہ مصفے ترجمہ مؤطا کے دیباچے میں فرماتے ہیں-

> باید دانست کہ سلف در استنباط مسائل و فتاوی بر دو وجہ بودند یکے آنکہ قرآن و حدیث و آثار صحابہ جمع میکردند از انجا استنباط مینمودند وایں طریقہ اصل راہ محدثین است و دیگر آنکہ قواعد کلیہ کہ جمعے از ائمہ تنقیح و تہذیب آں کردہ اندیا دگیرند بے ملاحظہ ماخذ آنہا- پس ہر مسئلہ کہ واردمی شد جواب آں از قواعد طلب می کردند و ایں طریقہ اصل راہ فقہا است - ۱۲ (مصفی صفحہ ۴)

آپ کی تصانیف سے ہندوستان کی علمی دنیا میں ایک عظیم انقلاب پیدا ہو گیا اور

قرآن و حدیث سے ناواقفی کی وجہ سے لوگوں کے ذہنوں میں جو یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ قرآن و حدیث کا علم نہایت مشکل ہے اور ان کو سوائے مجتہد کے کوئی سمجھ نہیں سکتا اور زمانہ اجتہاد و مدت سے ختم ہو چکا ہے۔ یہ بات حضرت شاہ صاحب کے تراجم اور علم قرآن و حدیث کی تشویق و ترغیب کے سبب ذہنوں سے جاتی رہی اور لوگ شوق سے قرآن و حدیث کے سیکھنے میں لگ گئے اور اس عمل بالحدیث کی بھی بنیاد پڑ گئی۔ ہم اس جگہ ان تصانیف پر ریویو کرنے کی بجائے تصنیف کے متعلق اجمالی نظر سے حضرت شاہ صاحبؒ ممدوح کی بعض خصوصیات ذکر کرتے ہیں جن سے معلوم ہو جائے گا کہ ملک ہندوستان میں حضرت شاہ صاحب سے پیشتر علمی خدمت کس ڈھنگ پر تھی اور آپ نے اسے کس رنگ میں رنگ دیا۔فللہ درہ۔

(ا) حضرت شاہ صاحب سے پیشتر قرآن شریف کی خدمت کی طرف مطلقاً توجہ نہیں تھی۔ قرآن شریف کا ترجمہ نصاب درسیات میں شامل نہیں تھا۔ اور معلوم ہے کہ قرآن شریف شریعت کا اصل ماخذ و منبع ہے اور علوم الٰہیہ کی تحصیل سے اصل مقصود یہی ہے کہ قرآن فہمی میں کمال حاصل ہو۔ لیکن جب قرآن پڑھا نہیں سیکھا نہیں اس کے اسلوب سے طبیعت مانوس ہوئی نہیں اور ان علوم الٰہیہ کی تحصیل کے بعد قرآن میں ان کے قواعد کا اجرو استعمال کیا نہیں گیا اور قرآن کی حلاوت کا ذوق و شوق دل میں موجزن ہوا نہیں تو اس کے فہم میں کمال کیسے ہو گا اور کہاں سے ہو گا؟ محض ذہنی عظمت زیادہ سے زیادہ محض ایمان کے درجے تک رکھتی ہے لیکن اطمینان کے درجے تک نہیں پہنچا سکتی۔

آپ کے والد شاہ عبدالرحیم صاحبؒ نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور قرآن شریف کی اشاعت و ترویج کے لئے ایک درسگاہ کھولی۔ جس کا نام آپ کے نام نامی پر مدرسہ رحیمیہ ہوا۔

شاہ عبدالرحیم کی وفات کے بعد آپ کو اس درسگاہ میں جو برابر بارہ سال تعلیم و تدریس کا موقع ملا اس میں آپ نے اپنے طلباء میں قرآن شریف سے استدلال کرنے

کی ایک نئی روح پھونک دی۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت شاہ صاحب کو قرآن فہمی کا ملکہ خاص طور پر عطا کیا تھا۔ چنانچہ اس فن میں آپ کی تصانیف الفوز الکبیر اور فتح الخبیر اور ترجمۃ القرآن الموسوم بفتح الرحمٰن اور تاویل الاحادیث فی رموز قصص الانبیاء وغیرہا اس کی شاہد موجود ہیں۔ خود جناب شاہ صاحب ان سب کو اللہ تعالیٰ کا خاص فضل اور اس کی □ قرار دیتے ہیں چنانچہ الفوز الکبیر میں اپنے علوم وہبیہ کے ذکر میں فرماتے ہیں۔

من العلوم الوهبية فی علم التفسير التی اشرنا اليها تاويل قصص الانبياء عليهم السلام وللفقير فی هذا الفن رسالة مسماة بتاويل الاحاديث الخ و من العلوم الوهبية تنقيح العلوم الخمسة التی هی منطوق القران العظيم مر من ذالك الباب جملة فی اول الرسالة فراجعه و من العلوم الوهبية ترجمة باللسان الفارسی علی وجهٍ مشابهٍ للعربی فی قدر الكلام و التخصيص و التعميم و غير ها اثبتنا ها فی فتح الرحمن فی ترجمة القرآن (الفوز الكبير صفحه ۱۲۰ بر حاشية سفر السعادت مطبوعه مصر)

علم تفسیر میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو علوم مجھے بخشے گئے ہیں اور جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے انبیاء علیہم السلام کے قصوں کی تاویل ہے۔ اور اس فقیر نے اس فن میں ایک رسالہ بہ نام تاویل الاحادیث رکھا ہے۔ الخ نیز علوم وہبیہ میں سے ان پانچ علوم کی تنقیح ہے جن کے متعلق قرآن شریف میں مستقل بحث مذکور ہے۔ اس باب میں سے کچھ بیان شروع کتاب میں گذر چکا ہے وہاں پر دیکھیں۔ نیز علوم وہبیہ میں سے قرآن شریف کا فارسی زبان میں ترجمہ ہے جو □ اور تعمیم وغیرہ کی جنس سے انداز کلام میں عربی عبارت کے مشابہ ہے جس کو ہم نے فتح الرحمٰن فی ترجمۃ القرآن میں درج کیا ہے۔

آپ عربی اور فارسی میں شعر کہنے میں ید طولی رکھتے تھے۔ چنانچہ تصوف اور مدح وحب نبیؐ میں آپ کے قصائد واشعار آبدار کتب تراجم کی زینت ہیں۔ جن کی زبان کی فصاحت و بلاغت علمائے عرب و عجم ومصر نے بھی تسلیم کی ہے۔

آپ کی تصانیف دو سو سے زیادہ ہیں اور سب کی سب نافع و مفید اور مقبول خاص و عام ہیں۔ ان میں سے بعض تو اپنے اپنے مضمون میں عدیم النظیر ہیں اور بعض ایسی کہ آپ سے پہلے کسی نے اس مضمون پر قلم نہیں اٹھایا۔

ان کتب میں سے حجة الله البالغة خاص طور پر قابل ذکر ہے جس میں علوم شرعیہ کے جمیع ابواب کے مسائل اور ان کے اسرار و حکم ایسے طریق پر بیان کئے گئے ہیں کہ یہ کتاب اس موضوع پر آپ سے پیشتر کی تمام کتب مصنفہ پر فوقیت لے گئی ہے اور اس میں کسی کو نزاع نہیں۔

حضرت نواب صاحبؒ اپنی کتاب اتحاف النبلاء (مقصد دوم صفحہ ۴۳۰) میں فرماتے ہیں۔

> "انصاف یہ ہے کہ اگر آپ کا وجود صدر اول اور زمانہ ماضی میں ہوتا تو آپ امام الائمہ اور تاج المجتہدین گنے جاتے۔" (انتہی مترجماً)

رتبہ مجددیت: آپ بلا نزاع بارہویں صدی کے مجدد ہیں۔ چنانچہ آپ اپنی کتاب تفہیمات میں فرماتے ہیں۔

> **لما تمت بی دورة الحکمة البسنی الله خلعة المجددیة فعلمت علم الجمع بین المختلفات.** (انتهى منقول از اتحاف النبلا مقصد دوم صفحه ٤٣٠)
>
> جب میرا دورہ حکمت یعنی علم اسرار دین پورا ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے مجھے خلعت مجددیت پہنائی۔ پس میں نے مسائل اختلافی میں جمع (و تطبیق) کو معلوم کر لیا۔

آپ کا سن وفات "او بود امام اعظم دین" ۱۱۷۶ھ ہے۔ افاض الله علينا فيوضه۔

شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی

ولادت ۱۱۵۹ھ　　　　وفات ۱۲۳۹ھ

نواب صاحب نے اپنی کتاب اتحاف النبلاء میں آپ کے حالات نہایت جامع عبارت میں درج فرمائے ہیں جن کا انتخاب بصورت ترجمہ حسب ذیل ہے۔

آپ ہندوستان بھر میں استاذ الاساتذہ خاتم المفسرین والمحدثین تھے۔ آپ کا تاریخی نام غلام حلیم (۱۱۵۹ھ) ہے۔

آپ اپنے زمانہ میں مرجع علماء و مشائخ تھے۔ آپ کا پایہ تمام علوم متداولہ وغیر متداولہ اور فنون عقلیہ ونقلیہ میں اتنا بلند تھا۔ کہ بیان سے باہر ہے۔ حافظہ کی پختگی و عمدگی تعبیر رویا کے علم و وعظ وانشاء کے سلیقہ' علوم کی تحقیقات اور مخالفین کے ساتھ مذاکرہ و مباحثہ میں اپنے ہم عصروں میں ایک ممتاز مقام رکھتے تھے۔ موافق و مخالف سب کو آپ سے عقیدت تھی۔ آپ نے اپنی تمام عمر تدریس وافتا' فصل خصومات' وعظ مریدوں کی تربیت اور شاگردوں کی تکمیل میں گذاری۔ دنیوی جاہ و عزت اور احترام و تعظیم کے ساتھ ساتھ آپ کمالات باطنی بھی رکھتے تھے۔

امیر المجاہدین سید احمد بریلوی آپ کے مرید طریقت تھے۔ بلاد ہند میں آپ اور آپ کے برادران کرام علم و عمل کی ریاست کے سردار تھے۔ ہندوستان میں کوئی علاقہ بلکہ کوئی شہر کم ہو گا کہ اس میں کوئی ایسا شخص ہو جسے اس خاندان سے نسبت تلمذ یا یا استفادہ باطن نہ ہو۔ بڑے بڑے علماء آپ کی شاگردی پر فخر کرتے ہیں اور فضلاء آپ کی تصنیف کردہ کتابوں پر کامل بھروسہ رکھتے ہیں۔ آپ نے اپنے والد ماجد اور ان کے خلفاء کرام سے علوم حاصل کئے اور بہت سی خلقت نے آپ سے استفادہ کیا۔

آپ کی تصنیفات میں سے مشہور ترین کتاب جو آپ کے وسعت علم و کمال کی دلیل ہے تفسیر فتح العزیز ہے۔ جو دو بڑی بڑی جلدوں میں ہے اور کوئی سوا تین پارے کلام مجید کی ہے (پارہ اول اور دوئم رکوع رمضان تک اور پارہ ۲۹ و ۳۰ کامل) یہ تفسیر ہندوستان میں دوبارہ شائع ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ تحفہ اثنا عشریہ رد شیعہ میں اور

بستان المحدثین سیر الشہادتین عجالہ نافعہ اور بہت سے فتاویٰ ہیں[1]

آپ نے ۱۲۳۹ھ میں وفات پائی۔ شعراو علماء نے آپ کی وفات کی تاریخیں لکھیں آپ کو اپنے پدر بزرگوار کے پہلو میں سپرد خاک کیا گیا۔

آپ کا خاندان علوم حدیث اور فقہ حنفی کا ہے۔ علم حدیث کی جو خدمت ملک ہند میں اس خاندان نے کی ہے کسی اور نے نہیں کی۔ سر زمین ہند میں عمل بالحدیث کا بیج حقیقت میں آپ کے والد بزرگوار نے بویا تھا۔ اور آپ نے اسے برگ و بار بخشا۔ ورنہ بلاد ہند میں کوئی شخص علاوہ فقہ حنفی کے علم حدیث سے تمسک نہیں کرتا تھا۔ فجزاہ اللہ عنا خیر الجزاء (انتہی ملخصاً و مترجماً)

شاہ رفیع الدین صاحبؒ المتوفی ۱۲۳۰ھ

آپ شاہ ولی اللہ کے سعادت مند فرزند اور شاہ عبدالعزیز کے چھوٹے بھائی ہیں۔ آپ نے جملہ علوم کی عموماً اور حدیث نبوی ﷺ کی خصوصاً سند اپنے والد ماجد سے حاصل کی۔ آپ علوم دینیہ اور عقلیہ میں مرجع ارباب استعداد تھے۔ چونکہ آخری عمر میں جناب شاہ عبدالعزیز کو کبر سنی نے بالکل ضعیف کر دیا تھا۔ اس لئے تدریس کا سلسلہ آپ ہی کی مقدس ذات سے وابستہ تھا۔ دور دراز کے شہروں سے جو زبردست فضلاء یہاں آکر آپ کی قدم بوسی کا شرف حاصل کرتے باوجودیکہ فضل و کمال کی سند حاصل کئے ہوتے پھر بھی آپ کا تبحر علمی دیکھ کر عش عش کر اٹھتے۔ دیار ہند کے تمام نامی اور مشہور فضلاء آپ ہی کے مستفیضوں اور خوشہ چینوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ آپ کو ہر فن کے ساتھ اعلیٰ مناسبت تھی۔

طلبہ کی تدریس کی وجہ سے تصنیف و تالیف کے لئے آپ کو بہت کم وقت ملتا تھا۔ پھر بھی آپ نے کئی مفید کتابیں تصنیف کیں۔ عربی میں پر معنی اور دلچسپ نظم و نثر کے مضامین لکھے اور قرآن شریف کا لفظی ترجمہ کر کے عامہ خلائق کو مستفیض فرمایا۔

آپ نہایت اعلیٰ پایہ کے محقق تھے۔ آپ کی بہت سی عمدہ تصنیفات ہیں جن میں

---

[1] آپ کا مجموعہ فتاویٰ دو جلدوں میں دہلی میں طبع ہو چکا ہے۔

بہت سے مشکل اور مخفی امور پر بحث کی ہے- ان میں تھوڑے کلمات میں بہت سے مسائل جمع کئے ہیں- رحمہ اللہ و افاض علینا من فیوضہ-

شاہ عبدالقادرؒ قدس سرہ المتوفی ۱۲۳۰ھ

آپ شاہ ولی اللہؒ کے خلف الرشید اور شاہ عبدالعزیزؒ اور شاہ رفیع الدینؒ کے چھوٹے بھائی ہیں-

آپ نے تمام کتب دینیہ و عقلیہ اپنے والد ماجد سے سبقاً سبقاً پڑھیں- مگر کسب فیض باطن کے لئے اپنے والد بزرگوار کے علاوہ دیگر اکابر دین اور اہل کمال کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے- آپ اپنے زمانہ کے جملہ اہل کمال کے حلقہ میں ایسے ممتاز تھے جیسے جھلملاتے تاروں کے حلقہ میں پوری روشنی کا چاند-

آپ کے زہد و اتقا' خلق و تواضع کی بے مثل شہرت ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلی ہوئی تھی-

آپ نے اپنی زندگی کا اکثر حصہ اکبر آباد کی ایک مسجد کے حجرہ میں بسر کیا- رات دن طاعت و ریاضت میں مصروف رہتے- قرآن مجید کے بامحاورہ اردو ترجمہ اور تفسیر موضح القرآن کے علاوہ آپ کی کوئی اور تصنیف دستیاب نہیں ہوئی- ترجمے اور حواشی میں اختصار سلاست زبان اور جامعیت ایسی ہے کہ عربی اور اردو زبان کے محاورات جاننے والے عش عش کر اٹھتے ہیں-

کسی بزرگ نے سچ کہا ہے کہ اگر قرآن مجید اردو زبان میں نازل ہوتا تو ان ہی محاورات کے لباس سے آراستہ ہوتا- جس کی رعایت شاہ عبدالقادر نے برتی ہے-

رحمہ اللہ و جزاہ عنا و عن سائر المسلمین-

شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ بن شاہ عبدالغنی صاحب

ولادت ۱۱۹۳ھ شہادت ۱۲۴۶ھ

آپ ائمہ دین و فقہائے متقین اور بلندپایہ محدثین میں سے ہوئے ہیں- آپ کے والد ماجد شاہ عبدالغنی بن شاہ ولی اللہؒ ۲۸ برس کی عمر میں اس جہان فانی سے رخصت ہو

گئے۔

اپنے والد بزرگوار کی وفات کے بعد آپ نے اپنے نامدار چچا شاہ عبدالقادرؒ دہلوی مؤلف موضح القرآن سے ظاہری و باطنی تربیت حاصل کی۔ علمی اور عملی کمالات اور خاندانی فضائل کی تحصیل کے لئے اپنے بزرگ چچاؤں کی خدمت میں زانوئے ادب تہ کر کے علم و فضل کی چوٹی تک پہنچے۔

آپ نہایت ذکی الطبع تھے۔ آپ کی طالب علمی کے زمانے کی ذہانت و فطانت کے قصے علماء و مدرسین کی زبانوں پر ہیں۔ مشکل امور و علوم کو نہایت جلد سمجھ کر بات کی تہ تک پہنچ جاتے۔

آپ نے سید احمد بریلوی مرید شاہ عبدالعزیز دہلویؒ سے بیعت جہاد کی ہوئی تھی اور آپ ان کے حجاج اور مجاہدین کے قافلہ کے سردار تھے۔ مشرق سے مغرب تک شریعت کا یہ تمام رواج اور بدعت و محدثات کا قلع قمع علوم کا چرچا، نماز اور روزہ اور زکوٰۃ کی کثرت اور مساجد کی آبادی جو ہندوستان اور پاکستان میں نظر آ رہی ہے آپ کی اور مولوی عبدالحئی[1] مرحوم کی کوشش اور اجتہاد کے طفیل ہے۔

سرزمین ہندوپاکستان میں ان دونوں بزرگواروں کی مثال جو اپنے پیر کے دو وزیروں کی طرح تھے۔ ان بارہ سو سال میں کم ملتی ہے۔ ان کے زمانہ میں اسلام کو ایک نئی رونق حاصل ہوئی اور مٹی ہوئی سنن ماثورہ آپ کی کوششوں سے دوبارہ زندہ ہوئیں۔ خصوصاً شاہ اسماعیل شہید کے وعظ و نصائح کی برکات اور آپ کے نصائح سے کثرت سے لوگوں کا ہدایت یافتہ ہونا۔ ایسی چیزیں ہیں کہ موافق و مخالف اس پر سب یک زبان ہیں۔

شرک و بدعت کی جو رسوم آپ نے مٹائیں اور محدثات و کفریات جو آپ نے دنیا سے دور کئے ان کا کوئی حساب ہی نہیں۔

اتباع سنت اور اجتناب از بدعت کا جو بیج آپ کے دادا شاہ ولی اللہ نے ان علاقوں

---

[1] یہ مولانا عبدالحئیؒ سید احمد صاحبؒ رائے بریلوی کی جہادی مساعی میں خلیفہ تھے۔ اور مولانا عبدالحئی لکھنوی محشی کتب عدیدہ آپ کے بہت بعد ہوئے ہیں۔

میں بویا تھا وہ آپ کے زمانہ میں خوب پھل لایا اور جو کام انہوں نے شروع کیا تھا آپ نے اسے انجام تک پہنچایا۔

آپ اسلام کے ان اولوالعزم عالی ہمت، ذکی، جری اور غیر معمولی افراد میں سے ہیں جو صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ علوم معقول و منقول میں آپ نے پہلوں کی یاد تازہ کر دی۔ اور فروع واصول میں علمائے سابقین سے بہت آگے بڑھ گئے۔ اصول فقہ آپ کو نوک زبان یاد تھے۔ علم حساب کے آپ خوب ماہر تھے۔ قرآن وحدیث آپ کے سینہ میں محفوظ تھا اور فقہ و منقول کی آپ کو دیرینہ مشق تھی۔

اگرچہ دوسرے علماء کی طرح بوجہ اپنی جہادی مسائی کی تدریس و تعلیم میں مشغول نہ ہوئے اور نہ ان کو حاصل کرنے میں عمر عزیز کا کوئی حصہ گذارا۔ تاہم اپنی خدا داد ذکاوت اور طبع نقاد کی عمدگی کی وجہ سے امتحان کے موقعہ پر محققین اور اکابر علماء مشہورین پر سبقت لے جاتے تھے۔

حج وجہاد کے لئے آپ نے عرب و عجم کا سفر کیا اور ہر دو جگہ بعض مسائل میں علماء زمانہ کے ساتھ مناظرہ ہوا۔ تو فتح واقبال آپ کے حصہ میں آئے اور مخالفین کو شکست پر شکست ہوئی۔

اپنی تمام عمر اعلائے کلمتہ اللہ واحیای سنن رسول اللہ ﷺ جہاد فی سبیل اللہ اور ہدایت خلق اللہ میں گذار دی۔

آپ کی تصانیف جو نہایت ضرورت کی وجہ سے اور عام طور پر لوگوں کے التماس اور اصرار پر لکھی گئیں تھی۔ اکثر و بیشتر سفر کی حالت میں لکھی گئیں اور ان پر نظر ثانی کا موقعہ نہ ملا۔ باوجود اس کے فصاحت وبلاغت اور لطافت و تحقیق معانی میں اپنے زمانہ کی تالیفات بلکہ بعض سابقہ تالیفات سے بدرجہا بہتر ہیں۔

آپ مجتہدانہ دماغ کے آدمی تھے۔ اگر آپ کو اشغال حربیہ سے فرصت ملتی اور تصنیف و تالیف اور درس و تدریس کا موقعہ ملتا تو آپ اپنے بہت سے پیشرو علماء سے بہت آگے ہوتے اور بہت سے فنون میں امام تسلیم کئے جاتے۔

مگر یہی ذکاوت طبع و جودت خاطر اور شرع مبین کے آداب میں کمال دینداری آپ کے لئے اہل زمانہ کے حسد اور مبتدعین کی عداوت کا باعث بنے۔ کبھی آپ کو ترک حنفیت کی تہمت لگائی جاتی اور کبھی وہابیت کا الزام لگایا جاتا۔ بلکہ یہاں تک کہ آپ کو معتزلہ اور خارجی کہا گیا مگر آپ کی کسی کتاب میں ایسی کوئی بات نہیں پائی جاتی۔ اس دروغ بافی سے ان دنیا طلبوں کا مقصد صرف یہ تھا کہ معبود حقیقی کی خالص عبادت سے لوگوں کو ہٹایا جائے اور بدعت کے بازاروں کو چمکایا جائے۔

آپ علوم دینیہ و خادمہ میں ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ فن سپہ گری میں بھی ماہر' تلوار چلانے میں مشاق' بے رکاب گھوڑے پر اچھل کر سوار ہونے والے' دریائے جمنا میں تیرنے والے' جامع مسجد دہلی کے وسیع صحن میں عین دوپہر کے وقت گرم پتھروں پر ننگے پاؤں سہج سہج سے چلنے والے تھے۔ لشکر کفار کے مقابلہ میں بذات خود ہی نہیں بلکہ فوجوں کو ترتیب دے کر لڑانے میں بھی ماہر تھے۔ آپ صرف سپاہی ہی نہ تھے بلکہ قابل جرنیل بھی تھے۔

سیالکوٹ میں ڈاکٹر سر محمد اقبال کی لندن و جرمنی سے اور میری حرمین شریفین اور دیگر بلاد اسلامیہ سے واپسی پر ان کے مکان پر میری ان سے ملک ہندوستان کے سیاسی حالات پر گفتگو ہو رہی تھی۔ اس کے دوران میں آپ نے فرمایا کہ اگر مولانا محمد اسماعیل شہید کے بعد ان کے مرتبے کا ایک مولوی بھی پیدا ہو جاتا تو آج ہندوستان کے مسلمان ایسی ذلت کی زندگی نہ گزارتے۔

بے شک ڈاکٹر صاحب مرحوم نے سچ فرمایا کہ مولانا شہیدؒ کے بعد ان کی طرز کا کوئی عالم پیدا نہیں ہوا لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان کے لگائے ہوئے پودے بے ثمر بھی نہیں رہے۔ چنانچہ آج ملک ہندو پاکستان میں جس قدر بھی اعلائے کلمۃ اللہ کی جدو جہد جاری ہے وہ آپ ہی کے نعرہ حق کے اثر سے ہے۔

فقہ' حدیث اور اصول میں آپ کی بہت سی تصنیفات ہیں۔ جو سب کی سب نہایت مفید اور اہل حق کے نزدیک مقبول ہیں۔ ان میں سے بعض یہ ہیں۔

ردالاشراک' تقویۃ الایمان' تنویر العینین فی اثبات رفع الیدین' اصول فقہ' الصراط ا □' رسالہ منصب امامت ایضاح الحق الصریح' مثنوی سلک نور (ناتمام)' تنقید الجواب دراثبات رفع الیدین' عقبات تصوف و تجلیات آلہیہ ہیں۔

آپ کی سب سے بڑی یادگار مغلوں کی سلطنت کے دم واپسیں کے وقت عین موقعہ پر ضرورت پر سرزمین ہند میں جذبہ جہاد کا پیدا کرنا ہے جس کا غلغلہ آج تک تمام ہندوستان و پاکستان میں بلند ہو رہا ہے۔

پنجاب میں سکھوں کے ساتھ آپ نے متعدد جہاد کئے مگر بعض لوگوں کی بے وفائی کی وجہ سے آپ اپنے پیر سید احمد شہید کے ہمراہ لڑتے ہوئے ۱۲۴۶ھ میں بمقام بالاکوٹ (علاقہ سرحد) زخم تفنگ سے شہید ہوئے۔

رحمه الله و ایانا و جزاه الله عن سائر المسلمین خیر الجزاء۔

استاذ الآفاق حضرت شاہ محمد اسحٰق محدث دہلوی قدس سرہ

ولادت تقریباً ۱۱۹۲ھ وفات ۱۲۶۲ھ

کنیت ابوسلیمان۔ والد بزرگوار کا نام محمد افضل فاروقی جو لاہور کے رہنے والے تھے۔

آپ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے نواسے تھے۔ آپ نے اپنے تینوں نانا شاہ عبدالعزیز شاہ' عبدالقادرؒ اور شاہ رفیع الدینؒ قدس اسرارہم سے تحصیل علم کی۔ چونکہ شاہ عبدالعزیز کی اولاد نرینہ نہ تھی۔ اس لئے ان کے بعد مسند خلافت پر آپ ہی بیٹھے۔ دہلی میں اس وقت جتنے ممتاز عالم تھے ان میں تو بعض براہ راست شاہ عبدالعزیز کے شاگرد تھے اور بعض کسی شاگرد کے شاگرد یا ان کے خاندان والوں میں سے کسی کے شاگرد تھے مگر سب سے بڑھ کر مشہور حلقہ درس جناب شاہ محمد اسحاقؒ کا تھا جو شاہ عبدالعزیزؒ کے نواسے اور جانشین تھے۔

۱۲۴۰ھ میں آپ فریضہ حج ادا کرنے مکہ مکرمہ گئے۔ وہاں ۱۲۴۱ھ میں شیخ عمر بن عبدالکریم مکی (المتوفی ۱۲۴۷ھ) نے بھی آپ کو اپنے طریقہ کی روایت حدیث کی

اجازت دی- شیخ عمر بن عبدالکریم ممدوح فرمایا کرتے تھے کہ آپ میں اپنے نانا شاہ عبدالعزیزؒ کی برکت حلول کر گئی ہے- شیخ موصوف علم حدیث اور رجال میں آپ کے کمال کے قائل تھے-

شاہ عبدالعزیز قدس سرہ آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے اور فرماتے الحمد اللہ الذی وھب لی علی الکبر اسماعیل و اسحاق- نیز آپ فرمایا کرتے کہ میری تقریر تولی اسماعیل نے تحریر رشید الدین[1] نے اور تقوی محمد اسحاق نے-

شیخنا السید محمد نذیر حسینؒ فرمایا کرتے تھے کہ جناب شاہ عبدالعزیزؒ کے وقت میں امامت نماز پنجگانہ شاہ محمد اسحاقؒ ہی کرایا کرتے تھے-

سر سید احمد خاں مرحوم آثار الصنادید میں لکھتے ہیں-

"آپ نے حدیث اور علم حدیث کا درس بیس برس تک جناب شاہ عبدالعزیزؒ کے سامنے بیٹھ کر طلبہ کو دیا- اتباع سنت میں سے کوئی کام آپ سے سرزد نہ ہوتا کہ جو فعل رسول مختار نہ ہوتا- حق جل و علا نے صورت اور سیرت دونوں عطا کی تھیں- ان کی صورت سے آثار صحابیت ظاہر ہوتے تھے اور یقین ہوتا تھا کہ حضرت سید الثقلین صلوات اللہ و سلمہ علیہ و آلہ کی صحبت کا فیض جنہوں نے پایا ہوگا ان کی یہی صورت و سیرت ہوگی-"

چونکہ آپ کو تدریس اور فتاوی نگاری سے فرصت نہ ملتی تھی اس لئے سوائے مسائل اربعین مائۃ مسائل اور تذکرۃ الصیام کے آپ کی کوئی اور تصنیف یادگار نہیں پائی جاتی-

استفتاء کا جواب آپ شیخنا السید محمد نذیر حسینؒ محدث دہلوی سے لکھایا کرتے تھے-

آپ نے شوال ۱۲۵۸ھ میں ہندوستان سے مکہ معظمہ کو ہجرت کی- جب آپ دہلی سے چلے تو پہلی منزل (بستی) نظام الدین میں کی اور تین روز وہاں قیام فرمایا-

---

[1] آپ شاہ عبدالعزیزؒ کے شاگرد تھے- علوم کثیرہ میں صاحب لیاقت اور خاص کر فن تحریر میں ماہر تھے- رد روافض میں شوکت عمریہ وغیرہ مفید کتابیں تصنیف کیں-

مشایعت کے لئے سینکڑوں آدمی دہلی سے وہاں تک گئے۔

آپ نے ستر برس کی عمر میں ماہ رجب ۱۲۶۲ھ میں مکہ معظمہ میں وفات پائی اور ام المومنین حضرت خدیجہ الکبریٰؓ کے مزار مبارک کے قریب مدفون ہوئے۔

آپ کے مختلف اطراف کے کثیر التعداد مشہور تلامذہ میں سے بعض کے اسماء گرامی یہ ہیں۔

مولوی محمد یعقوبؒ۔ مولوی محمد عمر بن مولانا شہیدؒ۔ شیخ محمد انصاری سہارنپوری مکی۔ مولوی عبدالخالق دہلوی میاں صاحب (سید نذیر حسین) کے خسر۔ مولوی صفۃ اللہ والد ماجد قاضی محفوظ اللہ پانی پتی۔ مولانا سید محمد نذیر حسین دہلوی۔ مولوی محمد ابراہیم عظیم آبادی۔ شیخ محمد تھانوی۔ شاہ عبدالغنی دہلوی مہاجر۔ مولوی علی احمد نزیل ٹونک۔ نواب رطب الدین خاں دہلوی۔ شاہ فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی۔ مولوی سبحان بخش شکار پوری۔ مولوی عبداللہ سندھی۔ مولوی گل کابلی۔ حافظ محمد فاضل سورتی۔ حافظ حاجی محمد مرحوم جون پوری دہلوی۔ مولوی بہاء الدین دکھنی۔ مولوی نورالحسن کاندھلی مولوی عبدالقیوم بھوپالی نواسہ شاہ عبدالعزیز دہلوی۔ مولوی نوازش علی دہلوی۔ حافظ احمد علی سہارنپوری وغیرہ وغیرہ۔ رحمہ اللہ و ایانا۔

شیخ الکل مولانا سید نذیر حسین صاحب محدث دہلویؒ

ولادت ۱۲۲۰ھ   وفات ۱۳۲۰ھ

آپ کا وطن مالوف قصبہ سورج گڑھ ضلع مونگیر ہ صوبہ بہار تھا۔ جہاں آپ ۱۲۲۰ھ مطابق ۱۸۰۵ء میں پیدا ہوئے۔ ولادت کی صحیح تاریخ اور مہینہ معلوم نہیں ہو سکا۔

آپ کے جد اعلیٰ سید احمد شاہ جاجنیری ایک ہزار سپاہیوں پر جرنیل تھے۔ آپ کے والد ماجد سید جواد علی کئی پشتوں سے موضع ملبھوا میں رہتے تھے جو سورج گڑھ سے پانچ چھ میل جانب جنوب ہے۔ سید جواد علی فارسی دانی میں ممتاز بین الا قران تھے۔

آپ داد ہال اور ننہال دونوں ہی جانب سے نقوی حسینی ہیں۔ آپ چونتیسویں پشت میں حضرت علی کرم اللہ وجہ سے اور پینتیسویں پشت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جا ملتے ہیں۔

آپ کا خاندان علم و فضل دولت و وجاہت میں پہلے سے ہی ممتاز تھا۔ آپ بزرگ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد سے خدمت قضا پر مامور تھے۔

بچپن میں آپ کو کھیلنے کا بہت زیادہ شوق تھا۔ تیرنے دوڑنے 'گھوڑا سواری کرنے' میں مشاق تھے۔

فارسی کی درسی کتابیں اپنے والد بزرگوار سے پڑھیں اور عربی کی ابتدائی کتابیں بھی انہوں نے شروع کرادیں۔

علم کی تلاش میں وطن چھوڑتے ہیں: ۱۲۳۶ھ سولہ سال کی عمر اپنے ایک ہم عمر طالب علم سے صلاح کر کے رات کو دونوں گھر سے نکلے اور پیدل چلتے چلتے عظیم آباد (پٹنہ) پہنچے جو اس وقت صوبہ بہار کا مدینۃ العلم تھا۔ قریباً چھ ماہ یہاں ٹھہرے اور غالباً ترجمہ قرآن اور مشکوۃ پڑھا۔

پٹنہ میں آپ کو شاہ اسماعیل شہید کے مواعظ حسنہ سننے کا موقع ملا جو حج کو جارہے تھے۔ اس سے آپ کے دل میں دہلی جانے کا خیال پیدا ہوا۔

۱۲۴۳ھ میں آپ پٹنہ سے دہلی کی جانب اپنے رفیق مولوی امداد ... صاحب کے ساتھ روانہ ہوئے- رستے میں غازی پور میں قیام کیا اور کچھ ابتدائی کتابیں مولوی احمد علی صاحب چڑیاکوٹی سے پڑھیں- صرف و نحو کی ابتدائی تعلیم علماء الہ آباد سے حاصل کی اور ساتھ آٹھ ماہ وہاں قیام کیا- آخر آہستہ آہستہ راہ بے راہ سفر کرتے ۱۳ رجب ۱۲۴۳ھ بدھ کے روز دہلی پہنچے- پہلے مفتی شجاع الدین صاحب کے مکان پر ٹھیرے- دس پندرہ روز بعد پنجابی کٹرہ کی مسجد اورنگ آبادی میں مولوی عبدالخالق صاحب (متوفی ۱۲۶۱ھ) کی خدمت میں حاضر ہوئے- یہاں پر بہ نسبت دیگر علوم درسیہ کے دینیات کی طرف زیادہ توجہ تھی-

تعلیم: پٹنہ میں آپ نے ترجمہ قرآن و ترجمہ مشکوٰۃ پڑھ لیا تھا- اس لئے علم دین کا خیال زیادہ تھا- سو عربی زبان میں مہارت حاصل کرنے کے لئے مولانا عبدالخالق سے کافیہ کا سبق شروع کیا اور کئی کتابیں پڑھیں-

آپ کے دیگر اساتذہ:

(۲) مولانا اخوند شیر محمد قندھاری المتوفی ۱۲۵۷ھ

(۳) مولانا جلال الدین ہروی- ایک معقولی بزرگ تھے-

(۴) مولوی کرامت علی صاحب اسرائیلی-

(۵) مولوی محمد بخش صاحب عرف تربیت خاں- علوم ریاضیہ و فلسفہ میں بڑی مہارت رکھتے تھے- کتب متقدمین پر نہایت وسیع نظر تھی-

(۶) مولانا عبدالقادر صاحب رامپوری-

(۷) ملا محمد سعید صاحب پشاوری-

(۸) مولوی حکیم نیاز احمد صاحب سہسوانی جو بڑے عالم اور عامل بالحدیث تھے-

رجب ۱۲۴۳ھ سے آخر ۱۲۴۶ھ تک قریباً ۲/۱ ۳ سال کے عرصہ میں تمام علوم رسمیہ سے فارغ ہو کر ہمہ تن تفسیر و حدیث و فقہ کی تحصیل میں مصروف ہو گئے- اور اس مقصد کے لئے شاہ محمد اسحاقؒ کی درس گاہ کا رخ کیا- صحاح ستہ، جلالین، بیضاوی،

کنز العمال اور جامع الصغیر (للسیوطی) یہ سب کتابیں شاہ صاحب سے پڑھنے کے علاوہ تیرہ برس کی مدت مدید تک شب و روز ان کی صحبت بابرکت سے مستفیض ہوتے رہے ابتدا میں ساتھ آٹھ برس صرف صرف و نحو' معانی کا درس دیا۔

عقد نکاح : دہلی پہنچنے سے چھٹے سال ۱۲۴۸ھ میں جب کہ آپ شاہ محمد اسحاقؒ سے اکتساب فیض کر رہے تھے۔ اپنے نہایت شفیق استاد سید عبدالخالق کی صاحبزادی سے عقد نکاح کیا۔ اس شادی کے کفیل و مہتمم خود شاہ محمد اسحاقؒ اور ان کے برادر خود شاہ محمد یعقوبؒ تھے۔

جس وقت شاہ محمد اسحاقؒ نے ۱۲۵۸ھ میں ہندوستان سے مکہ معظّمہ کو ہجرت کی تو شاہ صاحب موصوف کا واقعی اور حقیقی جانشین اور شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز رحمہما اللہ کے مسند درس کا مالک مولانا سید نذیر حسین کے سوا اور کوئی نہ ہو سکا۔

شاہ عبدالعزیزؒ کے خاندان کے سردار کو دلی والے میاں صاحب کہا کرتے تھے چنانچہ شاہ عبدالعزیزؒ اور ان کے بعد شاہ محمد اسحاقؒ کو لوگ میاں صاحب کہتے تھے۔ جب شاہ محمد اسحاقؒ ہجرت کر کے مکہ معظّمہ چلے گئے اور ان کی جگہ ان کے روحانی فرزند مولانا سید نذیر حسین علیہ الرحمتہ نے لی اور مسند درس وارشاد پر متمکن ہوئے تو ان کو بھی لوگوں نے میاں صاحب ہی کے نام سے پکارا کیونکہ شاہ عبدالعزیزؒ کی اولاد صلبی میں سے کوئی باقی نہ رہا تھا۔

علم حدیث کی خدمت : علم حدیث آپ کا خاص فن تھا۔ اس فن کی ترویج چار دانگ ہندوستان میں جیسی کچھ آپ کے ذریعہ سے ہوئی کسی فرد واحد کی کوشش نہیں کر سکتی۔

فنون متداولہ درسیہ میں کوئی فن ایسا نہیں تھا جس میں آپ استعداد کامل نہ رکھتے ہوں۔ آپ علم فقہ میں عدیم النظیر سمجھے جاتے تھے۔ سر سید احمد خاں مرحوم نے اپنی کتاب آثار الصنادید میں میاں صاحب کا تذکرہ کرتے ہوئے خصوصیت کے ساتھ اس کی تصریح کی ہے۔

میاں صاحب کی طبیعت ابتداہی سے تحقیق کی طرف مائل تھی- علم و تجوید و قرات کی کتابوں پر بھی آپ کی نظر وسیع تھی اور علم کلام پر آپ کو پورا عبور حاصل تھا-

مولانا شاہ محمد اسحٰقؒ کی ہجرت کے بعد آپ نے مسجد اورنگ آبادی میں اپنا مستقل حلقہ درس قائم کیا اور ۱۲۷۰ھ تک فنون درسیہ کی ہر شاخ اور تفسیر کی کتابیں بلااستثناء پڑھاتے رہے- لیکن اس کے بعد تمام دیگر فنون سے اعراض کر کے صرف علوم دین' فقہ' حدیث' اصول حدیث اور تفسیر کو اختیار کر لیا اور زندگی کا باقی حصہ جو کہ تقریباً پچاس برس کا طویل زمانہ ہے- محض دین کی خدمت اور علوم دین کی اشاعت میں بسر کر دیا-

مطالعہ کا شوق : زمانہ طالب علمی سے آپ کو کتب بینی کا بے حد شوق تھا-اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم عصروں میں جو وسعت نظر آپ کو حاصل ہوئی کسی دوسرے کو نہ ہو سکی-اخیر عمر تک آپ نے مطالعہ کا التزام رکھا- سرکاری اور دیگر کتب خانوں سے بھی آپ استفادہ کرتے تھے- ایک کتب خانہ خود اپنا ذاتی تھا جس میں بڑی محنت اور شوق سے کتابیں جمع کی تھیں-اس میں بیشتر کتابیں قلمی اور دست خاص کی لکھی ہوئی تھیں- جو طبع نہ ہوئی تھیں اور نایاب ہو چکی تھیں-افسوس وہ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی میں لٹ گیا-

آپ کے درس کی کیفیت : چند باتیں آپ کے درس میں قابل لحاظ تھیں- اقوال صحیحہ و ضعیفہ کی جانچ پڑتال' سلجھی ہوئی تقریر' بیان کی صفائی تفہیم کی قدرت' حافظہ کی قوت' اشکال کی تشریح' وسعت نظر' ملکہ راسخہ' ہر مقام کے مالہ و ماعلیہ کی واقفیت- چنانچہ مولوی عبداللہ صاحب بازید پوری فرماتے ہیں-درس کے وقت طلبہ کا ہجوم رہتا- آپ نہایت تحقیق کے ساتھ درس دیتے اور حق بات یہ ہے کہ فقہ' تفسیر' حدیث اور فلسفہ کے آپ متبحر عالم تھے- پڑھانے میں جب تقریر کرتے تو ایک بحر مواج معلوم ہوتے تھے-

راولپنڈی کی نظر بندی : وہابیت کا مقدمہ ۶۵-۱۸۶۴ء میں جب ہندوستان کے اکثر شہروں میں چلایا گیا- تو بیشتر ماخوذین کے لئے جس دوام بعبور دریائے شور کا

حکم دیا گیا- میاں صاحب پر بھی مواخذہ ہوا جو صرف مخبروں کی غلط خبر رسانی اور اہلکاروں کی غلط فہمی پر مبنی تھا- آپ تا تحقیقات کامل کم و بیش ایک برس تک راولپنڈی کی جیل میں نظر بند رہے-

بعد تحقیقات کامل معلوم ہو گیا کہ مواخذہ ناجائز ہے- اس لئے آپ کو رہا کر دیا گیا-

جیل میں بھی درس جاری رہا- چنانچہ عطاء اللہ نامی طالب علم نے جیل میں صحیح بخاری سبقاً سبقاً پڑھی اور قرآن شریف حفظ کیا-

حج بیت اللہ : ۱۳۰۰ھ میں آپ حج بیت اللہ کے لئے مکہ معظمہ تشریف لے گئے- آپ کے مخالفین بھی وہاں جا پہنچے-

میاں صاحب نے تین روز منیٰ میں قیام کیا اور شب و روز وہاں وعظ فرمایا- جس میں شرک و بدعت سے اجتناب، عمل بالحدیث کی ترغیب اور رسومات بد کی اصلاح کا بیان تھا-

ان وعظوں سے دشمنوں کی آتش عداوت و حسد اور بھڑک اٹھی- اس پر رفقاء و خدام نے بمنت و سماجت عرض کیا کہ حضور وعظ بند فرمائیں- مخالفین کی سازش بہت گہری ہو چکی ہے- اب جان کی خیر نظر نہیں آتی- اس کے جواب میں میاں صاحب نے صاف فرما دیا کہ

"سنو صاحب! بہت جی چکا- اب زندگی کی تمنا نہیں ہے- امام نسائی بھی مکہ میں شہید ہوئے تھے- اسی حرم میں جہاں میرے قتل کا منصوبہ ہو رہا ہے- میں ہر وقت قتل ہونے کے لئے تیار ہوں- مگر تبلیغ سے باز نہ آؤں گا-"

حج سے فارغ ہونے کے بعد آپ بانتظار قافلہ مدینہ طیبہ مکہ معظمہ میں ٹھہرے ہوئے تھے- مخالفین نے پاشائے مکہ کے ہاں مخبری کرا دی کہ مولوی نذیر حسین معتزلی اور وہابی ہیں- اسی طرح اور بھی بہت سے اتہامات لگائے- اس پر آپ کو پاشائی محل میں طلب کیا گیا- تین دن تک آپ وہاں رہے اور آپ سے ان تہمتوں کے جواب طلب کئے

گئے۔ آخر آپ بری قرار دیئے گئے۔ اس کے بعد پاشا نے آپ کا بہت اکرام کیا اور خاص اپنے ہاتھ سے قہوہ پیش کیا اور باز پرس پر معذرت کی اور طلب عفو کے ساتھ اپنے حق میں دعائے خیر چاہی۔

یہ معلوم کر کے کہ آپ مدینہ طیبہ جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ پاشا مذکور نے آپ کو ایک خط مدینہ منورہ کے پاشا کے نام لکھوا کر اپنی مہر خاص سے مسجل کر کے دیا۔ اور کہا کہ آپ سے وہاں کسی قسم کا تعرض نہیں ہو گا۔

پاشا کا یہ خط لے کر میاں صاحب مع اپنے شاگرد اور رفیق مولوی تلطف حسین صاحب عظیم آبادی وغیرہ کے مدینہ پہنچے۔ وہاں بھی مخالفین نے بہت کچھ فتنہ بپا کرنے کی کوششیں کیں مگر ان کی کچھ نہ چلی۔ آپ وہاں کچھ روز قیام کر کے واپس تشریف لے آئے۔

حافظ ڈپٹی مولوی نذیر احمد صاحب (مترجم قرآن) فرماتے ہیں۔

جب آپ سفر حجاز سے واپس تشریف لائے تو اسٹیشن دہلی پر استقبال کے لئے اس قدر لوگ حاضر ہوئے کہ پلیٹ فارم کا ٹکٹ ختم ہو گیا۔ کارپردازان اسٹیشن حیران تھے کہ یہ کس نامی گرامی شخص کی آمد آمد ہے۔

حکومت کی طرف سے خطاب: جون ۱۸۹۷ء مطابق محرم ۱۳۱۵ھ میں آپ کو گورنمنٹ انگلشیہ کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب ملا۔ جب لوگ خلعت و خطاب کے ساتھ میاں صاحب سے ملے اور آپ کو اس سے آگاہ کیا تو آپ نے فرمایا۔

"ہم غریب آدمی خلعت و خطاب لے کر کیا کریں گے۔ خلعت و خطاب تو بڑے آدمیوں کو ملنا چاہئے۔ ہم کو دنیا لا حاصل ہے۔ بعد اس گفت و شنید کے آپ نے اسی قدر فرمادیا۔ اچھا صاحب آپ حاکم ہو جا چاہو کہو۔"

اس خطاب کے بعد رسالہ دلگداز (لکھنؤ) کے ایڈیٹر نے بعنوان "شمس العلماء" ایک مضمون لکھا جس کا ماحصل یہ ہے۔

"مولانا سید نذیر حسین صاحب محدث دہلوی کی عزت افزائی تو اس خطاب

سے ہو ہی نہیں سکتی۔ لیکن اس خطاب کو عزت و شرف اس نام کی برکت
سے ضرور حاصل ہوا۔"

آپ کے چند اخلاق حسنہ : آپ کے دشمن جانی بھی جب سامنے آکر اپنی حاجتیں پیش کرتے تو آپ بکشادہ پیشانی نہایت ہی ہنسی خوشی سے ان کی حاجت روائی کرتے۔

مسجد میں داخل ہوتے وقت آپ اپنا جوتا خود اٹھاتے تھے۔ کسی اور کو اٹھانے کا موقعہ نہیں دیتے تھے۔ علیا حضرت والیہ بھوپال کی طرف سے قاضی القضاۃ کا عہدہ پیش کیا گیا لیکن آپ نے روش محدثین کو ملحوظ رکھتے ہوئے بوریا نشینی و درس و تدریس کو کرسی نشینی پر ترجیح دی۔

تقریباً اسی برس آپ دہلی میں رہے۔ مگر اپنی اور اپنے اہل و عیال کی سکونت کے لئے ایک مکان بھی تعمیر نہ کرایا اور کرایہ کے مکان میں زندگی بسر کر دی اور وہ مکان بھی محض معمولی درجہ کا تھا۔

اس خاکسار مولف کی موجودگی میں آپ کے پوتے سید عبدالسلام صاحب نے شیخنا حافظ عبدالمنان صاحبؒ وزیر آبادی سے کہا کہ آج تک ہم دہلی میں کرایہ کے مکان میں رہتے ہیں۔ آپ میاں صاحب سے عرض کریں کہ ہمارے لئے کوئی اپنا سکونتی مکان تو بنوا دیں۔ اس پر حافظ صاحب نے کہا کہ میری کیا مجال ہے کہ میں آپ سے کچھ عرض کر سکوں۔ کیونکہ جس شخص نے اسی سال تک ایک روش پر زندگی گزاری ہو۔ میں شاگرد ہو کر اس کے نقطہ خیال کو کس طرح بدل سکتا ہوں۔

اس عاجز پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی احسان : گویہ عاجز حضرت میاں صاحب مرحوم کے سب سے چھوٹے شاگردوں میں سے ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھ پر یہ فضل کیا ہے کہ بڑے بڑے بزرگوں کی اولاد نے مجھ عاجز سے علم حدیث تفسیر وغیرہ حاصل کیا۔ مثلاً خود میاں صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے پڑپوتے سید حسن صاحب' جناب حافظ عبدالمنان صاحبؒ کے فرزند صوفی عبدالرشید صاحبؒ' مولانا ابو عبداللہ غلام حسنؒ

سیالکوٹی کے فرزند رشید مولوی عبدالواحد صاحب۔ اور مولانا ثناء اللہ صاحب مرحوم کے پوتے مولوی رضاء اللہ صاحب اور مشہور ولی اللہ مولوی غلام رسول صاحب ساکن قلعہ میہاں سنگھ ضلع گوجرانوالہ کے پوتے مولوی محمد صادق صاحب نے۔ اللھم اغفرلی ولا ساتذتی و سلامذتی المتادبین۔

علاوہ تبحر فی العلوم ہونے کے آپ نہایت وسیع الخیال' زندہ دل' خوش طبع فراخ حوصلہ ادا شناس' سادگی پسند' تیز فہم' مجتہد' امام' فقیہ' محدث اور درویش تھے۔ عملی زندگی میں سب سے بڑا زیور آپ کی درویشانہ روش تھی۔

آپ کبھی اپنی ضرورت کسی کے سامنے ذکر نہ کرتے تھے۔ ساری عمر آپ کی صحت بہت اچھی رہی۔ اتنی بڑی عمر میں تندرستی کی وجہ آپ کی سادہ زندگی سادہ غذا اور جفاکشی تھی۔

آخر ۱۰ رجب ۱۳۲۰ھ مطابق ۱۳ اکتوبر ۱۹۰۲ء سو برس کی عمر میں آپ نے وفات پائی۔

انگریزی اخبار پاؤنیر الہ آباد نے آپ کی وفات پر مضمون لکھا۔ اردو اخباروں میں تو غالباً سارے ہندوستان میں کوئی اخبار یا رسالہ نہ ہوگا جس نے آپ کی وفات پر ماتم نہ کیا ہو۔

نماز جنازہ آپ کے سعادت مند بڑے پوتے سید عبدالسلام صاحب نے پڑھائی۔ جنازہ کے ساتھ خلقت کا اس قدر ہجوم تھا کہ باوجود اس کے کہ میت کی چارپائی کے ساتھ لمبے لمبے بانس باندھے ہوئے تھے اور لوگ ان کو پکڑ کر تبرک کی خاطر نوبت بہ نوبت کندھا دے رہے تھے۔ پھر بھی بہت سے لوگوں کو کندھا دینے کی سعادت حاصل کرنے کا موقعہ نہ ملا۔

شہر کے لاتعداد مسلمان اور بہت سے عمائد اور علماء جنازہ کے ساتھ تھے۔ آپ کی نماز جنازہ غائبانہ ہندوستان و پاکستان کے قریباً تمام شہروں اور قصبوں بلکہ بیشتر قریوں میں پڑھی گئی۔

درس تدریس میں کثرت مشغولیت و محویت کی وجہ سے آپ تصنیف و تالیف کا موقعہ نہ پا سکے- دوسری وجہ وہ ہے جو آپ نے خود بیان فرمائی جب کہ کسی شاگرد نے درخواست کی کہ آپ بھی حدیث کی کسی کتاب پر کوئی شرح تحریر فرمائیں- اس پر آپ نے فرمایا کہ وہ بات بتاؤ جو پہلے علماء نہیں لکھ گئے تاکہ میں اس کسر کو پورا کر دوں- ہاں علماء کی کتابیں پڑھانے کا کام رہتا ہے سو وہ میں کر رہا ہوں- تاہم آپ نے بہت سے رسائل متفرق مسائل میں لکھے مگر آپ کی سب سے زیادہ ممتاز تصنیف کتاب معیار الحق ہے- جس میں تقلید اور اتباع سنت کی ایسی خوش اسلوبی اور متانت سے تحقیق کی گئی ہے کہ اس نے اہل حدیث کو دیگر لوگوں سے سنت میں ممتاز کر دیا ہے- آپ کے جس قدر فتاوی میسر ہو سکے ان کو آپ کے پوتوں سید عبد السلام اور سید ابو الحسن نے دو جلدوں میں طبع کرا کر شائع کیا ہے-

آپ کے تلامذہ : آپ کے تلامذہ اقطاع عالم' حجاز' مکہ معظّمہ' مدینہ منورہ' یمن' نجد' شام' حبش' افریقہ' تیونس' الجزائر' کابل' غزنی' قندہار' پشاور' سمرقند' بلخ' بخارا' یاغستان' ایشیا کوچک' ایران' مشہد' خراسان' ہرات' چین' کوچین اور ہندوستان و پاکستان کے تقریباً ہر شہر' ہر ضلع اور بیشتر قریوں اور دیہات میں شرقاً غرباً جنوباً و شمالاً پھیلے ہوئے ہیں- اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اشاعت علم حدیث اسلامی دنیا میں جیسی کچھ آپ کی ذات سے ہوئی وہ آپ ہی اپنی نظیر ہے-

آپ کے چند تلامذہ کے اسماء گرامی :- صرف خاص خاص اصحاب کے نام دیے جاتے ہیں- ورنہ یہ فہرست ہزاروں تک پہنچتی ہے-

(۱) مولانا الحاج حافظ ابو محمد ابراہیم ساکن آرہ- مکی مدفنا (آرہ)

(۲) مولوی حکیم ضمیر الحق صاحب (آرہ)

(۳) مولوی محمد قاسم صاحب منتظم مدرسہ عالیہ کلکتہ (آرہ)

(۴) مولوی ابو الحسنات عبد الغفور داناپوری ضلع پٹنہ

(۵) حکیم فضل حسین صاحب- مظفر پور- پٹنہ (آپ کی سوانح عمری کے مؤلف)

(۶) مولوی تلطف حسین صاحب پٹنہ

(۷) مولانا شاہ محمد عین الحق صاحب خانقاہ پھلواری ضلع پٹنہ

(۸) مولانا حافظ عبدالعزیز صاحب رحیم آبادی۔ ضلع دربھنگہ

(۹) مولوی محمد حیات صاحب سندھ

(۱۰) مولانا ابو سعید محمد حسین صاحب بٹالوی

(۱۱) مولوی محمد عبدالحکیم صاحب کلانوری (پنجاب)

(۱۲) مولانا عبداللہ صاحب غزنوی امرتسر

(۱۳،۱۴،۱۵) مولانا محمد صاحب غزنوی اور ان کے برادران مولانا عبدالجبار اور مولانا عبدالواحد صاحبان۔

(۱۶) مولانا ابوالوفا ثناء اللہ صاحب امرتسری

(۱۷) قاضی طلا محمد صاحب پشاوری

(۱۸) مولانا سید شریف حسین صاحب (حضرت میاں صاحب کے فرزند ارجمند)

(۱۹) شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی۔ مترجم قرآن مجید

(۲۰) خاکسار مولف محمد ابراہیم میر سیالکوٹی (سیالکوٹ)

(۲۱) مولوی غلام رسول صاحب قلعہ میہاں سنگھ ضلع گوجرانوالہ

(۲۲) شیخنا حافظ عبد لمنان صاحب وزیر آبادی۔ ضلع گوجرانوالہ

(۲۳) مولوی محمد سعید صاحب (بنارس)

(۲۴) مولوی محمد عرفان صاحب نواسہ جناب سید احمد قدس سرہ

(۲۵) مولانا حافظ عبداللہ صاحب غازی پوری

(۲۶) مولوی عبدالحلیم صاحب شرر لکھنؤ

(۲۷) مولوی محمد بدیع الزماں صاحب لکھنؤ

(۲۸) مولوی محمد وحیدالزماں صاحب وغیرہ وغیرہ

اللهم اغفرلهم وارحمهم وارفع درجاتهم

حضرت میاں صاحب مرحوم کا ورود مسعود سیالکوٹ میں: آپ کے تلامذہ کی فہرست میں آپ کے لائق شاگرد مولانا ابو سعید محمد حسین صاحب بٹالوی کا نام نامی بھی ہے۔ غالباً ۱۸۸۹ء یا ۱۸۹۰ء کا ذکر ہو گا کہ مولانا ممدوح کے بیٹے شیخ عبدالسلام صاحب کی شادی تھی۔ برات بٹالہ ضلع گورداسپور سے بمقام پسرور ضلع سیالکوٹ جانے والی تھی۔ مولانا ابو سعید صاحب نے حضرت میاں صاحب سے اس تقریب میں شامل ہونے کی درخواست کی جو حضرت میاں صاحب مرحوم نے منظور فرمائی اور آپ سیالکوٹ میں تشریف لائے۔ مولانا ابو سعید صاحبؒ کی برادری شیخ قانون گو محلّہ دھارووال شہر سیالکوٹ میں کثرت سے آباد تھی۔ برات اسی محلّہ میں اتری۔ حضرت میاں صاحب کی زیارت کے لئے اہل حدیث اور دیگر حضرات جوق در جوق آتے رہے اور حضرت میاں صاحب مرحوم ان کو قرآن و حدیث کی تابعداری کے وعظ سناتے رہے۔

پسرور سے واپسی پر بھی آپ نے اسی محلّہ میں نزول فرمایا اور لوگ اسی طرح کمال اشتیاق سے زیارت کو آتے رہے۔ مغرب کی نماز آپ نے سیالکوٹ کے اسٹیشن کے میدان میں ادا کی۔ جس میں مقتدیوں کا شمار ہزاروں تک تھا۔ قرات میں آپ نے سورہ حشر کی آخری آیات تلاوت فرمائیں۔ جو حاضرین پر عجب اثر انداز ہوئیں۔ اس نماز کا اثر آج تک میرے دل پر باقی ہے۔ ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم۔

وفات کے قریب میاں صاحب کا جنات کو وعظ سنانا: ۱۳۱۶ھ میں جب یہ عاجز اپنے اور پنجاب کے استاذ جناب حافظ عبدالمنان صاحب مرحوم وزیر آبادی کی معیت میں پہلی بار حضرت میاں صاحب مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تو آپ نے ان ایام میں ایک دن مسجد میں آکر فرمایا کہ آج رات اس کمبخت نے ہم کو سونے نہیں دیا۔ کبھی اس طرف سے پاؤں آدباتا اور کبھی اس طرف سے۔ اس سے آپ کی مراد یہ تھی کہ جو جن آپ کا شاگرد تھا وہ رات کے وقت آپ کے پاؤں دبایا کرتا تھا۔

۱۳۲۰ھ میں جب آپ رحلت فرما گئے تو اس کے کچھ عرصہ بعد میں پھر دہلی گیا تو مولانا تلطف حسین صاحب عظیم آبادی جو حضرت میاں صاحبؒ کے لائق شاگرد اور

سفر حج میں آپ کے رفیق تھے انہوں نے ذکر کیا کہ جس روز میاں صاحبؒ کا انتقال ہونا تھا- ہم بہت سے ارادت مند آپ کی خدمت میں حاضر تھے- حضرت میاں صاحب نے یکایک گھر کی مستورات کو فرمایا کہ پردہ کر لو- اس کے بعد بار بار و علیکم السلام و علیکم السلام کرتے رہے- کچھ عرصہ تک یہی وظیفہ جاری رہا- اس کے بعد آپ نے سورہ جن تلاوت کر کے وعظ کہنا شروع کیا- وعظ ختم کرنے بعد دیر تک وہی و علیکم السلام و علیکم السلام کرتے رہے- کچھ عرصہ تک یہی وظیفہ جاری رہا- اس کے بعد آپ نے مستورات کو واپس آجانے کو فرمایا- واللہ علی ما اقول شہید-

اللھم ارحم یتوفی کلھم و ارفع درجاتھم -

حضرت میاں صاحب مرحوم کی اولاد: نرینہ اولاد آپ کی صرف مولانا سید شریف حسین صاحب تھے- جو جناب حافظ عبدالمنان صاحب مرحوم کے ہم سبق تھے- لیکن وہ کمال علم حاصل کرنے کے بعد حضرت میاں صاحب مرحوم کی زندگی ہی میں فوت ہو گئے تھے- ان کے دو بیٹے سید عبدالسلام اور سید ابوالحسن صاحبان تھے- سید ابوالحسن صاحب کے فرزند مجھ سے سیالکوٹ میں پڑھتے رہے- سنا ہے کہ حالیہ انقلاب کے بعد لاہور میں متوطن ہو کر فوت ہو گئے ہیں-

اللھم اغفرلنا و لھم وارحمھم-

استاذ پنجاب حافظ عبدالمنان محدث وزیر آبادیؒ

ولادت ۱۲۶۷ھ — وفات ۱۳۳۴ھ

آپ کا ذکر خیر کسی قدر جناب میاں صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے تذکرہ میں گذر چکا ہے- آپ ان کے لائق شاگردوں میں سے ہیں جنھوں نے علم حدیث کی اشاعت میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی- آپ بلا تردد تقریباً سارے پنجاب کے استاد حدیث ہیں- کوئی شہر یا قصبہ ایسا نہیں جس میں آپ کے شاگرد نہ ہوں- آپ موضع کرولی تحصیل پنڈ دادنخاں ضلع جہلم کے اعوان خاندان کے روشن چراغ ہیں- آپ کی ولادت ۱۲۶۷ھ

میں ہوئی ہے۔

حصول تعلیم : سات سال کی عمر میں آپ کو تعلیم حاصل کرنے کے لئے مسجد میں بٹھایا گیا۔ مگر ۹ سال کی عمر میں نزول الماء کے عارضہ سے آپ آنکھوں سے بالکل معذور ہو گئے۔ اسی حالت میں تحصیل علم کے لئے مختلف بلاد کا سفر کرتے رہے۔ گجرات کاٹھیاواڑ بمبئی ریاست بھوپال کے سفر کے بعد آخر کار آپ دہلی میں حضرت میاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دیگر علوم کے ساتھ علم حدیث کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔

آپ کا حافظہ نہایت قوی تھا۔ اس کے متعلق مجھے چشم دید حالات اور حافظ صاحب موصوف کے بیان فرمائے ہوئے بہت سے واقعات معلوم ہیں مگر بخوف طوالت اس مختصر ترجمہ میں ان کو بیان نہیں کر سکتا۔

آپ کو علم حدیث کے ساتھ ایک نادر عشق تھا۔ چنانچہ تدریس کے وقت جو کیفیت آپ پر طاری ہوتی تھی اس کا اثر اہل ذوق طلبہ پر بھی پڑتا تھا۔ اس کے بھی بہت سے واقعات ہیں۔

آپ فرماتے تھے کہ میری عمر بیس برس کی تھی جب جناب عبداللہ صاحب غزنوی نے مجھے امرتسر میں درس حدیث کی مسند پر بٹھایا۔ چنانچہ کچھ عرصہ تک میں امرتسر میں درس حدیث دیتا رہا۔ اس کے بعد وزیر آباد آیا۔ ابتداء میں یہاں بعض لوگوں نے شدت سے میری مخالفت کی۔ چنانچہ بعض اوقات مجھے گٹھڑی کی طرح باندھ کر باہر کھیتوں میں پھینک دیا جاتا۔ میں پھر شہر میں آجاتا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اللہ تعالیٰ نے اکثر لوگوں کو میرا عقیدت مند بنا دیا۔

صورت و سیرت : آپ کے چہرہ پر وجاہت اور ہیبت نمایاں تھی۔ لحیم جسیم اور صاحب قوت تھے۔ آپ کی آواز بلند۔ مزاج سادہ اور صاحب قناعت بزرگ تھے۔ لباس اور خوراک جیسی میسر آئی پہن لی اور کھالی۔ طبیعت میں تکلف ہرگز نہیں تھا۔ اپنی حاجت سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کے سامنے بیان نہیں کرتے تھے۔

آپ نے مجھ عاجز سے ذکر کیا کہ ایک دفعہ موسم سرما میں میرے پاس کوئی گرم کپڑا موجود نہیں تھا۔ میں مسجد میں بیٹھا بغلوں میں ہاتھ دبائے سردی کی شدت سے ٹھٹھر رہا تھا اور تہجد کے وقت یاد خدا میں مشغول تھا کہ اس وقت کسی نامعلوم شخص نے پشمینہ کا ایک کابلی دھسہ مجھ پر ڈال دیا جس سے میرا بدن گرم ہو گیا۔

وہ دھسہ مدت تک آپ کے پاس دیکھا جاتا رہا۔ لیکن اوڑھانے والے کا پتہ نہ لگ سکا۔

انسانوں کے علاوہ جنات نے بھی آپ سے علم حدیث حاصل کیا۔ اس امر کے بھی کئی واقعات آپ نے خود مجھ سے ذکر فرمائے۔

آپ اپنے شاگردوں پر خصوصی نظر الفت رکھتے اور ان کی دلداری میں ہر طرح سعی فرماتے۔ مولانا ثناء اللہ صاحب فاضل امرتسری مرحوم اور اس عاجز پر خصوصی نظر عنایت تھی۔ اس بات کی شہادت آپ کا ہر شاگرد دے سکتا ہے۔

آپ کی تدریس حدیث کا شہرہ اس قدر بلند ہوا کہ آپ کے پاس علم حدیث کی تحصیل و تکمیل کے لئے ایسے ایسے علماء بھی آتے رہے جو دیگر فنون میں کامل مہارت رکھتے تھے۔

آپ کی بے تعصبی: آپ ائمہ دین کا بہت ادب کرتے تھے۔ چنانچہ آپ فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص ائمہ دین اور خصوصاً امام ابو حنیفہؒ کی بے ادبی کرتا ہے۔ اس کا خاتمہ اچھا نہیں ہوتا۔ بعض متشدد لوگ آپ سے حدیث پڑھنے آتے مگر یہ شرط کر لیتے کہ حدیث تو آپ سے پڑھیں گے لیکن نماز آپ کے پیچھے ادا نہیں کریں گے۔ آپ اس شرط کو بخوشی منظور فرما لیا کرتے۔

بعض عقیدت مند مقتدی اس پر سوال کرتے کہ آپ ایسے لوگوں کو کیوں پڑھاتے ہیں جو نماز میں آپ کی اقتدا پسند نہیں کرتے؟ اس کے جواب میں آپ فرماتے کہ بھائی یہ ان کی نگاہ انتخاب ہے۔ انہوں نے مجھے جس قابل پایا اس کا فائدہ اٹھانا چاہا۔ اگر ان کی قسمت میں سعادت لکھی ہے تو اللہ تعالیٰ ان کو اتباع سنت کی راہ دکھا دے گا۔

چنانچہ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ایسے متشدد شاگرد رو رو کر آپ کے پاؤں پر گر پڑتے اور اپنی خطائیں معاف کراتے۔

وعظ و تذکیر کے بیان میں اس قدر زور تھا یہی معلوم ہوتا کہ علم حدیث کا دریا بہہ رہا ہے۔ حاضرین پر اس کا خاص اثر ہوتا تھا۔

شمس العلماء مولانا میر حسن صاحب سیالکوٹی (جو میرے اور ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم کے بھی استاد تھے) کو جناب حافظ صاحب مرحوم سے کمال عقیدت تھی۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ حافظ صاحب میں ایک خاص کمال ہے کہ مسائل میں آپ متشدد اور تنگ ظرف نہیں ہیں اور اگر سوال جواب کے سلسلہ میں اپنی بات سے رجوع بھی کرنا پڑے تو ہچکچاتے نہیں۔

آپ کے حلقہ درس کی وسعت: آپ کے شاگرد نہ صرف پنجاب بلکہ ہندوستان و پاکستان کے اکثر شہروں اور دیہات میں پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ مدراس' دہلی' کلکتہ' رنگون اور دوسرے مشہور شہروں میں آپ کے بہت سے شاگردوں سے میری ملاقاتیں ہوئیں جن میں سے بعض میرے زمانہ تعلیم سے پیشتر آپ سے علم حدیث کی تکمیل کر چکے تھے۔ سید ابوالحسن صاحب تبتی صحیح مسلم میں میرے ہم درس تھے۔ علاقہ نجد کے ایک شاگرد کی سند آپ کے حکم سے میں نے خود لکھی اور اس پر آپ کی مہر لگائی۔

مرض الموت: مرض الموت میں آپ نے مجھے اور میرے عم زاد بھائی مولوی احمد دین صاحب سیالکوٹی کو بلایا اور کہا کہ میرا کتب خانہ اس مسجد میں تدریس حدیث میں استعمال کیا جائے۔ یہ وقف ہے۔ میری اولاد میں سے کسی کو اس کی ملکیت کا حق نہ ہو گا۔ اگر یہاں درس قائم نہ رہے تو یہ کتب خانہ دہلی میں اہل حدیث کانفرنس کی تحویل میں دے دیا جائے۔

اس کے بعد آپ نے گھر سے ململ کی ایک پرانی دستار منگوا کر فرمایا کہ میاں صاحب مرحوم نے مجھے یہ عنایت فرمائی تھی اس کو میرے کفن میں استعمال کرنا۔ آپ

نے ماہ رمضان ۱۳۴۳ھ میں وفات پائی-انا للہ و انا الیہ راجعون-

مسلمانان وزیر آباد کے علاوہ لاہور' لائل پور' سیالکوٹ' جہلم اور دیگر کئی شہروں سے شاگرد اور ہزارہا ارادت مند وزیر آباد پہنچے-اور بلا تفریق مذہب نماز جنازہ میں شریک ہوئے- نماز جنازہ میرے دوسرے استاد اور آپ کے سمدھی مولانا ابو عبداللہ عبیداللہ غلام حسن صاحب سیالکوٹی نے پڑھائی- جو لوگ نماز جنازہ میں شریک نہ ہو سکے-وہ جوق در جوق آتے گئے اور جنازہ پڑھتے رہے-چنانچہ بارہ دفعہ نماز ادا کی گئی- مولانا ثناء اللہ صاحب مرحوم نے اس روز فرمایا کہ آج اس زمانہ کا امام بخاری فوت ہو گیا ہے-

اوپر گزر چکا ہے کہ آپ کی وفات رمضان شریف میں ہوئی-گرمی کا موسم تھا-جب تک نماز جنازہ ہوتی رہی ابر رحمت نے سایہ کر رکھا تھا-اللھم اغفر له و ارحمه و ارفع درجاته-

حافظ صاحب مرحوم کی اولاد : حافظ صاحب مرحوم کے پانچ فرزند عبدالجبار' عبدالستار' محمد حسین' عبدالرشید' عبدالباسط اور تین لڑکیاں تھیں- عبدالجبار' عبدالستار اور محمد حسین فوت ہو چکے ہیں- عبدالرشید اور عبدالباسط اللہ تعالیٰ کے فضل سے زندہ ہیں- عبدالجبار مرحوم کے فرزند عبداللطیف نے وکالت پاس کرنے کے بعد کچھ دیر پریکٹس کی اب وہ کراچی میں ہیں- عبدالباسط راولپنڈی میں اور عبدالرشید پشاور میں ہیں-

شیخنا حضرت الاستاد مولانا ابو عبداللہ عبیداللہ غلام حسن سیالکوٹی رحمتہ اللہ علیہ

ولادت

صحیح طور پر معلوم نہیں ہو سکی- غالباً حافظ عبدالمنان صاحبؒ کے ہم عمر تھے-

وفات : ۱۸ جنوری ۱۹۱۸ء

آپ شیخ فاروقی ہیں- آپ کے آباؤاجداد مدت سے موضع ساہووالہ ضلع سیالکوٹ میں مقیم تھے- آبائی پیشہ طبابت و خوش نویسی تھا-چھوٹی عمر میں شہر سیالکوٹ میں مولانا

غلام مرتضیٰ صاحب کے حلقہ درس میں شامل ہوئے- جن کا حلقہ درس شہر سیالکوٹ اور دیگر متصلہ شہروں میں مشہور تھا-

آپ کی طبیعت نہایت ذکی اور حافظہ نہایت قوی تھا- تھوڑی ہی مدت میں نصاب تعلیم ختم کر کے اپنے استاذ معظم کی وفات کے مسند درس پر جلوہ افروز ہوئے- علم حدیث کی سند آپ نے کتابتاً حضرت نواب صدیق حسن خاں صاحب بھوپالیؒ سے حاصل کی-

طبیعت نہایت بردبار اور بامذاق تھی- جو شخص آپ کی زیارت کی سعادت حاصل کرتا اور ایک نماز بھی آپ کے ساتھ پڑھ لیتا مدتوں اس سے لطف اندوز رہتا- کہ کاش پھر بھی یہ سعادت حاصل ہو- حافظہ کی قوت ایسی تھی کہ جس کتاب کا بھی کوئی صفحہ ایک دفعہ دیکھا ہے عمر بھی اس کو دیکھنے کی ضرورت نہ پڑتی- یہ عاجز اپنی ابتدائی عمر میں مولانا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا- اور اخیر یوم وفات تک آپ کی خدمت میں رہا- اتنے عرصہ میں میں نے آپ کو کسی کتاب کا مطالعہ کرتے نہیں دیکھا- ہر دم تسبیح ہاتھ میں لے کر ذکر الٰہی میں مشغول رہتے- گویا آپ حدیث لایزال لسانك رطبا من ذکر الله (حصن حصین) کی زندہ تصویر تھے-

طلبہ کے سبق کے وقت کتاب سامنے نہیں رکھتے تھے- البتہ صبح کی نماز کے بعد درس قرآن کے وقت تفسیر جامع البیان سامنے رکھتے اور بڑے بڑے مشکل مسائل سادہ الفاظ میں سمجھا دیتے- آپ کے طریقہ تعلیم اور حلقہ درس کی شہرت عام تھی- آپ کے شاگرد دور دراز تک پھیلے ہوئے تھے- جن میں سے اب عاجز کی طرح خال خال باقی ہوں گے-

بعض متشدد لوگ بھی آپ کی خدمت میں آتے اور باوجود آپ سے علم حاصل کرنے کے نماز میں آپ کے شریک نہ ہوتے تھے- مگر مولانا ان سے کچھ تعرض نہ کرتے- لیکن کچھ مدت کے بعد ان پر ایسا رنگ چڑھتا- کہ وہ سنت کے پورے تابعدار ہو جاتے-

شمس العلماء مولانا میر حسن صاحب مرحوم جن کا ذکر خیر حافظ عبدالمنان صاحب مرحوم کے ذکر میں آچکا ہے۔وہ مولانا صاحب کے پڑوس میں رہتے تھے۔ان کو حضرت مولانا سے کمال عقیدت تھی۔اور عام طور پر نمازیں بھی آپ کے ساتھ پڑھتے تھے۔

آپ خوش طبع اور بے تعصب تھے۔اتباع سنت میں آپ کا عمل نہایت پختہ تھا۔تمام بزرگان دین کا نہایت ادب کرتے تھے۔اور اختلافی مسائل میں یا تو صورت جامعہ پر عمل کرتے۔یا اس صورت پر جو اقرب الی السنہ ہو۔اور معرکتہ الارا اختلافی مسائل میں جن میں نص صریح سے فیصلہ نہ ہو سکتا ہو اپنی طرف سے اجتہاد کرنے سے بہت گریز کرتے تھے۔اور اپنی رائے محفوظ رکھتے ہوئے مسائل کے سامنے اختلاف ائمہ بیان کر کے ہر ایک کی دلیل بیان کر دیتے اور اس کو انہی کے ذمہ پر چھوڑ دیتے' اور فرماتے کہ اپنی طرف سے قول پیدا کر کے ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے کی نسبت ائمہ کا قول ذکر کر دینے میں اپنی سبکدوشی ہے اور بس[1]

فتویٰ میں حق گوئی یہاں تک مسلم تھی۔کہ دیگر فرقوں کے لوگ بھی اپنے علماء کی نسبت مولانا صاحب کی طرف زیادہ رجوع کرتے۔اور آپ کا طریق تفہیم اس قدر موثر تھا۔کہ شدید مخالف لوگ بھی آپ کی مجلس سے معتقد ہو کر اٹھتے۔دوسرے فرقوں کے لوگوں کی زبان پر عام طور پر مشہور تھا۔اگر مولانا صاحب اس درجہ کے متقی نہ ہوتے تو اہل حدیث کا مذہب سیالکوٹ میں اتنی جلدی نہ پھیلتا۔

تصانیف : آپ نے اپنی ابتدائی عمر میں چند رسائل ضرور تاتصنیف کئے جو انداز بیان سے از بس مفید ہیں۔اور وہ یہ ہیں :۔

(۱۴) کتاب الصلوٰۃ : جو سادہ طور پر سنت کے مطابق نماز کی تعلیم کے متعلق ہے۔اس کے حاشیہ پر ایک رسالہ نابالغ حافظ قرآن کی اقتدا میں نماز تراویح کے جواز میں لکھا ہے۔

---

[1] اپنے استاد مرحوم کی اقتدا میں اس عاجز کا بھی یہی مسلک ہے۔

(۳) لوامع الانوار فی عقائد الابرار : اس میں بعض معترضین نے اہل حدیث کے عقائد و اعمال پر جو اعتراض کیے ہیں۔ ان کا جواب دیا گیا ہے۔

(۴) شمس الضحیٰ : بعض معترضین کے اعتراضات کے جواب میں ہے۔

(۵) شہاب ثاقب : تقویۃ الایمان کی بعض عبارتوں پر جو اعتراض کے لئے ہیں ان کے جواب میں ہے یہ سب کتابیں اردو میں ہیں۔

(۶) القول الفصیح : اس کتاب میں امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنا ثابت کیا گیا ہے یہ عربی زبان میں ہے۔ حاشیہ پر اس کا اردو ترجمہ بھی درج ہے۔

امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنے یا نہ پڑھنے کے متعلق اہل حدیث اور احناف کی طرف سے بہت سی کتابیں لکھیں گئی ہیں۔ طرفین کی جو کتابیں دیکھنے میں آئی ہیں میرے ناقص علم میں ان سب میں حضرت مولانا ممدوح کی کتاب القول الفصیح سب سے زیادہ نافع اور مفید ہے۔

(۷) انیس الغریب : غیر مطبوعہ۔ کس کا مسودہ مولانا صاحب نے مجھے عنایت فرمایا تھا۔ اس میں خطبہ جمعہ کا جواز غیر عربی زبان میں ثابت کیا گیا ہے۔ انشاء اللہ اس کو چھپوا کر شائع کر دیا جائے گا۔

آپ پر ذوق تصوف غالب تھا۔ آپ کے چہرہ مبارک کا اتنا جلال تھا۔ کہ اہل ثروت بلکہ حاکم تک آپ کو اپنی مجلسوں میں نہیں بلا سکتے تھے۔ بلکہ آپ کی مجلس میں خود حاضر ہونے کو سعادت جانتے تھے۔

وفات : جمعرات اور جمعہ کی درمیانی رات۔ بوقت عشاء بتاریخ ۱۸ جنوری ۱۹۱۸ء کو داعی اجل ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

آپ کا جنازہ مولانا عبدالحکیم صاحب سیالکوٹی مرحوم کے مقربہ کے قریب کھلے میدان میں ہوا۔ جس میں بکثرت ہجوم تھا۔ تمام فرقوں کے لوگ بلا امتیاز شامل تھے۔

آپ کے دو صاحبزادے مولوی عبداللہ و عبدالواحد اور ایک بیٹی اللہ تعالیٰ کے فضل سے زندہ سلامت ہیں۔

اول الذکر پوسٹ ماسٹر اور عبدالواحد کلرک آف کورٹ کے عہدہ سے ریٹائر ہو چکے ہیں- اور آپ کی صاحبزادی ڈاکٹر شاہ نواز صاحب بالقابہ میڈیکل آفیسر ریاست حیدر آباد دکن کے گھر میں آباد ہے-

اللھم اغفرلہ و ارحمہ و ارفع درجتہ فی اعلی علیین-

شیر پنجاب حضرت مولانا ابوالوفا ثناء اللہ صاحب امرتسریؒ

ولادت جون ۱۸۶۸ء وفات مارچ ۱۹۴۸ء- مولانا کا تبحر علمی اور قادر کلامی مسلم کل ہے اس لئے محتاج بیان نہیں- آپ نے ابتدائی تعلیم مولانا ابو عبید احمد اللہ صاحب امرتسری اور مولانا غلام علی صاحب قصوری سے حاصل کی- بعد ازاں حافظ عبدالمنان صاحب سے حدیث پڑھی- فقہ اور دیگر علوم کی تکمیل کے لئے دیوبند تشریف لے گئے- اس کے بعد میاں نذیر حسین صاحبؒ سے حدیث کی سند حاصل کی-

مولانا کی مفصل سوانح عمری عزیزم مولوی عبدالمجید نے ایک ضخیم کتاب "سیرتِ ثنائی" کے نام سے تصنیف کی ہے- جس نے مجھے ان کے حالات لکھنے سے بہت حد تک مستغنی کر دیا ہے- ہاں اس قدر ضرور ہے کہ اگر عزیز مذکور اس کتاب کا مسودہ مجھے دکھا لیتے تو میں ان کو مولانا مرحوم کی زندگی کے متعلق بہت سی ایسی باتیں املا کراتا- جو کسی اور شخص کو معلوم نہیں- لیکن پھر بھی مولانا کی علمی قابلیت اور دینی خدمات- تصانیف و مناظرات اور ظرافت طبع حاضر جوابی کے دلچسپ واقعات اور غزنوی خداندن سے آپ کی نزاع کے تفصیلی حالات بہت زیادہ اس کتاب میں درج ہیں- جو ناظرین مطالعہ سے ملاحظہ فرما سکتے ہیں-

پاک و ہند کی تقسیم کے بعد ۱۳ اگست ۱۹۴۷ء کو مولانا ممدوح مع اہل و عیال لاہور چلے آئے وہاں سے آکر کچھ دن گوجرانوالہ میں مقیم رہے- چونکہ آپ کو اپنے امرتسر والے پریس کے عوض سرگودھا میں پریس الاٹ ہوا تھا- اس لئے آپ وہاں چلے گئے- جہاں آپ مرض فالج کے سبب مارچ ۱۹۴۸ء میں فوت ہو گئے- انا للہ و انا

الیہ راجعون۔

مولانا مرحوم کی اولاد : مولانا مرحوم کا فرزند ابو رضا عطاء اللہ فسادات کے زمانہ میں امرتسر میں ہی شہید ہو گیا تھا۔ان کے چار لڑکے رضا اللہ' ذکاء اللہ' بہاء اللہ اور ضیاء اللہ ہیں تینوں بڑے دنیوی کاروبار کرتے ہیں۔چوتھا زیر تعلیم ہے۔

کوئی جزئی فقہ کی جزئیات سے حدیث کی مخالفت ہوتی- تو اسے چھوڑ دیتے اور فرما دیتے- تعجب ہے- صحیح حدیث جو چند واسطوں سے رسول اللہ ﷺ تک پہنچ جاتی ہے ترک کی جاوے اور اس کے خلاف فقہ کا قول جس کے نقل کرنے والے مفتی اور قاضی ہیں- وہ بھی معلوم نہیں کہ کس واسطے سے ان کے پاس پہنچا ہے عمل کیا جاوے- چنانچہ آپ نے تشہد میں رفع سبابہ- رکوع سے پہلے اور بعد میں رفع یدین- آمین- بالجہر- فاتحہ خلف امام پر عمل کرنا شروع کر دیا- اور نماز بھی اول وقت خشوع خضوع سے پڑھتے-

توحید و سنت کی تبلیغ- شرک و بدعت کی تردید- لوگوں کی مخالفت اور جلا وطنی: آپ نے توحید و سنت کی تبلیغ اور شرک و بدعت کی تردید شروع کر دی- علاقہ کے عالم اور عوام آپ کے مخالف ہو گئے- امیر کابل دوست محمد خان سے آپ کی شکایتیں کیں- آپ کی مخالفت میں نمایاں حصہ لینے والے خان ملا درانی- ملا مشکی ارنڈی اور ملا نصر اللہ لوبانی تھے- امیر کابل نے ان لوگوں کے خوش کرنے کے لئے آپ کو وطن سے نکال دیا-

غزنی سے رخصت ہو کر آپ سوات بنیر پہنچے- وہاں سے کوٹھ- پھر ہزارہ- پنجاب اور وہاں سے دہلی تشریف لے گئے- یہاں آپ نے سید نذیر حسین صاحب محدث دہلویؒ سے حدیث کی سند حاصل کی- انہی دنوں ۱۸۵۷ء بمطابق ۱۶ رمضان المبارک ۱۲۷۲ھ کو آزادی کی جدوجہد جسے غدر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے شروع ہو گئی- دہلی سے سند حاصل کر کے آپ پنجاب تشریف لائے- یہاں کچھ عرصہ قیام کے بعد براستہ ڈیرہ اسماعیل خان وطن واپس چلے گئے- یہ امید لے کر کہ شاید امیر کابل کا خیال بدل گیا ہو- ایک ماہ کے قیام کے بعد یکا یک امیر کابل کے سوار آپ کے اخراج کے پروانہ لے کر پہنچے- آپ وہاں سے نکل کر ملک ناوہ میں چلے گئے- امیر نے وہاں بھی آپ کو رہنے نہ دیا- اور معہ اہل و عیال یاغستان کے پہاڑوں میں نکال دیا- آپ نے اسی علاقہ میں سکونت اختیار کر کے توحید و سنت کی تبلیغ شروع کر دی- ناوہ کے علماء کو جب

پتہ چلا۔ تو ایک لشکر جرار سے آپ پر چڑھائی کر دی۔ آپ کا گھر جلا دیا۔ اور آپ کے چند معتقدوں کو زخمی کر گئے۔ آپ کو وہاں سے بھی نکلنا پڑا۔ اہل و عیال سمیت پہاڑوں میں جگہ جگہ پھرتے رہے۔ جس جگہ آپ جاتے۔ مخالف علماء وہاں سے آپ کو نکلوا دیتے۔ آپ کو کہیں بھی سکون حاصل نہ ہوا۔ امیر دوست محمد خان فوت ہو گیا۔ اور اس کا بیٹا شیر علی خان تخت نشین ہوا۔ مولانا عبداللہ نے خیال کیا۔ کہ شاید حالات پر سکون ہو گئے ہوں پھر وطن چلے گئے علماء نے اس کے پاس بھی شکایت کر دی۔ اس نے آپ کو حکم دیا کہ ہماری ولایت سے باہر ہو جاؤ۔ آپ حیران ہوئے کہ اب کس طرف جاؤں۔ اتفاق سے اس وقت کابل میں بغاوت ہو گئی۔ اور شیر علی خان تخت چھوڑ کر ہرات چلا گیا۔ پھر محمد افضل خان اور محمد اعظم خان کو سلطنت ملی۔ علماء سو نے مولانا کے خلاف ان کو بھی اکسایا۔ محمد افضل خان نے مقر کے حاکم کے ذریعہ مولانا کو گرفتار کرایا اور آپ کو مع اسباب اور کتابوں کے سردار محمد عمر خان پسر دوست محمد خان کے پاس حاضر کیا۔ آپ کے فرزندوں میں سے مولوی عبداللہؒ مولوی محمد اور مولوی عبدالجبارؒ صاحبان اس وقت آپ کے ہمراہ تھے۔ سردار موصوف آپ کا نورانی چہرہ دیکھ کر نرم ہو گیا اوب سے بولا۔ آپ کیوں نہیں اس طریقہ کو چھوڑ دیتے۔ جو کچھ وقت کے مولوی کرتے ہیں ان کے ساتھ شامل ہو جائیں۔ آپ نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ کتاب و سنت کو جاری کیا جاوے۔ سردار پر آپ کی باتوں کا بہت اثر ہوا۔ چنانچہ اس نے امیر کابل کے نام خط لکھا کہ حسب الحکم آپ کے میں نے اس شخص کو گرفتار کیا۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ یہ شخص صالح اور فقیر ہے۔ اور اسباب دنیا سے متنفر ہے جو کچھ حکم ہوا رقام فرماویں۔ انہوں نے جواب میں لکھا کہ ان کو کابل پہنچا دو۔ سردار نے ان کو اسی وقت کابل کی طرف چند سواروں کے ہمراہ روانہ کر دیا۔

ملا مشکی اور ملا نصر اللہ وغیرہ نے کابل کے پاس جا کر کہا۔ کہ امیر دوست محمد خان کے وقت میں ہم اس شخص کا کفر ثابت کر چکے ہیں۔ اب دوبارہ تحقیق کی حاجت نہیں۔ امیر کی مرضی سے سب نے متفق ہو کر درے مارنے اور گدھے پر سوار کر کے شہر میں

پھرانے کا فتویٰ صادر کیا- چنانچہ آپ کو اور آپ کے تینوں بیٹوں کو شہر میں پھرایا گیا- اور درے مارنے شروع کیے- جب وہ ظالم اس تشہیر اور زدوکوب سے فارغ ہوئے تو آپ کو بیٹوں سمیت قید خانہ میں ڈال دیا گیا- دو سال تک قید رہے-

جب امیر افضل خان مر گیا- تو اس کے بعد امیر اعظم خان تخت پر بیٹھا- اس ظالم نے بھی خاں ملا اور خان عبدالرحمٰن کے بہکانے پر آپ کا پشاور کی طرف نکال دیا- آپ کے دو شاگرد ملا سفر اور ملا مراد ہم سفر تھے- پشاور پہنچ کر تھوڑی مدت یہاں توقف فرمایا- اور بعد میں پنجاب کے شہر امرتسر میں مستقل قیام کیا- اور یہیں پر تازیست کتاب و سنت کی تبلیغ فرماتے رہے- اور آپ ماہ ربیع الاول ۱۲۹۸ھ کو رحلت فرما گئے- انا للہ وانا الیہ راجعون- آپ کا مرقد شہر امرتسر میں دروازہ سلطان ونڈ کے باہر عبدالصمد کاشمیری کے تالاب کے کنارے پر ہے-

آپ کی اولاد: آپ کی اولاد ۱۲ صاحبزادے اور ۱۵ صاحبزادیاں ہیں- صاحبزادوں کے نام حسب ذیل ہیں- مولانا عبداللہؒ- مولانا محمدؒ- مولانا احمدؒ- مولانا عبدالجبارؒ- مولانا عبدالواحدؒ- مولانا عبدالرحمانؒ- مولانا عبدالستارؒ' مولانا عبدالقیومؒ' مولانا عبدالعزیزؒ' مولانا عبدالحیٔ- مولانا عبدالقدوس- مولانا عبدالرحیم یہ سب کے سب محدث تھے-

مولانا عبداللہؒ بن عبداللہؒ: (امام اول) آپ کی اولاد میں سے حافظ عبداللہ اسلامیہ کالج پشاور میں پروفیسر ہیں اور ان کے لڑکے احمد غزنوی ہیں جو آجکل حیدر آباد سندھ میں سیشن جج ہیں-

مولانا محمدؒ بن عبداللہؒ: ان کی اولاد ہیں- مولانا عبدالاول اور مولانا عبدالغفور ہیں- موخرالذکر نے غزنوی حمائل شائع کی-

مولانا احمدؒ: کی اولاد حکیم عبدالشافی اور مولانا عبدالوارث ہیں-

مولانا عبدالجبارؒ: (امام ثانی) آپ کے صاحبزادے- مولانا احمد علی- مولانا داؤد- حافظ سلیمان- مولانا عبدالغفار اور حافظ عبدالستار ہیں-

مولانا داؤد غزنوی: محتاج تعارف نہیں آج کل پنجاب اسمبلی کے ممبر ہیں اور ان کے دو صاحبزادے عمر فاروق اور ابو بکر ہیں۔ اول الذکر نہایت نیک اور صالح نوجوان ہیں۔ آج سے کچھ عرصہ قبل شاہ اسماعیل شہیدؒ کی جماعت مجاہدین چمر قنڈ میں شامل تھے۔ اور انگریزوں کے خلاف کئی معرکوں میں شریک جہاد ہوئے۔ ناشر بھی ان دنوں چمر قنڈ میں موجود تھا۔ مؤخر الذکر ابو بکر غزنوی آج کل اسلامیہ کالج لاہور میں پروفیسر ہیں۔

مولانا عبدالواحدؒ: (امام ثالث) آپ کے صاحبزادے مولانا اسماعیل۔ مولانا عبدالحمید' مولانا ابراہیم' مولانا ولی ہیں۔ مولانا اسماعیل غزنوی حاجیوں کی خدمت میں نمایاں حصہ لیتے ہیں۔ اس منصب پر آپ مدت سے مقرر ہیں۔ جب آپ مولانا عبدالواحدؒ کے ساتھ مؤتمر عالم اسلامی کے اجلاس منعقدہ ۱۹۲۶ء مکہ معظمہ تشریف لئے گئے تھے تو سلطان نجد و حجاز نے آپ کو حجاج کی خدمت کے لئے مقرر کر دیا مولانا اسماعیل کے صاحبزادے یہ ہیں۔ خالد' (ڈاکٹر) طارق' قاسم' عبدالواحد' ابراہیم' احمد' محمد' محمود' حسن۔

مولانا عبداللہ غزنویؒ:۔ کے چار صاحبزادے لاولد تھے مولانا عبدالرحمان' مولانا عبدالستار' مولانا عبدالحیٰ' مولانا عبدالقدوس۔

مولانا عبدالعزیزؒ بن عبداللہ: کے لڑکے عبدالاعلیٰ ہیں۔

مولانا عبدالرحیمؒ: کے صاحبزادے مولانا یحییٰ۔ مولانا عیسیٰ۔ حافظ ذکریا۔ مولانا موسیٰ۔ مولانا احمد اور نوح ہیں۔ مولانا عبدالرحیمؒ موصوف اور مولانا عبدالواحدؒ صاحب تجارت کے سلسلہ میں عرب کے علاقہ نجد ریاض میں گئے۔ دونوں حضرات سے سلطان ابن سعود والئی نجد و حجاز کے والد بزرگوار سلطان عبدالرحمٰن نے کہا۔ کہ آپ ہمارے ہاں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کریں۔ چنانچہ پانچ سال تک سلطان موصوف کے خاندان کو علم دین پڑھایا۔ اور دیگر اہل نجد بھی آپ کے علم سے فیضیاب ہوئے رحمہم اللہ علیہم اجمعین۔

مولانا غلام رسول (عبداللہ) سکنہ قلعہ میہاں سنگھ گوجرانوالہ

آپ کی ولادت ۱۲۲۸ھ میں ہوئی- آپ نے حدیث سید نذیر حسین محدث دہلویؒ سے پڑھی- مولانا عبداللہ غزنویؒ آپ کے ہم سبق تھے وعظ و نصیحت کا شوق آپ کو ابتدا ہی سے تھا- وعظ اس قدر موثر تھا- کہ اکثر غیر مسلم سن کر مسلمان ہو گئے- دہلی میں آپ کے وعظ کا چرچا بہت ہوا- ان دنوں ۱۸۵۷ء کا واقعہ رونما ہوا- انگریزوں نے موحدین کو اس کا مورد الزام ٹھہرایا جس کے متعلق شبہ ہوتا کہ یہ وہابی ہے دھر لیا جاتا- کسی نے شکایت کر دی کہ غدر میں مولانا غلام رسول وہابی کے وعظوں کو بھی دخل ہے- آپ کی گرفتاری کا خطرہ ہو گیا- وطن واپس آ گئے- اور وہاں گرفتار ہو کر منٹگمری کی عدالت میں لاہور پیش کئے گئے- لوگوں میں مشہور ہو گیا کہ مولوی صاحب کو پھانسی کا حکم ہو گا- ہزاروں آدمی جمع ہو گئے- منٹگمری نے معلوم کیا- یہ کیوں آئے ہیں- جواب ملا کہ یہ شخص پنجاب بھر کا استاد اور پیر ہے- یہ لوگ اس لئے جمع ہوئے ہیں- کہ اگر ہمارے پیر استاد کو پھانسی کا حکم ہوا- تو ہم ختم ہو جائیں گے ہمارا زندہ رہنا فضول ہے یہ سن کر منٹگمری کو اپنا ارادہ بدلنا پڑا- اور مولانا پھانسی سے بچ گئے- لیکن کچھ عرصہ کے لئے نظر بند کر دئے گئے- رہائی کے بعد آپ نے درس تدریس کا سلسلہ تا زیست جاری رکھا- اور کتاب و سنت کو زندہ کیا- ۱۲۸۹ھ کو حج سے فارغ ہو کر ۱۲۹۱ھ میں وفات پائی- اناللہ وانا الیہ راجعون- آپ کے صاحبزادے مولانا عبدالقادرؒ اور مولانا عبدالعزیزؒ بھی دین کی خدمت کرتے رہے- مولانا عبدالقادر کی اولاد- مولوی عبدالمالک- مولوی عبدالرشید- مولوی محمد صادق- مولوی عبدالوکیل ہیں- اور مولوی عبدالعزیزؒ کی اولاد مولوی عبدالواحد- محمد شفیع- محمد اشرف اور عبدالرحمٰن ہیں-

مولانا حافظ محمدؒ بن بارک اللہؒ لکھوکے

آپ کی تصانیف اور خاندان کی برکت سے کتاب و سنت کی اشاعت کو جو فائدہ پہنچا ہے وہ پوشیدہ نہیں- ان کے ذکر کے لئے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے-

مسلک کتاب وسنت کے فروغ کے لئے کوشاں
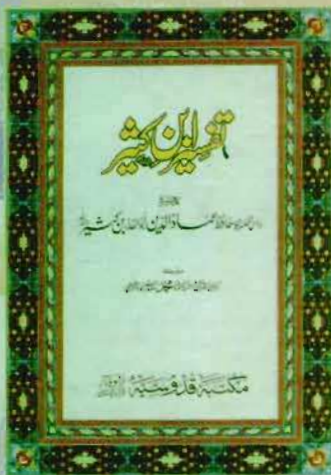
تمام مفسرین کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآن کو سلف صالحین کے انداز میں سمجھانے والی تفسیر ابن کثیر ہی ہے

ایک عظیم الشان خوشخبری

مولانا محمد داؤد رازؒ کے قلم سے فرامین نبویؐ کے بے مثال اور صحیح ترین مجموعے کی لاجواب تشریح

مکتبہ قدوسیہ اردو بازار لاہور